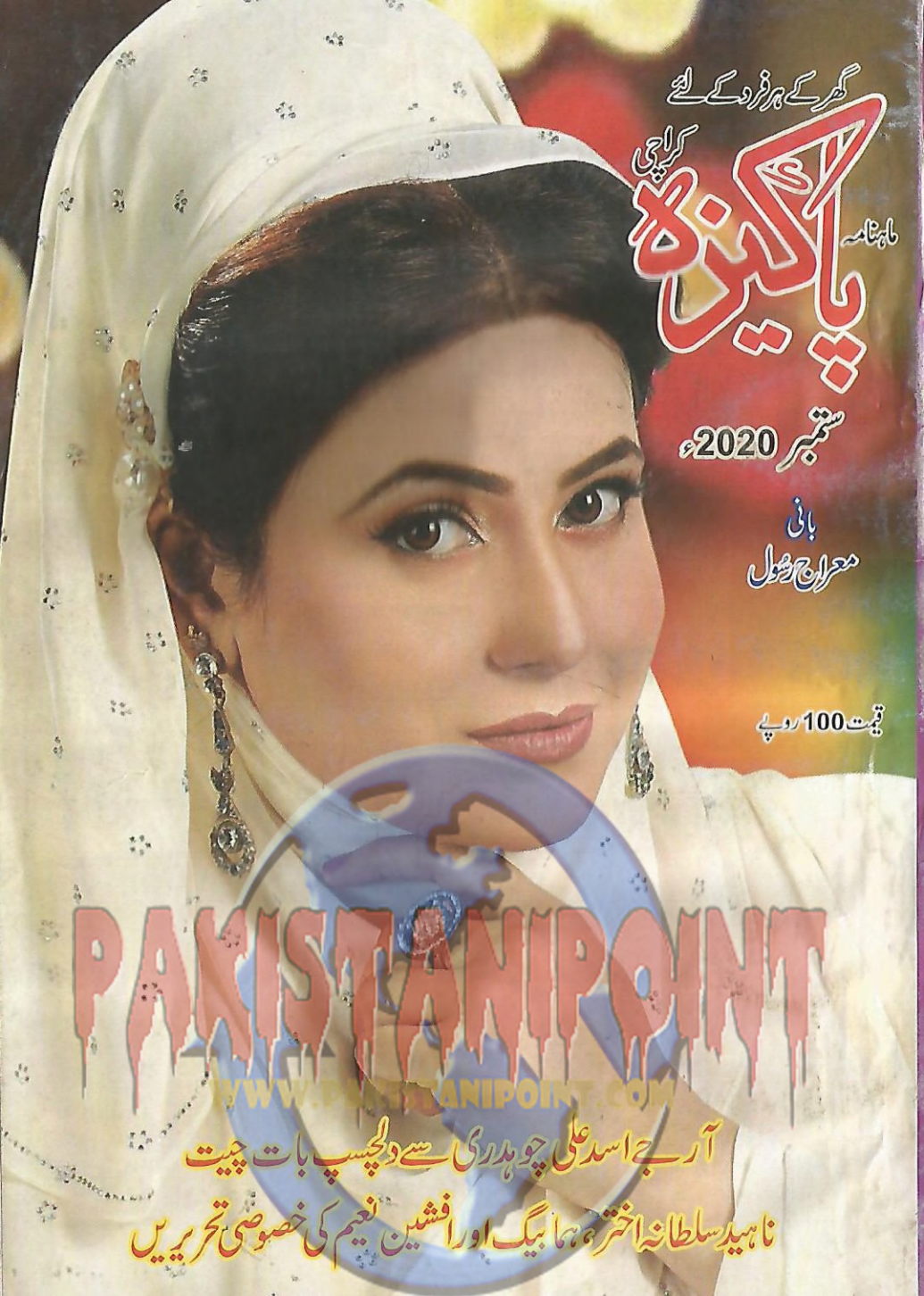

PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

آر جے اسد علی چوہدری سے دلچسپ بات چیت

ناہید سلطانہ اختر، ہما بیگ اور افشین نعیم کی خصوصی تحریریں

اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے — مدیرہ — 07

سلسلے وار ناول

میرا سارا رنگ اتار دو — افشاں آفریدی — 10
میں عشق ہوں — نایاب جیلانی — 98

مکمل ناول

پریوں کا دیس — مدیحہ شاہد — 204

ناولٹ

ایک سجدہ — عائشہ خان — 136

منی ناول

میں انمول — سعدیہ رئیس — 62

عورت کہانی

ع عورت ف فائدہ — فرحین اظفر — 175

افسانے

ترجیح کا سفر — ناہید سلطانہ اختر — 39
سوئی دھاگا — مہرین کنول — 49
التجا — صدف آصف — 51
کیسی ریت کیسے رواج — حلیہ عنصر مغل — 83
دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی..... — سعدیہ قریشی — 87
سوا لاکھ کا ہاتھی — فوزیہ احسان — 93
ہجرت کرکے انسان..... — عقیلہ اکبر — 123
آئیں تیاری کرلیں — راشدہ سعدیہ — 126
انا کی قربانی — حوریہ بتول — 128
کام اور کورونا — وردہ بخاری — 133
نگینہ — ہما بیگ — 185
بڑے کام کی چھوٹی بات — افشیں نعیم — 195

خصوصی مضامین

سرورق — شائستہ زریں — 240
شمع محفل — اختر شجاعت — 247
انداز نو — بنت زیب — 254

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ایکسٹنشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مستقل عنوانات

دین کی باتیں	ادارہ 08	خوش ذائقہ	شگفتہ یاسمین 278
بہنوں کی محفل	مدیرہ 261	بزم پاکیزہ	پاکیزہ بہنیں 280
پاکیزہ ڈائری	آمنہ حماد 271	روحانی شوز	ادارہ 282
میں اکثر گنگناتی ہوں	صغریٰ زیدی 275	حسن نکھار کے لیے	مہ جبیں 284
منتخب غزلیں	ادارہ 277	ہومیو کلینک	286

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

ایجنٹ وقارئین متوجہ ہوں

تمام ایجنٹ حضرات/قارئین کرام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی طرف سے اب مندرجہ ذیل تاریخوں میں ڈائجسٹ جاری کیے جائیں گے۔

نئے شمارے اکتوبر 2020ء سے ان تاریخوں میں دستیاب ہوں گے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
ہر ماہ کی 20 تاریخ تک

ماہنامہ پاکیزہ کراچی
ہر ماہ کی 25 تاریخ تک

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
ہر ماہ کی 30 تاریخ تک

ماہنامہ سرگزشت کراچی
ہر ماہ کی 03 تاریخ تک

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون: (021)-35804200 , (021)-35895313

عزیز قارئین.....السلام علیکم

ستمبر 2020ء کا ماہنامہ پاکیزہ لیے حاضر ہیں۔

الحمدللہ نیا قمری سال طلوع ہو چکا ہے اور اس سال کا پہلا ماہ محرم الحرام ہمیں اس عظیم اور ناقابلِ فراموش سانحے کی یاد دلاتا ہے۔ جب مٹھی بھر حامیانِ حق وصداقت نے اسلام کا پرچم سربلند کرتے ہوئے کربلا کے تپتے ریگ زار میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے.....اور صبر وصدق ووفا کی ایسی مثال قائم کی کہ جسے قیامت تک آنے والی نسلیں یاد رکھیں گی اور حق کی راہ پر چلنے کے لیے اسی عظیم الشان واقعے سے رہنمائی حاصل کرتی رہیں گی۔

نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسین علیہ السلام ان کے خانوادے اور انصار کے جذبۂ خلوص و وفا کی ثابت قدمی کی کوئی دوسری مثال نہیں۔

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ماہ ستمبر اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس ماہ بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح کا تاریخ وفات بھی ہے.....ہم قائداعظم کی زندگی کے زریں اصول اپنا کر ملک وقوم کی ترقی اور خوشحالی میں یقیناً اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ایک علیٰحدہ مملکت کا قیام جس مقصد کے لیے وجود میں آیا تھا انہی اصولوں پر عمل کر کے قائد کے خوابوں کو پورا کر سکتے ہیں۔ پوری قوم کو یومِ دفاع پاکستان کی پُرمسرت گھڑیاں بھی مبارک ہوں۔

ہم عزمِ صمیم رکھتے ہیں کہ اپنے وطن کی نظریاتی، جغرافیائی اور ثقافتی حدود کی پاسداری کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ ان شاءاللہ.....

مدیرہ

نزہت اصغر

الٰر یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔(۱) کیا لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ ہم نے انہی میں سے ایک آدمی کی طرف یہ وحی بھیجی کہ لوگوں کو ڈراؤ، اور وہ لوگ جو ایمان لائے انہیں (اس بات کی) خوشخبری دو کہ ان کے لیے ان کے پروردگار کے ہاں سچائی کا پایہ (اور مرتبہ) ہے۔ کافروں نے کہا یقیناً یہ ظاہر جادوگر ہے۔(۲) بے شک تمہارا پروردگار تو وہ اللہ تعالیٰ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ وقتوں میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش پر مستوی ہوا وہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی (بھی) اس کا سفارشی نہیں (ہوسکتا)۔ یہ اللہ تعالیٰ تمہارا پروردگار ہے۔ پس اسی کی عبادت کرو۔ کیا پھر بھی تم نصیحت نہیں پکڑتے ہو۔(۳) تم سب کی مراجعت اسی کی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے۔ یقیناً وہ مخلوق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر وہی اسے (قیامت کو زندہ کرے کے) لوٹائے گا۔ تاکہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور عمل نیک کیے انصاف کے ساتھ بدلہ دے اور وہ لوگ جو کافر ہو گئے، ان کے لیے پینے کو کھولتا ہوا پانی، اور دردناک عذاب ہوگا۔ اس لیے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے۔(۴) (اللہ) وہی ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو نورانی بنایا۔ اور اس (چاند) کی منزلیں مقرر کیں۔ تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ان (سب چیزوں) کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ وہ ان لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں آیتیں کھول کر بیان کرتا ہے۔(۵) یقیناً رات اور دن کے آگے پیچھے آنے، اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے۔ اس میں پرہیزگار لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔ یقیناً وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، اور وہ دنیا کی زندگانی پر راضی ہو گئے اور اسی پر مطمئن ہو گئے۔ اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں سے غافل ہیں۔(۷) یہ وہ لوگ ہیں کہ بوجہ ان اعمال کے جو وہ کماتے رہے تھے، ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ (۸) بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل نیک کیے، ان کا پروردگار ان کے ایمان کی وجہ سے انہیں نعمتوں والی جنتوں میں پہنچائے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔(۹) ان (جنتوں) میں ان کی دعا (یہ) ہوگی۔ اے اللہ تو پاک ہے۔ اور ان میں ان کی دعا ملاقات سلام (علیکم) ہوگی۔ اور ان کی دعا کا اخیر یہ ہوگا کہ ہر حمد تمام جہانوں کے پروردگار اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے۔(۱۰) جس طرح لوگ بھلائی کو جلدی مانگتے ہیں اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو نقصان پہنچانے میں جلدی کرتا تو ان کی میعاد ان تک کبھی کی پوری کر دی گئی ہوتی۔ پس ہم ان لوگوں کو جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے چھوڑے رکھتے ہیں کہ وہ اپنی سرکشی میں سرگرداں رہیں۔(۱۱) اور جس وقت کسی انسان کو کوئی تکلیف پہنچی تو اس نے اپنے پہلو پر لیٹے ہوئے یا بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے ہمیں پکارا پھر جب ہم نے اس کی تکلیف کو اس سے دور کر دیا تو وہ (اس طرح) گزر گیا گویا کہ اس تکلیف کے لیے جو اسے پہنچی۔ اس نے ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔ اسی طرح زیادتی کرنے والوں کے لیے جو عمل وہ کیا کرتے تھے زینت دے دیے گئے۔(۱۲)

(سورۂ یونس ۱۰ پارہ ۱۱ آیات ۱ تا ۱۲)

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ سَیِّدِ الْحَافِظِیْنَ ﷺ

سید کونین، ختم المرسلین، افضل الانبیا، سرور کائنات رحمۃ العالمین حبیب خدا، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام سیدنا حافظ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے جس کے معنی و مفہوم یاد رکھنے والے کے ہیں۔

1۔ القرآن: ا: ترجمہ: اب ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ تم فراموش نہ کر پاؤ گے۔ (آیت ۶۔ سورۃ اعلیٰ)

۲: ترجمہ: اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وحی کے پڑھنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیا کرو کہ اس کو جلد یاد کرلو (۱۶) اس کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمے ہے (۱۷) جب ہم وحی پڑھا کریں تو اس کو سنا کرو اور پھر اسی طرح پڑھا کرو (۱۸) پھر اس کے معنی کا بیان بھی ہمارے ذمے ہے۔ (۱۹) (سورۃ قیامہ آیات ۱۶ تا ۱۹)

2۔ الحدیث: ا: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں تنہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ زبان مبارک سے نکلا کہ جو دامن پھیلا کر اس وقت میری باتیں سینے میں سمیٹ لے گا وہ پھر کبھی نہ بھولے گا۔ میں نے دامن پھیلایا جب کلام مبارک ختم ہوا تو سینے میں سمیٹ لیا۔ اس وقت سے کوئی بات نہیں بھولا۔ (بخاری و مسلم)

۲: اصحاب صفہ (جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثیں یاد کرتے اور ایک دوسرے کو سناتے) کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا فرمائے کہ جن کے درمیان رہنے کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔''

3۔ الوائی: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو بھی الحمد سے والناس تک قرآن کا ایک، ایک لفظ زبانی یاد کرایا۔ چنانچہ اپنی وفات سے قبل حجۃ الوداع میں لاکھوں مسلمانوں سے اس امر کا اقرار لیا کہ قرآن ان تک پہنچا دیا گیا اور ان کے اقرار کے بعد اس پر خود اللہ کو شاہد قرار دیا کہ میں نے یہ قرآن ان سب تک پہنچا دیا۔ (مقام حدیث حصہ دوم)

4۔ الفضائل: روزانہ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد دس مرتبہ یہ اسم پاک پڑھنے والا لوگوں کو اپنے لیے مہربان پائے گا۔

اگر کسی کی یادداشت کمزور ہو اور بھول جانے کی عادت ہو تو ہر نماز کے بعد 50 مرتبہ یہ اسم مبارک ''یا حافظ'' پڑھنے سے یادداشت مضبوط ہو جائے گی۔

(قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس)

زندگی کبھی، کبھی انسان کو ایسے کربناک حادثے سے دوچار کر دیتی ہے کہ اس کا اپنی ذات اور ارد گرد کے لوگوں پر سے اعتماد متزلزل ہو جاتا ہے۔ اس حادثے کی وجہ بعض اوقات اس کی اپنی توقعات بھی ہوتی ہیں جو وہ کسی بے نام تعلق سے وابستہ کر لیتا ہے۔ وہ جذبے جو رشتوں کے توسط سے دل میں بسیرا کریں ان کی پزیرائی تو مذہب اور معاشرہ دونوں کرتے ہیں، ان کی حق تلفی پر جواب طلبی بھی کی جا سکتی ہے مگر وہ دلی تعلق جنہیں رشتوں کی سند نہ حاصل ہو، انہیں کسی عدالت سے بھی سزا نہیں سنائی جا سکتی، سوائے ضمیر کی عدالت کے۔ جبکہ وہ رشتے جنہیں تعلق کا نام بھی دے دیا جائے کبھی کبھی وہ اپنے جائز حق سے بھی محروم کر دیے جاتے ہیں۔ اور ان کی جوابدہی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ دنیا دارالعمل ہے جہاں انسان کے دو ہی امتحان ہیں، ایک شکر کا دوسرے صبر کا... مگر جب حضرتِ انسان حسد یا ہوس کی خاطر تقدیر سے لڑنے کی ٹھان لے تو پھر اس کے اپنے فیصلے ہی اس کی آزمائش بن جاتے ہیں۔

حادثوں میں گزری ہے راس بس تباہی ہے — زندگی کی چاہت میں زندگی گنوائی ہے

خواب اب نہیں میرے، نیند تک پرائی ہے — عارضی محبت تھی مستقل نبھائی ہے

امیدوں، جذبوں، فیصلوں اور احساسِ جرم پر مبنی کچھ ایسے کرداروں کی کہانی جو دل سے دیکھتے، دل سے سنتے اور دل سے ہی سوچتے ہیں

میرا سارا زنگ اتار دو

سلسلے وار ناول

افشاں آفریدی

Ayesha

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیرازی ولا میں مقیم مظفر اور سائرہ کی بیٹی ردا کی منگنی اس کی مرضی سے آصف کے ساتھ ہوتی ہے جس میں یو ایس اے سے تین سال بعد واپس آ کر مظفر صاحب کا یتیم بھتیجا عکرمہ بھی شریک ہوتا ہے۔ دُرِ مکنون، سائرہ چچی کی بھانجی ... جس کی ذمے داری مظفر احمد نے اس کے ماں باپ کے انتقال کے بعد اٹھالی تھی۔ عکرمہ دادی سے کہتا ہے کہ چچا جان کو دُرِ مکنون کی تعلیم شروع کرا دینی چاہیے۔ ایک رات دُرِ مکنون کی طبیعت خراب ہونے پر دادی اسے سکون آور دوا دیتی ہیں اور اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا بتاتی ہیں۔ عکرمہ، زوہا، ردا اور درمکنون کو شاپنگ پر لے کر جاتا ہے تو زوہا بتاتی ہے کہ زارا (مظفر صاحب کی دوسرے نمبر کی بیٹی) کے ساتھ اس کی نند خولہ آ رہی ہے اور شاید وہ دادی کو پسند ہے۔ دُرِ مکنون سوچتی ہے کہ کیا واقعی وہ اپنے آنسوؤں سے اپنے محسنوں کی خوشی کو دھندلا رہی ہے۔ اسٹڈی میں دُرِ مکنون کو دیکھ کر آنسو بہاتے مظفر شیرازی، عکرمہ کے ذہن میں ہلچل مچائے ہوئے تھے۔ مظفر صاحب نے اپنی نئی دل بنوائی تھی وہ لے کر عکرمہ نکلتا ہے تو زاویار کا شیری کے ساتھ رویہ دیکھ کر سوچتا ہے کہ کوئی عورتوں کے ساتھ اس طرح بھی برتاؤ کرتا ہے۔ خولہ، عکرمہ کا لیپ ٹاپ لینے جاتی ہے تو دُرِ مکنون کو اس کی باتوں سے اپنے بدصورت رویے کا احساس ہوتا ہے۔ خولہ، دُرِ مکنون سے عکرمہ کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اگر آپ اس گھر میں بہو بن کر آئیں تو بہت خوش رہیں گی، اس جملے کو سن کر عکرمہ ایک انجانے سے احساس سے دوچار ہوا تھا۔ سائرہ بیگم، عکرمہ کو بھی شام کو گھر پر رہنے کا کہتی ہیں۔ عکرمہ کو زاویار سے مل کر یاد آ جاتا ہے کہ اس نے صفدر صاحب کے آفس کے باہر اسے دیکھا تھا اور لڑکی سے اس کا خراب برتاؤ بھی یاد آ جاتا ہے (دُرِ مکنون کی تباہی کا ذمے دار) زاویار کو دیکھ کر درمکنون بے ہوش ہو جاتی ہے۔ درمکنون کے بے ہوش ہونے پر مظفر صاحب چراغ پا ہو جاتے ہیں اور سائرہ بیگم بھی یہ عہد کر لیتی ہیں کہ کم از کم ردا کی شادی تک وہ اس معاملے کو نہیں چھیڑیں گی۔ دُرِ مکنون سوچ رہی تھی کہ زاویار بنا کسی احساسِ جرم کے کس اطمینان سے نئی زندگی شروع کرنے جا رہا ہے۔ عبید اور ان کی فیملی ردا کی شادی پر نہیں آ رہے تھے اس خبر سے دادی کافی دلگرفتہ تھیں..... دُرِ مکنون کو پتا چلتا ہے کہ دادی نے خولہ کے رشتے سے منع کر دیا ہے تو اسے بڑا افسوس ہوتا ہے۔ یعنی، دُرِ مکنون سے ملنے آتی ہے اور اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے، عکرمہ کو یہ جان کر شاک لگتا ہے کہ دُرِ مکنون کے خوف اور وحشت کی وجہ اظہار بھائی ہیں۔ سائرہ بیگم، درمکنون کو بتاتی ہیں کہ زاویار نے رشتے سے انکار کر دیا ہے اور وہ اس کا رشتہ جلد از جلد کرنا چاہتی ہیں کیونکہ ان کے بعد عکرمہ اور سیف کی فیملی اس کی ذمے داری نہیں اٹھا سکے گی۔ عکرمہ گھر آتا ہے تو شہرین اسے باہر ملتی ہے جو خولہ کو لینے آئی تھی کیونکہ اس کے بھائی یعنی خولہ کے منگیتر آ رہے ہیں۔ عکرمہ اندر آتا ہے تو دُرِ مکنون بتاتی ہے کہ کوئی طاہرہ آنٹی آئی ہیں، عکرمہ بہت تیزی سے ان سے ملنے کے لیے جاتا ہے۔ دادی طاہرہ آنٹی کو بتاتی ہیں کہ والدین کے انتقال کے بعد وہ ان کے ساتھ رہ رہی ہے۔ ردا کے نکاح کی تقریب کے بعد خولہ تھوڑی دیر دُرِ مکنون کے کمرے میں جاتی ہے تو اسے باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ عکرمہ نے دُرِ مکنون کی وجہ سے انکار نہیں کیا ہے۔ دُرِ مکنون بھی خولہ کی طارق کے ساتھ منگنی پر زیادہ خوش نہیں تھی۔ عکرمہ، درمکنون کو کہتا ہے جب تک ردا کی شادی ہے وہ دادی کے پاس سوئے۔ رات کو سوتے میں دُرِ مکنون ڈر جاتی ہے تو دادی اس کا حوصلہ بڑھاتی ہیں۔ مظفر صاحب سے عکرمہ، دُرِ مکنون کے ڈاکومنٹس لیتا ہے کہ ولید کی کزن فارم جمع کرا دے گی تو اسے پتا چلتا ہے کہ مظفر صاحب درمکنون کے لیے بہت جذباتی ہیں۔ اظہار صاحب اپنی فیملی کے ساتھ اپنے رشتے داروں میں جا رہے ہیں تو دُرِ مکنون کی طرف سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ اپنی کلاس لے کر آتا ہے تو دادی سے پوچھتا ہے دُرِ مکنون کے بارے میں تو وہ اسے مطمئن کر دیتی ہیں۔ طاہرہ بانو پچھلے گیٹ سے آ کر درمکنون کو اپنے ساتھ لے جاتی ہیں اور اسے دوستی کی آفر بھی کرتی ہیں۔ طاہرہ بانو فون کر کے دادی کو بتاتی ہیں کہ وہ دُرِ مکنون کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہیں تو دادی عکرمہ اور مظفر صاحب کو بتاتی ہیں کہ انہوں نے طاہرہ کو دُرِ مکنون کی میڈیکل فائل زوہا کے ذریعے دے دی ہے۔ طاہر بانو، دُرِ مکنون کو بتاتی ہیں کہ عکرمہ کی والدہ شگفتہ ان کی دوست ہی نہیں دودھ شریک بہن بھی تھیں۔ وہ بھی اکلوتی اور یہ خود بھی اکلوتی اور دونوں کو بیٹی کا بہت شوق تھا اور دونوں کے بیٹی نہیں تھی اور دونوں کے والدین کا انتقال ایک ہی سال ہوا۔ اور آشیانے کی زمین بھی ان کو عکرمہ کے والد نصر بھائی نے دلوائی تھی۔ دُرِ مکنون جب طاہرہ بانو کے پاس سے واپس آتی ہے تو دُرِ مکنون کو عینی کا فون آتا ہے اس کے فون رکھتے ہی دوبارہ بیل ہوتی ہے تو عینی کا ہی سمجھ کر اٹھاتی ہے لیکن وہ زاویار کا فون تھا اور وہ اس سے معافی مانگتا ہے دُرِ مکنون کچھ کہہ نہیں پاتی رونے لگتی ہے عکرمہ جو گاڑی کی چابی بھول گیا تھا وہ دُرِ مکنون کو روتا دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے اور اس سے فون لے لیتا ہے لیکن دوسری طرف زاویار کی موجودگی اس کے لیے حیران کن تھی۔ طاہرہ آنٹی اپنی بھانجی ڈاکٹر فاریہ سے دُرِ مکنون کو ملواتی ہیں جو ان کی مدد کے لیے آئی ہے۔ ردا کے مایوں کی تقریب میں شہرین، عکرمہ کے ساتھ فاریہ کو دیکھ کر

متجسس ہوتی ہے تو دُرِ مکنون اسے بتاتی ہے کہ وہ طاہرہ آنٹی کی بھانجی ہے۔ دادی عکرمہ کے لیے فارینہ کا سوچتی ہیں۔ شہرین، میمونہ بیگم کو زاویار کے متعلق بتاتی ہے تو وہ سوچتی ہیں کہ آغا جان اور شہریار سے بھی اس کا دل صاف ہو جائے گا۔ جلال انصاری، شہریار کو کہتے ہیں کہ وہ زاویار کو کال کر لیں۔ عاصمہ، زاویار کے باپ شہریار سے طلاق لے چکی تھیں۔ وہ شہرین کو اپنے دوسرے شوہر عثمان کے انتقال اور مومنہ کی شادی کا بتاتی ہیں اور اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دیتی ہیں۔ شہریار انصاری، زاویار کو فون کرتے ہیں اور زاویار کے بدتمیزی سے جواب دینے پر فون بند کر دیتے ہیں۔ میمونہ بیگم، شہرین کو بتاتی ہیں کہ آغا جان چاہتے ہیں کہ خولہ کی یا شہرین کی شادی زاویار سے ہو جائے۔ زاویار تین سال پہلے کے اس منظر سے کسی طرح نکل نہیں پا رہا تھا۔ زاویار، نازیہ سے کہتا ہے کہ وہ دُرِ مکنون سے ملنا چاہتا ہے تو نازیہ ہامی بھر لیتی ہیں۔ شیری عاصمہ لاج پہنچتی ہے تو اسے زاویار کے ایکسیڈنٹ کا پتا چلتا ہے۔ وہ مولا بخش کے ساتھ ہی اسپتال جاتی ہے پھر زاویار کی حالت دیکھ کر خولہ کو فون کر کے بلاتی ہے تو زارا بھابی، اظہار بھائی اور خولہ کے ساتھ عکرمہ بھی اسپتال آتا ہے۔ عاصمہ، زاویار کو دیکھ کر ہی بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ تین سال بعد آغا جان، زاویار کے سامنے تھے اور ان کے انداز بھی خاصے بدل گئے تھے، ان کے ساتھ شہریار اور عینی بھی تھے۔ آغا جان، زاویار سے کہتے ہیں کہ گزرے دنوں کو بھول جاؤ اور اپنا دل صاف کر لو..... لیکن وہ کہتا ہے کہ کچھ نقصان ناقابلِ تلافی ہوتے ہیں اور خود سسٹر کو بلا کر باہر چلا جاتا ہے۔ شیری کھانا لے کر آتی ہے تو اس کو بتاتی ہے دُرِ مکنون، زارا بھابی کی کزن ہے اور وہ اس کے لیے ہاں کب کر رہا ہے وہ اور عینی جا کر اسے زاویار کے نام سے چھیڑیں گی۔ جس پر زاویار غصہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اس کے معاملات سے دور رہے اور کسی سے کچھ نہ کہے۔ آغا جان نے عاصمہ سے کہا کہ وہ زاویار کو شہرین کے لیے راضی کریں اور وہ یہ سوچ کر پریشان تھیں کہ وہ یہ کیسے کریں گی۔ شازیہ انہیں کہتی ہیں اگر انہیں دُرِ مکنون پسند ہے تو مہران کے لیے بات کر لیں لیکن یہ بات عاصمہ کو صحیح نہیں لگتی۔ خولہ، شہرین کو اسپتال جانے سے روکتی ہے لیکن وہ اس کی بات نہیں سنتی۔ شیری، خولہ سے پوچھتی ہے کہ اس نے عکرمہ کے بجائے طارق کے لیے ہامی کیسے بھر لی۔ عکرمہ سے دستبردار ہونا خولہ کے لیے تکلیف دہ تھا ضرور لیکن وہ یہ بات کسی سے بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ عاصمہ، زاویار کو سمجھاتی ہیں کہ آغا جان کے لیے جو کدورت اس کے دل میں ہے وہ نکال دے لیکن زاویار کہتا ہے کہ وہ یہ نہیں کر سکتا۔ عینی، زاویار کو بتاتی ہے کہ شہرین نے اسے دُرِ مکنون سے ملوایا۔ عاصمہ صبح صبح اسپتال آ جاتی ہیں زاویار کے پوچھنے پر وہ بتاتی ہیں کیونکہ تمہارے پاپا کی فلائٹ ہے اور وہ تم سے ملنے آئیں گے تو میں ان کے آنے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤں، زاویار کہتا ہے کہ آپ اس انسان کے لیے اچھا کیسے سوچ سکتی ہیں جس نے مجھے، آپ سے جدا کر دیا اس پر وہ کہتی ہیں کہ وہ پرانی بات تھی اب تم میرے ساتھ ہو اس لیے جب شہریار انصاری اور آغا جان آئے تو زاویار نے اپنے منفی جذبات پر کسی حد تک قابو پا لیا تھا۔ وہ لوگ زاویار کو اسپتال سے چھٹی ہونے پر اپنے ساتھ لے جانے آتے ہیں تو وہ انکار کر دیتا ہے۔ جس پر وہ کہتے ہیں کہ میمونہ نے کل جو تقریب رکھی ہے اس میں ضرور آنا تو وہ ہامی بھر لیتا ہے، گھر آنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے جہاں مولا بخش کا فون آتا ہے تو وہ بغیر کسی کو بتائے گاڑی لے کر نکل جاتا ہے عاصمہ گاڑی کی آواز سن کر اسے آواز دیتی رہ جاتی ہیں۔ زاویار، عاصمہ سے کہتا ہے کہ وہ مولا بخش کی مدد کرنے گیا تھا عاصمہ اس پر غصہ ہوتی ہیں کہ ایسے معاملات سے دور رہے اور آئندہ بغیر بتائے نہ جائے۔ زاویار کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے عاصمہ ریوالور دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں۔ زاویار، طارق اور خولہ کی انگیجمنٹ میں جاتا ہے تو طارق اس کے اور آغا جان کے درمیان ہونے والی ناراضی پر بات کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ ان باتوں کو چھوڑو اور اپنی خوشی کو انجوائے کرو۔ زاویار سوچتا ہے کہ اس نے فون کر کے انجانے میں دُرِ مکنون کو مزید اذیت نہ دی ہو۔ عاصمہ، زاویار کو جلال انصاری کا فیصلہ ماننے کے لیے راضی کرنا چاہتی ہیں تو وہ بتاتا ہے کیونکہ طارق اپنی کسی ڈاکٹر کولیگ میں انٹرسٹڈ تھا اس لیے آغا جان نے طارق کو خولہ سے منسوب کر دیا حالانکہ شہریار انصاری، طارق سے عینی کا رشتہ کرنا چاہتے تھے یہ انکشاف سن کر وہ حیران رہ جاتی ہیں۔ عاصمہ، زاویار سے وعدہ لیتی ہیں کہ وہ ان کے اور اپنے پاپا کے کیے کی سزا خود کو نہیں دے گا تو زاویار کوشش کرنے کا کہتا ہے۔

اب آگے پڑھیے

قسط نمبر 18

نواب شاہ والے ٹرپ کے بعد سے اس کے ٹخنے کی تکلیف میں قدرے اضافہ ہو گیا تھا۔ تاہم آج فزیوتھراپی کے بعد وہ خود کو کچھ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ واپسی پر کار گیٹ سے اندر لاتے ہوئے اس نے باہر کھڑی شہرین کی شیراڈ دیکھ لی تھی۔

PakistaniPoint www.pakistanipoint.com

وہ کار پارک کر کے باہر نکلا تو شہرین اسے سن شیڈز ناک پر جماتے ہوئے باہر نکلتی نظر آئی۔ دونوں کی نظریں بیک وقت ٹکرائی تھیں۔

''السلام علیکم۔'' وہ آگے بڑھ کر اس کے سامنے چلا آیا۔

''وعلیکم السلام! جیتے رہو' دودھوں نہاؤ...اور پوتوں پھلو۔''

شہرین کی چمکتی آنکھوں اور لہجے دونوں میں شوخی تھی۔

زاویار نے ایک عالم بیزاری میں اسے دیکھا تھا۔

''خیریت! آج کیا دادی جان کی روح آسمائی ہے تم میں۔''

''دادی کی روح تو خیر نہیں۔ ہاں البتہ تمہارے دادا کو بنفسِ نفیس لے کر آئی ہوں۔ جاؤ جا کر مل لو۔''

''کیا مطلب؟ آغا جان آئے ہیں؟'' وہ تحیر میں گھر گیا تھا۔ شہرین نے زور و شور سے سر ہلایا۔

''یہاں؟''

''ہوں۔''

''مگر کیوں؟'' وہ جھلا سا گیا۔ استعجاب کی جگہ بیزاری نے لے لی تھی۔

''کم آن زوی، وہ لاہور واپس جا رہے ہیں۔ تم سے ملنے آئے ہیں۔'' شہرین کی شوخی اس کی بددلی کے باعث سنجیدگی میں ڈھل گئی تھی۔

''وہ ہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ آخر کیوں۔ انہیں یہاں آنے کی ضرورت کیا تھی۔ بلکہ تمہیں انہیں یہاں لانے کی کس نے اجازت دی؟'' وہ یک دم اس پر الٹ گیا تھا۔

''آر یو میڈ زوی۔ آغا جان نے مجھے کہا کہ میں انہیں تم سے ملانے لے کر چلوں تو کیا میں انہیں منع کر دیتی۔ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ وہ اتنے پیار سے تم سے ملنے آئے ہیں اور تم ہو کہ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھ رہے ہو۔ سچ میں بہت ناشکرے ہو تم۔''

''شٹ اپ، مجھے لیکچر دینے کی ضرورت نہیں سمجھیں۔'' یک دم ہی وہ بپھر گیا تھا۔ ''تم انہیں مجھ سے ملانے لائی ہو تو یہیں رکو۔ انہیں یہاں چھوڑ کر جانے کی ضرورت نہیں۔ میں ان سے مل کر انہیں ابھی باہر لے آتا ہوں۔ جیسے انہیں ساتھ لائی ہو۔ ویسے ہی ساتھ لے بھی جاؤ۔'' تلملا کر نہایت درشتی سے اس نے کہا تھا۔

شہرین حیرت اور تاسف سے اسے دیکھنے لگی۔ مگر اس سے پہلے کہ زاویار قدم اندر کی طرف بڑھاتا اس نے لپک کر اس کا بازو تھام لیا تھا۔

''مامی نے آغا جان کو لنچ پر روک لیا ہے زوی۔ لہٰذا یاد رکھو جو تماشا تم اندر کرنے جا رہے ہو اس سے صرف تم اور آغا جان ہی نہیں، مامی کی میزبانی بھی بہت ڈی گریڈ ہوگی۔ اندر مہران بھی ہے۔ لاکھ تم آغا جان سے خفا سہی۔ یہ حقیقت تم کبھی جھٹلا نہیں سکتے کہ آغا جان تمہارے تعارف کا حصہ ہیں۔ ان کو humiliate کر کے دراصل تم اپنی ہی انسلٹ کرو گے۔'' ذرا دیر پہلے شوخی سے مسکرانے والی شہرین یکلخت سنجیدگی سے ناصحانہ انداز میں اسے سمجھانے لگی تھی۔

''کیا واقعی..... ماما نے انہیں کھانے پر روک لیا ہے۔'' یہ خبر سن کر اس کا غصہ اور تناؤ یک دم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ اس نے حیرت سے استفسار کیا۔

''آف کورس! تمہاری طرح بدتمیز اور بے مروت نہیں ہیں مامی۔ اوروں سے نہ سہی۔ کچھ ان سے ہی انسانیت سیکھ لو زوی۔'' شہرین نے بلا تکلف لتاڑ کر رکھ دیا تھا اسے۔

جواباً وہ ماتھے پر تیوریاں ڈال کر اسے خونخوار نظروں سے گھورنے لگا۔

''اب زیادہ ڈریکولا والی نظروں سے مت گھورو مجھے۔ جارہی ہوں میں۔ ہٹو سامنے سے۔'' اس نے اسے قدرے پرے دھکیلا اور وہ بیرونی گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔

کچھ دیر اسے باہر جاتا دیکھتے رہنے کے بعد اس نے جھلا کر سامنے پڑی لان چیئر کو ٹھوکر ماری تھی۔ پھر کچھ سوچ کر اندر چلا گیا۔ حسب توقع آغا جان کی آواز اسے ڈرائنگ روم سے آتی سنائی دے گئی تھی۔ اندر یقیناً عاصمہ بھی موجود تھیں۔ طوعاً و کرہاً اسے اندر آنا ہی پڑا۔ وہ دونوں یک دم اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ اس نے سلام کیا تو لہجے میں بیزاری کا عنصر موجود تھا۔

''وعلیکم السلام!'' جواب بیک وقت دونوں سے ملا تھا۔

وہ چپ چاپ سے آغا جان کے مقابل پڑے صوفے پر آبراجمان ہوا۔

''زوی، انکل تم سے ملنے آئے ہیں۔ ان فیکٹ یہ کل واپس لاہور جارہے ہیں۔ اس لیے سوچا کہ تم سے بھی ملاقات کرلیں۔''

چند ثانیے ان دونوں کے مابین گونجتی خاموشی کو عاصمہ نے توڑا تھا۔ اس نے گہری اور سنجیدہ نگاہ آغا جان کی جانب اٹھائی تو انہیں اپنی طرف متوجہ پایا۔

''چلیے آپ لوگ آپس میں باتیں کریں۔ جب تک میں لنچ کو فائنل کر کے ٹیبل پر لگاتی ہوں۔'' عاصمہ کو اپنا آپ مس فٹ لگا تو وہ ان دونوں کو اکیلا چھوڑ کر باہر نکل گئیں۔ البتہ جاتے، جاتے انہوں نے ایک تنبیہی مگر درخواستانہ سی نظر سے زاویار کو دیکھا تھا۔

وہ ماں کے تیور سمجھ گیا تھا اس لیے نگاہ چرا لی تھی۔

''کیسے ہو زاویار؟'' کمرے میں ایک بار پھر خاموشی گونجنے لگی تھی۔ جسے آغا جان کی آواز نے توڑا۔

''ٹھیک ہوں۔ آپ کہیے کیا حال ہیں؟'' گہری سانس بھر کر اس نے بمشکل خود کو کچھ کہنے پر آمادہ کیا تھا۔

''اچھے حال ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ میرے حال سے اچھا تمہارا مستقبل ہو میرے بچے۔'' اس کے سوال نے انہیں کچھ کہنے کے لیے راستہ دے دیا تھا۔

''معنی؟'' جواباً اس نے بھویں سکیڑ کر دھیان سے ان کی آنکھوں میں کچھ تلاش کیا۔

''معنی یہ میرے بیٹے کہ اب میں تمہارا مستقبل محفوظ کر دینا چاہتا ہوں۔''

''کیوں، میرے مستقبل کو ایسے کون سے خطرات لاحق ہیں جو آپ اس قدر فکرمند ہیں میرے لیے۔'' وہ استہزائیہ سا مسکرا دیا۔

''یہ بات نہیں بیٹا.. مگر وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں تمہیں سیٹل دیکھ لوں۔''

''تو دیکھ لیجیے۔ میں سیٹل ہوں۔ اچھی جاب ہے، کار ہے۔ پُرسکون زندگی ہے۔ بینک میں اچھی خاصا سیونگ اماؤنٹ ہے۔ اور مجھے کیا چاہیے۔''

''مگر یہ سب تو مادی چیزیں ہیں بیٹے۔ اصل زندگی تو اپنی فیملی کے ساتھ گزرتی ہے۔ اپنے گھر میں۔''

''ہاں تو ہے ناں میری فیملی۔ ماں بہن بھائی سب ہیں میرے ساتھ اور یہ گھر بھی اپنا ہے۔''

''میں اس فیملی کی نہیں تمہاری اپنی فیملی کی بات کر رہا ہوں زاویار بیٹے۔ تم..... تمہاری بیوی، تمہارے بچے یہ ہوتی ہے ''اپنی'' فیملی۔''

''اوہ۔ آئی سی تو آپ ''اس'' فیملی کی بات کر رہے ہیں۔ جسے ایک بار آپ کے بیٹے مسٹر شہریار انصاری نے ایک ٹھوکر مار کر اپنے سے دور کر دیا تھا اور پھر ایسی ہی ایک اور فیملی بنالی تھی۔ کہیں ''اسی'' طرح کی فیملی تو نہیں بنانا چاہ رہے ہیں آپ میرے لیے۔'' ہلکی سی استہزائیہ مسکراہٹ اس کے اندر کے زہر کو ظاہر کر رہی تھی۔

مگر آغا جان میں بھی بلا کا ضبط تھا۔ رسان سے بولے۔

''نہیں بیٹا... بہت اعتماد ہے مجھے شہرین پر۔ وہ تمہارے مزاج کو سمجھتی ہے اور گھر بنانے والی بچی ہے۔''

''کمال ہے آغا جان، جو کچھ آج سے ڈھائی تین سال پہلے گزرا۔ آپ اس سب سے واقف ہونے کے بعد بھی اپنی نواسی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینے کو تیار ہیں۔ شہرین پر آپ کا اعتبار کرنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن مجھ پر۔'' اب سنجیدگی کے ساتھ، ساتھ اس نے بہت متاسف انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں بیک وقت نہ جانے کیا، کیا تھا۔

آغا جان نے مجبوراً نظر چرائی۔

''تم پر مجھے خود سے بھی زیادہ اعتماد ہے زوی۔'' سر جھکا کر کہنے کے بعد انہوں نے دھندلی ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

''تم میرے خاندان کے اکلوتے وارث ہو اور اگلی نسل کے امین بھی۔ تم نہیں جانتے ہمارے لیے کیا ہو تم۔ بہت محبت کرتے ہیں ہم تم سے۔''

بنا کلف اور طنطنے سے عاری یہ لہجہ آغا جان کا تھا؟ وہ حیران ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔ گو کہ اس کے ساتھ ہونے والے ایکسیڈنٹ کے بعد جب وہ ان سے کراچی میں پہلی بار ملا۔ وہ اسے ایسے ہی ٹوٹے ہوئے اور شکستہ نظر آئے۔ مگر پھر بھی۔ آج ایک بار پھر حیرت نے اسے گھیر لیا تھا۔

''اور اسی محبت کے باعث ہم سب تم پر بہت حق رکھتے ہیں۔ اور اس حق کی بنا پر ہی تم سے امیدیں جڑی ہیں ہماری۔'' ان کے لہجے ہی میں نہیں آنکھوں اور چہرے کی جھریوں میں بھی زاویار کی محبت جھلک رہی تھی۔

وہ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا مگر لبوں پر آیا جملہ بھی وہ روک نہیں سکا تھا۔

''تو اگر اسی حق سے میں آپ سے کچھ امید رکھوں تو کیا یہ غلط ہوگا۔ آخر میری زندگی پر میرا بھی تو اختیار ہونا چاہیے۔'' اس کی جھلاہٹ عروج پر تھی۔

''اور پھر یہ کس جنتری یا horoscope میں لکھا ہے کہ میں انصاری خاندان کو 'وارث' دوں گا ہی دوں گا۔ کیا یہ انسان کے اختیار کی بات ہے؟ جب آپ کے دو بیٹے نرینہ اولاد سے محروم رہ کر زندگی گزار سکتے ہیں تو کیا یہ میرے ساتھ نہیں ہو سکتا۔'' اس کا لہجہ گستاخ نہ سہی تلخ ضرور تھا۔

آغا جان لمحے بھر کے لیے لاجواب سے ہو گئے۔ اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا ان کے پاس۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا وہ۔

''یوں بھی میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' بالآخر اس نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ آغا جان نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں بولنے سے روک دیا تھا۔

''پلیز... یہ مت پوچھیے گا کہ کیوں؟ کیونکہ آپ سے زیادہ بہتر کون جانتا ہے کہ ایسا میں کیوں نہیں چاہتا۔'' یک بیک اس کا لہجہ آنچ دینے لگا تھا۔ آغا جان کو اس کی آنکھوں میں اترتی سرخی سے اس کے دل کی جلن کا بخوبی اندازہ ہوا تھا۔

''کیا تم گزری باتیں بھول نہیں سکتے زوی؟ آخر اس حادثے کو تین سال بیت چکے ہیں۔''

''کیا آپ بھول سکتے تھے اگر آپ کے خاندان کی کوئی لڑکی اس حادثے کا شکار ہوئی ہوتی؟''

سوال تھا کہ زہر آلود بھالا۔ سیدھا آغا جان کے سینے میں کھبا تھا۔

''کسی اور پر بیتی ہوتی تو بھول جاتا مگر جس کو زندہ قبر میں دفنایا تھا۔ اسے زندہ لاش بنے دیکھ کر آیا ہوں میں۔ کیسے فراموش کروں وہ سب کچھ۔ اس کی امید بھری نظریں، بے بسی کے باعث ہونٹوں سے نکلے الفاظ..... اور پھر

اس کی چیخیں... کیا کیا بھلاؤں آغا جان۔'' اس نے بے بسی سے اپنے بال ہاتھوں میں جکڑ لیے تھے۔

آغا جان کو اس کے چہرے پر سوز و تھکن کے قافلے اترتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی حالت ایسی تھی جیسے اپنی اولاد کو جاں کنی کی کیفیت میں دیکھ رہے ہوں۔ بے بسی، بے اختیاری اور پچھتاوے نے انہیں ادھ موا سا کر دیا۔ کہنے کے لیے الفاظ جیسے بچے ہی نہیں تھے۔ وہ دُرِ مکنون سے ملا ہے یہ سن کر ہی وہ گویا سکتے میں آ گئے تھے۔

''جاگتا ہوں تو لگتا ہے جیسے اس کی آہیں میرا پیچھا کر رہی ہیں۔ سوتا ہوں تو بھیانک سپنے میرے احساسِ جرم کو اتنا بڑھا دیتے ہیں کہ دوبارہ ٹوٹی ہوئی نیند سے تعلق جوڑنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ٹرنکولائزرز پر جی رہا ہوں۔ ہر سانس جیسے میری بے چینی کا طعنہ بن کر سینے سے نکلتی ہے۔ کیا کروں آغا جان۔ کیا کروں۔ آخر یہ کیا کر دیا میں نے اس کے ساتھ..... کیا کر دیا۔''

انہیں لگا وہ رونے لگا ہو جیسے۔ جلال انصاری صاحب کے ضعیف سال خوردہ جسم میں گویا جان ہی نہیں بچی تھی۔

زاویار اعصابی اور جذباتی طور پر اس قدر ٹوٹا ہوا ہے۔ انہیں ذرا اندازہ نہیں تھا۔ وہ تو سمجھ رہے تھے کہ گزرے تین سالوں نے اس کے جذبوں پر بند باندھ دیا ہوگا اور زخموں پر کھرنڈ آ گئے ہوں گے مگر انہیں مغالطہ ہوا تھا۔ زخم تو ناسور کی یا شاید سرطان کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

اس کا چہرہ لہو رنگ ہوا جا رہا تھا۔

آغا جان کو شاید زندگی میں پہلی بار کسی سے خوف محسوس ہوا تھا اور وہ تھا زاویار..... جس سے اور جس کے لیے انہوں نے اپنے آپ کو سخت ہراساں پایا تھا۔

''تو پھر جیسے آپ نے مجھے اپنے دروازے سے ناامید لوٹایا تھا۔ میں بھی آپ کو ریٹرن میں یہی مایوسی دے سکتا ہوں۔ جیسے آپ کے دربار میں میری درخواست کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ آج میرے پاس آپ کے سوال کے جواب میں ''نہ'' کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ سخت اور کھردرا ہو گیا تھا۔ وہ کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہ جمائے بہت سفاکی اور بے دردی سے فیصلہ سنا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ٹھہری ہوئی نمی سرخی میں مل کر مانندِ لہو نظر آ رہی تھی۔ آغا جان کی پتھریلی بوڑھی آنکھوں میں نمکین پانی کے قطرے اترنے لگے۔

''زوی بیٹا۔ مگر.....''

''پلیز..... بس۔'' اس نے پھر سے انہیں ٹوک دیا تھا۔ لہجے کی سختی نے آغا جان کے لبوں کو یک دم آپس میں پیوست کر دیا۔

''ایک معصوم لڑکی میرے ہاتھوں پہلے ہی برباد ہو چکی ہے۔ اب کسی اور کو میں دکھی نہیں کر سکتا۔ شہرین بہت اچھی لڑکی ہے۔ اسے مجھ سے اچھا کوئی اور مل سکتا ہے۔ اور وہ ایک مکمل اور بہترین شریکِ سفر ڈیزرو بھی کرتی ہے۔''

''اور تم؟'' آغا جان کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ مایوسی نے ان کے اندر خیمے گاڑ دیے تھے۔

''میں!'' وہ خود پر ہنس پڑا تھا۔

آغا جان کو لگا جیسے وہ رو دیا ہو۔

''میں خود کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ کسی کے سر پر چادر ڈال سکوں۔ میرے لیے میرا احساسِ جرم ہی کافی ہے۔ جب وہ لڑکی ہو کر تنہا جی سکتی ہے تو میں کیوں نہیں۔'' اس نے گویا اپنے لیے سزا چن لی تھی۔

''کہاں ہے وہ؟'' بڑی ہمت کر کے انہوں نے پوچھا تھا۔

زاویار نے یوں تڑپ کر انہیں دیکھا جیسے شکوہ کر رہا ہوں کہ آخر اب خیال آیا انہیں اس کا۔

''یہیں کراچی میں۔ زارا بھابی کے گھر۔ ان کی کزن ہے وہ۔''

رکتے، رکتے نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے انہیں بتا دیا تھا۔

''کیا؟'' آغا جان کے سر پر اس اطلاع نے جیسے کوئی بم ہی دے مارا تھا۔
''وہ زارا بیٹی کی کزن ہے؟'' حیرت، تاسف اور بے یقینی سے وہ اسے تکے جا رہے تھے۔
''جی۔'' وہ طنزیہ مسکرا دیا۔ ''بلاواسطہ سہی... ہے تو وہ آپ کے خاندان سے ہی متعلق۔''
یہ خبر تھی کہ کوئی نیوکلر بلاسٹ جو زاویار نے ان کے گرد کر ڈالا تھا۔ ہاتھ میں پکڑی اسٹک ہونے کے باوجود وہ بیٹھے، بیٹھے ہی جیسے لڑکھڑا گئے تھے۔ زاویار نے ترحم آمیز نظروں سے انہیں دیکھا۔ جنہیں ان کا پچھتاوا بری طرح پچھاڑ رہا تھا۔
وہ اس سے اقرار کرانے آئے تھے مگر یہاں آ کر اپنا سکون اور اطمینان جیسے اپنے ہی ہاتھوں لٹا گئے تھے۔
ٹھیک ہی تو کہا تھا اس نے۔ آخر انہوں نے بھی تو اسے مایوس ہی کیا تھا تو پھر کس برتے پر اس سے امید لگاتے۔ شکستہ قدموں سے جس وقت وہ ڈرائنگ روم سے نکل رہے تھے۔ زاویار نے جلتے دل پر جیسے ہلکے، ہلکے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑتے محسوس کیے تھے۔
وہ جانتا تھا کہ جلال انصاری صاحب کے لیے ''خاندان'' کی کیا اہمیت ہے۔ زارا بھلے ہی ان [illegible] بیوی سہی۔ ان کے لیے تو ان کی فیملی کا حصہ تھی۔ اور دُرِ مکنون سے اس کا رشتہ ہونا انہیں کس طرح [illegible] بنا گیا تھا۔ اس سے وہ انجان نہ تھا۔
''کیسا لگے گا آغا جان۔ جب آپ آج رات پلک نہیں جھپک سکیں گے۔ پڑوس میں لگی آگ کبھی، کبھی اپنا گھر بھی جلا دیتی ہے۔ آج آپ کو پتا چلا کہ دوسرے کی عزت کو غیر اہم جاننے والے۔ کیسے کبھی، کبھی اپنا زعم بھی کھو دیتے ہیں۔ ان کی بے حسی ان کے گھر تک پہنچ کر انہیں بھی دکھی کر سکتی ہے۔'' جلتی آنکھوں سے انہیں جاتا دیکھ کر اس نے انگلیاں ایک بار پھر بالوں میں پھنسالی تھیں اور اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ عاصمہ کو کیا جواب دے گا۔

☆.....☆.....☆

زارا کے بچوں کو بہت پیار سے بہلا پھسلا کر اس نے کپڑے بدلوا دیے تھے۔ زوہا کا بیٹا بھی اس کے ہی پاس تھا۔ جبکہ ذرا، ذرا سی دیر میں سائرہ بیگم اس کے لیے بلاوا بھیج رہی تھیں۔
کبھی کوئی چیز رکھ کر وہ بھول چکی ہوتی تھیں۔ تو کبھی اس کے ہاتھوں رکھوائی کسی چیز کی ضرورت انہیں دُرِ مکنون کو آواز دینے پر مجبور کر دیتی تھی۔
اب بھی کچھ کام نبٹا کر اس نے دیکھا تو گھڑی چھ بجا رہی تھی۔ صبح سے گھن چکر بنا رکھا تھا اسے سب نے۔ اوپر کوئی نہیں تھا۔ وہ اطمینان سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔
''یہ آپ کب تک اسی طرح گھومتی رہیں گی۔ تیار ہونے کا ارادہ ہے کہ نہیں۔'' اظہار صاحب سامنے ہی صوفے پر براجمان تھے۔ اسے دیکھتے ہی ٹوکا اور اٹھ کر سامنے چلے آئے۔
اس کے روم، روم میں جیسے زہر دوڑ گیا۔
''جی۔ بس جا ہی رہی ہوں۔'' انتہائی کوفت کے عالم میں جواب دیا تھا اس نے۔
''اپنے حسن پر اعتماد اپنی جگہ مگر بے پروائی پھر بھی نہیں کرنی چاہیے۔ خاص طور پر ایسے حالات میں جب ایک سے ایک اسٹرانگ امیدوار مقابلے میں کھڑا ہو۔'' قریب آ کر خاصے رازدارانہ انداز میں انہوں نے اس کی سماعتوں میں زہر گھولا تھا۔ اس کے پلے خاک نہ پڑا۔
''مطلب؟'' اس نے متحیر اور نہ سمجھنے والے انداز سے انہیں دیکھا۔
''مطلب یہ محترمہ کہ آنسہ ردا صاحبہ کی شادی..... مسٹر عکرمہ کے سوئمبر سے کم تو نہیں۔ آپ کو نہیں لگتا کہ آپ کو اس سلسلے میں کچھ خاص تیاری کرنی چاہیے۔ گو کہ ''توجہ کا ارتکاز'' تو آپ کی طرف پہلے سے ہی ہے۔'' طنزیہ لہجے میں پھنکارتھی۔
اظہار صاحب کے نزدیک آنے پر اس کے حواس تو یوں بھی ساتھ چھوڑ دیتے تھے۔ اس پر یہ اندازِ تکلم اور

مستزاد عکرمہ کا موضوعِ گفتگو ہونا۔
وہ سرتاپیر جھلسی تھی جیسے۔
''بالکل بھی نہیں، آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے۔ میں اس ریس کا گھوڑا ہی نہیں ہوں۔ یوں بھی سوئمبر کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دادی نے فارینہ کو پسند کرلیا ہے۔''
غصے اور جھنجلاہٹ میں بھی اسے پتا تھا کہ اپنا نام وہ کسی کے ساتھ نتھی ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی بات کلیئر کی تو سامنے کھڑے اظہار صاحب کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔
''اچھا۔'' بھویں اچکا کر اسے سرتاپیر دیکھا اور تعجب آمیز لہجے میں کہا۔
''مگر دادی کے پوتے کا طواف تو آپ کے گرد ہی رہتا ہے۔ کیا اپنا باڈی گارڈ مقرر کر رکھا ہے آپ نے انہیں۔''
تپش اُن کے لہجے ہی میں نہیں آنکھوں سے بھی جھلک رہی تھی۔
دُرِمکنون کی پیشانی اس رکیک الزام پر جیسے جل اٹھی۔ غصے اور تشنت سے وہ ہولے، ہولے کانپ رہی تھی۔
''میں ایسی بے ہودہ باتوں کا جواب دینا پسند نہیں کرتی۔''
دل میں تو آیا کچھ اٹھا کر اس منحوس شخص کے سر پر دے مارے مگر وائے بدنصیبی وہ ایسا کر نہیں سکتی تھی۔ بمشکل یہ جملہ کھینچ کر لبوں تک لائی اور پھر تیز قدموں سے چلتی دادی کے کمرے میں جا چھپی۔
''اُف اللہ، آخر یہ شخص میری زندگی میں کیوں آ گیا ہے۔ کہیں چلا کیوں نہیں جاتا۔ پلیز میرے مالک۔ مجھے اس شخص سے نجات دے، دے اور مجھے اپنی امان میں لے لے۔'' کپڑے چینج کرتے ہوئے اس کا روم، روم دعا گو تھا۔
باہر آنے پر پتا چلا کہ سائرہ بیگم اس کی منتظر ہیں۔ انہیں اس کے ساتھ ہی پارلر جانا تھا۔ گھر سے باہر جانا گو کہ اس کے لیے مرحلہ ہی تھا۔ مگر اس وقت گھر میں موجود اظہار صاحب کی نگاہوں سے اوجھل ہونے کا یہ موقع اسے بہت اچھا لگا۔ حسبِ توقع ساتھ عکرمہ تھا۔ کار اس کو ہی ڈرائیو کرنی تھی۔
''تھینکس عکرمہ۔ تم ساتھ آنے پر راضی ہو گئے۔ ورنہ اس وقت تو مظفر نے بھی انکار کر دیا تھا۔ ان فیکٹ ہم لیٹ بھی تو کتنا ہو گئے ہیں۔'' کار میں بیٹھتے ہی سائرہ نے عکرمہ سے بہت متشکرانہ لہجے میں کہا تھا۔
''اس میں تھینکس کی کوئی بات نہیں چچی جان۔ ان فیکٹ مجھے فارینہ کو ایک جگہ سے پک کرنے جانا ہی تھا۔'' کار اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے متانت سے کہا تھا۔
''اچھا... کہاں ہے وہ؟''
''وہیں کارساز کی طرف کسی رشتے دار کے یہاں۔ طاری آنٹی نے کہا کہ اس نے کارٹیوننگ کے لیے دے رکھی ہے۔ اس لیے میں ہی اسے جا کر لے آؤں۔'' اس نے تفصیل بتائی۔
''ہوں۔'' جواباً سائرہ ہلکے سے مسکرا دیں۔ ''ویسے اپنی فارینہ کافی گڈ لکنگ نہیں ہو گئی ہے؟'' سوال میں ہلکی ہلکی شوخی تھی۔''
''کیا کہہ سکتا ہوں۔ ہر نظر کا اپنا حسین ہوتا ہے۔'' عکرمہ سمجھ کر زیرِلب مسکرا دیا۔
''ویل سیڈ..... اور میں سمجھتی ہوں کہ تمہارا جمالیاتی ذوق مجھ سے کچھ خاص مختلف نہیں۔ کیا خیال ہے؟'' انہوں نے اسے گھیر لیا تھا۔
جواباً وہ محض سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر سائرہ بیٹھی تھیں اور ان کے بالکل پیچھے دُرِمکنون۔
اس نے عکرمہ کی طرف دیکھا جس کے لبوں پر بڑی خوب صورت اور پُراعتماد مسکراہٹ تھی۔ جو سائرہ بیگم کے لبوں سے نکلنے والے جملے کی توثیق اور تصدیق کرتی تھی۔

جبکہ اسی لمحے عکرمہ نے بیک مرر میں اسے دیکھا تھا جو اس وقت بلیک اور پنک کے کنٹراسٹ والے انتہائی ٹائٹ ڈریس میں ملبوس تھی۔ ابھی پارلر جانے سے پہلے ہی وہ اس قدر اچھی لگ رہی تھی۔ واپسی میں تو اس کا روپ دیکھنے لائق ہوگا۔ اس کے لاشعور میں یہ خیال ابھر کر رہ گیا۔

پھر واپسی پر فارینہ اس کے ساتھ تھی۔ انہیں کچھ دیر پارلر کے باہر انتظار بھی کرنا پڑا اور جس وقت وہ دونوں تیار ہو کر نکلیں دُرِ مکنون کی چھب ہی دیکھنے والی تھی۔

فارینہ اسد کی نگاہوں میں ستائش و توصیف کے ساتھ رشک و حسد کے جو رنگ ابھرے وہ سائرہ بیگم کی نظروں سے مخفی نہ رہ سکے تھے۔

ان دونوں نے جن ستائشی نگاہوں سے ان کے ساتھ چلتی دُرِ مکنون کو دیکھا انہیں اپنی محنت ٹھکانے لگتی محسوس ہوئی اور یہ احساس کہ بہت جلد وہ اسے ''شیرازی ولا'' سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ ردا کی شادی کی خوشی دوبالا کر گیا۔

دُرِ مکنون البتہ اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ چند گھنٹوں پہلے کہے گئے اظہار صاحب کے جملے اس کے اندر زہر اتار رہے تھے۔ انہوں نے تو عکرمہ کے سوئمبر کا ذکر کیا تھا جبکہ اسے اپنا آپ بازارِ مصر میں فروخت کیے جانے والے اس غلام کے مانند لگ رہا تھا۔ جس کے حسن کے باعث اس کی بولی اونچی لگائی جانے والی تھی۔

اس کے اندر تواتر سے شبنم گرنے لگی تھی۔

ساتھ بیٹھی فارینہ سے اس کی سلام دعا ہی ہو سکی۔ اس کے بعد وہ یوں خاموش ہو کر بیٹھی جیسے اپنے گرد کے ماحول سے بالکل لاتعلق ہو۔ سائرہ شیرازی البتہ بڑے خوشگوار موڈ میں فارینہ سے مخاطب رہیں۔ اسی دوران وہ گھر پہنچ گئے۔

وہاں مظفر صاحب اور بقیہ بھی ہوٹل جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ زوہا اور زارا، ردا کو تیار کروا کر لا چکی تھیں۔

وہ اندر آئی تو سامنے بیٹھی ردا کو دیکھ کر یک دم اس کے اندر کا سکوت ٹوٹا تھا۔ وہ دلہن کے روپ میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔

من پسند ساتھی ملنے کی خوشی نے اسے مسحور کر رکھا تھا۔ مسکراہٹ اس کے لبوں سے گویا چپک سی گئی تھی۔

سائرہ نے آگے بڑھ کر محبت سے ردا کو سینے سے لگا لیا۔ جو انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ لمحے بھر کے لیے دونوں جذباتی ہو گئی تھیں۔ اور ممکن تھا کہ آنسوان کی پلکوں کی باڑ پھلانگ جاتے۔ زوہا اور زارا نے دونوں کو الگ کیا۔

''پلیز میمی... آپ ایسا کچھ نہیں کریں گی جس سے آپ کا میک اپ خراب ہو جائے۔'' زارا نے ان کے کندھے پر بازو پھیلایا۔

''ردا کا کیا ہے۔ یہ تو رونے والی ہے نہیں۔ میں نے آج تک اپنی شادی پر کسی کو اس قدر خوش نہیں دیکھا۔''

زوہا نے محبت سے بہن کو دیکھا تھا۔ ردا کے لبوں پر جاندار سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''ماشاءاللہ کہو... ماشاءاللہ۔''

''اللہ ہمیشہ خوش رکھے۔''

''سدا سہاگن رکھے۔''

وہاں موجود خواتین میں سے مختلف آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔

''سائرہ اب چلو بھی۔ وہاں سے آصف کے گھر والے بارات لے کر آدھے گھنٹے میں نکلنے والے ہیں۔ ہمیں نکل جانا چاہیے۔ تاکہ ان سے پہلے وہاں پہنچ سکیں۔'' مظفر صاحب نے اس دوران آ کر حکم شاہی سنایا تو مہمانوں میں ایک بار پھر افراتفری سی پھیل گئی۔ دھیرے دھیرے سب اپنی، اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔

دادی اور دُرِ مکنون کو عکرمہ کے ساتھ ہی نکلنا تھا اس لیے وہ دادی کے کمرے میں ہی آ بیٹھی تھی۔ فارینہ بھی ساتھ تھی۔ طاہرہ آنٹی کے آتے ہی انہیں نکل جانا تھا۔

عکرمہ جیٹ بلیک ڈنر سوٹ میں باہر نکلا۔ اسی دم طاہرہ آنٹی بھی چلی آئیں تو وہ تینوں بھی کمرے سے باہر آگئیں۔

''ماشاء اللہ، یہ اپنا عکرمہ تو خاصا ڈیشنگ ہوگیا ہے اماں۔'' دادی کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے محبت بھری ستائش سے کہا تھا۔

''بس زیادہ سر نہ چڑھائیں اسے۔ ویسے ہی موصوف خاصے خود پرست ہوتے جارہے ہیں۔'' فارینہ نے ہنس کر ٹوکا تھا۔

''ارے نہیں، میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔'' طاہرہ نے محبت سے دراز قد عکرمہ کا کندھا تھپکا تو اس نے چڑانے والے انداز میں فارینہ کو دیکھا تھا۔

''جی..... جی جیسے میں جانتی نہیں اسے۔'' فارینہ شوخی سے بولی۔

جواباً عکرمہ نے آہستگی سے اسے کچھ کہا تھا۔ عجب ناز بھرا انداز تھا۔ فارینہ کی ہنسی اور بے تکلفی پر عقب سے آتی دُرِ مکنون نے حسرت سے اسے دیکھا تھا۔

طاہرہ کی نظر اس دوران سج سج کر قدم اٹھاتی دُرِ مکنون پر پڑی تو جیسے ٹھٹک ہی گئی۔

''ماشاء اللہ، چشم بد دور۔'' وہ دو قدم پیچھے رک کر اس کے ساتھ ہی سیڑھیاں اترنے لگی تھیں۔ دُرِ مکنون نے پھیکی سی مسکراہٹ سمیت انہیں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! جیتی رہو۔ خوش رہو۔ سچ اماں یہ تو آنکھوں کا نور ہوئی جاتی ہے۔'' طاہرہ نے پھر سے دادی کو مخاطب کیا تھا۔

''بالکل صحیح کہا بیٹا۔ جب سے پارلر سے آئی ہے۔ دو بار نظر اتار چکی ہوں اس کی۔ اللہ نے رج کے حسن دیا ہے اسے۔ بس امانت ہے جس کی اس تک پہنچا دے اللہ۔'' دادی نے محبت سے کہا تھا۔ البتہ آخری جملہ بہت آہستگی سے ادا کیا تھا انہوں نے۔ طاہرہ نے گہری سانس بھر کر بڑے دل سے آمین کہا تھا۔

دُرِ مکنون نے بے دلی سے سر جھٹکا۔ اب یہ باتیں اس کا دل خوش نہیں کرتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

''پلیز زوی بھائی۔ آجائیں ناں۔ نہیں تو آغا جان ہمیں جانے نہیں دیں گے۔ آپ کو پتا ہے ناں کہ لڑکیوں کا اکیلے کہیں آنا جانا اور وہ بھی شہر کے ان حالات میں ان کو کس قدر ناپسند ہے۔'' عینی کی لجاجت بھری درخواست خاصی بے وقت تھی۔

وہ جانتا تھا کہ طارق آج صبح کی فلائٹ سے جاچکا ہے۔ کل شام اس کے ساتھ ہی ڈنر کیا تھا اس نے۔ اور مرزا انکل دو تین دن کے لیے ڈیپوٹیشن پر گئے ہوئے تھے۔

''کیا مشکل ہے تمہیں عینی۔ تم کل نہیں کہہ سکتی تھیں مجھے۔ اب یہ گیارھویں گھنٹے میں اپنی کمٹمنٹ چھوڑ کر کیسے آؤں میں۔'' وہ ٹھیک ٹھاک جھنجلا گیا تھا۔

''اُف، مجھے کیا پتا تھا کہ آغا جان اپنی طبیعت خرابی کی وجہ سے فلائٹ کینسل کردیں گے۔ شیری آپی کا موڈ سخت آف ہے۔ پلیز بھائی آجائیں۔''

عینی کی اس اطلاع نے کہ آغا جان نے اپنی فلائٹ ملتوی کردی ہے۔ اسے قدرے فکرمند کردیا تھا۔

''کیوں؟ کیا ہوا آغا جان کو؟''

''ان کا بی پی بہت ہائی تھا کل سے۔ آپ سے مل کر واپس آئے تو چپ چاپ جا کر اپنے کمرے میں لیٹ گئے تھے۔ میمونہ پھوپی نے زبردستی ڈاکٹر سے چیک اپ کرایا تو پتا چلا۔ اس لیے آج صبح وہ لاہور بھی نہیں گئے۔'' عینی نے تفکر سے بتایا۔

''اب کیسے ہیں وہ؟'' اس کے اندر گویا کہری جمنے لگی تھی۔ بولا تو یوں جیسے بہت گہرائی سے آواز نکلی ہو۔
''اب تو ماشاءاللہ بہتر ہیں وہ۔'' وہ مطمئن سی تھی۔
''ہوں۔'' وہ کسی سوچ میں گم ہو گیا تھا۔
''اچھا تو پھر بتائیں۔ آپ آرہے ہیں ناں۔ ہمیں پک کرنے؟'' عینی کی سوئی اپنی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔
''جانا کہاں ہے تمہیں۔'' بالآخر اس نے خود کو کمپوز کر کے سوال کیا۔
''زارا بھابی کی سسٹر کی ویڈنگ سیری منی ہے آج۔ میں نے بتایا تو تھا آپ کو۔ اور پلیز آپ انکار مت کیجیے گا۔ وہاں مجھے دُرِمکنون سے ملنا ہے۔ میں نے تو اس سے پرامس کر رکھا ہے کہ آج ضرور آؤں گی۔'' عینی کی اپنی فکریں تھیں۔ زاویار کی رگوں میں دوڑتا لہو ایک لمحے کو جیسے دُرِمکنون کے ذکر پر سست سا پڑ گیا۔
''ساری تیاری کر لی تھی میں نے اور اب میں بالکل بھی گھر پر رکنے والی نہیں ہوں۔ شیری آپی اور خولہ آپی نے کہا تھا کہ آپ ہرگز نہیں آئیں گے۔ لیکن پلیز بھائی منع مت کیجیے گا۔ آخر کو آپ میرے بھائی ہیں۔ اتنا تو مان رکھیں گے ناں میرا۔'' وہ نروٹھے پن سے کہتے، کہتے مان بھرے لہجے پر اتر آئی تھی۔
''اوکے، ویٹ کرو۔ میں آدھے گھنٹے تک پہنچتا ہوں۔'' زاویار نے گہری سانس بھر کر گھڑی پر نظر ڈالی۔
مزید کچھ کہے اور سنے بغیر اس نے لائن منقطع کر دی تھی۔ آج اس کے کولیگ نے فیئر ویل ڈنر پر انوائٹ کیا تھا سب کو جسے اسلام آباد ٹرانسفر ہو کر جانا تھا۔ اس نے زاویار کے کہنے پر آج ڈنر رکھا تھا۔ سارے اسٹاف میں بس ایک وہ ہی تھا جو ہر بار گیٹ ٹوگیدر پر بہانے بنا کر غائب ہو جاتا تھا۔ مگر آج کے لیے اس نے کمٹ منٹ کر لی تھی۔ اور وہ ڈنر پر جانے کے لیے تیار بھی ہو گیا تھا کہ عینی کی کال نے اس کو جیسے سب کچھ بھلا دیا۔
''کیا میں واقعی عینی کے لیے جا رہا ہوں یا؟'' اپنا پسندیدہ پرفیوم خود پر چھڑکتے ہوئے اس نے خود سے سوال کیا اور آئینے میں ابھرتی اپنی شبیہ کو دیکھ کر نظر چرا گیا۔
اس کے چہرے پر اس کی آنکھوں اور اس کے دل میں ہر طرف ایک ہی جواب تھا۔ ''نہیں'' اور صرف ''نہیں۔''
''تو کیا یہ سچ ہے دُرِمکنون کہ تم آج بھی زاویار انصاری پر مکمل کمانڈ رکھتی ہو؟'' کار قدرے تیز رفتاری سے چلاتے ہوئے وہ اپنا محاسبہ کر رہا تھا؟
اور یوں ہی اپنا تجزیہ کرتے، کرتے وہ میمونہ پھوپی کے گھر پہنچ گیا۔ دل تو قطعی نہیں چاہ رہا تھا مگر مروت کا تقاضا تھا۔ یا شاید اس محبت کا جو اسے فطری طور پر آغا جان سے تھی۔ وہ ان کا حال پوچھنے اوپر چلا آیا۔
شیری نفاست سے کیے میک اپ اور خوب صورت لباس سمیت اسے دروازے پر ہی مل گئی تھی۔
''آ گئے تم بچے'' اسے دیکھتے ہی وہ شروع ہو گئی تھی۔
''عینی نے کہا تو فوراً چلے آئے۔ ابھی میں نے کال کی ہوتی تو مر کر بھی نہ آتے تم۔'' آغا جان کا غصہ کہیں تو نکلنا تھا۔
زاویار نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے اسے دیکھا تھا پھر ترشی سے بولا۔
''یہ تو ظاہر ہے وہ بہن ہے میری۔''
''اور میں؟ کیا میں کچھ نہیں ہوں تمہارے لیے۔'' وہ شہرین ہی کیا جو سوچ سمجھ کر بولے۔
خولہ نے جز بز ہوتے ہوئے اسے دیکھا۔
''فی الحال تو شاید نہیں ہیں مگر مستقبل قریب میں بہت کچھ ہونے کے چانسز کافی برائٹ ہیں۔'' عینی اس دوران کمرے سے نکل آئی تھی۔ بلا ارادہ شوخی سے کہہ گئی۔
شہرین کو یک دم کسی احساس نے چھوا تھا۔ بے اختیار نظریں سامنے کھڑے زاویار پر پڑیں جو ناگواری سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے سے ملیں مگر اگلے ہی ثانیے زاویار نے رخ موڑ لیا تھا۔

''سوچ سمجھ کر بات کیا کرو عینی۔ جاؤ جا کر پانی لاؤ میرے لیے۔'' راستے بھر جو سوچ اسے جلا رہی تھی۔ اس کی جلن یک دم عینی پر نکل گئی تھی۔

اس کا لہجہ نہ صرف غصیلا تھا بلکہ چہرے پر بھی کچھ ایسے پتھریلے تاثرات تھے کہ شہرین کا دل یک دم ڈوب کر ابھرا۔ سبکی کے احساس نے اسے یک دم خاموش کر ڈالا تھا۔

''ٹیک اٹ ایزی زوی۔ اب ایسا بھی کیا کہہ دیا اس نے۔ بہن ہے تمہاری تم سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرے گی تو کس سے کرے گی۔ تمہیں اس طرح اسے ہرٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' خولہ نے ماحول میں در آنے والی تلخی کے باعث رسان سے کہا تھا مگر اس کا الٹا ہی اثر ہوا تھا۔

''مجھے اس قسم کے مذاق بالکل پسند نہیں ہیں۔ جب ایک دفعہ میں نے منع کر دیا ہے تو پھر کیا تک بنتی ہے مجھ سے ایسی باتیں کرنے کی۔'' اس نے مروت اور لحاظ سے عاری لہجے میں کہا تو شہرین سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔

''تمہیں تو غالباً لوگوں کا سانس لینا اور ہنسنا بولنا بھی پسند نہیں تو کیا اب تمہاری خاطر ہم زندہ رہنا بھی چھوڑ دیں۔ اگر ایسے ہی طرم خان ہو تو ان کو کیوں نہیں اپنے فیصلے سناتے... جنہوں نے میرے سر پر تمہارے نام کی تلوار لٹکا رکھی ہے..... بزدل، اسٹوپڈ کہیں کے۔'' بات مکمل کر کے پیر پٹختی وہ اپنے کمرے کے دروازے میں غائب ہو گئی تھی۔

یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ زاویار کچھ کہہ ہی نہیں سکا اور شہرین وہاں سے چلی بھی گئی۔ خولہ نے انتہائی خفگی سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

''حد ہو گئی ہے زوی، آخر ہو کیا گیا ہے تمہیں۔ مروت، اخلاق بھی کوئی چیز ہوا کرتی ہے۔'' خولہ قدرے نزدیک آ کر ناصحانہ لہجے میں بولی تو وہ جھلا کر گیسٹ روم کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں آغا جان ٹھہرے ہوئے تھے۔

ستمبر 2020ء کے شمارے کی ایک جھلک

فیصلے دل کے

محبت اور چالبازی کے درمیان عبرت اثر معرکہ آرائی کا احوال

آخری صفحات پر **نشور ہادی** کے قلم سے

بے منزل مسافر

گمشدہ تاریخی گوشوں پر ایک گہری نظر..... ابتدائی

صفحات پر **زویا اعجاز** کے قلم کا جادو

شہ زوز

عشق و محبت کے سحر انگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور

کثیف سازشوں کے جال **اسما قادری** کے قلم کا کمال

ساشا

کبھی پر خطر جزیروں، کبھی بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکتے مسافر

کی داستان..... **عمر عبداللہ** کے قلم کا شاہکار

اس کے علاوہ

تنویر ریاض، غلام قادر، طاہر جاوید مغل، منظر امام،

اعتزاز سلیم وصلی اور فہمی فردوس کی خوب صورت تحریریں

عینی اس دوران پانی لے آئی تھی۔ لپک کر اس کے پیچھے گئی جو لمبے، لمبے ڈگ بھرتا کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ہوٹل کی پارکنگ لاٹ میں کار سے اترتے ہوئے وہ خود میں گم تھی کہ فاصلے سے پکارے جانے والے اپنے نام نے اسے متوجہ کیا۔

عینی نے اسے دیکھ لیا تھا اور وہ وہیں سے اسے پکارتی چلی آ رہی تھی۔ دادی، طاہرہ آنٹی اور فارینہ کے ساتھ آگے جا چکی تھی۔

عکرمہ نے کار لاک کرتے ہوئے انہیں دیکھا۔

عینی تیز قدموں سے چلتی اس کے پاس چلی آئی۔ دُرِمکنون اسے دیکھ کر ہولے سے مسکرا دی۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام''

''دیکھا... میں آ گئی۔''

''ہاں مگر تم تو شام تک کہہ رہی تھی کہ آنا مشکل ہوگا۔''

''ہوں.. مگر دیکھ لو۔ تمہاری محبت کھینچ لائی۔'' عینی خاصے خوشگوار موڈ میں تھی۔ راستے میں زاویار نے اپنے رویے کی معافی ان سے جو مانگ لی تھی۔

اس کا جملہ عکرمہ نے قریب آتے ہوئے سنا تھا۔ اور بلا ارادہ اس کی نظر سامنے اٹھی تو کار سے باہر نکلتے زاویار پر پڑی۔

اس کے قدموں کی رفتار میں قدرے فرق پڑا تھا۔

زاویار نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔

دونوں ہی گہری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر آگے بڑھے تھے۔ دُرِمکنون کی نگاہ زاویار پر پڑی تو اس نے بے اختیار ساتھ کھڑی عینی کے کندھے کو دبوچ کر گویا خود کو سہارا دیا۔

''کیا ہوا؟ آر یو آل رائٹ؟'' عینی متوجہ ہوئی تھی۔

دُرِمکنون کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

زاویار اور عکرمہ کا سامنا ہونا اس کے اعصاب کے لیے کسی امتحان سے کم نہ تھا۔ خولہ اور شہرین بھی اس دوران قریب آ گئیں۔

اس نے دزدیدہ نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا جو ایک دوسرے سے مصافحہ کر رہے تھے۔

''کیسے مزاج ہیں آپ کے؟'' سلام دعا کے بعد عکرمہ نے اس سے استفسار کیا۔ لہجہ قدرے سپاٹ تھا۔

''الحمدللہ۔ شکر ہے اللہ ہے۔''

زاویار نے لبوں پر بمشکل پھیکی سی مسکراہٹ سجائی۔ سامنے کھڑے عکرمہ سے قدرے فاصلے پر موجود بلیک اور پنک کنٹراسٹ کے سوٹ میں ملبوس وجود اسے ایک بار پھر ناگفتہ بہ احساس میں جکڑ گیا تھا۔

''اور آپ کی انجریز کور ہو گئیں؟''

عکرمہ کا اگلا سوال اسے ذہن کو حاضر رکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔

''ہوں.. پہلے سے کافی بہتر ہے مگر کچھ زخموں کو مندمل ہونے کے لیے عرصہ دراز چاہیے ہوتا ہے۔ سو دیکھیں کب تک افاقہ ہوتا ہے۔'' اس کا لہجہ... اس کا چہرہ..... بیک وقت متفرق احساسات کا ترجمان تھا۔

کچھ تھا اس کے انداز میں، عکرمہ نے بغور اس کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا مگر اس کی نگاہ بے اختیار دُرِمکنون کی طرف اٹھی تھی اور پھر اسے چھو کر آہستگی سے پلٹ آئی تھی۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اتنے بڑے ایکسیڈنٹ کے باوجود سروائیو کر جانا بہت بڑی بات ہے۔ جب یہ ہو گیا ہے تو باقی بھی سیٹ ہو جائے گا۔'' عکرمہ کا ذہن کچھ سوچ رہا تھا۔ تاہم وہ اخلاق سے بولا۔

''ٹھیک کہا آپ نے حادثہ واقعی بہت بڑا تھا۔ اس سے سروائیو کر جانا اس سے بھی بڑی بات۔'' گہری سوچ اور گہری نظریں۔

دُرِّمکنون نے گلے میں آنسوؤں کا پھندا اٹکتا محسوس کیا۔

اس کی شاکی نظر نے چند سیکنڈز کے لیے وہاں موجود زاویار انصاری کو دیکھا تھا۔ نظر تھی کہ دو دھاری تلوار..... زاویار کے احساس کو چیرتی چلی گئی تھی۔

''بہر حال آپ آئیں اندر چلیں۔ باتیں تو اندر چل کر بھی ہو سکتی ہیں۔'' عکرمہ نے رسماً ہی نہیں واقعتاً کہا تھا۔

زاویار نے یک دم چونک کر اسے دیکھا۔

''نو تھینکس، اول تو میں انوائٹڈ نہیں۔ دوسرے میری کہیں ڈنر کی کمٹمنٹ بھی ہے۔ یوں بھی جس کام کے لیے میں آیا تھا۔ وہ تو ہو گیا۔'' اس کی نگاہ ایک بار پھر اختیار سے باہر ہوئی تھی۔

عکرمہ نے بنظرِ غائر اسے دیکھا۔

''آئی مین، ان تینوں کو ڈراپ کرنے آیا تھا میں۔'' وہ جیسے سنبھل کر بولا تھا پھر ان تینوں کی طرف مڑا۔ ''او کے پھر میں چلتا ہوں۔ فنکشن ختم ہو جائے تو کال کر دینا۔''

اس کے کہنے پر تینوں نے سر ہلا دیا۔

دُرِّمکنون اب اس کے بالمقابل کھڑی تھی۔

پارکنگ لاٹ میں لیمپس کی روشنی کے ساتھ، ساتھ تیرھویں کے چاند کی حسین چاندنی بھی پھیلی ہوئی تھی۔ جس میں اس کا فسوں خیز حسن پھوٹے پڑ رہا تھا۔ مگر زاویار انصاری کی نگاہ اس کے حسن، اس کے خوب صورت وجود پر نہیں تھی... بلکہ اس کے چہرے اور آنکھوں میں اتری اداسی اور اضمحلال کو جذب کر رہی تھی۔

سر جھٹک کر اس نے رخ عکرمہ کی جانب موڑا اور مصافحے کے لیے ایک بار پھر ہاتھ بڑھایا۔

''سی یو دین۔''

اس کا رسماً ادا کیا گیا فقرہ دُرِّمکنون کو سہما سا گیا۔

''ویل آف کورس!'' معاً عکرمہ مسکرایا تھا۔

پلٹ کر قدم اپنی کار کی جانب اٹھاتے ہوئے زاویار کو دل و دماغ پر جیسے کسی بڑے سے بوجھ کا احساس ہوا۔ ایک عجیب سی دل گرفتگی تھی۔ ساتھ ہی اپنی پشت پر اس نے دو گہری نگاہوں کا ارتکاز محسوس کیا۔ کار کا فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے اس کی نگاہ یونہی اٹھی تھی۔ شہرین شولڈر بیگ کے اسٹریپ پر انگلیاں جمائے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ کچھ سوال، تھوڑے خدشے اور ڈھیر سارا استعجاب تھا اس کی آنکھوں میں۔ لمحے بھر کے لیے ان کی آنکھیں چار ہوئیں۔

اگلے ہی لمحے ہوٹل کی طرف جاتی روش پر آگے کی جانب قدم بڑھاتی دُرِّمکنون کی پشت پر بکھرے بال اس کی نگاہ کا مرکز بنے اور پھر وہ تیزی سے بیٹھ کر زن سے کار آگے بڑھا لے گیا۔ بیک ویو مرر سے البتہ اس نے وہاں کھڑی شہرین کو ایک بار پھر دیکھا تھا۔ وہ پُرسوچ نظروں سے اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ یوں چل کر اندر آئی جیسے پیروں میں جان ہی نہ ہو۔ شدید اعصابی تناؤ نے اسے شکنجے میں لے رکھا تھا۔ ہال روم میں داخل ہوتے ہی اس کا استقبال ایک مخصوص خنکی والی مختلف پرفیومز سے بوجھل فضا نے کیا۔ جو سب سے پہلا صوفہ اسے سامنے نظر آیا وہ اس پر جیسے ڈھے گئی۔

''پلیز عینی یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔''
آگے جانے کی خواہشمند عینی سے اس نے بمشکل التجائیہ لہجے میں کہا تھا۔
''کیا ہوا دُرِّی۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟'' عینی متفکر سی اس کے پاس ہی ٹک گئی۔
''ہاں، میں ٹھیک ہوں۔''
اس نے جبراً مسکراہٹ لبوں پر سجائی مگر کوئی خاص افاقہ نہیں ہوا۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔
''خاک ٹھیک ہو۔ شکل دیکھو اپنی۔ کچھ کھاتی پیتی نہیں ہو کیا تم؟'' عینی نے اسے تشویش سے دیکھتے ہوئے ڈپٹا۔
''خیریت..... کیا ہوا اسے؟''
اس دوران خولہ اور اس کے عقب میں شہرین بھی ہال روم میں داخل ہو چکی تھیں۔ خولہ نے قریب آتے ہی فکرمندی سے سوال کیا تھا۔
''پتا نہیں۔ لگتا ہے ویک نیس ہے اسے۔ دیکھیں تو کیسے لرز رہی ہے یہ۔'' عینی نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔
''تم پانی لاؤ جا کر اس کے لیے۔'' خولہ نے عینی کو دوڑایا اور اس کے قریب آ بیٹھی۔
''لگتا ہے بی پی لو ہو رہا ہے تمہارا۔ اپنا خیال رکھا کرو دُرِّی۔''
خولہ نے ہمدردی سے کہا تھا۔ شہرین بھی اس کے پاس ہی آ ٹکی تھی۔
''مانا کہ اپنا زوی خاصا ڈیشنگ ہے۔ مگر اب ایسا بھی یوسفِ ثانی نہیں کہ تم جب اسے دیکھو ہوش و حواس کھونے لگو۔'' اس کے کان میں قدرے شوخی سے سرگوشی کرتی شہرین اسے بری طرح دہلا گئی تھی۔
اس نے وحشت زدہ سا ہو کر اسے دیکھا۔ جس کے چہرے پر بظاہر مسکراہٹ سہی مگر اس کی آنکھوں میں دبیز سنجیدگی تھی۔
دُرِّ مکنون پر جیسے کسی نے گرم پانی کا چھینٹا دے مارا تھا۔ وہ ٹوٹ کر ہوش میں آئی۔ گویا شہرین، زاویار کے شیرازی ہاؤس آنے اور دُرِّ مکنون کے بے ہوش ہو جانے والے واقعے سے واقف تھی۔
''کم آن، میں مذاق کر رہی تھی۔ ٹیک اِٹ ایزی۔''
یک دم شہرین ہنس پڑی تھی مگر دُرِّ مکنون کی سانس جیسے اٹک سی گئی۔ اس دوران عینی کسی ویٹر کو پانی کا کہہ آئی تھی۔
''بس ابھی پانی لاتا ہے وہ۔ اب کیا فیل کر رہی ہو تم؟''
عینی نے آتے ہی اس کے ٹھنڈے ہاتھ ہاتھوں میں لیتے ہوئے یوں سوال کیا جیسے اسے کئی گھنٹوں بعد ملی ہو۔
''میں ٹھیک ہوں عینی۔ میں نے کہا ناں۔ پلیز تم پریشان مت ہو۔''
اس نے خود کو سنبھال لیا تھا اور سنبھالنا ہی تھا۔ ساتھ بیٹھی شہرین کے مسکراتے چہرے پر اسے اپنے لیے استفسار جھلکتا محسوس ہو رہا تھا۔ اپنی اعصابی کمزوری کا اسے آج اور بھی اچھی طرح اندازہ ہوا تھا کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے شاک کو بھی برداشت کرنے کے قابل نہیں رہی ہے۔ یہ احساس اسے اداس سا کر گیا۔ مگر وہ خود میں زیادہ وقت گم نہ رہ سکی۔ ذرا دیر بعد ہی ہوٹل کا ہال روم لوگوں سے بھر گیا تھا۔ رنگ، روشنی، خوشبو اور مسکراہٹیں۔ چہچہاتی لڑکیاں، مسکراتے لوگ اور چہلیں کرتے جوان جوڑے۔ اس نے اپنی توجہ کا مرکز کوشش کر کے بدلا اور عینی کی معیت میں دھیان بٹانے کی کوشش کرنے لگی۔
آج مظفر صاحب جتنے خوش تھے اسی قدر جذباتی بھی ہو رہے تھے۔ ردا کو رخصت ہو جانا تھا۔ ان کی نگاہیں بار، بار اسٹیج پر دلہن بنی بیٹھی ردا کی طرف تھیں تو دل پدرانہ محبت سے لبریز ہو جاتا۔ ایسے میں دُرِّ مکنون کا خیال انہیں

بار، بار ڈسٹرب کیے دے رہا تھا۔ ردا کے بعد اب اس کی ذمے داری قسمت نے ان کے کاندھوں پر ڈال دی تھی۔
آج لوگ گزشتہ تقاریب سے کہیں زیادہ تھے۔
ذرا دیر بعد سائرہ اسے حسب سابق مختلف لوگوں سے متعارف کرانے کے لیے ساتھ لے گئیں۔ کئی سالوں بعد کچھ شناسا لوگ اسے ملے جو ماما کے بھی ننھیالی یا ددھیالی رشتے دار تھے۔ اور ان سے لاہور میں کئی بار ملنا ملانا ہوا تھا۔ ان سب نے جس طرح ماما اور بابا کے لیے تعزیت کی اور ان کی تعریفوں میں رطب اللسان ہوئے۔ اسے لگا جیسے سائرہ بیگم کے آگے اس کا سر فخر سے بلند ہو گیا ہو۔ گزرے تین سالوں میں تو شیرازی ہاؤس میں ان کے ناموں کے ساتھ جڑی نفرت ہی سماعت کا حصہ بنی تھی۔ اس کے دل پر جیسے کسی نے مرہم رکھ دیا تھا۔ البتہ ساتھ ساتھ سائرہ بیگم کو بھی سراہا گیا کہ کس طرح پیار اور محبت سے انہوں نے سوتیلی بہن کی بیٹی کو گلے سے لگا رکھا ہے۔
اور یہ حقیقت ایسی تھی کہ وہ انہیں شکر گزار نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔
شادی کی تقریب بہت اچھی رہی۔ ردا کی خوشی اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔ جس نے رنگ دوبالا کیا۔
شہرین اور خولہ کو زارا زبردستی اپنے ساتھ اٹھا کر لے گئی تو عینی اس کے پاس چلی آئی۔
''اف دُرِّی، کتنے سارے اور کس قدر پیارے رشتے دار ہیں تمہارے۔''
سائرہ بیگم کو کسی نے بلایا تو اس کی ''تعارفی کلاس'' سے جان چھٹی۔ ان کے منظر سے غائب ہوتے ہی عینی اس کے کان میں تقریباً گھس کر بولی تھی۔
اشارہ ان لڑکوں کی طرف تھا جن سے ابھی، ابھی سائرہ نے اس کا تعارف بھی کرایا تھا۔ ڈیشنگ اور اسمارٹ سے ایجوکیٹڈ لڑکے۔ عینی نے ستائشی انداز میں کہا تو اس کے سنجیدہ چہرے پر اداس مسکراہٹ دوڑ گئی۔
''تمہیں اچھے لگ رہے ہیں تو تم بنا لو انہیں اپنا رشتے دار۔''
''زہے نصیب۔ نیکی اور پوچھ، پوچھ۔ مگر تمہاری سائرہ آنٹی سے ڈر لگتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے وہ ان سب کو تمہارے لیے نظر میں رکھے ہوئے ہیں اور پھر میں تم جیسی دوست کا حق مارنا بھی نہیں چاہتی۔''
''فکر مت کرو۔ میں تمہیں اپنا حق بخشتی ہوں۔'' وہ رسان سے بولی تو عینی بھی مسکرا دی۔
''تم جیسی دوست سے مجھے یہ ہی امید تھی۔ مگر خلوص اِدھر بھی کم نہیں ہے۔ لہٰذا جاؤ جا کر انجوائے کرو۔''
وہ محض نظر جھکا کر رہ گئی۔ نہ جانے آج اسے شہرین کی آنکھیں کچھ کہتی ہوئی کیوں لگ رہی تھیں۔
اس نے قصداً موضوع کو بدلنے کی خاطر خولہ کی متوقع شادی کا قصہ چھیڑ دیا۔ اور یوں اس نے ان تینوں کی توجہ اپنی جانب سے ہٹا کر دوسری جانب مبذول کر دی۔
اس دوران ایک آدھ بار اظہار صاحب... ان لوگوں کے پاس بھی آئے مگر خولہ کی موجودگی کے باعث چاہتے ہوئے بھی اسے مخاطب نہ کر سکے۔
یوں بھی اس کا ذہن اس وقت اس قدر منتشر تھا کہ وہ ان پر زیادہ دھیان دے بھی نہیں پائی۔
ڈنر کے وقت سائرہ بیگم اسے بالخصوص بالکل ہی انجان فیملی کے ساتھ بٹھا گئیں۔ جن سے ذرا دیر پہلے ہی اس کا تعارف کرایا تھا۔ اس کی حواس باختگی اس وقت عروج پر تھی۔ ایسے میں زوہا اور عکرمہ کی وہاں آمد اس کے لیے کسی حد تک ڈھارس کا سبب بنی۔
فرحان نامی وہ بندہ جو اس کے بالمقابل بیٹھا تھا۔ خاصا خوش مزاج اور خوش خوراک تھا۔ دورانِ طعام بھی اس کی گفتگو کو بریک نہیں لگا تھا۔ سوالات کا ایک ذخیرہ تھا گویا اس کے پاس۔
وہ برائے نام ہی کھا پا رہی تھی۔ اس کے سوالات اور خاص طور پر اس کی بولتی ہوئی ستائشی آنکھیں اسے نروس کر رہی تھیں۔

تاہم عکرمہ کی آمد سے اس کی نگاہوں کے ارتکاز میں قدرے خلل واقع ہوا۔ وہ دونوں پرانے واقف کار تھے اور قدرے بے تکلف بھی۔

دُرِ مکنون کا چہرہ اس وقت لباس کے ہم رنگ ہوا جا رہا تھا۔

کچھ تھا اس کی آنکھوں میں، عکرمہ نے اسے ایک لمحے کے لیے بغور دیکھا اور پھر زوہا کو کوئی اشارہ کیا جس کے نتیجے میں وہ بہانے سے اسے وہاں سے اٹھا لے گئی تھی۔ عینی اور شہرین بھی ذرا دیر بعد گھر کو لوٹ گئی تھیں۔

ہر بار کی طرح اس مرتبہ بھی آنسوؤں کو پلکوں کی منڈیروں سے پیچھے دھکیلنے میں اسے سخت دقت کا سامنا رہا۔ گو کہ فرحان علی کی بے ضرر نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کیے تھیں مگر محض اس کی قربت ہی اسے لرزا گئی تھی۔

''کیا کروں یا اللہ، کہاں پناہ ڈھونڈوں اپنے لیے۔ تو، تو بے سہاروں کا سہارا ہے۔ مجھے سہارا دے۔ تیری اتنی بڑی دنیا میں کیا میری کہیں جگہ نہیں؟ کسی کے گھر میں نہیں؟ کسی کے دل میں نہیں؟ رحم فرما یا اللہ۔ میں کا دل میرے لیے فراخ کر دے۔ مجھے کسی کی زندگی کا حصہ نہیں بننا۔ کسی کا گھر نہیں بسانا۔ اس دنیا میں جتنا میرا وقت تو نے مقرر کیا ہے۔ اسے کسی نہ کسی طرح گزار دے۔ شیرازی ولا نام کی اس پناہ گاہ سے مجھے نہ نکال۔ رحم کر میرے مالک!''

وہ دل ہی دل میں دعا گو تھی۔ اسی دوران باہر رخصتی کا غلغلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دل تو یوں بھی گویا آبلہ بنا ہوا تھا۔ رخصتی کا رقت آمیز منظر اس کے آنسوؤں کو راستہ دے گیا۔ دادی، ردا کو سینے سے لگائے رو رہی تھیں جبکہ سائرہ بیگم اور مظفر صاحب بھی آبدیدہ کھڑے تھے۔

''کتنے خوش نصیب ہیں شیرازی انکل کہ آج اپنی تیسری بیٹی کو بھی باعزت رخصت کر رہے ہیں اور ایک میرے بابا تھے کہ اپنی اکلوتی بیٹی کے باعث کس قدر تذلیل اور کرب کا شکار ہوئے۔'' گرم، گرم آنسو گویا اس کے رخسار دہکا گئے تھے۔

زوہا اور زارا، سیف کے ساتھ اشک بار کھڑی تھیں۔

''ٹیک اِٹ ایزی۔ یہ وقت تو عموماً ہر لڑکی پر آتا ہے۔ رونے کے بجائے اپنی کزن کی خوشیوں کے لیے دعا گو رہیں۔ یہ زیادہ بہتر ہے۔'' اسے اپنے دائیں جانب سے گہرے لہجے سمیت دھیمی آواز میں نصیحت سنائی دی۔ ساتھ ہی ٹشو کا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا گیا تھا۔ وہ چونک کر متوجہ ہوئی۔

فرحان علی نزدیک کھڑا تھا۔ چہرے پر قدرے شوخی لیے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

بے دھیانی میں ٹشو کی طرف بڑھایا ہوا اس کا ہاتھ لمحے بھر کے لیے ہوا میں معلق رہ گیا۔

فرحان علی کی نگاہیں گویا اس کے چہرے میں جذب ہونے لگیں۔

نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن والا حال تھا۔

وہ مدد طلب نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

مگر سوائے دور کھڑے اظہار صاحب کی چبھتی ہوئی کٹیلی نگاہوں کے کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

''لیکن اگر آپ اپنے فیوچر کے لیے پریکٹس کرنے کے موڈ میں ہیں تو پھر کیری آن۔ اس کی گنجائش تو بہرحال نکالنی ہی پڑے گی۔ حالانکہ میں خواتین کے آنسوؤں سے کافی الرجک ہوں مگر بقول شاعر۔ رسمِ دنیا بھی ہے، موقع بھی ہے، دستور بھی ہے۔'' فرحان علی کا مسکراتا لہجہ اسے دہشت زدہ کرنے کو کافی تھا۔

اور کچھ اس کے فقروں کا بھی اثر تھا وہ باوجود ضبط کے اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکی اور بمشکل ''ایکسکیوزمی'' کہہ کر وہاں سے ہٹ آئی اور دو نگاہوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا۔

گو کہ اس کی نسوانی حس نے اسے مطلع کر دیا تھا کہ وہ شخص ناپسند کرنے کے لائق نہیں۔ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے احترام اور ستائش اس کی نگاہوں سے مخفی نہیں رہے تھے۔ تاہم وہ جانتی تھی کہ اگر اس کو دُرِ مکنون کے ماضی کی

ذرا سی بھی بھنک لگ گئی تو یہی آنکھیں اسے تحقیر، تضحیک اور پھر شاید ترحم سے گھور کر کسی اور طرف اٹھ جائیں گی۔
یہی وجہ تھی کہ اس کا دل اس ڈرامے کے کلائمکس سے واقفیت کے باعث کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا اور یہ سوچ کر پریشان تھا کہ آخر جو حقیقت اظہر من الشمس ہے۔ سائرہ اس سے صرف نگاہ کیوں کر رہی ہیں۔
رخصتی کا مرحلہ بخیر و خوبی نبٹا تو سب نے دھیرے، دھیرے گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچ کر اس نے سیدھا اوپر کی راہ لی۔
اتنے لوگوں کے ہونے کے باوجود گھر یک دم خالی، خالی لگ رہا تھا۔ ردا کا وجود کس قدر اہم تھا اسے آج اندازہ ہوا۔
بیٹی کے رخصت ہونے کے بعد والی اداسی اور خاموشی سب کو ہی محسوس ہوئی تھی۔ وہ لباس تبدیل کر کے باہر نکلی تو دادی کچن میں چائے بناتی نظر آئیں۔
''آپ بیٹھیے دادی..... میں بناتی ہوں۔''
اس نے ضد کر کے انہیں چولھے کے پاس سے ہٹایا۔
اسی دوران عکرمہ بھی چینج کرنے کے بعد کرتے کی آستینیں فولڈ کرتا اندر داخل ہوا تھا۔
اس نے دیکھا کاؤنٹر پر عکرمہ کا فیورٹ مگ بنا دھلے رکھا ہے۔ لہٰذا اٹھا کر اسے دھونے لگی۔ چائے کو دم لگنے میں ابھی تھوڑا ٹائم تھا۔
حسب عادت طائر ذہن اڑ کر فرحان علی اور زاویار انصاری تک جا پہنچا تھا۔ کچھ گھنٹوں پہلے اظہار صاحب کی زبان سے نکلنے والے الفاظ اس کے دماغ میں اودھم مچا رہے تھے۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ اپنے خیالات میں محو وہ تین بار مگ دھو چکی ہے۔
''دُرِ مکنون۔'' عکرمہ کے پکارنے پر وہ خود میں لوٹی۔
''جی۔'' چونک کر سعادت مندی سے جواب دیا تھا۔
''میں خاصا صفائی پسند ہوں مگر اتنا بھی نہیں۔ میرا خیال ہے میرے مگ کو دو بار دھونا بھی کافی ہوتا جبکہ اب تو یہ تین بار دھل چکا ہے۔'' سارے دن کی بھاگ دوڑ کے بعد وہ تھکا ہوا نظر آ رہا تھا مگر چہرے پر سجی مسکراہٹ بہت تازہ تھی۔
حسب توقع مخالفت سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔
چائے دم ہو چکی تھی۔ اس نے رخ موڑ کر کپوں میں انڈیلنی شروع کر دی۔ چائے پی کر وہ سیدھی کمرے میں آئی تھی اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔
تھکن کافی تھی۔ لہٰذا وہ جلد ہی نیند کی وادیوں میں کھو گئی کہ اپنے اردگرد ہونے والے نامانوس سے شور کو سن کر اٹھ بیٹھی۔
سامنے وال کلاک پر نظر پڑی تو پتا چلا اسے سوئے گھنٹا بھی نہیں ہوا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اور دادی وہاں موجود نہیں تھیں۔
نیچے سے آنے والی پریشانی بھری آوازیں اسے گہری نیند سے جگا گئیں۔ اس کا دل بے ترتیبی سے دھڑک اٹھا۔
وہ بمشکل پیروں میں چپلیں اٹکائے دوپٹا گھسیٹتی کمرے سے نکلی۔ نیچے سے دادی کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔
وہ کسی سیلابی ریلے کے مانند سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تھی۔ کوئی ناگہانی ہو جانے کا الہام اسے پریشان کر گیا۔
''اماں... پلیز..... پریشان مت ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' مظفر صاحب بہت پریشان نظر آ رہے تھے مگر دادی کو تسلی دیتے ہوئے جانے کیا سوچے جا رہے تھے۔
وہ دھڑکتے دل سے اتر کر لاؤنج میں چلی آئی۔ جہاں عجیب سی افراتفری تھی۔ شادی والے گھر کی بے ترتیبی میں یہ افراتفری کچھ نئی نہیں تھی مگر مکینوں کے چہروں سے جھانکتی تشویش بالکل انوکھی تھی اس کے لیے۔
''زوہا کیا ہوا ہے؟ سب کیوں پریشان ہیں؟ اور آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' وہ متوحش کھڑی تھی کہ کمرے سے

برآمد ہوتی زوہا کو دیکھ کر اس کی جانب لپکی جو اس وقت کہیں جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔ چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ بہت پریشان ہے۔

''آصف کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ چوٹیں بڑی شدید ہیں اور وہ اس وقت آئی سی یو میں ہے۔ ہم سب وہیں جارہے ہیں۔'' بڑے بھاری دل اور متورم لہجے میں زوہا نے اسے اطلاع پہنچائی تھی۔ اس نے گھبرا کر دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

''ان فیکٹ گھر پہنچ کر کچھ خاندانی رسمیں ادا کرنے کے بعد وہ اپنی پھپھو کو جن کو آج رات ہی فلائی کرنا تھا ائرپورٹ ڈراپ کرنے گیا تھا کہ واپسی پر یہ حادثہ ہوگیا۔'' خبر اور حادثہ اندوہناک تھا۔ شیرازی ولا میں جیسے ایک دم سوگواریت اتر آئی تھی۔

''چلو زوہا آؤ۔ آئیں انکل۔ آپ بھی آجائیں دادی کو لے کر۔''

سعد بھائی اس لمحے اندر داخل ہوئے اور بعجلت بات مکمل کی۔

''چلو ڈیری چلو تم بھی۔''

وہ خالی الذہن کھڑی تھی۔ جب زوہا نے اسے ہاتھ پکڑ کر ساتھ لیا اور یوں کچھ دیر بعد وہ سب لوگ اسپتال میں موجود تھے۔

ردا ان سب کو آتا دیکھ کر بے اختیار تڑپ کر آگے بڑھی تھی۔ اور پھر ماں کے گلے لگ کر پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔

''بس کرو بیٹا۔ اللہ سب ٹھیک کرے گا۔'' شیرازی صاحب نے بھاری آواز میں کہتے ہوئے بیٹی کو تسلی دی۔ جو اس وقت عروسی لباس میں ملبوس تھی۔

آصف کے والدین عرصہ ہوا انتقال کر گئے تھے۔ پھپھو نے پالا تھا اسے۔ جو کچھ گھنٹوں پہلے اپنے بیٹے کے پاس امریکا سدھار گئی تھیں۔ ایسے میں اس کے کچھ دوست اور قدرے نزدیک کے چند رشتے دار اسپتال آئے ہوئے تھے۔

وہ سب کھڑے ردا کو تسلی دے رہے تھے کہ اتنے میں ڈاکٹر آتا دکھائی دیا اور سب اس کی طرف لپکے۔

''ہم نے مسٹر آصف کو ٹریٹمنٹ دے دیا تھا۔ ان کی ٹانگ فریکچر ہوئی ہے اور سر میں بھی گہری چوٹیں ہیں۔ آج کی رات بہت بھاری ہے ان پر۔ دعا کریں کہ سب ٹھیک رہے۔''

''کیا ہم انہیں دیکھ سکتے ہیں ڈاکٹر؟'' ردا نے روتے ہوئے پوچھا تھا۔

''آپ؟''

''یہ اس کی مسز ہیں۔ آج ہی تو شادی ہوئی ہے ان کی۔''

آصف کی کزن نے متعارف کرایا۔

ڈاکٹر کے چہرے پر ہمدردی کا تاثر ابھرا۔

''جی... دیکھ لیں۔ مگر پلیز شور نہیں۔ صرف دو تین منٹ کے لیے اندر جاسکتے ہیں۔ مریض کو ابھی ہوش نہیں آیا ہے۔''

ڈاکٹر سے اجازت ملنا تھی۔ ردا..... زوہا اور زارا کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ پیچھے، پیچھے دادی اور دوسرے لوگ بھی تھے۔

ڈیرمکنون نے سب کو یوں جاتے دیکھا تو خود بھی آگے بڑھی۔

آئی سی یو کے کاریڈور میں ابھی اس نے قدم رکھا ہی تھا کہ سائرہ نے اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

''تم باہر ہی رہو۔ جب سے آئی ہو میرے گھر کا سکھ کھا گئی ہو۔ پہلے تمہاری وجہ سے مظفر شدید بیمار ہوئے پھر وہ لڑکا زاویار تمہیں ملنے آیا تو دوبارہ اپنی ٹانگوں پر گھر نہیں جاسکا اور اب ردا کی خوشیاں بھی کھا گئیں تم..... سبز قدم!''

ہلکی آواز میں ان کے زہر میں ڈوبے جملے اسے گویا پتھر کر گئے۔

''اپنا گھر تو ختم کر ہی ڈالا تم نے منحوس لڑکی۔ اب میرے گھر کے پیچھے پڑی ہو۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے، نہیں تو میں کچھ کر بیٹھوں گی۔'' بے پناہ غم اور پریشانی نے گویا انہیں پاگل سا کر دیا تھا۔

جوان بیٹی عروسی جوڑے میں جسے اس وقت حجلۂ عروسی میں ہونا چاہیے تھا۔ بیوہ ہوجانے کے خدشے سے سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

کسی تک ان کی آواز نہ پہنچے کہ یہاں ردا کے سسرالی اور ان کے اپنے دونوں داماد بھی موجود تھے۔ وہ اس کے بالکل نزدیک وحشت ناک انداز میں اس کا بازو دبوچے دانت بھینچ کر انتہائی تنفر سے کہہ گئی تھیں۔

دوسروں کی جانب پشت کیے شعلہ بار نظروں سے وہ گویا اس کو بھسم ہی کیے دے رہی تھیں۔ دُرِمکنون کا دکھی دل اس تذلیل پر جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ حیرت اور کرب سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑتے ہوئے سائرہ نے اسے قدرے پیچھے دھکیلا تو وہ اس ذلت پر بمشکل قدم اٹھاتی واپس پلٹ آئی۔ سامنے ہی اسے واش روم دکھائی دیا تھا۔ جس میں داخل ہوتے ہی وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی۔

ردا کے دکھ کے ساتھ، ساتھ اس درجے تحقیر پر اس کا دل خون کے آنسو رو دیا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ سائرہ اس وقت بہت دکھی اور پریشان ہیں۔ مگر ان کی پریشانی یا اس حادثے کی وجہ وہ تو نہیں تھی کہ اس طرح اسے دکھی کیا جاتا۔ وہ بیچ نیند سے اٹھ گئی تھی۔ جس کے باعث سر میں درد تو ویسے ہی ہو رہا تھا۔ اب رونے سے اور بڑھ گیا۔

کتنی ہی دیر اسے خود کو سنبھالنے میں لگی۔

منہ دھو کر وہ جب باہر نکلی تو وہیں ریسپشن کے پاس رکھی کرسی پر آبیٹھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس طرح ایسی جگہ بیٹھنے سے گریز کرتی۔ جہاں لوگوں کا آنا جانا لگا ہو۔

مگر رات کا ایک پہر گزر جانے کی وجہ سے اسپتال میں اس وقت رش نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ ایک کرسی پر آبیٹھی تھی۔

کچھ دیر گزری عکرمہ اسے سامنے سے آتا دکھائی دیا۔

''آپ یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہیں۔ وہاں آئیں۔ دادی نے بلایا ہے آپ کو۔'' متفکر سا وہ اس کے پاس آکر بولا تو وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

''آصف بھائی ٹھیک ہوجائیں گے ناں؟''

اس کا استفسار کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے عکرمہ کے جواب پر اس کی زندگی اور موت کا دارومدار ہو۔

''ان شاء اللہ۔ اللہ رحم کرنے والا ہے۔''

''سچ؟'' آنسو لڑیوں کی صورت میں اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ عکرمہ اس کے لہجے سے ٹپکتی پریشانی سے بہت متاثر ہوا۔ وہ جیسے بے یقینی کے اندھیرے میں امید کا کوئی جگنو تلاش کر رہی تھی۔

''کم آن دُرِمکنون۔ ٹیک اِٹ ایزی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ بہتر ہے۔ بس چوٹ لگنے کی وجہ سے بے ہوشی طاری ہے۔ ان شاء اللہ چند گھنٹوں تک ہوش آجائے گا۔''

''یا اللہ تیرا شکر ہے۔'' وہ دل ہی دل میں گویا سجدہ ریز ہوئی۔ عکرمہ البتہ منتظر کھڑا تھا۔ اس کی طرف ٹشو بڑھا کر بولا۔

''بہرحال آپ آئیں۔ میرے ساتھ۔'' وہ جس کام کے لیے آیا تھا وہ بھولا نہیں تھا۔

دُرِمکنون نے کچھ سوچ کر آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ اور گزرے چھ سات ماہ میں یہ پہلی بار تھا کہ اس نے عکرمہ کو کسی بات کے لیے انکار کیا ہو۔

عکرمہ نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

''نہیں، میں یہاں ٹھیک ہوں۔'' اس کا انکار دوٹوک اور واضح تھا۔

عکرمہ لمحہ بھر کے لیے چپ سا رہ گیا۔

اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔ یک دم دُرِ مکنون نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے تھے۔
''پلیز۔ مجھے فورس مت کیجیے گا۔ میں وہاں نہیں جانا چاہتی۔''
ملتجیانہ انداز اور آنکھوں سے چھلکتی گزارش۔ عکرمہ شیرازی کے چہرے پر یک دم کوئی تاثر در آیا تھا۔
''آپ کے گریز کی وجہ جان سکتا ہوں۔'' قدرے سخت لہجے میں اس نے سوال کیا تھا۔
جواباً دُرِ مکنون ہونٹوں کے گوشے کچلتے ہوئے سر جھکا گئی۔
اپنے گریز کی وجہ بھلا کیا بتاتی اسے۔ سو چپ چاپ آنسو بہانے لگی۔
اسے چند لمحے لب بھینچ کر دیکھتے رہنے کے بعد عکرمہ الٹے قدموں لوٹ گیا تھا۔ اور ٹھیک ڈیڑھ منٹ بعد جب وہ پلٹا تو اس کے ہمراہ شیرازی صاحب تھے اور ان کے آگے دُرِ مکنون کی پیش نہ گئی اور اسے ICU کے ساتھ بنے کاریڈور میں سائرہ بیگم کی تیغ صفت نگاہوں کے سامنے آنا پڑا۔
ردا کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ردا کے قریب جائے مگر سائرہ بیگم کی آنکھوں سے گویا چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ جو اسے قدرے فاصلے سے کھڑے ہونے کے باوجود جھلسا رہی تھیں۔ سو وہ ہمت نہ کر سکی۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن ولیمہ تھا جسے ملتوی کیا گیا۔ ڈاکٹرز آصف کو چھتیس گھنٹوں کے بعد ہوش میں لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مگر اس کے سر میں لگی چوٹ اور کمر میں آنے والے جھٹکے کے باعث اس کے لیے اپنے جسم کو ہلانا جلانا ناممکن ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی ٹانگ کا فریکچر اپنی جگہ بلائے جان تھا۔
مگر جس اندوہناک خبر نے سب کو گویا جڑ سے اکھاڑ ڈالا۔ خاص طور پر ردا کی حالت دیدنی تھی اور وہ خبر تھی کہ آصف کے nerves کے damage ہونے کی وجہ سے اس کا اپنی ٹانگوں پر دوبارہ چلنا گویا کسی حد تک ممکن ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
گو کہ ڈاکٹرز نے تسلیاں دی تھیں کہ فزیوتھراپی اور اپنی ول پاور اور قوتِ مدافعت کے ذریعے اگر وہ چاہے گا تو کچھ ماہ بعد چلنے کے قابل ہو جائے گا مگر اس کا امکان محض پچاس فیصد تھا۔
چند دن پہلے تک جو گھر خوشیوں کی آماجگاہ تھا۔ آج غم اور پریشانی کی کمین گاہ بن گیا تھا۔ ردا کو سنبھالنا مشکل تھا۔ اُدھر آصف کی پھوپی جنہوں نے اسے ماں بن کر پالا تھا اور جو اپنے علاج کے لیے امریکا روانہ ہو چکی تھیں۔ ان کا وہاں سے واپس آنا بھی ناممکن تھا۔ وہ وہاں الگ پریشان تھیں۔
آصف کے بہن بھائی تو تھے نہیں۔ پھوپی کا بھی صرف ایک بیٹا تھا جس کے پاس وہ امریکا گئی تھیں۔ لہٰذا یہاں اب ردا اور شیرازی فیملی ہی اس کے عزیز تھے۔ یا ایک آدھ دور پرے کے رشتے دار..... اور وہ آصف جو اپنی محبت کو پانے کی خوشی میں سرشار تھا۔ بے یار و مددگار بستر پر پڑا تھا۔
ردا اس کی محبت تھی اور اب منکوحہ بھی۔ جس کا گھونگٹ اٹھانے کے ارمان لیے وہ اسے رخصت کرا کر لے گیا تھا۔ ہوش آنے پر وہ اسے سادہ لباس میں نظر آئی تو دل پر جیسے چھری چل گئی۔ ان کی شبِ زفاف تو اس کی بے ہوشی میں کب کی گزر چکی تھی۔ فطری طور پر اپنے ساتھ ہونے والے حادثے اور ردا کی ناگفتہ بہ حالت نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔
دادی، سائرہ بیگم اور مظفر صاحب کا دل بیٹی کے غم پر خون کے آنسو رو رہا تھا مگر وہ اپنے آپ کو ردا کے لیے سنبھالے ہوئے تھے۔
اِدھر ان تمام سانحوں کا بدترین اثر دُرِ مکنون پر پڑا۔ گھر میں آنے جانے والوں کا گویا تانتا بندھا تھا۔ جس کے باعث وہ ایک کمرے تک محدود اور محصور ہو کر رہ بھی نہیں سکتی تھی۔
سائرہ بیگم تو جیسے بالکل ٹوٹ گئی تھیں۔ ایسے میں ہر منٹ بعد دُرِ مکنون کی پکار پڑتی۔ لوگوں کی موجودگی میں تو سائرہ

برداشت کر جاتیں۔ مگر جونہی وہ انہیں اکیلے نظر آتی۔ ان کا بے بسی سے بھرپور غصہ اس پر ہی اترتا۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ دادی کے کہنے پر وہ کھانا گرم کر کے ردا کے کمرے میں داخل ہی ہوئی تھی کہ وہاں موجود سائرہ اس کو دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو گئیں۔

''اس منحوس کو میرے سامنے سے ہٹاؤ زارا۔ میں اسے دیکھتی ہوں تو میرا دل جلتا ہے۔'' ان کا لہجہ ہی نہیں آنکھیں بھی آگ برسا رہی تھی۔

وہ ٹرالی بیڈ کے قریب لاتے، لاتے جیسے ششدر سی رک گئی۔

''پلیز میمی کیا ہو گیا ہے آپ کو۔'' زارا گھبرا اٹھی۔

''کیا، کیا ہے دُرِ مکنون نے؟'' وہ ماں کے تیور پر حیران تھی۔

''کیا، کیا ہے اس نے..... تم یہ مجھ سے پوچھ رہی ہو زارا؟'' انہوں نے حیرت سے بیٹی کی طرف اور پھر انتہائی تنفر سے دُرِ مکنون کو گھور کر دیکھا تو اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ اترتی محسوس ہوئی۔

''ارے یہ ہی تو وہ سبز قدم ہے جو اپنے ماں باپ کو کھا کر اب میرا گھر برباد کرنے آئی ہے۔ جب سے آئی ہے کوئی نہ کوئی پریشانی اس گھر پر مسلط ہو رہی ہے۔ مظفر کی بیماری اس کی دین ہے..... میرا سکون ختم ہو گیا ہے اس کے آنے سے..... جس کے ساتھ دو بول پڑھا کر رخصت کرنے کا ارادہ کیا... وہ بھی اس کی نحوست کے باعث اسپتال جا پہنچا..... اور اب یہ میری بیٹی کی خوشیاں بھی برباد کرنے کے درپے ہے۔'' سائرہ اپنے آپ میں نہیں رہی تھیں۔ جو منہ میں آیا بول رہی تھیں۔

دُرِ مکنون سمیت ان کی بیٹیاں بھی اپنی کوالیفائیڈ ماں کو بنظرِ حیرت تکنے لگیں۔

''میمی پلیز... ٹیک اٹ ایزی۔ آپ پُرسکون ہو جائیں۔'' زارا نے معذرت خواہانہ نگاہ دُرِ مکنون پر ڈالی اور ماں کے قریب چلی آئی۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر انہیں پُرسکون رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ بہت متحیر تھی۔ ماں کا یہ رو... سخت حیران کن تھا اس کے لیے۔

''کیسے ہو جاؤں پُرسکون۔ جس دن سے یہ سیاہ بخت میرے گھر آئی ہے۔ میرا سکون اور چین سب لٹ گیا ہے۔'' سائرہ کی آنکھوں سے گویا آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ دُرِ مکنون کو اپنے گرد کوئی الاؤ سا بھڑکتا محسوس ہوا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے منحوس لڑکی۔ دور ہو جاؤ۔ میری نظر سے۔'' یک دم وہ اس طرح بھڑکیں جیسے آتش فشاں پھٹ گیا ہو۔

''میمی پلیز... آپ کول ہو جائیں۔'' زارا نے پھر سے ماں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور پھر دُرِ مکنون کو پشیمانی سے دیکھتے ہوئے جانے کا اشارہ کیا۔

تو وہ یوں کمرے سے نکلی جیسے کسی کو جہنم سے اذنِ رہائی ملی ہو۔ مگر جو ذلت اور تذلیل کا دوزخ تھا۔ اس سے نہ جانے اسے کب آزادی ملنا تھی۔

کون جانے ملنی تھی بھی کہ نہیں۔

اس لمحے اس نے شدت سے جو چیز طلب کی وہ تھی ''موت''۔

☆.....☆.....☆

عینی کے ذریعے اسے زارا بھابی کے خاندان میں ہونے والے حادثے کی خبر مل گئی تھی۔ آغا جان بھی لاہور جانے سے پہلے اسپتال جا کر آصف کی عیادت کر آئے تھے۔

عینی نے اسے بھی کھینچا مگر اس بار وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور یوں عینی، آغا جان کے ساتھ لاہور فلائی کر گئی۔

جاتے، جاتے وہ اسے لاہور آنے کے لیے ہر ممکن طور پر منا چکے تھے۔ مگر اس کا دل جیسے پتھر ہو گیا تھا۔

یوں بھی جب سے اسے علم ہوا تھا کہ دُرِ مکنون اسی شہر کی ہواؤں میں سانس لے رہی ہے۔ وہ خود کو گویا یہاں محصور پاتا تھا۔ اور یہ وہ حصار تھا جسے وہ توڑنا چاہتا بھی نہیں تھا۔

شہرین اس دن کے بعد ایک بار بھی اسے ملنے نہیں آئی۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس روز والے اس کے ناگوار رویے نے یقیناً شہرین کو بددل کیا ہے۔ وہ اسے اس کے ردِعمل میں حق بجانب سمجھ رہا تھا کہ اچانک ایک دن وہ آنازل ہوئی۔ وہ آفس کے بعد سوئمنگ کے لیے چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو باہر لان میں وہ اسے عاصمہ کے ساتھ چائے پیتے ہوئے گپیں لگاتی مل گئی۔

''کیا حال ہیں؟ کہاں گم تھیں؟'' وہ اس کے مقابل کرسی پر فروکش ہوتے ہوئے بلاارادہ سوال کر گیا تھا۔

جواباً چائے کا سپ لیتے ہوئے شہرین کی آنکھیں مسکرانے لگیں۔

''زہے نصیب۔۔کہ ہز ہائی نیس نے کنیز کی کمی کو محسوس کیا۔'' وہ کارنش بجالائی۔

''فضول مت بولا کرو۔''

''بجا ارشاد فرمایا۔'' وہ قدویانہ انداز میں بولی تو زاویار نے بغور اسے دیکھا۔ جس کے بظاہر مسکراتے چہرے پر سجی آنکھوں میں اجنبی سے سوالات تھے۔ یہ استفسار اس نے اس روز انہیں شیرازی فیملی کے فنکشن کے لیے ڈراپ کرنے کے بعد بھی اس کی آنکھوں میں دیکھے تھے۔

''تم کافی پیو گے زوی؟'' عاصمہ نے پوچھا تو وہ سر ہلا گیا۔

''اوکے، میں بنالاتی ہوں۔ تم لوگ بیٹھو۔'' وہ کہہ کر اندر کی جانب بڑھ گئیں تو۔۔ان دونوں کے مابین ذرا دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ جسے شہرین نے توڑا۔

''زوی تم کو زارا بھابی کی سسٹر کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کا پتا چلا؟'' بظاہر سرسری لہجے میں سوال کرتی شہرین کی نگاہیں بڑی گہری تھیں۔

زاویار نے بھویں اچکا کر اسے دیکھا۔

''ہوں۔'' اس کے انداز میں قدرے روکھا پن تھا۔

''تم نے وزٹ کیا ان کے برادر ان لا۔۔کو ہاسپٹل؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''کیا مطلب کیوں؟ کیا میرا وزٹ کرنا ضروری ہے؟ آغا جان اور تم سب لوگ مل کر آتو گئے ہو تو پھر میرے نہ جانے سے بھلا کیا فرق پڑے گا؟''

اس کی جھلاہٹ عروج پر تھی۔ تلخی سے بولا تو شہرین نے تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''بہت افسوس کی بات ہے زوی۔ جب تم ہاسپٹلائزڈ تھے۔ تو زارا بھابی کی فیملی سے کتنی ہی بار وہ لوگ تمہاری عیادت کو آئے اور تم ہو کہ ایک بار بھی جانے کو تیار نہیں۔''

شہرین نے حسبِ سابق اور حسبِ عادت اسے لتاڑا تھا۔ وہ جز بز سا رہ گیا۔

''رہ گئی ہم میں سے کسی کے جانے کی بات تو فار یور کائنڈ انفارمیشن۔ ان لوگوں نے تمہیں وزٹ کیا تھا۔ مجھے یا آغا جان کو نہیں۔ اور نہ ہی یہ کوئی فرضِ کفایہ ہے کہ کسی ایک کے کرنے سے ادا ہو جائے گا۔ تمہیں چاہیے کہ تم پرسنلی وہاں جاؤ اور شیرازی انکل کو دلاسا دو۔ وہ لوگ اس وقت سخت تکلیف میں ہیں۔ کبھی، کبھی انسان کو اپنی ذات سے بالاتر ہو کر بھی سوچنا چاہیے زوی۔'' آخری فقرہ اس نے بڑے معنی خیز لہجے میں کہا تھا۔

زاویار کے چہرے پر تناؤ آرکا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا'' اپنی ذات سے ''اس سارے معاملے میں میری ذات بیچ میں کہاں سے آ گئی؟''
اس کے انداز سے ناگواریت کا اظہار ہو رہا تھا۔ شہرین نے ہلکی سی مسکراہٹ سمیت اسے دیکھا۔
''کہنے کی بات تھی سو کہہ دی۔ اب تشریح کرانے مت بیٹھو۔''
وہ شہرین ہی کیا جو ہاتھ آ جائے۔ زاویار نے گھور کر اسے دیکھا۔
''اچھا خیر جانے دو اس بات کو اور یہ بتاؤ کہ آخر دُرِ مکنون تم سے اس قدر ڈرتی کیوں ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے لاہور میں تو میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ تمہیں دیکھ کر سہم گئی ہو۔ جبکہ یہاں کراچی میں اس روز وہ تمہاری اس سے غالباً دوسری ملاقات تھی۔ پہلی میں تو وہ direct بے ہوش ہی ہو گئی تھی اور لاسٹ ویک بھی تمہیں دیکھنے کے بعد میری تشخیص کے مطابق اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے بچا تھا۔ بائی داوے... مسئلہ کیا ہے؟'' کرسی نزدیک کرتے ہوئے اس بار اس نے بڑی سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔ زاویار اس ڈائریکٹ سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ ماتھے پر بل ڈال کر اسے دیکھنے لگا۔
''یہ سوال اگر تم ان موصوفہ سے خود ہی کر لیتیں تو زیادہ بہتر ہوتا۔''
دل میں چور تھا... جسے چھپانے کے لیے اس نے قصداً بے پروائی کا اظہار کیا۔ وہ بھی قدرے غصے میں۔
شہرین نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔
''کیا تھا۔ مگر وہ یوں حواس باختہ ہوئی۔ جیسے کوئی جن دیکھ لیا ہو اس نے۔ حالانکہ وہ ایسی کبھی نہیں تھی۔''
''تو تمہیں کیا ٹینشن ہے۔ ہوگا اس کا کوئی مسئلہ۔ دنیا میں ہزاروں طرح کے لوگ ہیں اور ان کے لاکھوں مسائل۔ تم بس اپنے کام سے کام رکھو۔ دوسروں کے پرابلمز وہ جانیں۔'' اس نے سخت لہجے میں گویا اسے ڈپٹا۔
جس پر شہرین نے اسے ملامتی نظروں سے گھورا۔
''تم انتہائی بے حس انسان ہو زوی۔ وہ دُرِ مکنون کوئی غیر نہیں۔ شی از جسٹ لائک مائی سسٹر۔ عینی جیسی لگتی ہے وہ مجھے۔ اور اس کی ماما صوفیہ آنٹی۔ اُف کس قدر سوئٹ تھیں وہ۔ بالکل ماما کی طرح پروا کرتی تھیں وہ میری۔ آج وہ دنیا میں نہیں۔ پتا نہیں ان کے بغیر کیسے زندہ ہے دُرِ مکنون۔ تمہیں شاید پتا نہیں کتنے بڑے حادثے سے گزری ہے وہ۔'' دکھ اور تاسف شہرین کے چہرے سے عیاں تھا۔ زاویار کا سر جھک گیا۔
''کتنی پیاری لڑکی ہے وہ۔ تم نے کیوں انکار کیا اس کے لیے۔ کیوں زوی؟'' آج اچانک شہرین کا سۂ سوال لیے اس کے سامنے آ دھمکی تھی۔
زاویار کے اندر جیسے شرمندگی اور پشیمانی کا جوار بھاٹا اٹھنے لگا۔ جسے چھپانے کے لیے اسے ہمیشہ کی طرح غیظ و غضب کی ردا اوڑھنی پڑی۔
''دس از نن آف یور بزنس۔ تمہیں کوئی ضرورت نہیں۔ میرے معاملے میں بولنے کی۔ کوئی حق نہیں مجھ سے سوال کرنے کا۔ اور نہ ہی میں تمہیں جواب دینے کا پابند ہوں۔'' do you get that؟ خشمگیں نظروں سے اس نے گھور کر اسے گویا وارننگ دی تھی۔
جس پر وہ تلملا کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
''اسٹاپ اِٹ زوی۔ آخر تم کیوں نہیں سمجھتے کہ تمہارا معاملہ صرف تمہارا نہیں۔ اس میں کہیں نہ کہیں میں بھی انوالو ہوں۔''
سنجیدہ لہجہ اور متفکر چہرہ..... شہرین گویا اسے جانے کا راستہ دینے کو تیار نہیں تھی۔ یقیناً وہ آج کچھ سوچ کر ہی آئی تھی۔
یہی وجہ تھی کہ آج زاویار کے سخت تیور بھی اسے نروس نہ کر سکے تھے۔
چند ثانیوں کے لیے وہ جیسے چپ سا رہ گیا۔
''ٹیک اینی اسٹیپ زوی۔ میں اس طرح مما اور پاپا کو ویٹنگ روم میں بیٹھا نہیں دیکھ سکتی۔ نہ چاہتے ہوئے

بھی ان کے لیے تکلیف کا سبب بن رہی ہوں میں۔ تمہارا اس طرح لاتعلق ہو کر بیٹھ جانا مسئلے کا حل نہیں۔ تم میرے ساتھ زندگی کا سفر طے کرنا نہیں چاہتے تو بھی تمہارے اعصاب پر سوار ہونا پسند نہیں کروں گی۔ لہٰذا فیس کرو۔ سامنا کرو۔ ہمیشہ کی طرح فرار کا راستہ نہیں اپناؤ۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ میرے فرمانبردار پیرنٹس آغا جان کے فیصلے کے باعث سالوں سر جھکا کر انتظار کر سکتے ہیں۔ لیکن میں نہیں۔ نہ میں مما، پاپا کو اس طرح پریشان دیکھ سکتی ہوں۔ نہ تمہارے فیصلے پر کبھی اپنی زندگی کو ایسے ضائع کر سکتی ہوں۔'' نپا تلا لہجہ حتمیت اور قطعیت سے بھرپور انداز۔

زاویار انصاری کو آج ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا شہرین مرزا نے۔

''لہٰذا میرے خیال میں تمہیں اب اپنا پارٹنر ڈھونڈ لینا چاہیے۔ ابھی مامی بھی یہی بات کر رہی تھیں۔ انہیں دُرِمکنون بہت اچھی لگی ہے مگر تمہارے انکار کے باعث وہ مجبوراً چپ ہو گئی ہیں۔ تم ان لائنز پر ایک بار پھر سوچو زوی۔ مجھے امید ہے آغا جان بھی مان جائیں گے۔ آخر کو ہماری فیملی کتنے سالوں سے جانتی ہے صوفیہ آنٹی اور زاہد انکل کو۔ آغا جان کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی شہریار ماموں کو۔''

زاویار کو اپنی جانب بنا کوئی تاثر دیے دیکھتے رہنے کے باعث وہ ذرا توقف سے پھر بولنے لگی تھی۔

''یوں بھی دُرِمکنون اب بالکل اکیلی رہ گئی ہے۔ میں نے تو مامی سے کہا ہے کہ اگر تم نہ مانو تو وہ مہران کے ساتھ رشتہ طے کر دیں اس کا۔ سوچ لو ابھی وقت ہے تمہارے پاس۔'' گہری نظریں زاویار سے کچھ کہہ رہی تھیں۔

مگر اس وقت وہ کچھ بھی سمجھنے کی کیفیت میں نہیں تھا۔

دُرِمکنون کا ذکر اور شہرین کے لہجے سے چھلکتی معنی خیزی، اس کے استفسار.....زاویار انصاری کو جیسے گنگ کر گئے تھے۔

خاص طور پر اس کے لبوں سے ادا ہونے والے آخری فقرے زاویار کی ذات میں جیسے تہلکہ مچا گئے تھے۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔ شہرین اس کی خود فراموشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں سے جا چکی تھی۔

کار اسٹارٹ ہونے کی آواز پر وہ جیسے خیالوں کی دنیا سے باہر نکلا تھا۔ شہرین ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی مشاقی سے کار کو ریورس کر کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔

جاتے، جاتے بس یونہی اس نے زاویار کی طرف نظر اٹھائی تھی اور نہ جانے زاویار کو ایسا کیوں لگا کہ شہرین کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''کیا واقعی یہ شہرین تھی؟ کیا وہ رو رہی تھی؟ مگر کیوں؟''

اس نے خود سے کئی سوال ایک ساتھ کر ڈالے اور اچانک اسے احساس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ اترنے لگی ہے۔ بائیں پہلو میں احساسِ بے بسی سے درد تیرتا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ اس درد کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نہ ہی کسی کو دل چیر کر دکھا سکتا تھا۔

وہ خالی الذہن سا اٹھ کر اندر جانے لگا تھا کہ کافی کے ساتھ ریفریشمنٹ کے کچھ لوازمات سے بھری ٹرالی دھکیلتی عاصمہ باہر نکلیں۔

''ارے تم کہاں جا رہے ہو۔ اور یہ شہری کدھر گئی؟''

''وہ واپس چلی گئی۔''

''تم نے پھر سے اسے کچھ کہا ہوگا۔ ہے ناں؟ ناراض کر دیا ہے ناں اس کو۔'' وہ اسے خفگی سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔ جواباً اس نے خاموشی سے ٹرالی میں دھرا کافی کا مگ اٹھایا اور چپ چاپ اندر کی جانب بڑھ گیا۔

شہرین کی کہی گئی ہر بات سے بڑھ کر دُرِمکنون کا نام مہران کے ساتھ لیا جانا۔ اسے جیسے اندر سے اُدھیڑ رہا تھا۔

تمہارا نام کسی اجنبی کے لب پر تھا
ذرا سی بات تھی دل کو مگر لگی ہے بہت

☆.....☆.....☆

شیرازی ولا میں یک دم سوگواریت اور پریشانی نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔لگتا ہی نہیں تھا کہ ابھی کچھ ہفتوں پہلے یہاں خوشی اور مسرتوں کا راج تھا۔

آصف کی پنڈلی کی ہڈی کا آپریشن کرنا پڑا تھا۔جس کے باعث سب بہت پریشان رہے مگر ڈاکٹرز نے بہت امید دلائی تھی اور علاج میں کوئی کسر نہیں رکھی جارہی تھی گزرتے وقت کے ساتھ اس کے بقیہ زخم بھی مندمل ہوگئے تھے۔

اظہار صاحب زیادہ لمبے عرصے کے لیے رک نہیں سکتے تھے لہٰذا انہوں نے جانے کا قصد کیا۔زارا ابھی بہن کو، ماں کو اس طرح چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی مگر مجبوری تھی بچوں کی پڑھائی کا بھی مسئلہ تھا۔چنانچہ بھاری دل سے رختِ سفر باندھا۔شارجہ واپس جانے سے پہلے ان لوگوں کا دو دن کے لیے لاہور آغا جان کے پاس جانے کا ارادہ تھا۔

عکرمہ نے ان سب کی سیٹیں ریزرو کروائی تھیں اور ٹکٹ کنفرم کرا کر اسے انسٹی ٹیوٹ سے سیدھا اسپتال ہی آنا تھا۔

زارا مع فیملی آصف سے ملنے وہاں جارہی تھی۔عکرمہ کو بھی وہیں آنے کا کہہ رکھا تھا۔

جس وقت وہ اسپتال پہنچا گویا پورا شیرازی ولا وہاں موجود تھا۔حتیٰ کہ دادی بھی ساتھ آئی ہوئی تھیں۔

''لے آئے بیٹا ٹکٹ۔'' دادی اسے کاریڈور میں ہی مل گئی تھیں۔

''جی دادی، لاہور کی ٹکٹیں لے آیا ہوں۔اور شارجہ کی بھی کنفرم کرادی ہیں۔اظہار بھائی کہاں ہیں، میں ذرا انہیں یہ ٹکٹیں پکڑا دوں۔'' اس کی متلاشی نظریں آصف کے کمرے میں اظہار صاحب کو ڈھونڈ کر دادی کی طرف پلٹ آئیں۔

''وہ کوئی گھنٹا ہوا کہیں گئے ہیں۔''

''کہاں؟'' اس نے بے ساختہ سوال کیا۔

ساتھ ہی رسٹ واچ پر نظر دوڑائی۔ان کی فلائٹ میں کم ہی ٹائم رہ گیا تھا۔

''پتا نہیں کہہ رہے تھے کہ ضروری کام ہے کسی کے پاس۔''

''کون سا ضروری کام؟ اس وقت گلٹس سب سے ضروری تھے اور وہ کام تو میں کر آیا ہوں۔'' اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''پتا نہیں بیٹا۔مگر اب تو آتے ہی ہوں گے اظہار میاں۔آدھے گھنٹے کا کہہ کر گئے تھے۔''

''زارا کہاں ہے؟''

''وہ وہاں اندر ہے۔''

''اکیلے گئے ہیں؟'' وہ متردد سا سوال کیے جارہا تھا۔

''ہاں بیٹا۔بچے ساتھ جانے کی ضد کررہے تھے مگر انہوں نے منع کردیا تھا۔پر تم اتنے پریشان کیوں ہو عکرمہ؟'' دادی اس کے چہرے پر پھیلتی تشویش دیکھ کر پریشان ہوگئی تھیں۔اسے خود پر کنٹرول کرنا ہی پڑا۔

''اظہار صاحب کہاں جاسکتے ہیں اس وقت.....؟'' اس کا دماغ گویا کوئی الارم بجا رہا تھا۔چھٹی حس اسے کسی متوقع حادثے کی خبر دے رہی تھی۔

''میں پریشان نہیں ہوں دادی۔سوچ رہا ہوں کہ کہیں یہ لوگ لیٹ نہ ہوجائیں۔فلائٹ مس بھی ہوسکتی ہے۔اظہار بھائی کو اس وقت کہیں جانا نہیں چاہیے تھا۔کراچی کی ٹریفک کا آپ کو پتا ہے۔انسان کہیں بھی stuck ہوجاتا ہے۔''

اس نے کسی خیال سے نکل کر دادی کو تسلی دی۔

اور پھر کمرے میں داخل ہو کر اس کی نگاہوں نے سب سے پہلے دُرِ مکنون کو ڈھونڈا تھا۔

''دُرِ مکنون کہاں ہیں؟''

سلام دعا سے فارغ ہوتے ہی اس نے آہستگی سے زوہا سے پوچھا تھا۔جو آصف کے بیڈ کے پاس پڑے

صوفے پر بیٹھی تھی۔
کمرے میں مصنوعی خوش گپیاں چل رہی تھیں۔ دل سب کے اداس تھے مگر آصف کے سامنے سب ہنستے مسکراتے رہتے تھے۔
''وہ گھر پر ہے۔ بہت کہا تھا ساتھ چلو۔ مگر مانی نہیں۔''
''ڈیم اٹ۔'' عکرمہ کا چہرہ انتہائی درجے کی تشویش کا اظہار کر رہا تھا۔
''کیا ہوا۔ سب خیریت ہے؟'' زوہا نے بھی ہلکی آواز میں استفسار کیا۔
فوری طور پر وہ کوئی جواب نہیں دے سکا اور لب بھینچ کر سوچنے لگا پھر یک دم جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر زوہا سے سوال کیا۔
''زوہا میرے ساتھ چل سکتی ہو؟''
''کہاں؟''
''گھر۔''
''ہاں۔ مگر کیوں۔'' وہ دونوں ہلکی آواز میں بات کر رہے تھے۔
زوہا نے حیرت اور تفکر بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔
''ان فیکٹ میرا ایک کولیگ آرہا ہے گھر پر آدھے گھنٹے میں۔ اس کے ساتھ اس کی مسز بھی ہوں گی۔ اس لیے پلیز تم میرے ساتھ چلو۔ مگر ٹائم نہیں ہے۔ فوراً اٹھو۔''
وہ ہتھیلی پر سرسوں جما رہا تھا۔ زوہا ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
پھر عکرمہ کو زارا اور بچوں سے الوداع کہنے میں کوئی تین چار منٹ لگ گئے اس دوران زوہا..... میمی اور دادی کو بتا کر اس کے ساتھ نکل آئی۔
وہ جتنی تیز رفتار سے ڈرائیو کر سکتا تھا کر کے گھر پہنچا تو واچ مین کے گیٹ کھولتے ہی اندر کی طرف لپکا۔
زوہا نے بڑی حیرت سے اسے اس طرح اندر کی جانب بڑھتا دیکھا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے، پیچھے اندر آئی تھی۔
نیچے لاؤنج خالی پڑا تھا۔
عکرمہ نے دُرِ مکنون کو آواز دے ڈالی۔ مگر جواب ندارد تھا۔
دوپہر میں اس ٹائم پر عموماً گھر میں کام کرنے والے نوکر بھی شیرازی ولا کے عقب میں بنے کوارٹرز میں چلے جاتے تھے۔ جنہیں کچھ عرصہ ہوا دوبارہ کھلوالیا گیا تھا۔ ورنہ تین سال سے دُرِ مکنون کی بدولت وہاں کے مکین تو کب کے سدھار چکے تھے۔
''شاید سو رہی ہے وہ۔ تمہیں چائے پینی ہے تو میں بنا دیتی ہوں۔'' سوئے ہوئے سنی کو وہیں صوفے پر لٹاتے ہوئے زوہا نے کہا تھا۔ جسے ان سنی کرتے ہوئے وہ اوپر کی جانب بڑھا۔
مگر سیڑھیوں پر جس چیز نے اس کی توجہ کو جکڑ لیا وہ تھا سبز کا ہی رنگ کا دوپٹا جو کہ دو تین سیڑھیوں پر کچھ اس طرح بکھرا پڑا تھا جیسے کسی کے گھسیٹنے کے باعث شانوں سے گرا ہو۔
عکرمہ کے دل کی دھڑکن اس لمحے یک دم کچھ تیز ہوئی تھی۔ وہ تین چار سیڑھیاں پھلانگ کر جس وقت اوپر آیا۔ دادی کے کمرے کے پاس دُرِ مکنون کی ایک چپل اور کچھ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کا کانچ بکھرا دکھائی دیا۔ سبز کا ہی رنگ کا دوپٹا بھی دُرِ مکنون کا تھا اور اب یہ چوڑیاں اور چپل بھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ اتنی گہرائی سے چیزوں کا مشاہدہ نہیں کرتا۔ مگر اس لمحے اس کا دل جیسے کسی ناگہانی... کسی انہونی کا پتا دے رہا تھا۔
اس نے بے تابی سے بڑھ کر دادی کے کمرے کا دروازہ بجا ڈالا۔

(جاری ہے)

''باجی امی مرگئیں!'' چھ دہائیاں گزر جانے کے باوجود چھوٹے بھائی عابد علی کے ان الفاظ کی بازگشت اکثر میری آنکھیں نم کر دیتی ہے۔

وہ خونچکاں صبح میں بھلا کیسے بُھلا سکتی ہوں۔ روزانہ کی طرح میں اور مجھ سے بڑے بھائی زاہد اور چھوٹی بہن عاتکہ اسکول چلے گئے تھے۔ امی کی طبیعت خراب تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ مرنے کا اندیشہ ہوتا۔ ہمارے جانے کے بعد ابو بھی حسبِ معمول دفتر چلے گئے تھے۔ امی کے پاس صرف عابد تھا۔ ہم بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا۔ اس کی عمر اس وقت چار

ترجیح کا سفر

ناہید سلطانہ اختر

ساڑھے چار سال کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ دن چڑھے امی کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو انہوں نے ہمسائی کو جنہیں ہم ''برابر والی خالہ'' کہا کرتے تھے خود پکار کر بلایا۔ وہ آئیں تو ان سے کہا۔ ''میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ کچھ دیر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔'' وہ بیٹھ گئیں اور امی پلنگ پر لیٹ گئیں۔ کلمہ پڑھا اور ختم!

ابو ہم بھائی بہنوں کو اسکول سے لے جانے کے لیے خود آئے۔ مجھے آج بھی یاد ہے جب مجھے بستے سمیت بڑی آپا کے دفتر میں بلایا گیا تو وہاں ابو میرے بڑے بھائی زاہد کے ساتھ جنہیں ہم چھوٹے بھائی بہن بھائی صاحب کہا کرتے تھے موجود تھے۔ ابو بہت رنجیدہ تھے۔ بھائی صاحب کا بستہ ان کے کندھے پر لٹکا ہوا تھا اور وہ دونوں ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں رگڑ رہے تھے۔ بڑی آپا اپنی کرسی سے اٹھیں اور انہوں نے میرے نزدیک آکر میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ابو تمہیں لے جانے کے لیے آئے ہیں۔'' میں تو پہلے ہی ابو کو بڑی آپا کے دفتر میں دیکھ کر چونکی ہوئی تھی۔ میں نے ابو کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ابو نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''ابو کو حوصلہ دو۔'' بڑی آپا نے مجھے پیار سے چمکارا اور بولیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ بھائی صاحب کی طرف دیکھا تو احساس ہوا کہ وہ رو رہے تھے۔ ابو پلٹے اور مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔

''کیا ہوا ابو؟'' میں نے پوچھا۔

''بیٹا! تمہاری امی چلی گئیں۔'' ابو نے کہا۔

''کہاں؟'' میں حیران ہوئی۔

''اللہ میاں کے پاس۔''

میں اس وقت چوتھی جماعت میں تھی آٹھ نو سال کی بچی کے لیے آئندہ مشکلات کا اندازہ کرنا محال تھا۔

ابو ہمیں ساتھ لے کر گھر پہنچے تو گھر عزیزوں اور ملنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہمارا سب سے چھوٹا بھائی عابد پیش آمدہ طوفان کی شدت سے بے نیاز گھر کے صحن میں محلے کے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ہم تینوں بھائی بہنوں کو دیکھ کر وہ اپنا کھیل چھوڑ کر ہماری طرف لپکا۔

''باجی امی مر گئیں۔'' اس نے نہایت معصومیت سے مجھ سے کہا۔

امی کا یوں اچانک زندگی کے منظر سے نکل جانا کتنا بڑا سانحہ تھا۔ اس کا اندازہ ہمیں وقت گزرنے کے ساتھ بتدریج ہوا۔

چند دن تو گھر میں میلہ سا لگا رہا۔ ایک آتا ایک جاتا۔ عزیز، رشتے دار، ابو کے دوست، احباب، محلے دار اور ملنے جلنے والے آتے، پرسا دیتے، ابو کو دلاسا دیتے ہم بہن بھائیوں کو گلے لگاتے۔ سر پر ہاتھ دھرتے۔ چمکارتے، پیار کرتے۔ ابو کا خیال رکھنے کی نصیحت کرتے اور چلے جاتے پھر یہ میلہ چھٹنا شروع ہوا۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کی تعداد کم ہوتے، ہوتے برائے نام رہ گئی۔

ابو اور ہم بچوں کا امتحان شروع ہو گیا۔

ابو دفتر جانے لگے اور ہم بھائی بہن اپنے اسکول۔ عابد برابر والی خالہ کے ہاں رہتا۔ ہم بہن بھائی اسکول سے گھر واپس آجاتے تو عابد بھی اپنے گھر آجاتا۔

''امی کب آئیں گی؟'' معصوم تھا شروع میں اس نے کئی مرتبہ پوچھا۔

''امی اب نہیں آئیں گی۔'' بھائی صاحب اسے سمجھاتے۔

''کیوں؟''

''کیونکہ وہ اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں..... اللہ میاں کے پاس جانے والے لوگ واپس نہیں آتے۔''

''مجھے بھی جانا ہے اللہ میاں کے پاس۔''

''بری بات! ایسی بات نہیں کرتے۔''

''تو امی جو ہیں اُدھر؟'' عابد ٹھنکتا۔

''بیٹا! ہم سب ایک دن اللہ میاں کے پاس جائیں گے مگر اپنی اپنی باری پر..... تم ابھی چھوٹے ہو تم نہیں جا سکتے۔'' ایک روز ابو نے عابد کو سمجھایا۔

''آپ تو بڑے ہو..... آپ تو جا سکتے ہو ناں اللہ میاں کے پاس۔'' عابد نہایت معصومیت سے بولا۔

''بکواس مت کرو۔'' میں نے عابد کو ڈانٹا۔ امی کا جانا ہی میرے لیے ایسا روح فرسا سانحہ تھا کہ میں دل ہی دل میں چپکے، چپکے اللہ میاں سے یہ دعا کیے جاتی کہ اب گھر کے افراد میں سے ہم کسی کو نہ کھوئیں..... موت انسان کو کتنا خوف زدہ کر دیتی ہے۔

☆☆☆

امی کے بعد زندگی نہایت کٹھن ہوگئی۔ میں آٹھ نو برس کی تھی اور بھائی صاحب مجھ سے ایک سال بڑے۔ عائلہ مجھ سے دو سال چھوٹی تھی اور عابد تو ہم سب کا کھلونا تھا جیسے۔ ابو دفتر سے آنے کے بعد کھانا پکاتے اور شام کو ہم سب کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے۔ بچا ہوا کھانا اگلے دن اسکول سے آنے کے بعد ہمارے پیٹ بھرنے کے کام آتا۔ صبح ناشتے میں ابو ہمیں تازہ پراٹھوں اور چائے کا ناشتا کرواتے۔ بھائی صاحب اور میں اسکول سے آنے کے بعد گھر میں جھاڑو دیتے، برتن دھوتے، کپڑے بھی دھو لیتے البتہ بستر کی چادریں وغیرہ چھٹی والے دن ابو اپنے میلے کپڑوں کے ساتھ دھوتے کیونکہ بڑے کپڑے دھونے میں ہم سے سنبھلتے نہیں تھے۔ چھٹی والے دن ابو ہم بہن بھائیوں کو خصوصی کھانا پکا کر کھلاتے کبھی پلاؤ، کبھی بریانی، کبھی حلوا کبھی دودھ سوّیاں۔ کبھی کبھار ابو ہم چاروں بہن بھائیوں کو کسی ہوٹل میں کھانا کھلانے کے لیے بھی لے جاتے۔ کوئی بڑا ہوٹل نہیں چھوٹے سے ہوٹل میں۔ کیونکہ ابو کوئی امیر آدمی نہیں تھے۔ بس گزارے لائق آمدن تھی۔ امی کی زندگی میں تو ہم نے کبھی جھوٹ موٹ بھی ہوٹل کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ امی کے بعد ابو ہمارے چھوٹے، چھوٹے دلوں پر لگے بھاری صدمے کی چوٹ کی شدت کم کرنے کے لیے ہمیں اپنے قلیل وسائل کے باوجود کبھی کبھار گھمانے پھرانے اور باہر کھانا کھلانے کے لیے لے جانے لگے تھے۔

کچھ عرصہ معاملات یوں ہی چلے پھر عزیزوں، رشتے داروں اور احباب و اقارب نے ابو کو دوسری شادی کا مشورہ دینا شروع کر دیا مگر ابو نے اس قسم کے مشوروں پر نہ صرف کان نہ دھرا بلکہ بعض اوقات برا بھی منایا۔ ابو کا کہنا تھا کہ وہ ہمیں سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر نہیں ڈالیں گے۔ ہماری خاطر ابو نے اپنا گھر کرایے پر اٹھایا اور اپنے دفتر کے نزدیک ہی دوسرا مکان کرایے پر لے لیا اور ہمیں پرانے اسکولوں سے اٹھا کر گھر کے نزدیک ہی نئے اسکولوں میں داخل کرا دیا۔ عابد بھی اسکول جانے لگا تھا۔ میں اور عائلہ لڑکیوں کے اسکول میں تھیں۔ بھائی اور عابد لڑکوں کے اسکول میں۔ ابو کا دفتر اور گھر نزدیک ہونے کا فائدہ یہ ہوا کہ دفتر میں کھانے اور نماز کے وقفے کے دوران ابو گھر آجاتے اور ہمیں دوپہر کو بھی تازہ کھانا ملنے لگا۔ کبھی ابو جلدی سے کوئی سبزی بھون لیتے کبھی دفتر سے گھر آتے ہوئے نہاری لے آتے۔ چپاتیاں گرم، گرم توے پر سے اتارتے اور ہم بہن بھائی مٹی کے تیل کے چولھے کے آس پاس بیٹھے ابو کے ہاتھ کی پکی گرم، گرم چپاتیاں کھائے جاتے۔

موسم سرما شروع ہونے سے قبل ابو نے پرانے لحاف، گدے ٹرنک سے نکال کر اُدھیڑے۔ انہیں دھویا، دوبارہ بھرائی کرائی اور ایک اجرتی عورت کو بلا کر اس سے لحاف گدوں میں ڈورے ڈلوائے۔ عورت کو ہم بچوں سے پتا چلا کہ ہماری ماں مر چکی تھیں۔ ''بھائی جی! بڑی ہمت ہے جو تم عورت کے بغیر چار بچوں کو سنبھال رہے ہو۔'' اس نے ابو سے کہا۔ مجھے آج بھی اس عورت کو ابو کا جواب یاد ہے۔

''ہمت میرے بچوں نے کی ہے جو ماں کے بغیر صبر سے وقت گزار رہے ہیں۔'' ابو نے کہا۔ عورت نے ابو کو دوسری شادی کا مشورہ دیا تو ابو بولے۔

''بی بی! جس کام کے لیے آئی ہو کام کرو، پیسے لو اور جاؤ۔''

ہماری خاطر ابو نے باقی ساری زندگی مجرد گزاری اور کبھی نہ ہمیں اپنا یہ احسان جتایا نہ ہی یہ ظاہر کیا کہ انہیں اپنے اس فیصلے پر کوئی پچھتاوا تھا۔

☆☆☆

امی کی موت نے ہم بہن بھائیوں کی باہمی محبت کو غیر معمولی احساسِ وابستگی میں منسلک کر دیا۔ بھائی صاحب اور میں ایک دم جیسے بہت بڑے ہو گئے۔ عاتکہ اور عابد کے ساتھ ہم بزرگانہ اور مشفقانہ رویہ رکھتے جیسے ماں باپ اپنے بچوں کے ساتھ رکھتے ہیں۔ ہم ان کی چھوٹی، چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھتے۔ انہیں بہلائے رکھنے کی کوشش کرتے۔ بھائی صاحب اور میں ابو کی طرف سے کبھی کبھار ملنے والے جیب خرچ کو اپنے بجائے انہی دونوں پر خرچ کر دیتے۔ ہمیں ابو کے مسائل کا بھی احساس تھا۔ بیچارے امی کے بعد بہت اداس اور تھکے، تھکے نظر آنے لگے تھے۔ ہمیں خوش رکھنے کو ابو ہر جتن کرتے۔ دفتر سے آنے کے بعد وہ تمام وقت گھر کے کاموں میں لگے رہتے ہمیں ابو پر بہت ترس آتا۔ اگرچہ خود ہم نے بھی بہت سے گھریلو کام سنبھال لیے تھے مگر وہ بات تو نہیں تھی جو امی کے زمانے میں ہوتی تھی۔

ایک روز بھائی صاحب اور میں نے نہایت سنجیدگی سے فیصلہ کیا کہ ابو کی دوسری شادی کروا دی جائے۔ ہم نے اپنی خالہ سے بات کی تو انہوں نے کہا۔

''تم لوگ اپنے ابو کو راضی کر لو۔ ان کی شادی کروانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ میں کروا دوں گی۔ خالہ کو اور ہمیں بھی معلوم تھا کہ ابو دوسری شادی سے انکار کرتے ہیں مگر ہم نے پھر بھی ابو سے بات کی۔

''تم لوگوں کو کوئی مسئلہ ہے؟'' ابو نے ہماری بات سن کر کہا۔

''نہیں ابو جی۔'' ہم ڈرے سہمے سے تھے۔

''تو پھر؟''

''آپ کو اتنے سارے کام جو کرنے پڑتے ہیں۔'' بھائی صاحب بولے۔

''تو؟''

''آپ تھک جاتے ہیں۔''

''کس نے کہا؟''

ابو کے اس سوال کا جواب نہ بھائی صاحب کے پاس تھا نہ میرے پاس۔

''اپنے بچوں کے لیے کام کر کے بھی کوئی تھکتا ہے۔'' ابو نے کہا۔

''ابو جی پلیز!'' بھائی صاحب کے اشارے پر میں گھگیائی۔

''دیکھو بیٹا..... سارا نظام ٹھیک چل رہا ہے..... اسے ایسے ہی چلنے دو، میں اسی طرح خوش ہوں۔'' ابو نے کہا۔

بھائی صاحب اور میں نے ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھا۔

''اور ہاں آئندہ مجھ سے یہ بات نہ کرنا۔'' ابو کے لہجے میں ناپسندیدگی جھلک رہی تھی۔ ''ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا..... بات کرنا چھوڑ دوں گا تم لوگوں سے۔''

ہم اپنے ابو کے مزاج سے واقف تھے۔ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ غصہ انہیں بہت کم آتا۔ دوسروں کی غلطیوں کو اکثر درگزر کر دیتے۔ کوئی بات ناپسند ہوتی تو ان کے لہجے میں ویسی ہی ناگواری جھلکتی جیسی کہ اس وقت ہمیں تنبیہہ کرتے وقت تھی۔ ہم نے دوبارہ ابو سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی کیونکہ ان کی ناراضی کا اندیشہ تھا۔

☆☆☆

وقت اچھا ہو یا برا، سہل ہو یا کٹھن گزر ہی جاتا ہے۔ ہمارے دن بھی گزر ہی گئے۔ ابو نے بہت مشکلات اٹھائیں۔ مگر ہم پر سوتیلی ماں نہیں لائے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ساری سوتیلی مائیں بری ہوتی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے ابو شادی کرتے تو ہمیں کوئی اچھی سوتیلی ماں ہی مل جاتی مگر ابو نے ہماری خاطر شادی نہیں کی۔ ان کے بالوں میں سفیدی آ چکی تھی۔ بھائی صاحب اور میں اپنی تعلیم کے آخری مراحل میں تھے۔ عاتکہ اور عابد بھی پڑھ رہے تھے۔ ہم نے بھی ابو کو مایوس نہیں کیا تھا۔ ابو سے محبت کی جڑیں ہمارے رگ و پے میں بہت گہرائی تک اتر گئی تھیں۔ ہم ان کا بھرپور

احترام کرتے۔ ان کی ذرا سی تکلیف ہمیں انتہائی پریشانی سے دوچار کر دیتی۔ ابو کبھی معمولی سا بھی بیمار ہوتے تو ہمیں اپنی دنیا اندھیر ہوتی محسوس ہوتی۔

ہم بھائی بہنوں میں آپس میں بھی بہت پیار تھا۔ میں، بھائی صاحب کو اپنا بھائی ہی نہیں دوست، سہیلی، رازداں سمجھتی۔ بھائی صاحب میری ہر بات ماننے کو تیار رہتے عاتکہ میرے آگے پیچھے پھرتی۔ عابد، عاتکہ کو نہ دیکھتا تو پریشان ہو جاتا۔ باہر سے گھر میں داخل ہوتے ہی دونوں کی پہلی صدا ''باجی'' ہوتی۔ اس صدا کا جواب نہ ملتا یا جواب دینے میں دیر ہو جاتی تو عاتکہ اور عابد گھر بھر میں صدائیں لگاتے پھرتے۔ ''باجی کہاں ہو؟'' کبھی، کبھی میں جانتے بوجھتے جواب نہ دیتی۔ وہ پریشان ہو جاتے۔ عاتکہ کی آواز بھرا جاتی۔

''کیا ہے؟'' میں کسی کونے کھدرے سے مسکراتی ہوئی نکلتی۔

''کہاں تھیں؟''

''یہیں گھر میں اور کہاں۔''

''ہم تو پریشان ہو گئے تھے۔''

''کیوں؟ کسی روز امی کی طرح میں بھی مر گئی تو؟'' میں انہیں پیار سے دیکھتی۔

''اللہ نہ کرے۔'' عاتکہ سہم کر مجھ سے لپٹ جاتی۔

''مرنے کی بات نہ کیا کرو باجی۔'' عابد کہتا۔

''کیوں بھئی؟''

''مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''کس سے؟''

''گھر میں کسی کے مرنے سے۔''

''مرنے سے کیا ڈرنا..... مرنا تو ہے ہر کسی کو ایک نہ ایک دن۔''

''پلیز! ایسی باتیں نہ کیا کریں۔''

''اچھا بابا۔''

امی کی موت نے میرے چھوٹے بھائی، بہن کو بہت خوف زدہ کر دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ موت سے مجھے بھی ڈر لگتا تھا۔ میں دل ہی دل میں ابو اور اپنے بہن بھائیوں کی درازیٔ عمر اور عافیت کے لیے دعا گو رہتی۔ سخت حالات سے گزرنے کے باوجود میں نہایت آرٹسٹک تھی۔ مجھے بچے، پھول، تتلیاں اور رنگ اچھے لگتے۔ میری ڈرائنگ بہت اچھی تھی۔ اچھی موسیقی مجھے بھاتی۔ پرانے گائیکوں کے گانے مجھے مسحور کر دیتے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ہمارے گھر میں ان دنوں فقط ایک ریڈیو ہوا کرتا تھا اور وہ بھی پرانی وضع کا۔

اب یہ بتانا نا گزیر ہے کہ میں زمانۂ حال میں اپنی عمر کے سات عشرے مکمل کرنے میں صرف چند ماہ دور ہوں۔

ان دنوں جب میں اپنے گھر میں پرانی وضع کے ایک ریڈیو سیٹ کی موجودگی کا ذکر کر رہی تھی میری عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ گھر میں موجود ریڈیو سیٹ ہی میرے ذوق وشوق موسیقی کو تسکین فراہم کرتا۔ میں ریڈیو کی سوئی گھما، گھما کر اسٹیشن بدلتی اور گانے سنتی۔ میرا جی چاہتا اپنی پسند کے گانے بار، بار سنتی رہوں۔

انہی دنوں مجھے عابد کی زبانی معلوم ہوا کہ ہمارے پڑوس میں رہنے والی ایک اینگلو انڈین لیڈی اپنے گھر کا کچھ سامان فروخت کر رہی تھی اور اس برائے فروخت سامان میں ایک گراموفون بھی شامل تھا۔

''باجی! گراموفون تم خرید لو..... تمہیں بار، بار ریڈیو کا اسٹیشن بدلنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔'' عابد نے مجھے للچانے کی کوشش کی۔

''کتنے کا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ مجھے نہیں معلوم..... تم لیڈی کے گھر جا کر خود پوچھ لو۔ ویسے میرا دوست بتا رہا تھا گراموفون ہے مزیدار..... بالکل نیا جیسا..... اور گراموفون کے ساتھ لیڈی ڈھیر سارے ریکارڈ بھی دے گی۔''

''اچھا۔'' میرا اشتیاق بڑھا۔

''میں تو کہتا ہوں لے لو..... ہم بھی سنا کریں گے۔''

''دیکھتے ہیں۔''

میں نے بھائی صاحب کو بتایا۔

بھائی صاحب ان دنوں اپنی تعلیم مکمل کر کے ایک دفتر میں نئے، نئے نوکر ہوئے تھے پہلی تنخواہ بھی نہیں ملی تھی

مگر میں نے اپنی گولک میں کچھ رقم جوڑ رکھی تھی۔ میں نے بھائی صاحب کو اپنی اینگلو انڈین محلے دار کے گھر جا کر گراموفون کا معائنہ اور قیمت معلوم کرنے پر آمادہ کرلیا۔

گراموفون واقعی اچھا تھا۔ بالکل نیا جیسا اور اس کے ساتھ ڈھیروں ریکارڈز بھی تھے۔ لیڈی نے ہمیں شیشم کی میز پر رکھا گراموفون چلا کر بھی دکھایا۔ گراموفون کے سنہری بھونپو اور سوئی تلے گھومتے ریکارڈ سے نکلتی مدھر آواز نے میرے دل کو پکڑ لیا۔

''بھائی صاحب قیمت پوچھیں۔'' میں نے کہا۔

لیڈی نے جو قیمت بتائی وہ میری سوچ سے زیادہ اور گولک میں جمع میری جمع پونجی کی رسائی سے باہر تھی۔ ابو سے ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے۔

''کوئی بات نہیں عالیہ..... میری تنخواہ ملے گی تو کوئی دوسرا دیکھ لیں گے۔ گراموفون تو بکتے ہی رہتے ہیں۔'' بھائی صاحب نے میرا دل رکھنے کو کہا۔

''بھائی صاحب ایسا ہی سنہری بھونپو والا۔'' میں لیڈی کا گراموفون نہ خرید سکنے پر ملول ہو رہی تھی۔

''ہاں، ہاں..... ان شاء اللہ ایسا ہی۔'' بھائی صاحب نے مجھے اطمینان دلایا۔

کافی دن تک سنہری بھونپو والا وہ گراموفون میری آنکھوں میں گھومتا رہا اور سوئی کے نیچے گھومتے ریکارڈ کی آواز میری سماعت کو گرماتی رہی۔

بھائی صاحب کی پہلی، دوسری، تیسری تنخواہ بھی مل گئی۔ مگر ویسا کوئی برائے فروخت گراموفون ہمارے علم میں نہ آیا۔ میں نے اپنی خواہش کو تھپک، تھپک کر سلا دیا اور بھائی صاحب بھی شاید بھول گئے مگر نہیں، وہ بھولے نہیں تھے۔

☆☆☆

تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں درس و تدریس سے وابستہ ہوگئی۔ عاتکہ ابھی پڑھ رہی تھی۔ ابو میری شادی کر دینا چاہتے تھے اور میں شادی کے بعد ابو اور بہن بھائیوں سے دور ہو جانے کے خوف میں مبتلا تھی۔ شادی سے انکار کرکے میں ابو کو خفا بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کتنی قربانی دی تھی انہوں نے ہم سب کے لیے۔ بھلا کوئی مرد اپنے بچوں کے لیے یوں اپنی زندگی لٹاتا ہے۔ ابو کی تنہا گزاری شاموں کا عکس ان کی اداس آنکھوں میں ڈولتا تھا۔ میں ساری زندگی شادی کیے بغیر ابو اور اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی مگر ابو کی خواہش مجھے ان سے کچھ کہنے سننے کی اجازت نہ دیتی۔

ابو نے میرے لیے رشتہ بھی تلاش کرلیا۔ ظفر، ابو کی پھوپی زاد بہن کے بیٹے تھے۔ دو ہی بھائی تھے۔ ظفر چھوٹے تھے۔ فخر بھائی ان سے بڑے۔ فخر بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ ظفر سرکاری افسر تھے۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ بڑے بھائی ان کے سرپرست تھے۔ ابو کے کسی رشتے دار کے توسط سے میرے لیے ظفر کا رشتہ آیا۔ ابو نے مجھے اور بھائی صاحب کو اپنے سامنے بٹھا کر براہ راست بات کی۔

''لڑکا اچھا ہے، سب سے بڑی بات یہ کہ خاندان کا ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ برسرِ روزگار ہے۔ کراچی میں سرکاری بنگلا ملا ہوا ہے۔ کراچی کی کسی اسکیم میں پلاٹ بھی بک کرا رکھا ہے۔ اپنا گھر بھی بنا لے گا..... کیا مرضی ہے تم لوگوں کی؟''

بھائی صاحب نے کن انکھیوں سے مجھے اور میں نے بھائی صاحب کو دیکھا۔

''آپ دیکھ لیں ابو۔'' بھائی صاحب بولے۔

''ہاں بیٹا تم کیا کہتی ہو؟'' ابو نے مجھ سے پوچھا۔

میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''کیا ہوا؟'' ابو چونکے۔

''میں آپ لوگوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''بیٹا! جانا پڑتا ہے، بیٹیوں کو ایک نہ ایک دن ماں، باپ کا گھر چھوڑ کر اپنے اصلی گھر جانا پڑتا ہے..... باپ کے گھر تو بیٹیاں مہمان ہوتی ہیں۔ میں اکیلا ہوں بیٹے..... میری خواہش ہے کہ تم اور تمہارے بعد عاتکہ بھی اپنے گھر کی ہو جائے اور تمہارے بھائی کا گھر بھی آباد ہو جائے..... عابد کو یہ خود سنبھال لیں گے..... اگر

میں نہ بھی رہا تو..... کیوں زاہد میاں سنبھال لو گے ناں چھوٹے بھائی کو؟'' ابو نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا۔

''خدا آپ کو بہت لمبی عمر دے ابو..... آپ تو ہمارے باپ بھی ہیں ماں بھی۔'' بھائی صاحب بولے۔

''رشتہ ہر اعتبار سے مناسب ہے..... میں ہاں کر رہا ہوں۔'' ابو نے کہا۔

''ابو پلیز! ہاں مت کریں..... میں..... میں آپ سے..... اپنے بہن بھائیوں سے جدا نہیں ہو سکتی۔'' میں نے تڑپ کر ابو کو دیکھا۔

''کون کہہ رہا ہے جدا ہونے کو۔''

''کراچی بہت دور ہے لاہور سے۔'' میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''کوئی دور نہیں..... رات کو ریل میں سوار ہوا کرو گی اگلے دن لاہور.....''

''ابو میں تو ایک دن کے لیے بھی دور نہیں جانا چاہتی۔''

''مجھے آسانی دو بیٹا۔'' ابو نے اتنی عاجزی سے کہا کہ میں مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ جھٹ پٹ رشتہ طے ہوا اور شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔ ابو، بھائی صاحب، عاتکہ، عابد..... میں کس، کس کی جدائی سہہ سکتی تھی۔ بھائی صاحب تو میرے بھائی ہی نہیں دوست، سہیلی، رازداں سبھی کچھ تھے۔ بھائی صاحب کی آنکھیں چغلی کھاتیں کہ وہ بھی اداس تھے۔

''آپا! بہت یاد آیا کرو گی۔'' عاتکہ بار، بار کہتی۔

''سر میں تیل لگا دو آپا پھر تو تم چلی ہی جاؤ گی۔'' عابد، میرا چھوٹا بھائی اپنا سر میرے زانو پر رکھ کر لیٹ جاتا۔ مجھے دل ہی دل میں خود پر غصہ آتا کہ میں نے ابو کی عاجزی کے سامنے سپر کیوں ڈال دی تھی۔ مجھے اڑ جانا چاہیے تھا۔ ثابت قدمی دکھانی چاہیے تھی۔ خواہ مخواہ پسپائی اختیار کر لی۔ مجھے انکار کر دینا چاہیے تھا..... کم از کم اس رشتے سے تو بہر صورت..... کراچی سے لاہور آنا جانا کوئی مذاق تو نہیں تھا۔

میں دل ہی دل میں ظفر کے مرنے کی دعائیں مانگنے لگی۔ یہی ایک صورت تھی اس مصیبت سے پیچھا چھوٹنے کی۔

''عالیہ! تم چلی جاؤ گی تو مجھے تمہارے پھلکے بہت یاد آیا کریں گے۔'' ایک روز جب میں بھائی صاحب کے لیے توے سے گرم، گرم پھلکا اتار رہی تھی۔ بھائی صاحب بولے۔

''اللہ کرے وہ مر ہی جائیں۔'' میں نے..... بے ساختہ کہا۔

''کون؟'' بھائی صاحب چونکے۔

''وہی..... جن کے ساتھ ابو مجھے کراچی بھیجنے کی تیاریوں میں لگے ہیں۔''

''ایسا مت کہو.....'' بھائی صاحب بولے۔

''کیوں نہ کہوں..... اس شخص کی وجہ سے مجھے ابو سے اور آپ سے دور جانا پڑ رہا ہے..... کیوں نہ کہوں میں ایسا۔'' میں بھڑک اٹھی۔

''کبھی تم آ جایا کرنا..... کبھی ہم آ جایا کریں گے تمہارے پاس۔''

''اللہ کرے وہ مر ہی جائے۔''

''ابو نے سن لیا تو بہت ناراض ہوں گے۔''

''میں جو پریشان رہتی ہوں ہر وقت۔'' میں روہانسی ہو گئی۔

''امی ہوتیں تو شاید تم پریشان نہ ہوتیں۔'' بھائی صاحب بولے۔

بھائی صاحب کی یہ بات ٹھیک ہی تھی شاید..... امی کی موت نے ہم بھائی بہنوں کو محبت کی ایسی زنجیر میں باندھ دیا تھا کہ ہمارے درمیان عام بھائی بہنوں والی محبت نہ تھی۔ ہماری جانیں ایک دوسرے کی جان میں اٹک گئی تھیں۔ امی کی موت نے ہم بھائی بہنوں کی محبت کو نارمل نہیں رہنے دیا تھا ابنارمل کر دیا تھا۔

شادی ہو گئی اور میں رو، رو کر سچائی آنکھوں کے ساتھ ظفر کے ہمراہ لاہور سے کراچی آ گئی۔ بارات اور ولیمہ دونوں تقریبات لاہور ہی میں منعقد ہو چکی تھیں۔

کراچی میں میرا ذرا دل نہ لگتا۔ ظفر سے ذرا انس محسوس نہ ہوتا۔ ان کا سرکاری بنگلا مجھے بھوت بنگلا

لگتا۔ میں بولائی، بولائی رہتی۔ ظفر کے پاس فوکسی تھی جس میں وہ دفتر آتے جاتے اور شام کو دفتر سے گھر واپسی کے بعد اکثر مجھے اسی گاڑی میں اپنے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بٹھا کر کبھی اپنے بھائی کے گھر لے جاتے کبھی کسی دوست کے ہاں اور کبھی باہر گھمانے پھرانے۔ میرے علاوہ ظفر پر اور کسی کی کفالت کی ذمے داری نہ تھی لہٰذا میرے کہے بغیر وہ کھلے ہاتھ سے مجھے کھلاتے پلاتے اور نت نئی چیزیں خرید واتے۔

''مجھے نہیں چاہیے۔'' میں منع کرتی۔

''نہیں، نہیں..... لے لو۔'' وہ کہتے۔

عائشہ کے خط سے مجھے معلوم ہوا کہ بھائی صاحب بہت اداس رہنے لگے تھے اور کبھی کبھی میرا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو بھی آجاتے تھے۔ میں نے خوب گڑگڑا کر اللہ میاں سے ظفر کے لیے بددعا کی۔

''اللہ کرے یہ آدمی مرجائے تاکہ میں ہمیشہ کے لیے اپنے بہن بھائیوں کے پاس واپس جاسکوں۔'' میری بددعا خدا جانے کہاں اٹک کر رہ گئی۔

مجھے ظفر کے ساتھ ان کی فوکسی سے بھی نفرت محسوس ہونے لگی جس میں مجھے بادلِ ناخواستہ ان کے ساتھ بیٹھ کر جانا پڑتا تھا۔

''اللہ میاں! اتنا تو کریں کہ اس شخص کی اس منحوس گاڑی میں ہی کسی روز آگ لگ جائے..... اتنا تو آپ کر سکتے ہیں ناں۔'' میں نے اللہ میاں سے کہا۔ میں نہیں جانتی کہ اس بددعا سے میرا کون سا مقصد پورا ہونا تھا..... شاید دشمن کا دوست بھی دشمن دکھنے والی کوئی بات تھی..... اپنی اس گاڑی کا ظفر بہت خیال رکھتے تھے۔ چھٹی والے دن اسے دھوتے، کپڑا پھیر، پھیر کر اسے چمکاتے اور کہتے۔ ''یہ گاڑی میری دوست ہے۔''

بہرحال ہوا یہ کہ ایک روز جب ظفر دفتر جاتے ہوئے راستے میں پیٹرول پمپ سے گاڑی میں پیٹرول ڈلوا رہے تھے نہ جانے کیونکر گاڑی میں آگ لگ گئی اور چمکتی دمکتی گاڑی شعلوں کی نذر ہو کر سیاہ آہنی ڈھانچا بن گئی۔ ظفر دفتر جانے کے بجائے خلافِ معمول جلدی گھر واپس آگئے، ان کا چہرہ خاصا اترا ہوا تھا۔ میرے پوچھے بنا انہوں نے ازخود بتایا۔ ''آج گاڑی میں پیٹرول ڈلواتے ہوئے نہ جانے کیسے آگ لگ گئی۔ پیٹرول پمپ والوں کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بڑی مشکل سے گاڑی کو کھینچ کر دور ہٹایا ورنہ ان کا بھی بہت نقصان ہو جاتا۔ خیر ہماری گاڑی پر ہی بلا ٹلی..... لیا دیا کام آگیا۔'' میں نے دل میں سوچا ظفر کی گاڑی کو آگ لگ جانے سے مجھے کیا فائدہ ہوا..... جواب صفر تھا۔

میرے بعد بھائی صاحب کا بھی لاہور میں دل نہ لگا۔ انہوں نے اپنا تبادلہ کرایا اور کراچی آگئے۔ مجھے یک گونہ خوشی ہوئی۔ ظفر نے بھی نہایت مسرت کا اظہار کیا۔ اتنے عرصے میں اتنا تو مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ ظفر بنیادی طور پر ایک شریف النفس اور نیک فطرت انسان تھے۔ میں ان سے اپنے تعلق میں محبت یا گرمجوشی کا اظہار نہ کرتی مگر وہ کبھی گلہ نہ کرتے۔ بھائی صاحب کے آنے سے گھر کے ماحول میں زندگی اور رونق کا احساس در آیا۔ ظفر اور بھائی صاحب دوستوں کی طرح رہتے۔ ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے۔ دونوں کی لمبی، لمبی نشستیں ہوتیں۔ ظفر نے ایک پرانی گاڑی خرید لی تھی۔ بھائی صاحب اور ظفر اپنے، اپنے دفتر جانے کے لیے صبح کو اکٹھے گھر سے نکلتے۔ بھائی صاحب کو ان کے دفتر چھوڑتے ہوئے ظفر اپنے دفتر جاتے اور شام کو انہیں لیتے ہوئے دونوں اکٹھے گھر واپس آتے۔ ظفر نے بھائی صاحب کے تبادلے کے بعد ان کے لاہور سے کراچی آنے سے پہلے ہی گھر میں ایک کمرا اور غسل خانہ بھائی صاحب کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ حالانکہ کراچی آنے کے بعد بھائی صاحب نے بہت چاہا کہ ہمارے سرکاری بنگلے کے نزدیک ہی کوئی پورشن کرایے پر لے لیں لیکن ظفر نے انہیں اپنے پُرزور اصرار سے اپنا قیام و طعام ہمارے ساتھ ہی رکھنے پر مجبور کر دیا۔ بھائی صاحب

کے آنے سے میں کتنی خوش تھی میرا خیال تھا ظفر کو میری اس خوشی کا اندازہ نہیں مگر میری یہ غلط فہمی اس روز کافور ہوگئی جب ظفر نے مجھ سے کہا۔

''مجھے معلوم ہوتا کہ میری بیگم اپنے بھائی صاحب کے آنے سے اتنی خوش رہنے لگیں گی تو میں تمہاری رخصتی کے ساتھ ہی ان کا تبادلہ کرا کر انہیں بھی شادی کے فوراً بعد اپنے ساتھ لے آتا۔'' میں ان کی اس بات پر کچھ جھینپ سی گئی تو وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولے۔ ''عالیہ! تمہیں خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہو جاتا ہوں..... خوش رہا کرو بس۔''

بھائی صاحب تقریباً ڈیڑھ برس ہمارے ساتھ رہے۔ ابو نے ان کا رشتہ اپنے ایک دوست کی بیٹی سے طے کر دیا۔ شادی بھی کر دینا چاہتے تھے مگر بھائی صاحب کو سعودی عرب میں ملازمت مل گئی۔ انہوں نے ابو سے کہا۔ نئی نوکری ہے فی الحال شادی کیے بغیر جانے دیں، ایک سال بعد پہلی رخصت پر گھر آؤں گا تو شادی کروں گا..... ابو مان گئے، لڑکی والوں کو بھی اعتراض نہ ہوا..... مجھے بھائی صاحب کے پردیس جانے کا دکھ تو تھا مگر..... اب پہلے کی سی دیوانگی نہ تھی۔ شاید میں نے وقت کے ساتھ زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو قبول کرنا سیکھ لیا تھا۔ ویسے بھی میں اب ایک نئے رشتے کی زنجیر میں بندھنے جا رہی تھی..... اولاد کا رشتہ۔ بھائی صاحب سعودی عرب چلے گئے۔

☆☆☆

اطہر کی پیدائش نے مجھے ماں اور اولاد کے تعلق کی گہرائی کو سمجھنے میں مدد دی۔ کیا خوب صورت تعلق ہوتا ہے یہ۔ مجھے لگتا دنیا سمٹ کر اطہر کے ننھے سے وجود میں مجتمع ہوگئی تھی۔ میں جو ابو، عاتکہ اور عابد سے ایک دن بھی فون پر بات کیے بغیر نہ رہتی تھی، اطہر کی دیکھ بھال مجھے دو، دو دن ان سے بات کرنے کی مہلت نہ دیتی۔ ابھی اسے دودھ پلانا ہے تو ابھی اس کا پوتڑا بدلنا ہے۔ کبھی اس کے پیٹ میں درد تو کبھی کان میں تکلیف۔ ظفر دفتر سے آنے کے بعد بیٹے کی دیکھ بھال میں میری پوری معاونت کرتے۔ ابو اپنے ساتھ عاتکہ اور عابد کو لے کر انہیں بھانجے سے ملوانے کے لیے آئے۔ دونوں بہت خوش تھے۔ عاتکہ کی تعلیم بھی بس مکمل ہونے کے قریب تھی ابو چاہتے تھے کوئی اچھا رشتہ ملے تو بھائی صاحب کی شادی کے ساتھ اس کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں۔

آٹھ دس روز ہمارے ساتھ گزار کر ابو، عاتکہ اور عابد واپس گئے تو میرا دل اداس ضرور ہوا مگر اطہر کی چھوٹی، چھوٹی ضرورتوں نے ان کے جانے کی اداسی کو جلد ہی زیر کر لیا۔

بھائی صاحب سعودی عرب سے اکثر مجھے اور ظفر کو فون کرتے رہتے۔ وقت اتنی تیزی سے گزرا تھا کہ ان کی سالانہ چھٹی پر گھر آنے میں دو ماہ رہ گئے اور پتا بھی نہ چلا۔ ابو ان کی شادی کی تیاریوں میں بھی تھے اور عاتکہ کے لیے بھی کسی مناسب رشتے کی تلاش میں بھی تھے۔

خوش قسمتی سے عاتکہ کے لیے ایک اچھا رشتہ مل گیا۔ غیر خاندان تھا مگر ابو کے ایک دوست ان لوگوں سے پرانے واقف تھے۔ لڑکا انجینئر تھا۔ ابو نے فون پر مجھے اور ظفر کو ساری تفصیل بتائی اور لڑکے کی تصویر بھی بھجوا دی۔ بھائی صاحب کی رائے بھی لے لی گئی۔ رشتہ طے ہوگیا اور طے پایا کہ بھائی صاحب کے آنے پر عاتکہ کی شادی بھی کر دی جائے گی۔ میرا اور ظفر کا جانا تو لازم تھا۔ میں نے بھی بھائی صاحب اور عاتکہ کی شادی میں شرکت کے لیے تیاری شروع کر دی۔

بھائی صاحب نے چھٹی پر آنے سے کچھ دن قبل مجھے فون کیا اور بولے۔ ''عالیہ جس طرح کا گراموفون تم لینا چاہتی تھیں وہ تو میں نے یہاں بہت ڈھونڈا نہیں ملا۔ اب تو ڈیک کا زمانہ ہے۔ ڈیک لے آؤں تمہارے لیے؟''

میں پہلے تو حیران ہوئی کہ بھائی صاحب نے میری خواہش کو اب تک یاد رکھا ہوا تھا پھر میں نے کہا۔ ''بھائی صاحب نہ گراموفون چاہیے نہ ڈیک۔''

''کیوں؟'' بھائی صاحب چونکے۔
''اب تو سارا دن ایک ہی ریکارڈ سنتی ہوں۔''
''کون سا ریکارڈ؟'' بھائی صاحب کو اچنبھا ہوا۔
''اطہر صاحب کا۔''
''اچھا۔'' بھائی صاحب ہنس دیے پھر بولے۔
''کوئی اچھا سا ڈیک لے آتا ہوں تمہارے لیے۔''
''نہیں، نہیں بھائی صاحب..... کون سنے گا..... یونہی رکھا رہے گا۔''
''تمہیں تو پرانے گانے سننے کا بہت شوق تھا۔'' بھائی صاحب بولے۔
''اب نہیں رہا۔'' میں نے کہا۔
''تو پھر کیا لاؤں تمہارے لیے؟''
''کچھ بھی نہیں۔''
''ایسے کیسے..... کچھ نہ کچھ تو ضرور لاؤں گا..... تم خود ہی بتا دو تو اچھا ہے۔''
''اچھا تو پھر ایسا کیجیے..... چار موم کے دو پٹے لے آئیے گا۔'' میں نے کہا۔
''چار موم کے دوپٹے۔'' بھائی صاحب نے دُہرایا۔
''ہاں..... آپ بزاز کو بتائیں گے تو وہ سمجھ جائے گا۔''
''ٹھیک ہے۔''
زندگی میں ہماری ترجیحات کیسے بدلتی ہیں۔
کبھی سنہری بھونپو والا سیکنڈ ہینڈ گراموفون خریدنا میری دلی آرزو تھی اور اب چار موم کے دو دو پٹے۔
بھائی صاحب چھٹی پر آئے تو لاہور جانے سے پہلے ایک دن کے لیے ہمارے پاس ٹھہرے۔ میرے، ظفر اور اطہر کے لیے وہ بہت سے تحائف لائے تھے اور میری فرمائش پر چار موم شیفون کے دو، دو پٹے نہیں دو تھان۔
بھائی صاحب اور عائشہ کی شادی میں ہی نہیں عابد کی شادی میں بھی میں نے بھائی صاحب کے لائے انہی تھانوں میں سے دو پٹے اتار کر رنگوائے۔ کئی سال تک مجھے ریشمی جوڑوں کے ساتھ دوپٹے خریدنے کی ضرورت نہ پڑی۔ بھائی صاحب کے لائے تھان اعانت کرتے رہے۔

☆☆☆

برسوں بیت گئے۔
ابو نے لمبی عمر پائی۔ اولاد کی اولاد دیکھی مگر جب وقت آیا تو دوا دارو نے کام دکھایا نہ ہی ہماری دعاؤں نے۔ کل نفس ذائقۃ الموت سو ابو کو موت سے کیسے مفر تھی۔
ہم بہن بھائی اپنی، اپنی زندگی کی ترجیحات میں گھرتے چلے گئے۔ شکر کرتی ہوں کہ آخری وقت میں ابو میرے پاس تھے۔ ظفر انہیں اصرار کر کے اپنے پاس لے آئے تھے۔ ورنہ شاید آخری وقت میں مجھے ابو کی خدمت کا موقع بھی نہ ملتا۔ احمر میرے اکلوتے بیٹے کا چار سالہ بیٹا ان دنوں اپنی شدید علالت کے باعث بستر پر پڑا تھا۔ اسے چھوڑ کر میں ابو کی تیمارداری کے لیے لاہور ابو کے پاس نہیں جا سکتی تھی سو ظفر ابو ہی کو کراچی لے آئے تھے۔
زندگی میں ہماری ترجیحات غیر محسوس طور پر کس طرح بدلتی چلی جاتی ہیں۔
کبھی ایسا بھی دور گزرا تھا جب اپنے ابو اور بہن بھائیوں کے نزدیک رہنے کے لیے میں اپنے ہونے والے شوہر کے مرنے کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ اب یہ حال ہے کہ ظفر کے بغیر میرے لیے جینے کا تصور ہی روح فرسا ہے۔ ظفر اور میں یک جان دو قالب بن چکے ہیں، ہر نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر اپنے رب سے صدقِ دل سے دعا کرتی ہوں کہ پروردگار وہ دن نہ دکھائے جب خدانخواستہ ظفر اس دنیا میں نہ ہوں۔
بھائی صاحب سے مجھے آج بھی محبت ہے اور شاید انہیں بھی مجھ سے اسی طرح پیار ہے مگر ہم دونوں ہی کی ترجیحات بدل چکی ہیں..... اپنے، اپنے بچوں کے سامنے ہمیں سب کچھ ہیچ لگتا ہے۔
وقت کے ساتھ ہماری ترجیحات کا بدلنا بھی خوب ہے..... سنہری بھونپو والے گراموفون سے چار موم کے دو پٹوں تک.....!

سوئی دھاگا

مہرین کنول

''ذرا سا پھٹا ہوا پاجامہ سوئی دھاگے سے سینے کو کہا تھا۔ سلائی تو جانتی ہے لیکن سوئی دھاگے کا استعمال نہیں جانتی۔'' زہرہ جبیں خفگی سے پاجامے کی سلائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اریبہ کو ڈپٹ رہی تھیں۔

''اماں سلائی مشین موٹر والی ہے۔ تھی والی تو ہے نہیں، لائٹ آئے گی تو پاجامہ پکا سل جائے گا۔ سوئی دھاگے میں وہ بات کہاں.....'' اس نے اپنے طور پر عذر پیش کیا۔

''واہ کیا عقل پائی ہے میری بیٹی نے۔ داد دینے کو دل چاہ رہا ہے۔ پھوہڑ کہیں کی، اِدھر آ سوئی میں دھاگا ڈال کر میں تجھے بتاتی ہوں۔'' سوئی میں دھاگا ڈالنے میں کامیاب ہونے کے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی زہرہ سے سوئی دھاگے کی سلائی سیکھنے لگی۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ جو نہیں مگر اب سلسلہ یہیں پہ ختم نہیں ہوا بلکہ وہ تو اب شروع ہوا تھا۔ اب اماں آئے دن اسے کچھ نہ کچھ سینے کو دے دیتیں۔ بازار سے آتے ہی زہرہ نے نئے کشن اور تکیے روئی کے ڈھیر سمیت اس کی طرف ڈال دیے اوپر سے حکم صادر کیا۔

''کشن اور تکیوں میں روئی بھر کر ان کے منہ سوئی دھاگے سے ترپائی کر کے بند کرو۔'' زہرہ کو آنا کانی کا موقع دیے بغیر آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئیں۔

''اماں آپ کو حکم دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کشن اور تکیے دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا مجھے اب سوئی دھاگے کا کام شروع.....'' اس نے کڑھتے ہوئے سوچا اگر کہہ ڈالتی تو اماں سے ڈنڈے نہ پڑتے۔

زہرہ شام کو اٹھیں تو تیار کشن اور تکیے دیکھ کر انہیں جانچتی نگاہوں سے ٹٹولا اور پھر اطمینان چہرے پر جلد آ گیا۔

''اریبہ! رات کے کھانے سے فارغ ہو کر میری دونوں قمیصوں کے گلے ترپائی کر دینا، دو دن ہو گئے قمیص

جوں کی توں پڑی ہیں کل مجھے رانیہ کے گھر جانا ہے۔'' وہ اسے پھر سوئی دھاگے کا کام یاد دلاتی عشا کی نماز کی تیاری کرنے لگیں اور وہ جو کچن میں کب سے برتنوں کے ڈھیر صاف کر رہی تھی۔ سوئی دھاگے کے نام سے تپنے لگی۔

''پتا نہیں سوئیاں کیوں ضروری ہیں اور دھاگے کیوں ضروری ہیں۔'' وہ بڑبڑانے لگی۔

☆☆☆

وہ اپنی بیوہ ماں کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔ عین جوانی میں شوہر کا ساتھ چھوٹ جانا اور میکے سے بھی کوئی آسرا نہ ہونا اگرچہ زہرہ کے لیے مشکل ضرور تھا مگر اللہ کی مدد شاملِ حال ہو تو ہر حالات سے بندہ گزر ہی جاتا ہے اور زہرہ تو ٹھہری ایک نہایت سلیقہ مند اور سمجھدار عورت تو بیٹی کو احساسِ محرومی دیے بغیر اسے اپنی خداداد صلاحیتوں پر بھروسا کرنا سکھا دیا تھا۔

دسویں پاس کر کے وہ گھر کے کام کاج اور سلائی کڑھائی میں طاق ہو چکی تھی۔ دونوں ماں، بیٹی کی شرافت، سلیقہ اور قناعت پسندی نے پورے محلے میں انہیں بہت قابلِ احترام بنا دیا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کا رشتہ بھی وہیں محلے میں طے پا گیا تھا۔ زہرہ کو اپنی تربیت اور بیٹی کی صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔

اس کی شادی کی بات پکی ہو گئی تھی سو اپنے جہیز کے کپڑوں، تکیوں، گاؤ تکیوں، غلاف، کشن اور بہت سے سامان کی تیاری اور سلائی کرنا تھی۔ مگر وہ خوش تھی حالانکہ اب بھی وہ دروازوں سے اپنے لمبے پردوں کو برابر لانے کے لیے پردوں کے نیچے کے حصے کو موڑ کر ترپائی کر رہی تھی مگر اس کی سوچیں، اسے ان سب کاموں سے آزادی کی خبریں سنا رہی تھیں۔ اب اسے روز اُدھڑی ہوئی چیزیں یوں سینی نہیں پڑیں گی۔ روز، روز سوئی دھاگا استعمال نہیں کرنا پڑے گا ہر وقت سوئی دھاگے کی گردان نہیں سننا پڑے گی نہ ہی سوئی ڈھونڈنی پڑے گی نہ ہی دھاگا۔

☆☆☆

اریبہ کی شادی کو تقریباً دو ماہ ہو گئے تھے۔ ساس اور نند کی روایتی چپقلش شروع ہونے سے پہلے ہی اس کے بخت کا ستارہ جلد ہی چمک گیا تھا۔ دو دن پہلے اپنی نند سونیا کے ساتھ جا کر اس نے سوٹ خریدا تھا جسے اس نے آج کے دن پہننا تھا، سلائی خود کی تھی مگر سلائی مشین تو دو دن سے خراب پڑی تھی پھر بھی اس نے سلائی بڑی خوبی سے کی تھی مگر کیسے؟

سونیا ابھی ابھی اسے وہ نیا سوٹ پہنا دیکھ کر اپنی ماں کے پاس آئی تھی۔ اریبہ کچن میں مصروف تھی مگر نند اور ساس کی گفتگو اس کی سماعت تک بہ آسانی پہنچ رہی تھی۔

''اماں بھابی کا سوٹ دیکھا کیسا زبردست سیا ہے۔ وہ بھی سلائی مشین کے بغیر یعنی ہاتھ کی سوئی اور دھاگے سے اتنا باریک اور پکا کام.....'' وہ حیرت زدہ اور متاثر کن لہجے میں اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔

''بیٹا ہماری بہو تو واقعی میں سگھڑ ہے۔ اس کی ماں نے بہت اچھی سٹیج پر اس کی تربیت کی ہوگی، ہر چھوٹا موٹا کام سکھایا ہوگا۔ بہو کو اس بات کی ضرور قدر ہوگی کہ معمولی کاموں میں بھی بڑے، بڑے کام چھپے ہوتے ہیں اس کی ماں نے اسے باریک بینی سے سلیقہ مند بنایا ہے تبھی تو میں اپنا سر فخر سے بلند کر رہی تھی اپنی دوست سعدیہ کے سامنے جو آج صبح بہو کو دیکھنے آئی تھی اور اس کے کپڑے کی سلائی کا پوچھ رہی تھی میں نے جب بتایا کہ بہو نے خود سلائی کی ہے تو وہ بہت تعریف کرنے لگی اور مجھے داد دے رہی تھی کہ کتنی اچھی بہو ڈھونڈی ہے۔'' واقعی پڑوسن نے بہت اچھے الفاظ میں تعریف کی تھی جسے اریبہ نے خود سنا تھا۔

''تمہاری بہو تو واقعی بڑی سلیقہ شعار ہے۔ ورنہ آج کل کی لڑکیاں تو کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتی ہیں اور اچھے بھلے آسان سے کام بھی نہیں کرنا چاہتیں۔'' کچن میں سالن بناتی اریبہ پھولے نہیں سما رہی تھی۔ وہ اپنے سلیقے اور ماں کی دور اندیشی سے بڑی شان اور بڑی آن سے اپنی سسرال میں نام کما چکی تھی سو وہ اب فخر محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کی اماں یہاں ہوں اور وہ خود اپنی اماں سے کہے۔

''اماں سوئی دھاگے کا کوئی کام ہو تو بتاؤ، میں سوئی میں دھاگا ڈال دیتی ہوں۔'' سچ بات ہے بظاہر چھوٹی سی چیز ہے پر کام بڑا کرتا ہے یہ سوئی دھاگا۔

التجا

صدف آصف

اس کی آنکھیں کھلیں تو اطراف میں پھیلی تازہ گلابوں کی بھینی، بھینی خوشبو نے جیسے وجود میں خوشگواریت کا احساس بھر دیا۔ التجا ملال نے آہستہ سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے تازہ ہوا سانس کے ذریعے اپنے اندر اتاری اور سر اٹھا کر گردن دائیں بائیں گھمائی مگر خوشبو کے راز کا پتا نہیں چلا۔ اس نے سستی سے کمبل اٹھا کر تہ کرنا چاہا، اچانک نگاہوں کے سامنے خوشبو کا منبع آ گیا۔ سرخ گلابوں سے سجا بڑا سا گلدستہ کمبل کے نیچے چھپا کر رکھا گیا تھا۔ اس کا دل ایک دم سے خوش ہو گیا۔

''ارے..... کتنے خوب صورت پھول ہیں.....''

التجا نے بے اختیار ہاتھ بڑھایا اور مومی انگلیوں نے گلدستے کو اٹھا لیا۔

''گلاب تو ویسے بھی میری کمزوری ہیں۔'' اس نے بے اختیار پھولوں میں اپنا حسین چہرہ چھپاتے ہوئے خود کلامی کی۔

''کس نے بھیجا ہے؟'' الٹ پلٹ کر بھرپور انداز میں جائزہ لیا تو کونے میں ایک کارڈ چسپاں دکھائی دیا۔

''دیکھوں تو کیا لکھا ہے؟'' التجا نے کارڈ نکال کر

بے چینی سے کھولا۔

''طلال..... تم نہیں سدھرو گے.....'' وہ شوہر کی خوب صورت لکھائی کو پہچان کر مسکرائی۔ ایک بار پھر موی انگلیوں نے انہیں چھوا، پھولوں کی نرمی سے تازگی کا احساس جاگا اور روح کو سرشار کر گیا۔

''جناب کو آخر کار اپنی غلطی کا احساس ہو ہی گیا۔'' سیاہ روشنائی سے بڑا سا ''سوری'' لکھنے کے ساتھ، ساتھ آنسو بہاتا ہوا ایک کارٹون بھی بنایا گیا تھا۔

''افوہ..... مگرمچھ کے آنسو تو دیکھو۔'' اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکنے لگے، ہنستے ہوئے خود کلامی کی۔

پھول کی پتی، پتی میں اسے طلال کا مسکراتا چہرہ دکھائی دیا۔ ایک دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ نازک سے پیروں کو بستر سے نیچے اتارا اور چپل ڈھونڈتے ہوئے گھنے بالوں کو موڑ کر جوڑے کی شکل میں باندھا۔ اب اسے ناشتا بنانے کے لیے باہر جانا تھا، رات کو ہونے والی جھڑپ کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ دروازے کی جانب بڑھی، ہینڈل گھمانا چاہا، اچانک دروازہ خود بخود کھل گیا، اس نے سہم کر نگاہ اٹھائی.....

☆☆☆

طلال بیگ اس کا رشتے کا کزن ہونے کے ساتھ، ساتھ پہلی چاہت اور آخری محبت تھا۔ اسی طرح التجا یوسف بھی طلال کی زندگی میں آنے والی وہ پہلی لڑکی تھی جس کی دلکشی اور حسن نے اسے اس حد تک اپنا اسیر کر لیا تھا کہ وہ ایک لمحہ بھی اس کے بغیر رہنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی تو التجا کو اس کی محبتوں کی شدت سے خوف آنے لگتا اور کبھی وہ خود پر نازاں ہو جاتی۔

اتفاق سے ان دنوں کے گھر بھی ایک ہی محلے میں واقع تھے۔ اسی لیے بچپن ایک ساتھ کھیلتے کودتے گزرا حالانکہ ان کے گھر کے بڑوں کا آپس میں بہت زیادہ میل ملاپ نہ تھا پھر بھی ان دونوں کے بیچ دوستی کا رشتہ مضبوط سے مضبوط ہوتا چلا گیا۔ جیسے وہ طلال بیگ کی رگ رگ سے واقف تھی، اسی طرح طلال کو بھی التجا یوسف کی کمزوریوں کے بارے میں اچھے طریقے سے پتا تھا۔ جوانی میں قدم رکھتے ہی التجا کی شہد جیسی آنکھوں میں اپنے لیے پنپتی محبت کا ادراک ہو جانے کے بعد اسے خود پر فخر محسوس ہونے لگا۔ طلال کے ہاتھ میں محبت بھری کمزوری کیا آئی وہ التجا کو اپنی ملکیت جان کر حق جتانے لگا۔ وہ دھوپ چھاؤں جیسا عجب مزاج کا لڑکا اس نازک سی لڑکی کے سامنے بے بس ہو جاتا۔

مرادنہ وجاہت کا حامل طلال بیگ اچھے مزاج کا مالک، خوب صورتی کا دلدادہ اور اچھے چہروں کا قدر دان تھا۔ اسی لیے اس کے اردگرد خوب صورت اور زہین و فطین لڑکیوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ ان سب کھیل تماشوں کے باوجود طلال اپنی چاہت کے حوالے سے التجا کے معاملے میں بڑا حساس اور سنجیدہ تھا۔ التجا کو طلال کی ہر بات اچھی لگتی تھی مگر اس کے مزاج کی شوخی و شرارت اس وقت بری لگنے لگتی، جب وہ اسے نظر انداز کر کے کسی بھی حسین لڑکی کے ساتھ خوش اخلاقی برتنے میں عار محسوس نہیں کرتا۔ حالانکہ طلال نے التجا سے کبھی نہیں چھپایا کہ دورانِ تعلیم بہت سی لڑکیاں طلال کے فرینڈ شپ سرکل میں شامل تھیں لیکن ان کے تعلقات صرف دوستی تک محدود رہے، پھر بھی جب وہ کسی لڑکی کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا، التجا کا منہ بن جاتا اور دونوں کے بیچ زوردار لڑائی ہوتی اور پھر وہ اسے منانے میں جت جاتا۔ ان دنوں زندگی کھٹی میٹھی سی رہتی اور ہر لڑائی کے بعد طلال ہی اسے مناتا تھا، محبت کا یہ ہی مان تھا جو التجا کو اس کی جانب مائل رکھتا تھا۔

☆☆☆

''ہم سے بھول ہوگئی ہم کا معافی دیدو۔'' طلال کانوں کی لوؤں کو چھوتے ہوئے شرارتی مسکراہٹ چہرے پر سجائے دروازے پر کھڑا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ مصنوعی خفگی ہونٹوں پہ سجائے ہاتھ میں پکڑے گلدستے کو اس کے چہرے کے مقابل لا کر بولی۔

''جان، اسے اظہارِ محبت کہتے ہیں.....'' سر کھجاتے ہوئے ترنت جواب آیا اور اندر کی جانب قدم بڑھائے۔

''ہونہہ..... بڑے آئے محبت کا اظہار کرنے

والے۔'' التجا نے مکھی اڑانے والے انداز میں .... بے پروائی دکھائی اور مڑ گئی۔

''محترمہ کیا آپ کو اب بھی میری محبت پر کوئی شک ہے؟'' طلال نے اس کا چہرہ زبردستی اپنی طرف موڑا اور التجا کی آنکھوں میں جھانکا، ایک سحر نے جیسے اسے اپنے دام میں جکڑنا شروع کیا۔

''بس کردو..... میں جیسے جناب کو جانتی نہیں ہوں..... پکے فلرٹی ہو۔'' اس نے طلال کو دھکا دیتے ہوئے نگاہیں چرائیں۔

''التجا تم یقین کرو نہ کرو ..... مگر پچھلی باتیں ماضی کا حصہ بن چکی ہیں۔ اب تو صرف تم ہی میرا حال اور مستقبل ہو۔'' طلال نے بڑی سنجیدگی سے اس کا ہاتھ تھام کر پُراثر لہجے میں سمجھانا چاہا۔

''تو پھر کل رات جو ہوا، وہ کیا تھا؟'' وہ بدک کر پیچھے ہوئی غم دو بالا ہونے لگا، اس کے لہجے میں ملال جاگا۔

''یار..... وہ تو ہلکی مذاق چلتا رہتا تھا، ماریہ میری یونیورسٹی کی فرینڈ تھی اتنے سالوں بعد ملی تو پرانے قصے کہانیاں ہونے لگے مگر تم تو انجوائے کرنے کی جگہ ہر بات پر منہ بنا کر بیٹھ جاتی ہو۔'' وہ ہنستے ہوئے اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

''تم جانتے ہو ناں..... میں تمہارے معاملے میں کتنی پوزیسو ہوں..... پھر بھی۔'' اس کا گلا رندھ گیا، زبردستی اس کے ہاتھوں سے بال چھڑائے۔

''ایک منٹ التجا اِدھر میری طرف دیکھو۔'' طلال کو اس کا رونا ہمیشہ پست کر دیتا تھا۔ انگلی سے اس کا چہرہ اونچا کرتے ہوئے آنکھوں میں دیکھا۔

''مجھے کچھ نہیں سننا۔'' اس نے آنکھیں میچ لیں، جانتی تھی کہ وہ ایک بار پھر اسے منانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

''اچھا..... اپنی عقل نڑاؤ اور مجھے ایک بات بتاؤ..... اگر میرے اور ماریہ کے درمیان کچھ بھی ہوتا تو مجھے اس سے شادی کرنے سے بھلا کوئی روک سکتا تھا؟'' اس نے ہنستے ہوئے زبردستی بیوی کی آنکھیں کھولیں اور پیار سے جھانکا۔

''نہیں.....'' التجا نے نفی میں گردن ہلائی وہ ہمیشہ کی طرح لاجواب ہو گئی۔

''تو بس..... اگر میری زندگی میں تم شامل ہو تو اس کا مطلب یہ ہی ہے کہ تمہاری حیثیت ان سب سے بڑھ کر ہے، جن کو تم بلاوجہ اپنا دشمن سمجھ کر جلنے سڑنے لگتی ہو۔'' اس نے پیار سے سرگوشی کرتے ہوئے التجا کو اپنے قریب کرنا چاہا۔

''جلیں میرے دشمن.....'' وہ ایک بار پھر تپ کر اسے دھکا دیتے ہوئے پیچھے ہوئی۔

''اچھا..... جان..... سچ میں آئندہ خیال رکھوں گا..... اب تو معافی دے دو..... آفس کو دیر ہو رہی ہے۔'' اس نے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے اس کے دونوں کانوں کو پکڑا۔

''باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔'' التجا کی ہنسی نکل گئی۔

''اور ناشتا بنانا؟'' طلال نے شرارتی انداز میں پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے کچن کی طرف دھکیلا۔ وہ ناراضی بھول بھال کھلکھلاتے ہوئے اس کے ساتھ چل دی۔

☆☆☆

شوہر کو دفتر بھیجنے کے بعد وہ گھر کے کاموں میں الجھ گئی۔ بہت بڑا فلیٹ نہیں تھا پھر بھی اسے سارے کام بڑے بھاری لگتے، شروع سے کام کرنے کی عادت جو نہیں تھی۔ کام والی ماسی آ گئی تو اس کے ساتھ لگ کر پورے گھر کی صفائی ستھرائی کروائی اس کے بعد میلے کپڑے نکالے اور ماسی کو ہدایت دینے کے بعد کچن سمیٹتے ہوئے رات کے کھانے کے بارے میں سوچنے لگی۔ کچھ سوچ کر فریزر سے چکن کا پیکٹ نکالا۔ رات کے کھانے کے لیے سوپ اور پاستا بنانے کا سوچا اور چکن بوائل کرنے کے لیے رکھ دی۔ ویسے بھی اسے روایتی قسم کے بھاری بھرکم مسالے والے کھانے پکانے تو آتے نہیں تھے، اسی لیے کبھی میکرونی، کبھی پیزا، سوپ یا پاستا وغیرہ بنا لیتی تھی۔ ایسے کھانوں پر طلال کا منہ تو بن جاتا مگر اس کی محبت میں برداشت کر کے چپ چاپ

لمحالیتا۔ ویسے بھی جب طلال کا قورمہ، بریانی کھانے کا دل کرتا تو وہ اپنی ماں کے گھر چلا جاتا یا فرمائش کر کے سسرال کا رخ کرتا۔ کبھی، کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے وہ دونوں کسی اچھے ریسٹورنٹ میں جا کر ڈنر کر لیتے۔ التجا اس کے کہنے پر روایتی کھانے پکانا سیکھ رہی تھی مگر ابھی پرفیکٹ نہیں ہو سکی تھی۔

وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہوئی تو تھکن سی محسوس ہونے لگی، استری شدہ کپڑے نکالے اور نہا دھو کر فریش ہو گئی۔ چائے کی طلب نے بے حال کر دیا تو اس نے اپنے لیے ایک کپ چائے کا بنایا اور لاؤنج کی طرف نکل آئی، سامنے ٹیبل پر رکھے فلاور واز پر نگاہ پڑتے ہی پُرکشش چہرے پر پیاری سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ طلال نے وہ گلدستہ وہاں سجا دیا تھا، اس کا ذہن صبح والے واقعے کی طرف چلا گیا تو پھولوں کو خوب صورت انگلیوں سے چھو کر محسوس کیا، وجود میں تازگی سی پھیل گئی۔ التجا صوفے پر بیٹھ گئی چائے کا سپ لینے کے بعد نم بالوں کو انگلیاں سے سلجھاتے ہوئے ہوئے، طلال کے ساتھ گزرے ہوئے ماضی کے حسین لمحات میں کھو گئی۔

☆☆☆

ان دونوں کے بیچ جب بھی لڑائی ہوتی تھی تو ہمیشہ طلال ہی اسے مناتا اور نئے سرے سے اپنی محبت کا یقین دلانے لگ جاتا۔ التجا کو ایسا لگتا جیسے وہ شیشے سے بنی کوئی گڑیا ہو جسے طلال اپنے دل سے لگا کر رکھتا ہے، اسے یقین تھا کہ طلال کا ساتھ ہوگا تو زندگی کا سفر دلنشین ثابت ہوگا ورنہ کسی اور میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس جیسی بگڑی ہوئی لڑکی کو برداشت کر سکے۔ ان سب باتوں کے باوجود لڑکیوں میں اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ، دیکھ کر التجا جلتی کڑھتی رہتی۔ اسے ڈر تھا کہ طلال کسی اور حسین کی زلف کا اسیر نہ ہو جائے۔ وہ اس سے لڑتی جھگڑتی مگر مسلسل عدم احساسِ تحفظ کا شکار رہنے لگی۔

طلال اس سر پھری لڑکی کو دل سے چاہتا تھا اور اس کا... مزاج آشنا ہونے کے ساتھ، ساتھ اس کے اندر پلنے والے خوف کو جان گیا تھا وہ اپنی بھلی بیوی کے بلاوجہ کے اندیشوں پر من ہی من میں مسکراتا رہتا۔ اسی لیے جب ایک دن ان دونوں کی نوک جھوک حد سے زیادہ بڑھ گئی تو تنگ آ کر طلال نے التجا کو اپنی بے پناہ محبتوں کا یقین دلاتے ہوئے ایک دم سے شادی کے لیے پروپوز کر دیا۔ التجا تو جہاں کی تہاں رہ گئی اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ ایک ٹک اسے گھورتی رہی۔ طلال کی محبت پر تو وہ آنکھیں بند کر کے یقین کرتی تھی مگر یہ نہیں جانتی تھی وہ اس سے شادی کے فیصلے میں اتنی جلد بازی کا مظاہرہ کرے گا۔ اور طلال اس کی حالت کو انجوائے کرنے لگا۔ کچھ دیر تک جب وہ ایسے ہی بت بنی اس کے سامنے بیٹھی رہی تو اس نے محبت سے التجا کا ہاتھ تھام کر اپنا مطالبہ دُہرا دیا۔ اس کے چہرے پر خوشی روشنی بن کر پھیل گئی۔ وہ شادی کے معاملے میں شروع سے تذبذب کا شکار تھی کیونکہ کبھی کبھی طلال اسے فلرٹی سا لگنے لگتا اسی لیے جب اس نے شادی کی آفر کی تو وہ ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار نہ تھی۔

''جانے ہمارے والدین اس رشتے کے لیے آمادہ ہوں گے بھی یا نہیں؟.....'' اس کی آنکھوں میں اچانک شبنم اترتے دیکھ کر طلال تڑپ کے رہ گیا۔

اس کے اندیشوں کے پیچھے ایک وجہ طلال کی ممی واصفہ تائی بھی تھیں۔ التجا اس کے شاندار فیملی بیک گراؤنڈ سے ڈرتی تھی اور اس کی ماں کے خیالات سے بھی بخوبی واقف تھی جو بچپن سے ہی اسے ناپسند کرتی آئی تھیں۔ اسی لیے وہ گھبراہٹ کا شکار تھی کہ یہ طبقاتی فرق یا اس کی والدہ کی ناپسندیدگی ان دونوں کی محبت کے درمیان حائل نہ ہو جائے مگر طلال کے لہجے کی مضبوطی نے اسے جیسے زندگی لوٹا دی۔

جب سے ان کے بیچ شادی کی بات نکلی دوسری طرح کے خدشات نے التجا کے اندر سر اٹھانا شروع کر دیا۔ اس نے ایک دن کچھ سوچ کر اپنے دل کا درد طلال کے آگے بیان کر دیا تو وہ مسکراتے ہوئے بڑے سادہ لفظوں میں اپنے جذبوں کی سچائی اس پر واضح کرتا

چلا گیا۔ اس کی اتنی محبتوں پر التجا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ شہد کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے طلال نے اس کے نرم و نازک ہاتھ پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھتے ہوئے تاعمر ساتھ نبھانے کا پختہ یقین دلایا تو التجا نے بھی تمام واہموں کو سر جھٹک کے دل سے نکال دیا اور خوش رہنے لگی۔

وہ جانتی تھی کہ طلال کیسا بھی ہو مگر زبان دے کر پھرنے والوں میں سے نہیں اسی لیے وہ اس کے سچے جذبوں کی دل سے معترف ہوگئی۔ اس کا پرپوز کرنا ثابت کرتا تھا کہ طلال کا شمار ان عام لڑکوں میں نہیں ہوتا جو محبت کو وقت گزاری سمجھتے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ محض دوستی یا وقت گزاری نہیں کر رہا تھا بلکہ سیدھے سادے طریقے سے اسے ساری زندگی کے لیے اپنا بنانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

جیسے ہی گھر والوں کو ان کے بیچ پکنے والی محبت کی کھچڑی کا پتا چلا تو دونوں جانب سے سمجھانے کا عمل تیز ہوگیا۔ التجا کے والد یوسف علی کو طلال کا لاابالی پن پسند نہیں تھا مگر اس سے زیادہ وہ اپنی بھابی کی تنگ مزاجی سے پریشان تھے جنہیں اپنی دولت اور خاندانی ہونے کا بڑا زعم تھا۔ وہ ہر وقت دوسروں کو نیچا دکھانے میں مصروف رہتی تھیں، قریب رہنے کی وجہ سے ان کا زیادہ تر نشانہ التجا کے گھر والے بنتے۔ واصفہ بیگم کو لگتا تھا کہ ان کے دیور یوسف علی نے اپنی اکلوتی بیٹی التجا کے ساتھ بلاوجہ کا لاڈ پیار کر کے اسے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

وہ ناک چڑھا کر جتاتیں۔ ''دونوں میاں بیوی چھٹانک بھر کی لڑکی کو قابو میں کرنے کی جگہ اس کے ناز نخرے اٹھانے میں ہلکان ہوتے رہتے ہیں، اسی لیے تو وہ چکی نہیں بیٹھتی ہے۔''

انہیں اس کا لڑکوں کی طرح اپنے کیریئر کے معاملے میں سنجیدہ ہونا بالکل پسند نہیں آتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ التجا جو خاندان کی روایات کو سائڈ لائن لگا کر انجینئر بننے چلی ہے۔ وہ دوسری لڑکیوں کے لیے کوئی اچھی مثال ثابت نہیں ہوگی۔ شاید ان کے دل میں کہیں یہ خدشہ پہلے سے موجود تھا کہ طلال اس لڑکی کو ان کی بہو بنانے کی ضد نہ کر بیٹھے اس لیے وہ اس کے بغض میں خاندان بھر میں بلاوجہ کی برائیاں کرنے سے بھی باز نہیں آتیں۔

یہ باتیں جب گھوم پھر کر یوسف علی اور ان کی اہلیہ صبیحہ کے کانوں تک پہنچتیں تو وہ لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے مگر بیوی کے سمجھانے پر ٹھنڈے پڑ جاتے۔ صبیحہ سمجھاتی کہ بھابی کا تو کیا بگڑے گا الٹا ان کی اپنی بیٹی کی بدنامی ہو جائے گی۔ یوسف علی کا دکھ اس وقت سوا ہو گیا جب اتنی باتوں کے ہو جانے کے باوجود بیٹی کا جھکاؤ طلال کی طرف محسوس کیا۔ حالانکہ انہوں نے دبے، دبے لفظوں میں کئی بار بیوی کے ذریعے بیٹی کو سمجھانا چاہا کہ وہ ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دے جن کی تعبیر ممکن نہیں مگر سب کچھ جانتے بوجھتے التجا اس دل کا کیا کرتی جو بس طلال کو پانے کے لیے بے قرار رہتا۔

☆☆☆

واصفہ نے جب ایک دن بیٹے کے سامنے لڑکیوں کی تصویروں کا ڈھیر لگا کر ہدایت کی کہ اس میں سے اپنے لیے ایک لڑکی پسند کر لو تاکہ شادی کی بات آگے بڑھائی جائے تو اس نے ساری تصویریں ماں کو دیکھے بغیر واپس کر دیں۔

''ممی آپ ایسا کریں یوسف چاچا کے گھر جا کر التجا کا ہاتھ مانگ لیں۔'' طلال نے ماں کی سوالیہ نگاہیں خود پر گڑی دیکھیں تو بڑے مزے سے دھماکا کیا۔

''یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' ایسے حالات میں بیٹے کے منہ سے التجا کا نام سنتے ہی وہ اچھل پڑیں۔

''ممی سمپل سی بات ہے۔ میں التجا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' طلال نے اپنے جاگرز سمیٹ کر مطالبہ دہرایا۔

''مجھے پتا تھا کہ یہ دوستانہ ایک دن کوئی نہ کوئی گل کھلائے گا۔'' وہ ہاتھ نچاتے ہوئے ایک دم چمک کر بولیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں..... وہ بس مجھے پسند ہے۔'' اس نے ماں کی بات کاٹی۔

''میں تو پہلے ہی کہتی تھی یہ یوسف کی لڑکی پورے گنوں کی ہے..... ایک دن اپنا اثر ضرور دکھائے گی۔'' وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولیں۔

''ممی..... پلیز..... التجا کا ذکر ان الفاظ میں نہ کریں..... وہ آپ کی بہو بننے کے ساتھ، ساتھ اس خاندان کی لڑکی بھی ہے۔'' اس کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔

''ایسا نہیں ہوسکتا، میرے گھر کی بہو کوئی نوکری پیشہ لڑکی نہیں بن سکتی ہے۔'' وہ صاف انکار کرتے ہوئے اپنی بات پر اڑ گئیں۔

''مجھے آپ کے خیالات پر بڑا دکھ ہورہا ہے ہی..... مگر چاہے وہ اس گھر کی بہو نہ بنے مگر میری بیوی تو التجا کو ہی بننا ہے.....'' طلال نے ماں کو گھور کر دیکھا اور اپنا حتمی فیصلہ سنا کر کرسی کو ٹھوکر مارتا ہوا باہر نکل گیا۔ واصفہ دل پر ہاتھ رکھے دروازے پر پڑے پردے کو ہلتا ہوا دیکھتی رہ گئیں۔

بیٹے کے ہٹیلے پن پر واصفہ بیگم سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ شوہر سے بات کی تو انہوں نے بھی بیٹے کا ہی ساتھ دیا۔ ایک مہینے تک بڑی کوشش کی کہ وہ کوئی اور لڑکی کو پسند کرلے مگر جب ایک نہ چلی تو مجبوراً التجا کا ہاتھ مانگنے دیور کے دروازے پر پہنچ گئیں۔ یوسف چپ چاپ تکبر بھری عورت کو بیٹے کی وجہ سے جھکتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ جو آج ان کے سامنے سوالی بنی کھڑی تھیں شاید یہ ہی اوپر والے کا انصاف تھا۔

وہ انکار کرتے بھی تو کس برتے پر، ویسے تو التجا نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا لیکن طلال کا نام آتے ہی اس کے گالوں پر کھلتے گلابوں کا رنگ باپ کی جہاندیدہ نگاہوں سے چھپا نہ رہ سکا۔ ان کی خوشی اکلوتی بیٹی کی خوشی سے مشروط تھی وہ جان گئے تھے کہ التجا کی خوشی طلال کے ساتھ میں ہیں۔ پھر بھی بھاوج کے مزاج کو جانتے ہوئے انہوں نے رسمی سے انداز میں سوچنے کے لیے وقت مانگا اور ایک ہفتے میں ہی ہاں کردی۔ یوں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق چند ماہ کے اندر اندر انتہائی دھوم دھڑکے کے ساتھ وہ ''واصفہ منزل'' میں رخصت ہوکر آ گئی۔ دلہن بن کر التجا کا حسن مزید نکھر گیا۔ طلال کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے اپنے دل میں چھپا کر رکھ لے۔

ویسے والے دن بھی سجی سنوری التجا کو اپنے پہلو میں بیٹھا دیکھ کر وہ شوخیوں پر اتر آیا۔ یہ سوچ ہی اسے سرشار کرنے کے لیے کافی تھی اب وہ ہمیشہ کے لیے اس کی بن گئی ہے۔ بیٹے کا والہانہ پن دیکھ، دیکھ کر واصفہ کا منہ مزید پھول گیا مگر انہیں کسی کی بھی پروا نہیں تھی ایک دوسرے میں کھوئے رہے آخر انہوں نے اپنی منزل کو پالیا تھا۔ ہلکے گلابی بھاری کامدار ڈریس میں دلکشی کی تصویر بنی التجا کا حسن ہوش ربا اسے بہکائے دے رہا تھا۔ ایک دوسرے کو پالینے کی خوشی ان کے چہروں سے عیاں تھی جسے دیکھ دیکھ کر واصفہ کے اندر التجا کے لیے نفرت کا گراف بڑھتا چلا گیا۔

☆☆☆

طلال، التجا کو ڈھونڈتا ہوا لاؤنج میں آیا تو دیکھا، وہ چائے کے کپ میں چمچہ گھماتے ہوئے منہ سُجائے بیٹھی تھی۔

''ناٹ اگین۔'' اس نے بدمزہ ہوکر سوچا۔

''التجا سنو.....'' کرسی پر بیٹھ کر اسے متوجہ کرنا چاہا۔

''مجھے کچھ نہیں سننا.....'' اس کی نگاہوں نے جواب دیا۔

''ایک منٹ یار ہوا کیا ہے؟'' اس بار پھر جواب نہ آیا۔

''اچھا..... چلو جلدی سے ایک کپ چائے بناؤ قسم سے سر درد سے پھٹا جارہا ہے۔'' طلال نے سر کو ہاتھ سے دباتے ہوئے فرمائش کی۔

''کیوں..... میں کیوں بناؤں؟'' وہ چیخ اٹھی۔

''کیا مطلب؟..... تم بیوی ہو میری اور کون بنائے گا؟'' اس نے غصے میں جواب دیا۔

''ان سے بنواؤ ناں، جن کے ساتھ سوشل میڈیا پر دوستیاں بڑھائی ہوئی ہیں۔'' التجا نے جل کر کہا۔

''واٹ..... کیا ہوگیا ہے تمہیں..... یار'' اس نے تمسخر اڑانے والے انداز میں بیوی کو گھورا۔

''یہ دیکھو..... کتنی لڑکیوں کے ''مس یو'' کے پیغامات آئے ہوئے ہیں۔'' اس نے طلال کا موبائل

اٹھا کر میسج باکس کھول کر دکھایا۔

''اوہ گاڈ..... التجا مجھے تم سے اتنی... بیوقوفی کی امید نہیں تھی..... یہ تو صرف فرینڈز ہیں.....'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''سچ مچ... میں صرف۔ فرینڈز...؟ اچھا' میں بھی اگر اس طرح سے دوستیاں پال لوں تو... کیا... تم برداشت کرو گے؟'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

''شٹ اپ..... التجا اپنی حد میں رہو۔'' وہ ایک دم توے پر بیٹھ گیا، بات غیرت پر جو آ گئی تھی۔

''اچھا..... اور جناب کی بھی کوئی حد ہے کیا؟'' اس نے دانت کچکچا کر طنز کیا۔

''جان سنو پلیز خفا مت ہو..... میری پہلی اور آخری محبت تو تمہی ہو ناں۔'' طلال کو لگا غصے سے بات بگڑ جائے گی اس لیے پیار جتایا مگر وہ بدک کر دور ہوئی

''ہونہہ..... محبت... شادی کے ایک سال میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔'' وہ تیز لہجے میں بولی۔

''کیا..... کیا اندازہ ہو گیا ہے؟'' وہ بھی چڑ گیا۔

''یہ ہی کہ تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟'' اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر جتایا۔

''اچھا..... بتاؤ کہ کیا سمجھتا ہوں؟'' وہ جھلایا۔

''ماسی..... اور کیا.....؟'' بیوی کے انکشاف پر اس نے افسوس سے سر پر ہاتھ مارا۔

''تمہیں احساس بھی ہے کہ میں پورے دن گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہوں۔ خانساماں بن کر اچھے، اچھے کھانے پکاتی ہوں، دھوبن کی طرح میلے کپڑے دھوتی ہوں مگر اس کے باوجود تعریف و تحسین کے ڈونگرے دوسروں پر برساتے ہو۔'' وہ انگلیوں پر کام گنتے ہوئے بولی۔

''بس کرو..... کام کرتی ہو تو کوئی احسان نہیں کرتیں، یہ تو ہر شادی شدہ لڑکی کا فرض ہوتا ہے کہ وہ شادی کے بعد اپنا گھر سنبھالے، ویسے بائی داوے تم پکاتی کیا ہو؟ یہ میرا ہی حوصلہ ہے جو تمہارے پکائے ہوئے بدمزہ کھانے کھا لیتا ہوں۔'' اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں اسے دیکھا۔

''اچھا..... میں بدمزہ کھانا پکاتی ہوں..... تو کوئی کھانا پکانے والی رکھ لو..... جب اسے ہر مہینے خطیر تنخواہ دینی پڑے گی ناں تو میری قدر آئے گی.....'' وہ بھنّائی۔

''اگر سارے کام باہر والی سے ہی کروالوں گا تو پھر گھر والی کا کیا کام؟ ویسے بھی تم دن بھر ٹی وی دیکھنے کے علاوہ کرتی ہی کیا ہو کوئی کھانا پکانے کا پروگرام دیکھ لو تو شاید کچھ سیکھ ہی جاؤ۔'' اس نے تپے، تپے انداز میں پوچھا۔

''میں نے تمہارے لیے اپنے والدین کے فیصلے کے خلاف جا کر تمہارا رشتہ قبول کیا، اپنی سہیلیوں کو چھوڑا کیونکہ وہ تمہیں پسند نہیں تھیں، یہاں تک کہ اپنی لگی لگائی جاب چھوڑ دی۔ اپنے کیریئر سے منہ موڑا، ہر بات مانی اور تم مجھے اس قربانی کا صلہ یہ دے رہے ہو۔'' التجا نے روتے ہوئے کہا۔

کورونا وائرس کے باعث پیدا ہونے والی صورت حال

☆ جب سے لاک ڈاؤن ہوا ہے ہم سب گھر پر بیٹھے ہوئے ہیں، مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے کہ اپنی فیملی کے ساتھ اچھا وقت گزر رہا ہے۔ اپنے رشتے داروں سے ہم نہیں مل سکتے۔ اس کا دکھ ہے مثبت تبدیلی یہ آئی ہے میرے اندر کہ مجھے لگتا ہے وقت بہت ہے میرے پاس تو میں نے خاصی ایسی چیزیں شروع کر دیں جو میں نے پہلے کبھی نہیں کیں۔ پینٹنگ، اسکیچنگ، وہ بھی شاید اس لیے کہ میرے پاس باہر کا کوئی کام نہیں گھر کے کام ہیں جو ظاہر ہے ہم سب مل کر کرتے ہیں۔

حنا علی رضوی۔ گھریلو خاتون..... شارجہ

☆ مشکل لگتا ہے اپنے پیرنٹس کو اتنی، اتنی دیر بعد ملنا اور اگر مل بھی لیں تو دور بیٹھ جاتے ہیں۔ stress بڑھ گیا ہے۔ ہر چیز کو صاف کرنے کی ٹینشن لگی رہتی ہے ہوم اسکولنگ کا اضافی کام ہے۔

ڈاکٹر توصیف اظہر النہدہ، شارجہ

''ہاں تو کیا ہوا؟ میں نے بھی تو تمہاری خاطر اپنا بڑا سا گھر چھوڑ آرام و آسائش چھوڑ کر اس فلیٹ میں شفٹ ہوگیا کیونکہ ممی تمہیں پسند نہیں تھیں۔'' طلال نے بھی طعنہ مارنا ضروری سمجھا۔

''کیا..... کہا.....؟ مجھے ممی پسند نہیں یا ان کو مجھ سے چڑ تھی..... وہ مجھے جینے نہیں دیتی تھیں..... اور میں نے تم سے کب الگ ہونے کا کہا تھا' وہ تو تمہارا اپنا فیصلہ تھا۔'' اس نے بھی چلا کر جواب دیا۔

''اچھا ٹھیک ہے..... اور وہ جو میں جاب کرتا ہوں تمہاری ضرورتوں کا خیال رکھتا ہوں..... اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' طلال کا انداز چڑانے والا ہوگیا، اب وہ بیوی سے تفریح لینے لگا۔

''ہاں تو کیا ہوا؟ شادی سے پہلے تو بڑے دعوے کرتے تھے کہ جان آسمان سے چاند ستارے توڑ کر تمہاری راہوں میں بچھادوں گا..... اب مجھے کمانے کے طعنے دینے لگے ہو۔'' اس نے بھی خاموش ہونے کی جگہ ترکی بہ ترکی لڑائی جاری رکھی۔

''ممی نے کتنا سمجھایا تھا کہ اس لڑکی سے شادی نہ کرو..... ساری عمر انگلیوں پر نچا کر رکھے گی مگر میری آنکھوں پر تو تمہاری محبت کی پٹی بندھ گئی تھی۔'' وہ چھیڑنے سے باز نہیں آرہا تھا۔

''میرے پاپا..... بھی کہتے تھے یہ بڑے گھر والوں کی آنکھوں میں وفاداری نہیں ہوتی مگر میں ہی بیوقوف بنتی چلی گئی۔'' اس نے بھی چلا کر سنایا۔

''ہاں..... تو اب ہوگئی ناں غلطی..... مت ماری گئی جو اتنی ساری حسین و جمیل لڑکیوں کو چھوڑ کر تم سے شادی کا فیصلہ کرلیا۔'' اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ التجا کے دل پر جیسے گولہ بن کر پھٹے وہ ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر اسے دیکھتی چلی گئی تو اسے احساس ہوا کہ کچھ غلط ہوگیا ہے، جانتا بھی تھا کہ اس معاملے میں وہ کتنی جذباتی اور حساس ہے مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا اب واپس موڑنا ناممکن تھا۔

☆☆☆

''طلال معافی مانگو اس بات پر.....'' وہ ایک دم بپھر اٹھی۔

''کیا..... معافی اور میں مانگوں؟'' اس نے بھویں اچکائیں۔

''ہاں..... ہاں..... تمہیں اس بات پر معافی مانگنی پڑے گی۔'' اس نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔

''شٹ اپ التجا..... میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جو معافی مانگوں۔'' ہمیشہ جھکنے والا طلال جانے اس بار کیوں اکڑ گیا۔

''دیکھو..... اگر تم معافی نہیں مانگو گے تو..... تو.....'' التجا نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑی۔

''تو..... کیا؟'' وہ بھنایا۔

''میں یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔'' التجا نے دھمکایا۔

''اگر ہم دونوں کا رشتہ اتنا ہی کچا ہے تو تمہیں یہاں سے جانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' ہمیشہ منانے والے طلال کی مردانہ انا اس بار جاگ گئی تھی۔

''میں جارہی ہوں۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے زور سے کہا۔

''جاؤ..... بالکل جاؤ..... مگر جہاں تک سواری کی بات ہے وہ تو میں بالکل نہیں کروں گا۔'' اس کی نہ ہاں میں نہیں بدلی۔

''ٹھیک ہے..... میں تمہیں چوبیس گھنٹے کا وقت دیتی ہوں۔ اگر تم نے اپنے الفاظ واپس نہیں لیے تو میں کل یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی، کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گی اور نہ ہی تم مجھے کال کرنا..... آیا سمجھ میں۔'' اس نے جھلا کر شوہر کو دیکھا۔

''ارے جانا ہے تو ابھی جاؤ..... چوبیس گھنٹے کا بہانہ کیوں؟'' وہ بھی ضد میں آگیا یا شاید اپنی محبت کو آزمانا چاہتا تھا۔

''دیکھ لو..... واپس نہیں آؤں گی۔'' التجا نے ایسے دیکھا جیسے وہ چاہتی ہو کہ شوہر اسے روک لے۔

''مت آنا..... میں بھی تمہارے بغیر مر نہیں جاؤں گا..... کہو تو کال کر کے ٹیکسی منگواؤں؟'' وہ ٹس سے مس نہ ہوا، الٹا فون کے نمبر پریس کرنے لگا۔

''یہ احسان کرنے کی بھی ضرورت نہیں میں پاپا

کو بلا لیتی ہوں۔'' اس نے ہاتھ سے فون چھیننا چاہا تو طلال نے اسے پیچھے دھکیلا اور غصے میں دھپ، دھپ کرتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ شام کو گھر لوٹا تو ڈرتے، ڈرتے اندر داخل ہوا، ساری لائٹس بند تھیں انہیں جلایا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا کچھ دیر لاؤنج میں کھڑے ہو کر چاروں طرف نگاہیں گھما کر جائزہ لیا۔ ہر سو خاموشی چھائی ہوئی تھی، اس کا دل زور سے دھڑکا۔

''کہیں سچ مچ میں چلی تو نہیں گئی؟'' وہ گھبرا اٹھا۔

''اگر جاتی تو باہر کا دروازہ ڈبل لاک ہوتا.....'' اس نے خود کو حوصلہ دینا چاہا۔

''چائے بنانے کے لیے آواز دوں کیا؟'' من میں سوچا۔

''بلاوجہ سر پر مزید چڑھ جائے گی.....خود ہی بنا لیتا ہوں۔'' وہ کچن میں داخل ہوا اور لائٹ آن کر کے دودھ فریج سے نکال کر گرم پر رکھا۔

''ہر وقت کی چخ، چخ سے تنگ آ گیا ہوں۔'' اس نے چائے کا پانی چولھے پر رکھتے ہوئے سوچا۔

''ہر بار میں ہی کیوں مناؤں.....اتنی دیر میں اگر ایک فون کر کے مجھے بلا لیتی تو میں مان جاتا مگر کہاں مہارانی کا تو دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا ہے۔'' اس نے کھولتے پانی میں پتی ڈالتے ہوئے اندر کی کھولن پر قابو پایا۔

''بھوک سے جان نکل رہی ہے مگر محترمہ کو تو بس اپنی ہی پڑی رہتی ہے، فلاں کو کیوں دیکھا، ڈھمکاں سے بات کیوں کی، مسکرائے کیوں؟'' وہ جل بھن کر بڑبڑانے لگا

''اُف.....'' اس نے بے خیالی میں اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی گرم چائے کا سپ لیا اور زبان جلا بیٹھا۔ اسی وقت التجا اندر داخل ہوئی اور اس کی حالت پر مسکرا دی۔ اسے بھی بیوی کو گھر میں دیکھ کر سکون حاصل ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ کمرے سے لاؤنج میں آیا تو التجا کے پاس پڑوس میں رہنے والی حنا بیٹھی تھی دونوں کو باتوں میں مصروف پایا۔ سلام کرنے کے بعد وہ گیلری میں جا کر کھڑا ہو گیا مگر اس کے کان ان دونوں کی باتوں کی طرف ہی لگے ہوئے تھے۔

''کیا.....سچ میں اوپر والی شبانہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر میکے چلی گئی ہے؟'' التجا نے جان بوجھ کر زور سے کہا۔

''ہاں ناں.....اور تو اور اپنے پانچ بچوں کو بھی شوہر کے حوالے کر گئی ہے۔'' حنا نے چٹخارا بھرتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہ تو پھر.....ارشد بھائی کا کیا بنا؟'' اس نے زور سے پوچھا۔

''کسی بچے کی ناک پونچھ رہے ہوتے ہیں، کسی کی نیپی بدل رہے ہوتے ہیں اور کسی کو نوڈلز بنا کر کھلا رہے ہوتے ہیں۔'' حنا کا قہقہہ طلال کو زہر سے بدتر لگا۔

''ہاں.....تو شبانہ نے بالکل ٹھیک کیا۔ بعض مرد ایسے ہی ہوتے ہیں جنہیں اپنی بیویوں کی خدمت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ انہیں چھوڑ کر چلے جانا چاہیے۔'' اس نے شوہر کو سنایا۔

''اور کیا.....سنا ہے ہاتھ جوڑ کر بیوی کو منانے گئے ہیں۔'' حنا نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ہاں.....تو اپنی غلطی ہو تو معافی مانگ لینی چاہیے۔'' التجا نے غلطی پر زور دے کر کہا۔

''اچھا.....چھوڑو ان باتوں کو کل پاس والے مال میں کپڑوں کی سیل لگی ہوئی ہے.....چلو گی میرے ساتھ۔'' حنا نے بات بدلی۔

''نہیں یار.....میں تو آج امی کی طرف رہنے جا رہی ہوں۔'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔

''اچھا.....اچانک میکے جانے کا پروگرام بنا لیا.....واپسی کب تک ہوگی؟'' حنا نے پوچھا۔

''ابھی کچھ نہیں پتا.....ہو سکتا ہمیشہ کے لیے وہیں رہ جاؤں۔'' جذبات میں اس کے منہ سے نکلا تو طلال بری طرح سے تپ گیا۔

''کیا مطلب؟'' حنا کا انداز سن گن لینے والا ہوا۔

''کچھ نہیں یار مذاق کر رہی تھی۔'' اس نے دھیرے سے کہا تو حنا اسے یوں تکنے لگی جیسے دال میں کچھ کالا ہو۔

☆☆☆

وہ حنا کے جانے کے بعد انجان بنی گیلری میں آکر کھڑی ہوگئی۔ اسی وقت طلال نے موبائل کانوں سے لگایا اور اسے سنانے کے لیے جھوٹ موٹ کی باتیں کرتا چلا گیا۔

''کیا ہوا..... سمیع؟'' وہ زور سے ہنستے ہوئے بولا۔

''بھائی سے جھگڑا ہوگیا۔ ابے مرد بن مرد۔'' اس نے جان بوجھ کر بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا، میکے جانے کا بول رہی ہے..... ہاں تو، تو خود چھوڑ کر کیوں نہیں آتا۔'' طلال نے آواز کو بلند کیا تو التجا نے گھورا۔

''اور سن بالکل معافی نہیں مانگنا، ہم نے معافیاں مانگ مانگ کر ہی تو اپنی بیویوں کو سروں پر چڑھا لیا ہے۔ یہ سمجھتی ہیں کہ ہم ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔'' اس نے استہزائیہ ہنسی چہرے پر سجائی۔

''اچھا ہے..... تیری بھابی بھی میکے جانے کا بول رہی ہے..... دونوں چلی جائیں تو ہم بھائی مل کر پارٹی کرتے ہیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے جھوٹ موٹ کی کال کاٹ دی۔ التجا نے بھویں اچکا کر شوہر کو مشکوک انداز میں دیکھا اور سوکھے ہوئے کپڑے اتار کر اس کے سامنے یوں جھاڑ جیسے ہاتھ میں طلال ہو اور وہ اس کی درگت بنا رہی ہو۔

''اس وقت کس کا فون آگیا؟'' اچانک طلال کا فون سچ مچ میں بجنے لگا۔ اس نے فون کانوں سے لگایا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ کمرے میں آیا اور بیڈ کے نیچے سے اپنا سوٹ کیس کھینچ کر نکالا اور وارڈ روب سے عجلت میں کپڑے نکال، نکال کر رکھنے لگا۔ التجا کمرے میں آئی تو حیرت زدہ سی اس کی پیکنگ کو دیکھنے لگی۔

''اس کو کیا ہوا؟'' دل ایک دم پریشان ہونے لگا۔

''کیا..... یہ مجھے چھوڑ کر جا رہا ہے.....؟'' التجا نے سوچا اور وجود میں تھرتھری سی مچی۔

''اسے یہ بھی یاد نہیں کہ کچھ دیر بعد ہماری زندگی کا سب سے خوشگوار اور قیمتی وقت شروع ہونے والا ہے۔'' التجا کو افسوس ہوا۔

''اتنی رات کو جا کہاں رہا ہے، کہیں اپنی ماں کی طرف تو شفٹ نہیں ہو رہا؟'' اسے بڑی دیجمی سے پیکنگ کرتا دیکھ کر سوچا۔

''کیا ہوا جو میں اسے منالوں؟'' دماغ نے سمجھایا۔

''لیکن پیار سے سوری بول دینا تو اس کا کیا چلا جاتا؟'' اسے اپنا مان ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔

''اس نے ہی تو میری عادتوں کو بگاڑا ہے۔ اب معافی نہیں مانگ رہا.....'' اس نے بچوں کی طرح منہ پھلا کر اسے گھورا۔

''مگر ہمیشہ وہ ہی تو مجھے مناتا ہے، اس بار میں منالوں گی تو کیا ہو جائے گا۔'' التجا نے اقرار کیا۔

''شاید..... وہ بھی مجھ پر ایسا ہی مان رکھتا ہو۔'' دماغ نے سمجھایا تو وہ شوہر کو منانے کے لیے خود کو منانے لگی۔

☆☆☆

طلال کو اپنی پشت پر بیوی کی نگاہوں کا احساس ہوا مگر وہ سر جھکائے خاموشی سے اپنا سامان رکھتا رہا۔ اسے آفس کی طرف سے اچانک ایک میٹنگ کے سلسلے میں اسلام آباد جانا پڑ گیا تھا۔ دراصل اس میٹنگ میں اس سے سینئر آفیسر جا رہے تھے مگر اچانک ان کی والدہ کی ڈیتھ ہوگئی، ایمرجنسی میں قرعہ فال اس کے نام نکل آیا..... بات بھی ایسی تھی کہ وہ منع نہیں کر سکتا تھا۔ حالانکہ ان حالات میں التجا کو چھوڑ کر جانے کا من نہیں کر رہا تھا۔

''چلو اچھا ہے ایک ہفتے کے لیے اس سے دور رہوں گا تو میری قدر جان جائے گی۔'' طلال نے افسردگی سے سوچا۔

''کیا تھا کہ اس بار وہ شروعات کر دیتی، ہمیشہ تو

میں نے ہی اس کا مان رکھا ہے۔ اس بار وہ مجھے پکار لیتی تو مجھے بھی اس کی نظروں میں اپنی اہمیت کا اندازہ ہوتا۔'' وہ سوٹ کیس بند کرتا ہوا دکھی ہوا۔

☆☆☆

دروازے پر بیل ہوئی، اس نے جا کر دروازہ کھولا، آفس کا ڈرائیور کھڑا تھا۔ اسے سامان اٹھانے کے لیے اندر بلایا۔

''صاحب یہ لے جاؤں؟'' ڈرائیور نے اسے سوچوں میں گم دیکھا تو پوچھا۔

''ہاں..... تم یہ لے کر جاؤ..... میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔'' وہ سر ہلا کر بولا۔

''کوئی بات نہیں صاحب میں گاڑی میں بیٹھا ہوں..... آپ آرام سے آجایئے گا۔'' ڈرائیور نے دانت نکال کر کہا اور مؤدب انداز میں مڑ گیا۔

''اوہ تو آفس ٹور پر جا رہا ہے۔'' التجا نے ڈرائیور کی باتوں سے اندازہ لگایا۔

''کتنی ڈھیٹ ہے، اب تو پتا چل گیا ہے میں جا رہا ہوں مگر مجال ہے جو منا لے.....'' طلال کو غصہ آ گیا۔

''جا رہا ہے..... مگر مجھے بتانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی..... پتا ہے مجھے اکیلے کتنا ڈر لگتا ہے۔'' اسے ایک بار پھر غصہ آ گیا۔

''یہ کبھی سوری نہیں بولے گی..... جاتے، جاتے میں ہی اسے منا لیتا ہوں ورنہ روتی رہے گی۔'' طلال کو بیوی پر غصے کے ساتھ پیار بھی آیا۔

''اس بار تو تمہیں ہی سوری بولنا ہوگا..... ہمیشہ وہ تمہاری محبت کا مان رکھتا ہے، اس بار تم اسے چاہت کا احساس دلاؤ تو کیا برا ہے۔'' التجا نے خود کو جھڑکا اور دھیرے سے چلتی ہوئی اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ اتنے میں طلال بھی اسے منانے کے لیے مڑا۔

''سوری..... اینڈ آئی لو یو۔'' دونوں کے ہونٹوں سے ایک ساتھ یہ الفاظ نکلے اور ساتھ ہی گھڑی نے بارہ بجائے۔

''ہیپی اینورسری.....'' دونوں نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا اور شادی کی سالگرہ کی مبارک باد دی۔

''اب تو معاف کر دو۔'' طلال نے وارفتگی سے بیوی کو دیکھا اور جیب سے گولڈ کی رنگ نکال کر اس کی موی انگلیوں میں پیار سے پہناتے ہوئے سرگوشی کی۔

''سوری..... غلطی میری بھی ہے بلاوجہ شک کرتی ہوں۔'' اس نے دھیرے سے سر ہلاتے ہوئے اعتراف کیا۔

''وعدہ کرو آئندہ کبھی مجھ پر شک نہیں کرو گی۔'' طلال نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے وعدہ لیا۔

''آئی پرامس کبھی تم پر شک نہیں کروں گی۔'' اس کا لہجہ بھی محبت سے چور، چور ہوا۔

اتنے میں طلال کا فون بجنے لگا۔ التجا نے چڑ کر اس کا فون چھینا اور نام دیکھتے ہی لال پیلی ہونے لگی۔

''یہ اتنی رات کو ماریہ کس خوشی میں تمہیں کال کر رہی ہے؟'' وہ طلال کو اسکرین پر چمکتا ہوا نام دکھاتے ہوئے چلائی۔ اس نے بیوی کو دیکھا اور سر پیٹنے لگا، سارے وعدے ہوا ہو گئے۔

''بتاؤ ناں..... یہ کیوں فون کر رہی ہے؟'' اس نے طلال کو جھنجوڑا۔

''اوہ..... پھر سے شروع ہو گئی..... یار میں نے اسے اپنی اینورسری کا بتایا تھا شاید مبارک باد دینا چاہ رہی ہوگی۔'' طلال نے صفائی پیش کرنا چاہی۔

''نہیں..... نہیں..... میں کچھ بھی کر لوں تم نہیں سدھرو گے۔'' التجا روتے ہوئے ایک بار پھر سے شروع ہو گئی تھی۔

''التجا ایسی کوئی بات نہیں اچھا چلو تم خود بات کر لو۔'' اس نے فون بیوی کی طرف بڑھایا جو مسلسل بج رہا تھا۔

''بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری ماریہ۔'' اس نے فون پرے کیا اور دوڑتے ہوئے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ طلال نے بریف کیس اٹھا کر ائرپورٹ جانے میں ہی عافیت جانی۔ چچا کو وہ پہلے ہی فون کر چکا تھا کہ اسے چار دن کے لیے لے جائیں اکیلے میں ڈرے گی۔

میں انمول

سعدیہ رئیس

پانچواں حصہ

صبح کی سرمست سی ہوا نے اس کے مزاج میں بھی مستی سی بھر دی تھی۔ اس نے گنگناتے ہوئے فلاسک میں چائے ڈال کر فلاسک کا ڈھکنا بند کیا۔ مگ اور شوگر پاٹ وغیرہ وہ پہلے ہی باسکٹ میں رکھ چکی تھی۔

''ایسا کب تک چلے گا سمیرا..... تین دن میں کوئی رسپانس نہیں آیا۔'' شافعہ ناز نے اچانک ہی وہاں آ کر سمیرا سے پوچھا۔

''امید پر دنیا قائم ہے امی جان.....'' وہ ترنگ میں آ کر بولی۔ کسی فکر، اندیشے یا خوف کے آثار اس کے خیالوں میں نہ تھے۔ بے حد مگن اور بے فکری تھی وہ۔ دو دن سے روز صبح ظفر کا ناشتا پانی وہی لے کر جا رہی تھی۔ دوپہر کا لنچ وہی دے کر آتی تھی البتہ رات کو دونوں باہر ہی کہیں کھا لیتے تھے مگر اب شافعہ ناز کو یہ سب کچھ کھٹک رہا تھا۔

''تم کب تک اسے یوں چھپ چھپا کر جا کر ناشتا پانی دیتی رہو گی۔ ابھی تو بات کھلی نہیں لیکن اگر ارد گرد کسی کو ہوا بھی لگ گئی تو جینا حرام ہو جائے گا ہمارا اور بدنامی الگ.. مجھے تو کوئی پوزیٹو رزلٹ نظر نہیں آ رہا۔'' انہوں نے اس کی شرارتی سی مسکراہٹ کو قطعاً نظر انداز کر کے بے حد سنجیدگی سے پوچھا۔

''امی پلیز..... بس کچھ دن اور..... فی الحال تو ظفر کی والدہ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اب بہتر ہونے کے بعد کچھ نہ کچھ تو ہو گا ہی۔'' وہ بے حد مطمئن تھی۔

''یہ کوئی اچھی بات نہیں.. اگر طبیعت زیادہ بگڑ گئی تو کون ذمے دار ہو گا۔ تم تو اسے ایڈونچر سمجھ کر کر رہی ہو مگر کسی کی جان پر بن گئی ہے۔ سوچو ذرا کیا تم یہ ٹھیک کر رہی ہو؟ بلکہ مجھے تو اب افسوس ہو رہا ہے خواہ مخواہ تمہاری باتوں میں آ کر تمہیں اس فضول ڈرامے کی اجازت دی۔'' وہ ناراضی سے بولیں۔

''امی..... یہ میری زندگی کا سوال ہے اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ ایک کوشش کررہی ہوں۔'' اس نے منت بھرے انداز میں کہا۔

''تم بھی تو سوچو کہ تمہارا کیا امیج بنے گا وہاں..... پسند کی شادیوں میں لڑکیوں کو وہ عزت نہیں ملتی جو کہ ملنی چاہیے۔ نہ ہی کوئی ان کو دل سے قبول کرتا ہے۔ سسرال میں ساری زندگی.... طعنے ملتے رہتے ہیں۔ بہت مشکل راستے کا انتخاب کرلیا تم نے۔'' وہ بے حد متفکر اور الجھی ہوئی لگ رہی تھیں۔

''امی..... سوئٹ امی..... آپ پریشان نہ ہوں..... میں نے کہا ناں میں خود پیچھے ہٹ جاؤں گی اگر بات نہ بنی تو..... اور پھر ارینج میرج میں کون سا اچھا سلوک کیا جاتا ہے بہوؤں کے ساتھ۔ کون اتنا مہمان اور شریف النفس ہوتا ہے کہ بھولا کر عزت دیتا ہے۔ معاف کیجیے گا امی..... بے شک میری عمر چھوٹی ہے مگر میرا مشاہدہ بہت وسیع ہوگیا ہے۔ میں نے لوگوں کو اپنی پسند کی بہوؤں کے ساتھ بھی بیر پالتے ہی دیکھا ہے عموماً۔ سب چاہتے ہیں کہ آنے والی کو دو کوڑی کا کر کے رکھیں، ہم سے دب کر رہے۔ اپنے شوہر پر حاوی نہ ہو اور اس خوف میں کیسی .... بے سروپا اور دل دکھانے والی باتیں کرتے ہیں اس کے ساتھ۔ کیا میں نہیں جانتی یہ سب۔'' اس نے بے خوفی سے ان کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

شافعہ ناز سٹپٹا سی گئیں۔ وہ اس کے سامنے اکثر لاجواب ہو جاتی تھیں۔ وہ غضب کی ذہین اور باریک بین تھی اور پھر یہ عمر تو ہوتی ہی بے خوف ہے۔ کچھ وہ فطرتاً بھی نڈر تھی۔

''خیر..... ہر جگہ ہر ایک کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔'' وہ کمزور انداز میں بولیں۔

''ہوں..... آپ کی بات صحیح ہے مگر 95 فیصد ایسا ہی ہوتا ہے اور صرف وہی لڑکی سر اٹھا کر جیتی ہے جس کا شوہر مالی اعتبار سے مضبوط ہو اور ہر معاملے میں اس کا ساتھ دے اور ظفری پر مجھے پورا اعتماد ہے۔'' وہ اتنے یقین سے بولی کہ شافعہ ناز اسے دیکھتی رہ گئیں۔

''بہرحال جلد سے جلد اس معاملے کو نمٹانے کی کوشش کرو۔'' انہوں نے تاکیداً کہا۔ وہ سمجھ چکی تھیں کہ وہ سمجھنے سمجھانے کی حد سے گزر چکی ہے۔ اس کے پاس ہر بات کا جواز موجود ہے۔ انہوں نے خود بھی ظفر سے اس معاملے پر بات کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ سمیرا سے بات کرنی بیکار تھی۔

وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ بھوک کے مارے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ ایک تو رات بھر کی بے آرامی، تنہائی اور آئندہ کے وسوسے اسے سونے نہیں دے رہے تھے اور اب ناشتے میں اتنی دیر اسے گراں گزرنے لگی۔ حرمین سے اسے روز پل، پل کی رپورٹ مل رہی تھی۔ گھر میں ہونے والی ایک، ایک بات سے وہ آگاہ تھا۔ جب صبر کی آخری حد ختم ہونے لگی تو وہ باہر کسی ہوٹل پر ناشتا کرنے کے ارادے سے ابھی گیٹ تک پہنچا ہی تھا کہ مسکراتی ہوئی سمیرا چلی آئی۔

''شکر ہے آگئیں..... کون سی ٹرین سے آئی ہو جو اتنی دیر لگادی؟'' وہ ناراضی سے بولا۔

''ارے..... ارے..... صبح، صبح خیر تو ہے کیوں کاٹ کھانے کو دوڑ رہے ہو؟'' اس کی بھوک سے اتری شکل دیکھ کر وہ سمجھ تو گئی تھی کہ کیا وجہ ہے مگر انجان بن کر معصومیت سے پوچھا۔

''خود گزارو ناں اس طرح اندھیرے اور اکیلے میں رات تو پتا لگے۔'' وہ تپ کر بولا۔

سمیرا کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ ہنسنے میں مصروف رہی اور ظفری بھوکوں کی طرح ناشتے پر ٹوٹ پڑا۔ آج اس نے رسماً بھی سمیرا کو ناشتے کی دعوت نہیں دی۔

''تو اور کرو عشق..... ذرا سی مشکل سے گھبرا گئے۔ ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں بھی تو تھے۔ ایک دوسرے کے لیے کیسے پاپڑ بیلے انہوں نے۔'' وہ چھیڑنے لگی۔

''جی..... پک وا پوائنٹ..... دونوں نے..... صرف ایک نے نہیں۔ دربدری صرف میں بھگت رہا ہوں، لعن طعن بھی میں ہی سہہ رہا ہوں اور وہ زمانے گئے ہیر رانجھا والے..... یہ ماڈرن دور ہے۔ کچھ لو اور کچھ دو۔'' وہ انڈے، ڈبل روٹی کا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔

''اونہوں..... بدھضمی ہوگئی تم کو تو..... محبت راس

نہ آئی..... اپنا نظر آرہا ہے اور میں جو روز کسی داسی کی طرح تمہارا ناشتا لے، لے کر آرہی ہوں وہ کچھ نہیں..... ویسے بھی آج صبح، صبح امی سے جھاڑ پڑ گئی۔'' اس نے اپنا حال سنایا۔

''واٹ، یعنی میم بھی..... اوہ نو..... ہم تو برے پھنسے...اب کیا کریں؟'' وہ پریشان ہوگیا۔

''جی..... امی کی یہی شرط ہے کہ تمہارا کوئی سرپرست آکر بات کرے پھر کوئی قدم اٹھایا جائے گا۔ ایسے ہی کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ کرو ظفری ورنہ تم مجھے کھو دو گے، ہمارا ڈراما فلاپ ہو جائے گا۔'' اس نے زور دیا۔

''کیا کروں؟ عجیب صورتِ حال ہوگئی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''یہ سب تمہاری غلطی ہے۔ بات اتنی نہ بڑھتی اگر تم نے پہلے اپنے گھر میں بات کر لی ہوتی۔ تمہارے اندر ہمت کی کمی ہے اور ظفری مائنڈاٹ میں صرف تمہارے بل بوتے پر اس گھر میں جاؤں گی، تم کو میرا ہر قدم پر ساتھ دینا ہوگا۔ اگر تم میں ہمت نہیں تو ابھی بتا دو۔'' صبح ماں کی باتیں سن کر وہ بھی کچھ اپ سیٹ سی ہوگئی تھی۔

اس کی شکل اتر گئی۔ ایسے ناموافق حالات میں اگر سمیرا ساتھ چھوڑ دیتی تو باقی کا بچتا پھر۔

''سمیرا ایک بار معاملات سیٹ ہونے دو..... اور بھروسا رکھو میں تمہیں پوری عزت اور شان سے اپنے گھر لے کر جاؤں گا۔'' اس نے بڑے اعتماد سے اسے یقین دہانی کرائی۔

درحقیقت وہ خود بھی ... اسی سوچ میں الجھا ہوا تھا کہ آخر یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ آج تیسرا دن تھا اور حالات جوں کے توں تھے۔ سمیرا کے جانے کے بعد سے وہ اسی سوچ میں الجھا ہوا تھا۔ کچھ دیر باہر اپنے کام سے گیا واپس آیا تو خالی کمرے، خالی جگہوں میں وحشت سی ہونے لگی۔ امتحانات کے بعد آج کل اسکول کی چھٹیاں تھیں اس وجہ سے اور بھی سناٹا ہو رہا تھا۔ دس بجے تک دیگر ٹیچرز آجاتے اور وہ ان کے آنے سے پہلے وہاں سے نکل جاتا ایسا بن جاتا جیسے ابھی آیا ہے مگر اب وہ خود کوفت میں مبتلا ہو رہا تھا۔ مسئلہ گمبھیر ہو گیا تھا اور نتیجہ صفر لگ رہا تھا۔

دوپہر کو سمیرا لنچ لے کر آئی مگر اس سے بھوک کے باوجود کچھ کھایا نہ گیا۔ تین دن میں وہ خاصا جھٹک گیا تھا۔

سمیرا نے بغور اسے دیکھا۔ ہلکی بڑھی ہوئی شیو، شکن آلود لباس اور رتجگوں سے سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ وہ دل میں اترتا جا رہا تھا۔ سمیرا نے دل کی شور مچاتی دھڑکنوں کو ڈپٹ کر اس سے نظر چرائی۔

''شیو تو بنا لیتے کم از کم..... اور کپڑے بھی کتنے رف ہو رہے ہیں۔'' اس نے ٹوکا۔

''میرا کچھ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔ گھر سے کوئی پلٹ کر ہی نہیں آیا۔ خود وہاں جاؤں گا تو ایک قیامت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اماں تو میرا نام سننا بھی پسند نہیں کر رہیں۔'' اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں دل کا حال سنایا۔

''اور ادھر امی میرے پیچھے پڑی ہیں کہ ظفر سے کہو کہ اپنے کسی بڑے کو بھیجے۔'' سمیرا نے ایک نیا شوشا چھوڑا۔

''یار..... میم کو پتا نہیں کیا جلدی پڑ گئی۔ کیا مجھ پر بھروسا نہیں انہیں اور پھر ہمارے لیے ان کی سرپرستی کافی تھی مگر وہ بھی فضول کی شرط لگا رہی ہیں۔ اماں کو منانا ناممکن ہے۔ ہمیں جو کرنا ہے خود کرنا ہے۔ میری مانو..... میم کو راضی کر لو وہ ہماری سرپرستی کر لیں۔ نکاح کے بعد میں ڈٹ کر مقابلہ کر سکتا ہوں۔ میں تمہیں تمہارا حق دلواؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔'' وہ جیسے گھر والوں کی طرف سے بالکل ناامید تھا۔

''ناممکن..... امی یہ سارا ڈراما کرنے پر اسی شرط پر راضی ہوئی تھیں کہ منگنی ٹلنے کے بعد باقاعدہ طور طریقے سے سارا کام ہوگا ورنہ..... کوئی چانس نہیں۔'' سمیرا نے ٹکا سا جواب دیا۔

آج کلاس ہونی تھی جو اس نے کینسل کر دی اور خود چہل قدمی کرتا کوچنگ کے عقبی حصے میں آگیا۔ جہاں کچھ پرانا فرنیچر کاٹھ کباڑ کی طرح پڑا تھا۔ ایک چھوٹا کمرا، پرانی ردی اور شافعہ ناز کے کچھ پرانے گھریلو سامان سے بھرا تھا۔ یہ حصہ اندھیرے میں ڈوبا رہتا تھا مگر اس وقت ایک چھوٹا سا بلب وہاں جل رہا تھا۔ دفعتاً اسے وہاں ایک سایہ

سا نظر آیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور حرمین کو وہاں اکیلے دیکھ کر چونک گیا۔

''حرمین..... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اس نے مشکوک نظروں سے آس پاس دیکھا۔ ایک لمحے کو حرمین کی رنگت متغیر ہوئی مگر پھر خود پر قابو پا کر وہ دوڑ کر اُس کے پاس آ گئی۔

''چاچو..... میں چپکے سے آپ کے پاس آئی ہوں۔ وہاں گھر میں بڑی باتیں ہو رہی ہیں۔ دادی بہت غصے میں ہیں شاید آج دادا آپ سے ملنے آئیں۔'' اس نے بے ربط سے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے چوکنا سے انداز میں کہا۔ وہ بہت ڈری ہوئی لگ رہی تھی۔ ظفر کو اس پر بہت پیار آیا۔ اس کی خاطر وہ کیسے چپکے سے اسے سب بتانے چلی آئی تھی۔

''تم یہاں اکیلی آ گئیں۔ آفس میں آ جاتیں میرے پاس۔'' وہ اسے سمجھانے لگا۔ اسی وقت آہٹ ہوئی۔ اس کے ساتھ حرمین نے بھی چونک کر اُدھر دیکھا۔ وکی کو آتا دیکھ کر حرمین کا رنگ اڑ گیا۔ یوں رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ سامنے سے وکی مگن سے انداز میں چلا آ رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں تھا اور دوسرے ہاتھ میں موبائل تھامے وہ اس کی اسکرین پر نظریں جمائے چلا آ رہا تھا مگر جب سر اٹھا کر سامنے سر ظفر کو دیکھا تو خون خشک ہو گیا۔

''وکی..... تم اِدھر کیسے؟'' کچھ سمجھتے ہوئے ظفر نے دونوں کو باری، باری دیکھا۔

''وہ..... اسے میں نے کہا تھا چاچو یہاں آنے کے لیے..... آپ کو بلانے کے لیے بھیجا تھا میں نے وکی کو۔'' بروقت حرمین نے بہترین بہانہ گھڑا جو صورتِ حال کے عین مطابق تھا۔

''جج..... جی..... سر آپ مجھے وہاں کہیں نظر ہی نہیں آئے تو میں حرمین کو بتانے آیا تھا۔'' وکی کے چہرے کی رنگت بحال ہو گئی اس نے کچھ اٹک کر حرمین کی بات کی تائید کی۔

''ہوں.....'' وہ اس صورتِ حال پر زیادہ غور نہ کر سکا کیونکہ خود اس کا اپنا معاملہ پیچیدہ سا ہو گیا تھا۔

''چلو اندر چلتے ہیں۔ جاؤ وکی شکریہ تمہارا..... آؤ حرمین میرے ساتھ۔'' اس نے حرمین کو ساتھ لیا اور ایک خالی کلاس میں چلا آیا جہاں تفصیل سے اس سے ساری باتیں سن سکے۔

''اوہ خدایا.....'' حرمین کی زبانی گھر کی باتیں سن کر اس نے بے بسی سے ہتھیلی پر مکا مارا۔

حالات میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی ہلچل نظر آ رہی تھی۔ نہ ہی کامیابی کے امکانات لگ رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں پر سر گرائے بت بن کر بیٹھ گیا۔ حرمین کلاس سے باہر آئی۔ وکی کو دور سے اشارہ کیا۔ وہ بڑے ہی غیر محسوس انداز میں اس کے پاس آ گیا۔

''پہلے میں اپنی کلاس لے لوں..... پھر واپسی میں آئس کریم کھاتے ہوئے گھر چلیں گے۔'' حرمین نے پروگرام ترتیب دیا۔

''ایز یو وش..... مائی لو.....'' وکی ایک ادا سے ہلکا سا خم ہوا۔

''اچھا، فلم نہ چلاؤ..... اور جاؤ اب۔'' حرمین نے اسے گھورکا اور اس سے پہلے خود دوسری طرف نکل گئی۔

وہ کڑک چائے کا ایک کپ پی کر بیٹھا تھا مگر سر اب بھی بھاری ہو رہا تھا۔ کوچنگ کا وقت ختم ہونے والا تھا۔ اِکا دُکا اسٹوڈنٹس ہی رہ گئے تھے۔ حرمین اپنی کتابیں سنبھالے تیار کھڑی تھی کہ سامنے سے محبّ آتا دکھائی دیا۔

''اوہ نو.....'' اس نے مایوس نظروں سے وکی کو دیکھا جو کلاس کی آخری کرسی پر بیٹھا اپنی فائلز اور نوٹس سیٹ کر رہا تھا۔

''حرمین..... آپ روز لیٹ ہو رہی ہو۔ اس لیے میں آج لینے آ گیا آپ کو۔'' محبّ نے حرمین سے کہا تو حرمین نے الوداعی نظر وکی پر ڈال کر اسے جانے کا اشارہ کیا۔ آج کا پورا دن بور گزرا تھا اور دونوں پروگرام خراب ہو گئے تھے اس لیے حرمین بھی موڈ آف کر کے وہیں ایک کونے میں بیٹھ گئی۔

محبّ اور ظفر بغلگیر ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔

''یہ کیا حماقت کی تم نے.....'' محبّ نے بات کا آغاز کیا۔

حرمین نے انتہائی توجہ سے ان دونوں کی باتوں پر کان لگادیے کیونکہ اسے سمیرا کو بھی رپورٹ دینی تھی۔

☆☆☆

لاؤنج کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک غباروں سے آراستہ کیا گیا تھا اور فیاضی کی انتہا کرتے ہوئے اندرونی و بیرونی ساری لائٹیں کھول کر پورے گھر میں چکا چوند کردی گئی تھی۔ عصر کی نماز پڑھ کر آپا خاتون بصد اصرار کمرے سے باہر نکلیں تو خاص انتظامات دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ اتنی وافر مقدار میں بجلی کے زیاں پر ان کے چہرے پر برہمی جھلکنے لگی۔ انہوں نے باریک بینی سے سب طرف کا جائزہ لیا تو مزید جھٹکا لگا۔ لاؤنج کے وسط میں ایک اضافی ٹیبل لگائی گئی تھی اور اس پر فرانس کا خوب صورت ڈنر سیٹ پوری شان سے سجا ہوا تھا۔ کشن کور تبدیل کردیے گئے تھے اور کھڑکیوں، دروازوں پر رنگین آرائشی پٹیاں لٹک رہی تھیں۔ ان کی تیوری چڑھ گئی۔

''مجھ سے پوچھے بغیر کیا پروگرام ہو رہا ہے آخر..... کہیں.....'' ان کے ذہن رسا میں اندیشوں نے سر اٹھایا۔

انہوں نے ایک بار پھر سب طرف دیکھا۔ کئی دنوں سے ظفر والے واقعے کی وجہ سے جو سوگواریت سی سب طرف پھیلی تھی اس کی جگہ شادمانی نظر آرہی تھی۔ جس نے ان کے اس خدشے کو بھرپور تقویت دی کہ یقیناً یہاں ظفر اور اس کی بیوی کا استقبال ہو رہا ہے۔ اس سوچ نے ان کے اندر شرارے سے بھر دیے۔ غصے اور تنفر سے ان کی آنکھوں اور کانوں سے دھواں سا نکلنے لگا۔ جب ان کی مرضی کے بغیر ظفر اس گھر میں پاؤں نہیں دھر سکتا تھا تو پھر اب یہ سب کیا ہو رہا تھا۔

''یہ کیا فضول حرکتیں ہو رہی ہیں۔ کسی کی شادی ہو رہی ہے کیا؟'' حرمین مگن سی اُن کے پاس آئی تو اس کا بازو پکڑ کر انہوں نے کرختگی سے پوچھا۔

ان کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ کچن کیبنٹ میں سامان رکھتی حورعین کے ہاتھ رک گئے۔ غبارہ پھلاتے محب کا ہوا بھرنے کا عمل رک گیا اور غبارے کی ہوا نکل گئی۔ پورچ کے دروازے پر موجود جوجی نے بھی ان کی آواز سن لی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کولڈ ڈرنکس کے تھیلے تھے۔ وہ تیزی سے اندر آیا توقع کے مطابق صورت حال کشیدہ تھی۔ حرمین کی خوشی سے چمکتی رنگت بجھ گئی تھی۔

''ہم سب چاچو کی سالگرہ سیلیبریٹ کررہے ہیں۔'' جوجی کو سامنے پاکر اس کی ہمت بندھی تو تھوک نگل کر وضاحت دی۔

''جوجی کی سالگرہ.....'' انہیں جھٹکا سا لگا۔

انہیں تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔ اپنے غم میں وہ بھول ہی گئی تھیں ورنہ ہر سال وہ بڑے اہتمام سے اس کی سالگرہ منایا کرتی تھیں اور گھر میں زبردست سا کھانا پکا کر سب کی دعوت کرتی تھیں۔

''اے ہے، میں تو بھول ہی گئی تھی۔'' انہوں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''مگر اب کیے گا کیا..... میں نے تو کچھ کیا ہی نہیں۔'' وہ فکرمند ہوگئیں۔

''ارے اماں..... سب کچھ ہوگیا۔ آج ہم سب نے آپ کو سرپرائز دیا ہے۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ آپ خوش رہیں۔'' جوجی اُن کے قریب چلا آیا۔

''جیتے رہو..... سدا خوش رہو..... اور..... اور ماں باپ کے فرمانبردار رہو۔'' یہ کہتے سمے دکھ سے ان کی آواز بھرّا سی گئی۔

ظفر نے انہیں بہت دکھ پہنچایا تھا۔ ان کا دل اداس تھا مگر سب کی خوشی کے لیے وہ کئی دنوں بعد ان سب کے درمیان بیٹھ گئیں۔ حرمین نے ماں کے ساتھ مل کر چاکلیٹ کیک بیک کیا تھا۔ وہ یہ سن کر حیران رہ گئیں۔

''تو حرمین اتنی بڑی ہوگئی؟'' انہیں حیرت آمیز خوشی ہوئی۔

حورعین نے چائے بھی دم دی تھی اور اس کی خوشبو سب طرف چکرا رہی تھی۔

''ارے یہ کیا پاگل پن ہے۔ سب لوگ کولڈ ڈرنک اور چائے دونوں پئیں گے کیا؟ ٹھنڈا گرم ایک ساتھ نہیں لیتے نقصان دہ ہوتا ہے۔'' انہوں نے حسبِ عادت ٹوکا۔

''ارے اماں..... چائے تو میں نے آپ کے لیے اور ابا کے لیے بنائی ہے۔'' حورعین نے جلدی سے جواب دیا۔

ان کے نابعدارانہ انداز پر وہ نہال سی ہو گئیں۔ عرصے بعد اسے محبت بھری نظر سے دیکھا۔

''اتنی بری بھی نہیں ہے..... میں خواہ مخواہ اسے کہتی رہتی ہوں۔'' انہوں نے دل میں اعتراف کیا۔

''خوش رہو بیٹا..... سکھی رہو۔'' انہوں نے بے اختیار دعا دی۔ اور دعا دیتے ہوئے ان کے دل میں ملال کے بادل چھا رہے تھے۔ ظفری کی نافرمانی نے انہیں سبق سکھا دیا تھا۔

یہ انسان کی سرشت ہے کہ اسے جو کچھ بھی ملتا ہے وہ اس پر قناعت کرنا تو دور کی بات ناشکری کرنے پر آجاتا ہے۔ اچھی بھلی چیز اور نعمت کی قدر نہیں کرتا مگر اب انہیں بڑی بہو کی قدر آ گئی تھی جو ہر وقت کی باتیں سننے کے بعد اب بھی ان کے سامنے سر جھکا کر رکھتی... تھی نہ ہی اس نے محبت کو ورغلا کر ان سے دور کیا تھا۔ وہ تو خود ہی وہ اپنے اندر کے خوف سے پریشان ہو کر الٹی سیدھی باتیں سوچنے لگتی تھیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا تھا مگر اب جو حقیقت قدرت نے ان کو دکھائی اس نے نہ صرف ان کی آنکھیں کھول دیں بلکہ ان کے باطن کی سیاہی کو بھی صاف کر دیا۔

''اپنے جو جی کی میں اپنی پسند سے بہو لے کر آؤں گی۔ بالکل اپنی حورعین جیسی.....'' انہوں نے اسی وقت دل میں تہیہ کیا۔

ان کے اطراف میں سب طرف خوب غل غپاڑا اور شور ہنگامہ ہو رہا تھا۔ ناصر نے سوئی چھو کر کئی غبارے پھاڑ دیے تھے اور جب وہ کسی کے کان کے پاس لے جا کر یہ حرکت کرتا تو پھر ایک نیا طوفان سر اٹھاتا۔

''بدتمیز..... یہ کیا حرکت ہے؟'' کومل کان میں انگلی ڈال کر ہلانے لگی۔

نیلم کی چیخ نکل گئی اور انزلہ اور امبر شور مچا، مچا کر تالیاں پیٹ کر داد دے رہی تھیں۔ کیک کٹنے کے بعد سے نہ ختم ہونے والا ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔ کیک کھانے کے ساتھ، ساتھ اس کی کریم سے ایک دوسرے کے چہروں پر نقش و نگار بھی بن رہے تھے۔

آپا خاتون اردگرد کے ہنگامے سے بے نیاز ساکت مورتی کی طرح بیٹھی تھیں۔ اس رنگ و بو کی محفل میں ہوتے ہوئے بھی وہ موجود نہ تھیں۔ اداسی کی دبیز تہ ان کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ ان کو شور ہنگامہ سنائی بھی نہ دے رہا تھا۔ انہیں کا دل جیسے خالی ہو رہا تھا۔ حرمین نے تیز آواز میں ڈیک چلا دیا تھا تب وہ بری طرح چونکیں۔

''ارے آواز ہلکی کرواؤ..... شام کا وقت ہے اذان مغرب ہونے والی ہے۔'' انہوں نے پاس بیٹھی کومل کو ہدایت دی۔

کومل اٹھ کر سب کو چپ کرانے لگی مگر نقار خانے میں طوطی والا معاملہ تھا۔ حورعین چائے لے کر آئی تب تک شور میں کچھ کمی آ گئی تھی۔

شام کا جھٹپٹے کا وقت تھا۔ آفتاب کی مدھم کرنوں نے باہر کی دنیا میں اندھیرا پھیلا دیا تھا مگر اندر روشنیاں اتری ہوئی تھیں۔ آپا خاتون کا دل گھبرانے لگا۔ ان کے اندر گونجتے سناٹے ان کو نڈھال کرنے لگے۔ انہوں نے بمشکل چائے کی آدھی پیالی پی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''دادی بیٹھ جائیں ناں۔'' انزلہ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ہاں، اماں بچے خوش ہو رہے ہیں۔'' کومل نے بھی اصرار کیا۔

''نہیں، اب ہمت نہیں ہے۔ نماز پڑھوں گی اب۔'' انہوں نے بوجھل سی گہری سانس بھر کر کہا۔ ظفری کی بے اعتنائی اور نافرمانی کا سوچ کر ان کی تمام تر توانائی نچڑتی سی جا رہی تھی۔

''ابھی اذان کہاں ہوئی ہے؟'' محبت نے بھی روکنا چاہا۔

''اکیلی کیا کریں گی اندر جا کر۔'' وکیل صاحب کو بھی کہنا پڑا۔

مگر جب وہ ایک بار ''نہ'' کر دیتی تھیں تو پھر ہاں میں بدلنا مشکل ہوتا تھا جو ایک بار ٹھان لیتی تھیں اس سے روکنا مشکل ہوتا تھا۔ وہ کچھ دلگرفتہ سی شکستہ چال چلتی کچھ قدم چلی تھیں کہ لاؤنج کے دروازے پر ظفری نمودار ہو گیا اور وہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئیں۔

ماحول پر چھائی ہلچل یکلخت تھم گئی۔ سب کو سانپ

سونگھ گیا تھا جیسے۔ وکیل صاحب اپنی جگہ سے اٹھ نہ سکے۔ آپا خاتون نے پہلے تو اسے سخت نظروں سے گھورا مگر جب وہ دھندلا نظر آنے لگا تو جلدی سے رخ موڑ کر چل دیں۔

''اس سے کہو یہاں سے چلا جائے۔'' انہوں نے بمشکل آواز کی لرزش پر قابو پایا۔ ان کے ڈولتے وجود کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بمشکل چل پا رہی ہیں۔

''اُف!'' ظفر نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

وہ کسی اجڑے بکھرے دیوانے کی طرح دروازے میں استادہ تھا۔ بے چینی، اضطراب اور بے آرامی اس کے حلیے اور چہرے سے مترشح تھی۔ آنکھوں کے سرخ ڈورے اس کی افسردگی اور رت جگوں کا پتا دے رہے تھے۔ بھائی کی یہ حالت دیکھ کر نرم دل کومل تڑپ ہی اٹھی۔

''یہ تم نے کیا کر دیا ظفر..... کیسے ٹھیک ہوگا اب سب کچھ؟'' کومل نے روکھے سے انداز میں پوچھا۔

''بھائی آپ تو کہہ رہے تھے گھر آ کر بات کرو اور یہاں تو کوئی بات ہی نہیں کر رہا..... اب یہ مسئلہ کیسے حل ہو گا۔ کچھ کریں پلیز..... میں..... میں بہت فیڈ اپ ہو چکا ہوں۔'' کومل کی بات کا جواب دیے بغیر وہ سیدھا محبت کے پاس چلا آیا۔

''یہ سب تمہاری غلطی ہے، تم پہلے ہم کو اعتماد میں لیتے یوں عین موقع پر منگنی سے انکار نہ کرتے تو ہم سنبھال بھی سکتے تھے۔'' کومل نے لتاڑا۔

''ہاں ٹھیک ہے..... میں غلط ہوں..... میں نے غلطی کی..... مجھے اعتراف ہے مگر اب اس غلطی کا تدارک بھی بتائیں۔'' اس نے غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''اس سمپل..... تم اماں سے معافی مانگ لو۔'' محبت نے مشورہ دیا۔

''جیسے وہ معاف کر دیں گی؟'' وہ طنزیہ بولا۔

''پھر کیا کریں؟'' محبت پریشانی سے بولا۔

''آپ اور ابا ان کو کنوینس کریں اس وقت صرف آپ دونوں ہی مجھے سپورٹ دے سکتے ہیں۔ کومل اور بھابی سے کہنا بیکار ہے مجھے معلوم ہے کہ اماں نہیں مانیں گی اور آپ تو کہہ رہے تھے کہ ابا اس مسئلے کا کوئی حل نکال لیں گے۔ وہ تو مجھ سے بات بھی نہیں کر رہے۔'' وہ رو دینے والا ہو رہا تھا۔ سب بچہ پارٹی اِدھر اُدھر کونوں کھدروں میں گھسے یہ سارا ڈراما دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً حورعین کو خیال آیا اور اس نے ڈانٹ ڈپٹ کر سب کو باہر بھگا دیا۔

''یہ مسئلہ..... عام مسئلہ نہیں مسئلہ کشمیر ہے۔ مجھے تو حل ہوتا نظر نہیں آ رہا۔'' جوجی نے بچی کھچی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا۔

ظفر نے دکھی اور زخمی نظروں سے اسے دیکھ کر سر جھکا لیا۔ سب کو اس پر بیک وقت غصہ بھی آ رہا تھا اور رحم بھی۔

''میں نے بھابی اور آپی کو بتایا بھی تھا۔ منصوبہ بھی بنا کر دیا تھا مگر ان دونوں نے کچھ نہ کیا۔'' اس نے شکایتاً کہا۔

''اچھا، دو تین روز پہلے بتایا تھا اور پھر تمہارے سامنے ہے سب کیسے جھٹ پٹ طے کر لیا تھا اماں نے۔'' کومل نے فوراً اسے ٹوکا۔

''تم ایک بار اماں سے معافی مانگ کر تو دیکھو۔'' محبت نے اصرار کیا۔

''ہاں، ایسا کرنے میں کیا حرج ہے۔ وہ ماں ہیں ان کا دل ضرور پگھلے گا۔'' حورعین نے ڈھارس دی۔

''بیکار ہے..... میں جانتا ہوں اماں کو..... کبھی نہیں مانیں گی۔'' وہ مایوسی سے بولا۔

''تو پھر مان لو ان کی بات اور چھوڑ دو اس لڑکی کو۔'' کومل نے سنگدلی سے اس کی رگِ جاں پر چھری پھیر دی۔

''آپی اگر آپ کچھ نہیں کر سکتیں تو خاموش رہیں پلیز..... میں اس لڑکی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں، میرا فیوچر اور ہماری زندگی کی خوشیاں سب ایک دوسرے سے جڑی ہیں۔ وہ لڑکی سمیرا، اسکول کی اونر کی بیٹی ہے جنہوں نے مجھے اپنے اسکول کا بے تاج بادشاہ بنا دیا ہے۔ ہمارا کو چنگ بھی خوب چل پڑا ہے۔ وہ میری بزنس پارٹنر بھی ہے اور لائف پارٹنر بھی وہی بنے گی۔ سنا آپ سب نے..... میں اسے ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ اب آپ لوگوں کو ہی میرے لیے کچھ کرنا ہے اور اماں کو منانا ہے۔'' وہ ہٹیلے ضدی لہجے میں بولا۔

اس وقت اس پر مالک ہٹ سوار تھی ایسی ضد جو ہر طور پوری کرنے پڑے گی ورنہ نتائج برے نکلیں گے۔ وہ سب برے پھنسے تھے۔ ایک طرف آپا خاتون تھیں تو دوسری طرف انہی کا بیٹا ظفر تھا جو کسی طور بھی اُن سے کم نہ تھا۔

''تو پھر وہ کون سا دوست تھا جس سے پارٹنر شپ کی تھی؟'' کومل نے آنکھیں پھیلا کر استفسار کیا۔

''وہ دوست سمیرا ہی ہے آپی۔'' ظفر نے انکشاف کیا۔

''گڈ..... ویری اسٹریٹیجک..... بڑی دلچسپ کہانی ہے۔'' اذان نے پہلی بار اس معاملے میں مداخلت کی۔ اُن کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور وہ بے اختیار تالی بجاتے جا رہے تھے۔ ''زندگی اسی کا نام ہے۔ اونچ نیچ، نرم گرم سب چلتا ہے ورنہ تو بندہ ایک ہی روٹین سے اکتا جائے۔ ٹھیک ہے ہم تمہاری سرپرستی کریں گے، تمہاری مدد بھی کریں گے اور اماں کو بھی منائیں گے مگر تم بھی ایک وعدہ کرو کہ ہماری ہر بات مانو گے۔'' اذان نے کسی سے بھی مشورہ اور رضامندی لیے بغیر سب کی طرف سے اس کے مسئلے کو حل کرنے کی پورے اعتماد کے ساتھ حامی بھر لی۔ کمرے میں بیٹھے وہ چاروں نفوس حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔

''مگر اماں کبھی نہیں مانیں گی..... یہ ناممکن ہے۔'' کومل نے گہری سانس بھر کر مایوس سے کہا۔

کھڑکی کے پردے کی اوٹ میں کھڑی حرمین نے تاسف سے سر ہلایا اسے سمیرا کو یہ اطلاع دیتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا تھا مگر بتانا تو تھا ہی کہ وہ اول روز سے اس کی شریکِ راز تھی اور قاصد بنی پیغامات اس تک پہنچاتی تھی۔

☆☆☆

موسم بدل رہا تھا۔ سخت تپش، حبس آلود گرمی اور لو کے موسم کے بعد اب سرد ہوائیں چلنی شروع ہو گئی تھیں۔ عشق پیچاں کی بیل تلے ڈھیر پھول اور پتے خشک ہواؤں کے رحم و کرم پر اڑتے، بکھرتے سب طرف پھیلے ہوئے تھے۔ کہر آلود شام میں بسی ہلکی نمی جیسے جسم و جاں میں اتر رہی تھی۔ کیاری میں لگے پودوں میں رنگ برنگے پھولوں کی بہار بہت دلفریب لگ رہی تھی۔ وہ یک ٹک ان پھولوں کو دیکھتی رہ گئی۔

''موسم کبھی ایک سا نہیں رہتا..... اس میں تبدیلی ضرور آتی ہے اور وقت بھی کبھی ایک سا نہیں رہتا اس میں بھی تبدیلی آجاتی ہے بشرطیکہ خود اپنی کوشش بھی شامل ہو تو..... اچھا وقت ہم پر بھی آسکتا ہے۔'' وہ بے خیالی میں ایک ٹہنی کے ہرے پتوں کو نوچتے ہوئے سوچنے لگی۔

اس نے گہرے سبز رنگ کی اونی شال اوڑھ رکھی تھی اور خود بھی اسی بیل کا حصہ لگ رہی تھی۔ مٹیالی سی شام میں اس کے چہرے کی رنگت بھی جیسے کچھ ماند پڑ گئی تھی۔ وہ اعصابی طور پر بہت تھک گئی تھی۔ وہ تبدیلی کی خواہاں تھی مگر اب تک کوئی آثار نہیں تھے۔ وقت جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔

اچانک کوئی ان دیکھی چیز بجلی کی رفتار سے اڑتی ہوئی آئی اور اس کے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ وہ بری طرح ڈر کر اچھلی۔ مٹیالی سی شام کے ملگجے سے اندھیرے میں اسے اندازہ نہیں ہوا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ وہ بری طرح سے پریشان ہو کر زمین پر اِدھر اُدھر اس چیز کو تلاش کرنے لگی۔ عشق پیچاں کی بیل تلے کونے میں کاغذ کی ایک بال پڑی ہوئی تھی۔

برابر سے آتی سیٹی کی مدھم آواز سے چونک کر اس نے اس طرف دیکھا تو یوسف ٹیرس پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''اُف..... بدتمیز.....'' اس نے فضا میں مکا لہرا کر اسے دھمکایا۔

کس قدر غضب کا اسمارٹ لگ رہا تھا وہ۔ اس نے کالے سفید چیک کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ پہلے سے کہیں زیادہ پُراعتماد اور وجیہہ لگ رہا تھا۔ انمول کا دل ڈول سا گیا۔ وہ اسے اوپر آنے کا اشارہ کر رہا تھا، اپنے پاس بلا رہا تھا..... اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر اس کے پاس چلی جائے مگر سماج کی سیسہ پلائی دیوار دونوں کے درمیان تھی جسے پار کرنا اس کے لیے پل صراط پار کرنے کے برابر تھا اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے اِدھر گری کہ اُدھر.....

اس نے ایک اور کاغذ کی بال پھینکی اور اشارے سے پڑھنے کو کہا۔

''رات کو چھت پر آجانا..... بات کرنی ہے تم

سے۔'' اس نے کاغذ پر لکھے الفاظ پڑھے اور یوسف کی گمبھیر سی سرگوشی پورے وجود میں آواز بن کر دوڑنے لگی۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

''کیا ہوا، اکیلے اکیلے کیوں مسکرا رہی ہو؟'' ایمل جانے کب وہاں دبے پاؤں چلی آئی تھی۔

انمول نے غیر محسوس طور پر ہاتھ میں تھما کاغذ مٹھی میں دبا کر چھپا لیا۔ ایمل کی اچانک آمد سے اس کے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا۔

''کیوں، ہنسنے مسکرانے پر پابندی ہے کیا؟ یا پھر تم سے اجازت لے کر مسکرایا کروں؟'' اندر کی کڑواہٹ نے لہجے میں طنز پیدا کر دیا۔

''میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔'' اس کے ناگوار انداز پر ایمل کی مسکراہٹ سمٹ سی گئی۔

''ہاں، تمہیں زیادہ معلوم ہے ناں سب..... تم تو یہی چاہتی ہو کہ میں سب کچھ تمہاری مرضی سے کروں..... میں دوسروں کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاؤں..... میری اپنی کوئی مرضی اور خوشی نہیں بس میں دوسروں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنی رہوں۔'' وہ حد درجہ تلخی سے بولی۔

نیم اندھیرے سے ماحول میں وہ ایمل کی آنکھوں میں چمکتی شبنم بھی نہ دیکھ پائی۔

''تمہیں صائمہ آنٹی بلا رہی ہیں۔'' اس کو کسی بھی بات کا جواب دیے بغیر وہ خود پر ضبط کر کے اس سے کہہ کر چلی گئی۔

''اونہہ..... مشکل وقت میں کوئی بھی ساتھ نہیں دیتا۔'' اس نے تنفر سے سوچا۔ بے اختیار اس نے سامنے کھڑے یوسف کو دیکھنا چاہا مگر اب وہاں کوئی نہیں تھا دور گہری بدلیوں کے درمیان چمکتا روشن چاند شاید اسی کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر چاند کو دیکھنے لگی اور چاند یوسف کی شکل میں ڈھل گیا۔

گیٹ پر کھٹکا ہوا تو وہ چونک گئی۔ وقار صاحب کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس سے پورچ روشنی میں نہا گیا۔

''بابا آ گئے.....'' وہ کچھ مضطرب سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

کل ہی تو بابا نے اسے خاص طور پر بلا کر پوچھا تھا کہ اب اس کا کیا پروگرام ہے اور جب ہی سے وہ بے چین ہو گئی تھی۔ وہ بے چینی سے ہاتھ مسلتی اندر کی جانب بڑھنے ہی لگی تھی کہ وقار صاحب کے ساتھ جنید کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ دونوں آپس میں کوئی بات کرتے اسی طرف بڑھ رہے تھے۔ جنید کو دیکھ کر اس کے اندر شرارے سے دوڑ گئے۔ جی چاہا کہ جادو کی چھڑی گھما کر اسے غائب کر دے اس نے کوفت اور بیزاری سے سر جھٹکا۔

''یہ پھر آ گیا..... عجیب ہے..... میرا اتنا روڈ بی ہیویئر بھی اثر نہیں کر رہا۔'' اس نے سوچا۔

''اخاہ! تو آج ہماری بیٹی استقبال کے لیے کھڑی ہے ہمارے..... ہوں..... اچھا، اچھا..... پتا لگ گیا ہوگا کہ جنید بھی میرے ساتھ آ رہا ہے۔'' بابا نے شگفتگی سے مذاق کیا۔ وہ ڈھنگ سے مسکرا کر بھی نہ سکی۔

''نہیں تو بابا..... میں تو بس ویسے ہی..... میں تو یونہی.....'' اس سے بات ہی نہ بن پائی۔

''شرما گئی..... واہ بھئی..... کتنی پیاری ہے میری بیٹی..... آئم پراؤڈ آف یو۔'' بابا نے سر پر محبت بھری تھپکی دی۔ انمول کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹا..... بابا کو اس پر کتنا مان تھا اور وہ کیا کرنا چاہ رہی تھی۔ کیا وہ انہیں دھوکا دے رہی ہے۔ کیا وہ غلط کر رہی ہے.....

کیا وہ ان کی محبت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے..... اس کے ذہن میں دھماکے سے ہونے لگے..... سر میں درد کی تیز ٹیس سی اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھی۔ وہ ایک دُہرے عذاب میں گرفتار ہو کر تڑپ رہی تھی اور اندر ہی اندر گھل رہی تھی۔

''کیسی زرد رنگت ہو رہی ہے تمہاری..... کیا ہوا انمول.....'' وہ لڑکھڑاتی چال سے اندر داخل ہوئی تو صائمہ آنٹی نے لپک کر اسے تھام لیا۔

''کک..... کچھ نہیں ہوا مجھے..... بس وہ..... چکر آ رہے تھے..... شاید.....'' وہ صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے نڈھال آواز میں بولی۔

''ڈاکٹر کو فون کرو.....'' وقار صاحب کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ ایمل پانی لے کر آئی اور زبردستی ایک دو گھونٹ اسے پلائے..... کچھ دیر بعد اس کے حواس بحال ہوئے۔ جنید اس کے بالکل قریب اس کا

ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش تھی اور وہ خود آڑی ترچھی سی صوفے پر نیم دراز تھی۔ اس کا دوپٹا کمر کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اسے بے طرح حیا آئی۔ اس نے جھنجلا کر جنید کی گرفت سے ہاتھ چھڑایا اور خود ٹھیک سے بیٹھنا چاہا۔

''آرام سے..... آرام سے..... لیٹی رہو.....''

جنید نے اس کے شانوں پر دباؤ دے کر اسے واپس لیٹنے پر مجبور کر دیا۔

وہ اس کے اس قدر قریب تھا کہ اس کے ملبوس سے اٹھتی کلون کی مہک اس کے وجود پر چھاتی چلی گئی۔ اسے وحشت ہونے لگی۔ ناگواری سے کئی بل شفاف پیشانی پر پڑ گئے۔ وہ جس قدر اس کے لیے پریشان اور فکرمند تھا۔ اسے اسی قدر اس سے الجھن ہو رہی تھی۔

وقار صاحب اور صائمہ آنٹی آگے پیچھے کچھ بولتے اندر آئے تو وہ کچھ سنبھل کر خود ہی پیچھے ہٹ گیا۔ ورنہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ انمول کو اپنے وجود میں سمیٹ لے اور انمول روز بروز اس کے لیے امتحان بنتی جا رہی تھی۔

وہ جتنی بے تابی سے اس کا منتظر تھا وہ اتنا ہی وقت لگا رہی تھی فاصلہ مٹانے میں۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد تسلی آمیز الفاظ کہے تو سب کی جان میں جان آئی۔

''ویک نیس ہے ان کو..... ڈائٹ پراپر لیں اور کسی قسم کی ٹینشن نہ لیں۔'' ڈاکٹر نے نسخہ لکھ کر تھما دیا۔

''یہ سب ٹھنڈ کا اثر ہے..... کب سے وہاں بیٹھی تھیں تم..... شکل دیکھو اپنی کیسی لگ رہی ہے..... برسوں کی مریضہ لگ رہی ہو۔'' صائمہ آنٹی ناراض ہونے لگیں۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد کھانا کھایا گیا۔ انمول نے برائے نام ہی کھایا۔ جنید کی شکل دیکھ کر اس کی بھوک اڑ گئی تھی۔ اس کے تقاضے پورے کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔

''کیا سوچا ہے تم نے..... بات کی انکل آنٹی سے؟ اماں کہہ رہی تھیں کہ وہ خود ہی بات کر لیں گی انکل سے۔'' کھانے کے بعد موقع دیکھ کر جنید نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''اُف.....!'' اس نے کرب سے آنکھیں بھینچ لیں۔ جنید کا وجود اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اسے دیکھ کر ہی اسے چکر آئے تھے۔

''پتا نہیں کیا جلدی ہے..... میری طبیعت ٹھیک نہیں پلیز.....'' اس نے صاف طور پر ٹالا۔

وہ اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اس کا ساتھ منظور ہی نہیں تھا۔

''او کے..... تم ریسٹ کرو..... ہم بعد میں بات کر لیں گے۔'' اس کا اطمینان قابلِ دید تھا۔ وہ آسانی سے ٹلنے پر تیار نہ تھا۔ اس نے خود ہی وہاں سے جانا چاہا..... مگر اسے اٹھتے دیکھ کر صائمہ آنٹی نے روک دیا۔

''بیٹھی رہو انمول..... سب کے درمیان اچھا محسوس کرو گی۔ جنید بھی ہے ابھی تو.....''

ان کی بات اسے ناگوار گزری مگر ظاہر نہ کیا۔

''میں آرام کرنا چاہتی ہوں آنٹی.....'' وہ وہاں رکنے کے موڈ میں نہ تھی۔

''میں چلتا ہوں اب.....'' صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے جنید نے اجازت چاہی۔

''ٹھہرو بیٹا..... ایمل کافی لا رہی ہے ابھی..... اور انمول تم بھی کافی پی کر اپنے کمرے میں جانا..... یہ سب ٹھنڈ کا اثر ہے۔ شروع میں سردی اچھی لگتی ہے مگر درحقیقت وہ نقصان دہ ہوتی ہے ہمارے لیے۔'' صائمہ آنٹی کے طویل لیکچر کے سامنے وہ بے بسی سے بیٹھی رہ گئی۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ جنید کا وجود ایک پل میں اوجھل ہو جائے مگر وہ تلخ حقیقت کی طرح اس کے سامنے پورے اعتماد اور حق سے براجمان تھا۔ انمول نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ ایسی حقیقت جسے اس کا ذہن و دل قبول کرنے پر تیار نہیں تھا۔ وہ حقیقت سے نظریں چرائے سپنوں کا تاج محل بنا رہی تھی۔

جنید کے چلے جانے کے بعد اس نے گہری سانس بھری۔ وہ خطرے کی تلوار کی طرح اس کے سر پر لٹکا ہوا تھا۔ اس سے جان چھڑانے کی جلد از جلد ضرورت تھی۔

گیارہ بج چکے تھے۔ اس نے بے بسی سے گھڑی

دیکھی..... عموماً اس وقت تک سب سو جاتے تھے مگر آج جنید کی آمد اور اس کی طبیعت کی خرابی نے سب کام خراب کر دیا۔ اس کا ذہن وہیں لگا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یوسف چھت پر اس کا منتظر ہوگا..... مگر سب طرف رونق سی تھی۔ صائمہ آنٹی کچن میں گھسی کچن سمیٹ رہی تھیں اور ایمل یونیفارم استری کر رہی تھی..... ہر مرحلے پر ہر بار ہی نئی مشکل کھڑی ملتی تھی۔ اس نے کمرے میں آکر دیکھا..... موبائل پر یوسف کے کئی میسجز اور مسڈ کالز تھیں۔ مگر وہ فی الحال جانے سے قاصر تھی۔ وہ بے بس سی بیڈ پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

''لیٹ جاؤ انمول..... سر میں درد ہو رہا ہے کیا!'' ایمل جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ اس کے برے رویے کے باوجود اس سے محبت سے بات کر رہی تھی۔ اس نے ایمل کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مایوس ہو کر لیٹنا ہی چاہ رہی تھی کہ ایمل کے موبائل پر فیصل کی کال آگئی۔ اب آدھا پونا گھنٹا تو وہ مصروف اور بے نیاز سی ہوگئی تھی، موقع اچھا تھا۔ وہ دبے پاؤں باہر آگئی۔ کچن کی لائٹ بند تھی۔ صائمہ آنٹی اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ اس نے یوسف کو میسج کیا اور چھت پر آگئی۔

ٹھنڈی اور خشک ہوا سے اس کے وجود میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ یوسف سیاہ رنگ کی شال منہ پر لپیٹے دور سے کوئی ڈاکو لگ رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کو تھم سی گئی۔

''کیا ہوا، رک کیوں گئیں کیوں خوفزدہ ہو..... کیا مجھ سے ڈر لگ رہا ہے؟'' یوسف نے پاس آکر اس کے ٹھنڈے یخ ہاتھ تھام لیے۔

''یوسف..... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے پتا نہیں کیا ہوگا اب..... پلیز کچھ کرو'' وہ رو دینے والی ہوگئی۔

''میں تو تیار ہوں، کرنا تو تم کو ہے..... تم خود دیر لگا رہی ہو..... جان چھڑاؤ اس لنگور سے..... کیوں آیا تھا وہ..... بولو..... کیوں آجاتا ہے ہر تھوڑے دن بعد وہ.....'' اسے سب خبر رہتی تھی۔

''مجھے بس کچھ مہلت اور چاہیے..... لیکن پھر..... بعد میں تم کیا کرو گے..... مجھے بتاؤ یوسف..... کیا پلان کیا ہے تم نے..... ہم کہاں رہیں گے، کیسے ہوگا یہ سب.....'' وہ درد و اذیت میں مبتلا تھی۔

''میں تمہیں الگ گھر لے دوں گا..... یہ میرا وعدہ ہے..... لیکن پہلا قدم تم ہی کو اٹھانا ہے۔ تم جاب کرنے کو بھی کہہ رہی ہو..... کب کرو گی یہ سب کام..... میں ابھی جاب لیس ہوں، ویسے بھی ماموں پر انحصار ہے میرا..... اپنے قدم جمانے میں ٹائم لگے گا مجھے مگر بہرحال تم جب کہو گی میں تمہارا ساتھ دوں گا۔'' اس نے ہمیشہ کی طرح لفظی تسلی دی۔

''مگر یوسف..... یہ سب ایسے ہی نہیں ہوگا..... باقاعدہ سوچ سمجھ کر پلان کرنا ہوگا..... سمجھو کہ ہم ایک بند گلی کی طرف جا رہے ہیں۔ آگے کوئی راستہ نہیں ہو گا۔'' کئی دنوں سے وہ اسی موضوع پر سوچ، سوچ کر ہلکان ہو چکی تھی۔

''یہ سب تسلی سے کرنے کی باتیں ہیں..... تم کل کسی وقت مجھ سے باہر ملو..... وہیں سب کچھ طے کرتے ہیں۔'' اس نے فوری پروگرام بنالیا اور جگہ بھی بتا دی۔

''ٹھیک ہے..... میں چلتی ہوں اب۔'' اسے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔

''اتنی جلدی.....'' اس نے بے اختیار اس کا بازو تھام کر اپنے قریب کر لیا۔ کچھ اس طرح کہ اگر انمول خود نہ رکتی تو اس کے سینے سے جا ٹکراتی۔

''میں نے تو دل کی باتیں کرنے کے لیے بلایا تھا۔ دیکھو تو آج چودھویں کا چاند کس قدر خوب صورت لگ رہا ہے..... اسے دیکھوں یا تمہیں..... ایک ہی بات ہے.....'' اس کا گمبھیر خواب آور لہجہ اس کے جذبات کو گدگداتا ہوا اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

ایک لمحے کو وہ کسی منڈلی مورتی کی طرح بے حس و حرکت سی کھڑی رہ گئی۔ اس لمحے اسے خود اپنی دھڑکنیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ یہی تو وہ خوبی تھی جس نے اسے اسیر کر لیا تھا۔ اس کا خوابناک لہجہ، جذبوں سے پُر الفاظ اسے جکڑ لیتے تھے..... اسے مسحور کر دیتے

تھے..... وہ جیسے خود کو بھی بھولنے لگتی تھی۔ اس کی اٹھی ہوئی آنکھیں اسے گنگ کر دیتی تھیں اور سب سے بڑھ کر اس کا استحقاق اسے مکمل طور پر جامد کر دیتا تھا۔

''کیا دیکھ رہی ہو لڑکی..... نظر لگانے کا ارادہ ہے کیا؟'' وہ اس کے یوں دیکھتے رہنے پر شرارت سے بولا تو وہ جیسے ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی۔

''یوسف..... میں چلتی ہوں اب..... پلیز.....''

اس نے لجاجت سے اجازت چاہی۔

''اوں ہوں.....'' اس نے صاف منع کر دیا۔

''یوسف پلیز..... بہت دیر ہوگئی اب اور..... اور مجھے سردی بھی لگ رہی ہے۔'' اس نے اصرار کیا۔

''ہوں..... میرے پاس آکر بھی سردی لگ رہی ہے..... ہوں..... ارے میرے پورے وجود میں آگ لگا رکھی ہے تم نے..... بولو کب بجھاؤ گی یہ آگ.....'' اس کا مخمور لہجہ جیسے بہک رہا تھا۔

وہ کچھ جھجک کر پیچھے ہٹی..... محتاط سے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا۔

''پلیز یوسف..... بہت دیر ہوگئی..... میں چلتی ہوں اب.....'' وہ ایک دم پلٹ کر نیچے کی طرف بھاگی اور جلدی سے اپنے کمرے میں بستر میں جا گھسی۔ اس کی ناہموار سانس کسی طور ٹھیک ہونے میں نہیں آرہی تھی..... جذبوں کی شدت سے دہکتے گال سرخ پڑ گئے تھے اور دل بھر آیا تھا۔ نہ جانے وہ کتنی دیر اور کب تک کمبل میں منہ چھپائے روتی رہی۔

صبح اٹھی تو طبیعت بوجھل سی تھی۔ سر بھاری ہو رہا تھا اور چہرے پر جاگنے اور رونے کی وجہ سے... بھر بھراہٹ سی آگئی تھی۔

''کیا ہوگیا لڑکی تم کو..... ناشتے کے بعد اپنی میڈیسن ضرور لے لینا۔'' صائمہ آنٹی نے تشویش سے اسے دیکھتے ہوئے ہدایت دی۔

وہ چپ رہی..... وہ اسے بغور دیکھتی لاؤنج میں آگئیں۔ ان کے چہرے پر سوچ فکر کی پرچھائیاں تھیں۔

''مجھے انمول ٹھیک نہیں لگ رہی..... اس کا پراپر علاج کرائیں۔ فل چیک اپ کروائیں.....'' انہوں نے وقار صاحب سے تشویش کا اظہار کیا۔

''ہوں..... میرا خیال ہے کہ وہ بہت حساس ہے اور اب تک بدلے ہوئے حالات کو قبول نہیں کر پائی۔ وہ اس نئے ماحول میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی۔'' وقار صاحب خود بھی سوچ بچار میں پڑے ہوئے تھے۔ انمول کے بیزار رویے اور مستقل طبیعت کی خرابی نے انہیں بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''بیٹیاں تو اپنے گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ نئی زندگی نئے گھر میں مگن ہوگی تو ٹھیک ہو جائے گی وہ..... کیا خیال ہے۔'' صائمہ آنٹی نے پوچھا۔

''ہوں..... ہوسکتا ہے کہ یہ بات ہو..... میں کرتا ہوں کچھ۔'' انہوں نے سرسری سا کہا۔

ان کے جانے کے بعد وہ اندر آئیں تو انمول ناشتا کر کے اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ کچن پھیلا ہوا تھا اور رانی بھی ابھی تک نہیں آئی تھی۔

انمول اکیلی بیٹھی سوچ بچار کر رہی تھی۔ اسے آج یوسف سے ملنا تھا مگر اب اس کے پاس جانے کے لیے کیا بہانہ بنائے، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اسے صائمہ آنٹی کی خاص توجہ حاصل تھی اسے معلوم تھا کہ وہ اسے صاف منع کر دیں گی باہر جانے سے معاً اسے جویریہ کا خیال آیا۔ ہمیشہ سے جویریہ ہی آڑ میں اس نے یوسف سے کئی ملاقاتیں کی تھیں۔ اس نے جویریہ کو فون ملا لیا۔

''کہاں غائب ہو بے وفا لڑکی.....'' ہائے ہیلو کے بعد اس نے فوراً شکوہ کیا۔

''کہاں جاؤں گی، یہیں ہوں.....'' جویریہ کا بجھا سا لہجہ اداس لگا۔

''خیریت تو ہے جویریہ..... تم ٹھیک ہو ناں؟''

''بس گزر رہی ہے زندگی، پاپا بھی پتا نہیں کس عذاب میں ڈال گئے مجھے۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

''ہائیں..... کیا ہوگیا جویریہ.....؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ کچھ عرصہ پہلے جویریہ کے والد خود تو ملک سے باہر چلے گئے تھے اور جویریہ کو اس کے ماموں

کے گھر چھوڑ دیا تھا۔ ان کا اپنا گھر بند ہو گیا تھا مگر... بہرحال دونوں میں ملنا ختم تو نہیں ہوا تھا کچھ کم ہو گیا تھا اور وقاص کو انہوں نے اپنے ایک ریٹائرڈ کرنل دوست کی سرپرستی میں دے دیا تھا۔

''یار، قسم سے ممانی بڑی سخت مزاج ہیں ہر وقت میری تربیت کرنے پر تلی رہتی ہیں، گھر داری سکھانے میں لگی ہوئی ہیں مجھے۔'' اس نے روٹھے سے انداز میں شکایت کی۔

''اچھا ہے اس بہانے کچھ تو آ جائے گا ناں.....'' چھیڑنے سے باز نہ آئی۔

''اچھا، اچھا..... زیادہ دماغ کی دہی نہ کرو اور کام بتاؤ..... مجھے پتا ہے کہ تم مطلب کے بغیر تو فون کرتی نہیں ہو۔'' جویریہ نے بھی برابر سے جواب دے کر حساب بے باق کر دیا۔

''ہاں یار، سچ تو یہ ہے کہ میں نے اسی لیے تم کو فون کیا ہے، یار مجھے یوسف سے ملنا ہے۔ تم آج شام کو آ جاؤ پھر دونوں ساتھ چلیں گے۔'' اس نے فوراً مدعا بتایا۔

''بہت مشکل ہے..... ممانی کہیں اکیلے نہیں جانے دیتیں..... بھائی کو باڈی گارڈ بنا رکھا ہے میرا۔'' اس نے صاف منع کر دیا۔

''یار..... کوئی بھی بہانہ سوچ لو..... آ جاؤ پلیز.....'' اس نے اصرار کیا۔

''دیکھو انمول، تمہاری محبت اپنی جگہ مگر یہ بہت... پُرخار راستہ ہے، تم دو کشتیوں کی سوار ہو کر خواری اٹھاؤ گی۔ اب تم کو نئی زندگی میں مگن ہونا چاہیے جو حقیقت ہے اسے قبول کر لو۔''

''تم میرے احساسات کو سمجھ ہی نہیں سکتیں۔ دیکھو پلیز دادی اماں مت بنو..... پلیز ہیلپ می.....'' اس نے پھر اصرار کیا۔

''او کے..... میں کوشش کروں گی..... اگر بائے چانس آسکی تو آ جاؤں گی ورنہ مشکل ہے.....'' اس نے مکمل رضامندی ظاہر نہیں کی۔

انمول فون بند کرنے کے بعد پیچ و تاب کھاتی رہی۔ اب جویریہ کا بھی آسرا نہیں رہا تھا۔ وہ اکیلی مشکل میں پھنسی تھی۔ اسے جویریہ پر غصہ آنے لگا۔ پھر اسے خود پر، اپنے نصیب پر... اور اپنے کھوٹے راستوں پر غصہ آنے لگا۔ وہ تکیے پر پے در پے مکے مارنے لگی اور.... بے بسی سے رونے لگی۔ اسے روتے، روتے شدت سے ماما کی یاد آنے لگی۔ ماما کے ساتھ کتنا سکون اور اطمینان تھا۔ خوشی ان کے دروازے پر ہمہ وقت کھڑی مسکراتی تھی۔ ماما بھی تو لاڈ اٹھاتے نہ تھکتی تھیں۔ کوئی کام بھی مشکل نہیں ہوتا تھا کیونکہ ماما ہر مسئلہ چٹکیوں میں حل کر دیتی تھیں۔ زندگی کے چھوٹے موٹے مسائل کو انہوں نے کبھی خود پر سوار نہ کیا تھا مگر جب سب سے اہم مسئلہ پیدا ہوا تو وہ اسے حل نہ کر سکیں۔ وہ تقدیر کے سامنے ہار گئیں۔ وہ جو دوسروں کے دکھ، درد پر تڑپ جاتی تھیں اپنی بیماری کا مقابلہ نہ کر پائیں۔

☆☆☆

وہ دن کیسے عجیب سے تھے۔ فریدہ کی بہن کے سوگ نے پورے محلے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ ان دنوں کچھ بھی تو اچھا نہ لگ رہا تھا۔ ماما اپنی طبیعت کی وجہ سے نڈھال سی رہتی تھیں۔ پھر انہوں نے سنا کہ فریدہ کا گھر خالی ہو گیا۔ وہ لوگ گھر فروخت کر کے کہیں اور شفٹ ہو گئے تھے۔ فریدہ کی بہن کا قصہ فریدہ کے جانے کے بعد ختم ہو گیا اور... ایک نامعلوم سی اداسی نے سب طرف ڈیرے ڈال لیے تھے۔

وہ بھی ایک ایسی ہی زرد اور پھیکی سی سہ پہر تھی۔ انمول دونوں ہاتھوں پر ٹھوڑی ٹکائے جی بھر کر بور ہو رہی تھی جب اچانک ہی جویریہ کی آمد سے کھل اٹھی۔ پچھلے کئی روز سے جویریہ اس کے گھر نہ آئی تھی۔ نہ ہی وہ خود جا سکی تھی۔

''ہائے..... کاش کہ میں کچھ اور ہی مانگ لیتی..... ابھی ابھی تمہیں دل سے یاد کیا تھا۔'' انمول کے بیزار سے چہرے پر بشاشت سی آ گئی۔

وہ صدیوں سے بچھڑی سہیلی کی طرح جویریہ سے اس بری طرح لپٹی کہ وہ بھی بوکھلا گئی۔

''توبہ ہے انمول..... ہٹو بھی..... کیا جان لوگی میری؟'' جویریہ اس کی گرفت میں پھڑ پھڑا کر چلائی۔

انمول نے ہنستے ہوئے اسے چھوڑا اور ہاتھ پکڑ کر اندر لے جانے لگی۔

''اوہ یہ کیا بات کی تم نے کہ کاش میں کچھ اور مانگ لیتی؟ ایک تو اللہ نے دل کی مراد پوری کی اور تم نے ناشکری کردی فوراً.....'' جویریہ نے خاص طور پر اسے جتایا۔

''اچھا ناں.....بس میں خوشی میں پاگل ہی ہوگئی تھی۔ عجیب بوریت سی ہورہی تھی۔ مجھے اکیلے.....'' وہ اب تک سرخوشی کے عالم میں تھی۔

''اکیلی ہو؟ آنٹی کہاں ہیں.....اور بوا صغریٰ بھی نہیں ہے۔'' جویریہ اس کی بات سن کر ٹھٹک کر پوچھنے لگی۔

''اکیلی ہوں بھی اور نہیں بھی.....'' وہ مبہم سا بولی۔

''کیا مطلب.....؟'' جویریہ نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

''بھئی.....ماما تو میڈیسن لے کر سوجاتی ہیں پھر انہیں جب تک ڈسٹرب نہیں کرتی جب تک وہ خود نہ اٹھ جائیں.....بوا صغریٰ کو سونے کی بیماری ہے جہاں بیٹھتی ہیں وہیں اونگھ جاتی ہیں اور ایمل کا کل ٹیسٹ ہے وہ کتاب میں سر دیے بیٹھی ہے۔'' اس نے تفصیل سے بتایا۔

''ہوں.....تو تم اکیلی بور ہورہی تھیں۔'' جویریہ نے گہری سانس بھری۔ وہ پہلے کی نسبت کچھ چپ سی لگ رہی تھی۔ اس کے انداز میں سنجیدگی تھی۔ ورنہ فطرتاً وہ بھی شوخ وشنگ سی تھی مگر انمول نے اپنی خوشی میں اس کے بجھے، بجھے انداز کو محسوس نہیں کیا۔

''ہاں، ناں، اچھا ہوا تم آگئیں.....اب میری ساری بوریت دور ہوجائے گی۔'' وہ مگن سے انداز میں بولتی اسے لاؤنج میں لے آئی۔

''آنٹی کی طبیعت کیسی ہے اب؟'' جویریہ نے صوفے پر بیٹھتے ہی پوچھا۔

''ڈاکٹر نے کورس بتایا ہے تو ماما آج کل میڈیسنز لے رہی ہیں، ویسے اب وہ ٹھیک ہیں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''ہاں، عجیب لگ رہا ہے۔ آنٹی سو رہی ہیں تو کتنا سونا، سونا لگ رہا ہے۔'' جویریہ نے بہت محسوس کیا ان کی غیر موجودگی کو۔

''ہاں، بس کچھ دنوں سے یہاں ایسا ہی ہے۔ دراصل جب سے فریدہ کی بہن کا واقعہ ہوا ہے ہماری گلی میں عجیب سی افسردگی پھیل گئی ہے۔ اِدھر ماما بھی بیمار ہیں تو بس دل نہیں لگ رہا۔ ہر طرف اداسی لگ رہی ہے اور اب تو فریدہ کے گھر والے بھی گھر چھوڑ کر چلے گئے۔'' انمول نے تفصیل سے بتایا۔

''اچھا.....چلے گئے وہ لوگ.....؟ چچ.....چچ.....ٹھیک ہی کیا، اتنی بدنامی کے بعد کیسے رہتے یہاں پر.....'' جویریہ نے افسوس سے سر ہلایا۔

''ارے ہاں.....تم آئی کس کے ساتھ ہو، آج وقاص نہیں آیا تمہارے ساتھ؟'' انمول کو اچانک ہی خیال آیا۔

''مجھے پاپا چھوڑ کر گئے ہیں.....وقاص کا تو پاپا نے زبردست بندوبست کردیا ہے اب.....'' اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''اچھا، کیا ہاسٹل بھجوادیا ہے اسے؟'' اس نے اندازہ لگایا۔

''اونہوں.....مگر سمجھو کہ ہاسٹل کی طرح ہی ہے۔ پاپا کے ایک ریٹائرڈ کرنل دوست ہیں وقاص کو ان کے پاس بھجوادیا۔'' وہ اداسی سے بولی۔ اتنی دیر میں پہلی بار انمول کو اس کے چہرے پر اداسی کے رنگ نظر آئے۔

''ہا.....تم کتنی اکیلی ہوگئی ہوگی؟ کب گیا وقاص؟'' انمول کو اس کے جانے پر بھی افسوس تھا اور ملے بغیر جانے پر زیادہ افسوس ہورہا تھا۔

''ہفتہ بھر تو ہوگیا.....تم بھی تو آنٹی کی وجہ سے اسکول نہیں آرہی تھیں۔ مجھے معلوم تھا تم بھی پریشان ہو اس لیے تمہیں بتایا نہیں.....'' وہ دھیرے، دھیرے بتانے لگی۔

''مل کر بھی نہیں گیا بدتمیز.....مگر.....انکل نے کیوں بھیج دیا اسے؟ یہاں پر ٹھیک تو ہورہا تھا وہ اب۔'' اسے ملال سا ہوا۔

''وہ نہیں سدھر سکتا انمول.....پکی عادت ہوگئی تھی

اس کی۔ وعدہ کرتا پھر توڑ دیتا..... معافی مانگتا پھر وہی کرتا..... پاپا تنگ آگئے تھے۔ وہ پاپا کے کنٹرول سے باہر ہورہا تھا.....'' جویریہ نے تھکی، تھکی آواز میں کہا۔

''مگر جویریہ..... بچہ جتنا اپنے باپ سے اٹیچ ہوتا ہے اور اس سے ڈرتا ہے کسی اور سے اتنا نہیں دبتا۔'' اس نے اپنی معلومات کے مطابق کہا۔

''ہاں لیکن..... پاپا..... پتا نہیں کچھ ڈسٹرب سے ہیں..... جیسے بہت تھک گئے..... بہت خاموش رہتے ہیں، زیادہ بولو تو انہیں برا لگنے لگتا ہے۔'' وہ پریشانی سے بولی۔

''تو جویریہ پھر تم اکیلی کیسے رہو گی؟'' انمول کو تشویش ہونے لگی۔

''فی الحال تو پڑوس والی خالہ آجاتی ہیں یا پھر میں چلی جاتی ہوں ان کی طرف..... ان کے گھر ٹیوشن والے بچے بھی بہت آتے ہیں۔ دو چار بچوں کو وہ میرے پاس بھیج دیتی ہیں، شام تک پاپا آہی جاتے ہیں۔'' وہ بھی الجھن کا شکار ہورہی تھی۔

''یہ سب کیا ہورہا ہے جویریہ..... اِدھر ماما بیمار ہیں اُدھر تم پریشان ہو۔'' انمول جو جویریہ کے آنے سے کھل سی گئی تھی اب حد درجہ سنجیدہ سی ہوگئی تھی۔

''خالہ کہتی ہیں یہ پریشانیاں زندگی کا حصہ ہیں، ہمیں خود ہی انہیں solve کرنا چاہیے۔'' جویریہ نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

''تم..... میرے پاس رہنے لگو جویریہ..... میں پاپا سے کہوں گی کہ وہ انکل سے بات کرلیں۔'' ایک آدھ منٹ کی خاموشی کے بعد انمول نے اپنے زرخیز ذہن سے آئیڈیا نکالا۔

''اونہوں..... یہ نہیں ہوسکتا اب۔'' جویریہ افسردگی سے بولی۔

''وہ کیوں.....؟'' انمول نے حیرانی سے پوچھا۔

''اس لیے کہ پاپا ملک سے باہر جارہے ہیں اور میں..... مجھے پاپا، ماموں کے گھر چھوڑ دیں گے۔'' جویریہ نے پلکیں جھپک کر آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کیا.....!'' انمول کے لیے یہ بہت بڑے صدمے کی بات تھی۔

''انکل باہر جارہے ہیں؟ اور تمہارے ماموں کہاں رہتے ہیں؟'' اس نے صدمے کے زیر اثر ہلکی آواز میں پوچھا۔

''پاپا کہہ رہے ہیں کہ کچھ سالوں کی بات ہے۔ وہ وقاص کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے ہیں۔ اس کی ایجوکیشن کے لیے خاصی رقم درکار ہے۔ کرنل انکل تو اس کی صرف نگرانی اور دیکھ بھال کریں گے اخراجات تو پاپا ہی پورے کریں گے ناں..... اسی لیے وہ مجھے ماموں کے پاس چھوڑ کر جائیں گے۔ ماموں کا گھر زیادہ دور تو نہیں ہے مگر یہاں سے فاصلہ تھوڑا بڑھ جائے گا۔'' اس

دنیا کے کسی بھی کونے میں اور ملک بیٹھے گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا سالانہ زرِ اشتراک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر کے لیے 1500 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 12000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 11000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

نے گہری سانس بھر کر بتایا۔

''مگر جویریہ..... ہم دور ہو جائیں گے..... ہم کیسے ملیں گے؟'' انمول نے بے چینی سے پوچھا۔

''ہم اسکول میں ملیں گے ناں.....'' جویریہ اداسی سے مسکرائی۔

''جویریہ ..... میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گی..... نہیں جویریہ انکل کو روکو..... پلیز.....'' انمول کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''میں پاپا سے کہوں گی کہ وہ ماموں کو تمہارے بابا سے ملوا دیں تاکہ ہمارے آنے جانے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔'' جویریہ کئی دن کی سوچ بچار کے بعد بہت کچھ سوچ کر آئی تھی۔

''اُف..... یہ سب کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟'' انمول دکھ اور رنج میں ڈوب سی گئی۔

بہت ہی عجیب، بدرنگ، بے رونق سی شام نے گھر میں ڈیرا ڈال لیا تھا۔ پوری دوپہر اتنی لمبی اور بیکار گزری کہ انمول کا رونے کو دل چاہتا۔ جویریہ کا گھر بند ہو گیا تھا اور اس کے بعد سے اس پر قنوطیت سی طاری ہو گئی تھی۔ شام کے دلفریب رنگوں میں اداسی سی گھل گئی تھی۔ ماما کا مستقل علاج چل رہا تھا۔ اب وہ بہت بہتر تھیں مگر پہلے کی نسبت کمزور ہو گئی تھیں۔ ان کی چمکتی رنگت بھی کچھ ماند پڑ گئی تھی۔ مگر اس کے لیے یہی بہت تھا کہ ماما پہلے کی طرح ہر شام تیار ہونے لگیں۔ وہ ماما کی خوشی کے لیے ایمل کے ساتھ مل کر کھیلتی تھی مگر اندر سے دل اداس ہی تھا۔ جویریہ کے بغیر کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

کبھی، کبھی جب سب طرف خاموشی کا پہرہ ہوتا تو وہ گھبرا سی جاتی..... کبھی پہروں بیٹھی بادام کے درخت کے سرخ سبز پتوں کے طلسماتی رنگوں کو دیکھتی رہتی۔ بوا صغریٰ کبھی برآمدے کی کرسی پر اونگھتی اور کبھی صوفے کے ہتھے سے سر ٹکائے خراٹے بھرتی..... اندر باہر سب طرف پھیلتی خاموشی اسے ڈرانے لگتی، مہر آنٹی کے گھر کی خاموش دیواروں اور بند دروازوں سے اسے وحشت ہونے لگتی..... کبھی اسے لگتا کہ خاموشی اور تنہائی کا یہ آسیب اس کے وجود میں پنجے گاڑ کر بیٹھ گیا ہے وہ اب کبھی اس سے نجات حاصل نہیں کر سکتی اور جب سارے خوف، وحشت، وہم اور گھبراہٹ ہوا ہو جاتے تو وہ یہاں سے وہاں بوکھلائی پھرتی یا پھر ایمل کے ساتھ مل کر لان میں خوب ہنگامہ مچاتی۔

بلاوجہ کی لڑائی، شور شرابا اور بے وجہ قہقہے لگا کر وہ آس پاس کے پھیلے سناٹوں کو توڑنا چاہتی تھی۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا، ایک حبس بھری بے کیف سی پُرتپش دوپہر گزارنے کے بعد یکا یک ہی موسم بدلا تھا اور بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ اس نے خوب زور و شور سے چلّا، چلّا کر ایمل کو بھی باہر بلایا اور دونوں مل کر مزے کرنے لگیں۔ وہی وہ پہلا دن تھا جب یوسف سے پہلی بار ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ یوسف ان کے سپاٹ، بے رنگ، بے لطف دنوں میں بہار کا جھونکا بن کر داخل ہوا تھا۔

جویریہ کا نعم البدل ثابت ہوا تھا یوسف..... یہ اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ اولادِ نرینہ کی محرومی کے باعث وقار آفندی نے اس پر اپنی شفقت اور توجہ کے خزانے لٹا دیے، یہ انہی کی دی ہوئی اجازت تھی کہ وہ ان کے گھر میں دندناتا پھرتا۔ انہی کے کہنے پر اس نے شام کا وقت دونوں کے ساتھ گزارنا شروع کیا تھا ورنہ ماموں حامد اور ان سے بڑھ کر شمع جی کی سختیوں کے سامنے اس کی مجال نہ تھی کہ یوں روزانہ کے ہاں آ جاتا۔ اسے وقار آفندی کی حمایت حاصل تھی اسی لیے ماموں حامد اور ممانی نے اس سے رعایت برتی تھی۔ وہ ان کی زندگی میں کسی خوشبو کی طرح سرایت کر گیا تھا جو نظر نہیں آتی مگر اپنی ایک اہمیت رکھتی ہے جو دوسروں کی تسکین اور راحت ہوتی ہے جو سانسوں میں بس کر من کو شانت کر دیتی ہے۔ اور یہ خوشبو انمول کے تن من میں روم، روم میں بس گئی تھی..... دل لبھا دینے والی خوشبو جس نے اس کے حواسوں کو جکڑ لیا تھا بلکہ اسے مسمرائز کر دیا تھا وہ خوشبو بھرے دن بڑے جادوئی سے تھے..... سب طرف یوسف ہی تھا۔

یوں سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں وہ آپس

میں ایک دوسرے کے راز دار دوست اور دکھ سکھ کے ساتھی بن گئے تھے اور اب تو معاملہ کچھ اس سے بھی آگے چلا گیا تھا۔

☆☆☆

کئی روز سے وہ بہت بور ہو رہی تھی اور پریشان الگ تھی۔ ماما ہفتے میں دو بار اسپتال جا رہی تھیں اس پر اتفاق سے یہ جان لیوا انکشاف کل ہی ہوا تھا کہ اس کی ماما کے گردوں کا ڈائی لیسس ہو رہا تھا۔

''دیکھو بچیوں کو بالکل پتا نہ چلے اور میرے پیچھے ان کا بہت خیال رکھا کرو.....''

وہ اگرچہ کہ اب میٹرک میں تھی مگر بال بناتے ہوئے اکثر اسے ماما کی مدد درکار ہوتی کہ لمبے بال سلجھتے ہی نہیں تھے، پنوں کی مدد سے بہت سنبھال کر بنانے پڑتے تھے۔ وہ اسی لیے ماما کو بلانے آئی تھی مگر کچن میں کھڑی ماما ہولے، ہولے بوا صغریٰ کو ہدایات دے رہی تھیں۔

اسے اس بیماری کے بارے میں اتنی زیادہ معلومات تو نہیں تھیں مگر ماما کے پھیکے زرد چہرے اور پُرتشویش لہجے نے اسے فکر مند کر دیا.....اس نے اچانک ہی اسکول جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

''ماما میرے سر میں درد ہے۔'' اس نے بہانہ بنا دیا۔ اس کی وجہ سے ایمل کی بھی چھٹی ہو گئی مگر اسے پروا نہیں تھی وہ کتنی ہی دیر منہ سر لپیٹے پڑی رہی۔ کل جویریہ بھی اسکول نہیں آئی تھی۔ آج وہ خود غیر حاضر ہو گئی۔ یوسف بھی کئی روز سے غائب تھا۔ اسے جویریہ سے ملنے کی ہڑک ہونے لگی۔ اس نے فون ملایا تو اس کی ممانی نے کال ریسیو کی۔

''وہ تو اسکول گئی ہے بیٹا.....جب آئے گی تو بتا دوں گی۔'' انہوں نے میٹھے نرم لہجے میں جواب دیا۔

''آنٹی بہت دن ہو گئے جویریہ سے ملے ہوئے.....پلیز اسے بھیج دیں میرے گھر.....'' وہ سخت افسردہ ہو رہی تھی اور تنہائی محسوس کر رہی تھی۔

''ارے.....روز ملتی تو ہو اسکول میں۔'' ممانی نے ہولے سے ہنس کر کہا۔

''جی.....مگر.....بس ایسے ہی دل چاہ رہا تھا.....دراصل ماما بیمار ہیں ناں تو میں خود نہیں آسکتی ابھی۔'' اس نے جواز پیش کیا۔

''ٹھیک ہے بیٹا.....دیکھو آج یا کل کسی دن آجائے گی جویریہ.....'' وہ نرمی سے بولیں۔

''کتنی اچھی ہیں جویریہ کی ممانی اور وہ کہتی ہے کہ سختی کرتی ہیں۔'' فون بند کرنے کے بعد اس نے ایک لمحے کو سوچا۔ اکتایا ہوا دل اسے چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا۔ ایمل یونیفارم بدل کر کافی دیر تک جاگتی رہی تھی اور وہ منہ سر لپیٹے پڑی رہی تھی۔ اب ایمل گہری نیند سو رہی تھی اور وہ دبے پاؤں سب طرف بے کل سی پھر رہی تھی۔ صبح کی ہوا کے مست خرام جھونکے اسے چھوتے ہوئے لطافت کا بھرپور احساس دے گئے مگر اس وقت سارے احساسات پر افسردگی غالب تھی۔ اس کے دل میں ڈھیروں وہم اور وسوسے پیدا ہو گئے تھے۔ ایسے اس وقت کسی ساتھی اور ہمدرد کی ضرورت تھی۔ مگر بدقسمتی سے کوئی میسر نہ تھا۔

اس نے ٹیرس پر جا کر مہر آنٹی کے گھر جھانکا.....سب طرف خاموشی کی ردا تنی ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے متلاشی نظروں سے یوسف کو دیکھتی رہی۔ معاً گیٹ پر کھٹکا ہوا۔ ان کی کام والی آئی تھی۔ ایک جانب سے حامد انکل بنیان اور پاجامے میں ملبوس نمودار ہوئے تو وہ جھٹ پیچھے کو ہو گئی مگر وہ سارا دن بور بیکار اداس اور غمگین سا گزرا.....اس روز اس نے ایمل کو بھی لفٹ نہ کرائی۔ اکیلی اداس بیٹھی رہی یا پھر ماما کا سایہ بن کر ان سے باتوں میں لگی رہی۔

''کیا ہوا انمول کچھ پریشان ہو؟'' ماما نے اس کی بے چینی محسوس کر لی۔

''نہیں تو.....ماما۔'' اس نے لہجے میں اطمینان بھر کر کہا مگر وہ ماں تھیں اس کے اندر کی پریشانی کو بھانپ تو گئی تھیں لیکن کیا پریشانی ہے، یہ نہیں سمجھی تھیں۔

''بور ہو رہی ہو؟'' انہوں نے اندازہ لگایا۔

''اونہوں.....بس ایسے ہی دل نہیں چاہ رہا کسی سے بولنے کا۔'' اس نے اکتا کر کہا۔

''ایمل کہاں ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''پڑھ رہی ہے۔'' مختصر سا جواب دیا۔

''تو آپ بھی کچھ پڑھ لو.....'' انہوں نے مشورہ دیا۔

''اونہوں..... میرا دل چاہ رہا ہے کہ آپ کے پاس بیٹھوں.....'' وہ بلاوجہ ہی اُن سے لپٹ گئی۔

''ارے..... کیا ہوا، کیوں اداس ہے میری بیٹی.....؟'' انہوں نے پیار سے اس کے بکھرے بال کان کے پیچھے کیے۔ مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا ممتا کی خوشبو خود میں سموتی رہی۔

''کہیں جویریہ سے ملنے کو تو دل نہیں چاہ رہا۔'' انہوں نے پھر اندازہ لگایا اسی وقت انمول کے ذہن کی کھڑکی کھلی۔ وہ اداس تھی کچھ ماما کی وجہ سے اور کچھ یوسف کی وجہ سے..... سچ تو یہ تھا کہ جویریہ سے دوری کے ملال کو یوسف نے کافی حد تک کم کیا تھا۔

''ماما، مجھے امپورٹنٹ نوٹس لینے ہیں اپنی ایک فرینڈ سے۔'' اس نے لمحے کے اندر ہی بہانہ تراشا۔

''تمہارے بابا تو بہت تھکے ہوئے آئیں گے یہ سب کام پہلے سے سیٹ کر کے رکھنے چاہئیں۔'' ماما نے تنبیہہ کی۔

''ماما بس آنا اور جانا ہے..... یوسف کے ساتھ چلی جاؤں؟'' اس نے جھٹ حل نکالا۔

''ہوں..... یوسف کے ساتھ..... چلی جاؤ مگر پہلے مہر سے پوچھ لو کہیں وہ شمع کے کسی کام میں مصروف نہ ہو۔ تمہیں تو معلوم ہے شمع کتنا برا مانتی ہے یوں درمیان میں کام چھوڑ کر جانے سے۔'' انہوں نے رضامندی تو دے دی مگر ایک نئی الجھن میں ڈال دیا۔ لیکن پھر وہ الجھن بھی انہوں نے خود ہی حل کر دی۔ مہر آنٹی کو فون کر کے یوسف کو بلوالیا اور انمول جیسے پھر کی کی طرح بے حد پھرتی سے پانچ منٹ میں ہی تیار ہو کر آ گئی۔

یوسف ہارن پر ہارن دے رہا تھا وہ تقریباً بھاگتی ہوئی وہاں پہنچی۔

''جلدی آؤ..... دیر نہیں کرو.....'' یوسف نے اسے بلند آواز میں بلایا۔

''افوہ.....! آ تو گئی..... کیا مشکل ہے؟'' وہ فرنٹ ڈور کھول کر دھپ سے سیٹ پر بیٹھی۔

''مشکل اوپر ہے..... ابھی شمع جی کو پتا نہیں ہے کہ میں یہاں آ گیا۔ اگر کھڑکی سے جھانک لیا تو مشکل ہو جائے گی۔''

یوسف نے ریورس کر کے گیئر لگایا اور گاڑی کو تیز رفتاری سے آگے بڑھا دیا۔

''آہستہ، آرام سے..... اُف یوسف.....'' وہ چیختی رہ گئی۔

''تم کو بھی سکون نہیں ہے پتا بھی ہے وہ جلاد ہر وقت میرا سر قلم کرنے پر تیار بیٹھی رہتی ہیں۔'' وہ کچھ الجھے ہوئے انداز میں بولا۔

''اچھا ناں..... تم کور کر لینا..... اتنی باتیں بنا تو لیتے ہو۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''کہاں جانا ہے..... کون سی دوست سے نوٹس لینے ہیں۔'' اس نے موڑ کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''اوں..... الپائن چلتے ہیں۔'' انمول نے ایک لمحہ سوچ کر کہا۔

''الپائن.....'' اس نے اچانک ہی تیز رفتار گاڑی کو بریک لگائے انمول اپنی سیٹ پر بری طرح لڑھکی۔ وہ دروازے سے ہٹ کر یوسف کے بے حد قریب ہو گئی تھی۔ خود کو سنبھال کر اس نے یوسف کو دیکھا تو اس کی گہری نظروں سے گھبرا سی گئی۔

''کتنی چالاک ہو تم..... ماما سے جھوٹ بھی بولنے لگیں۔'' وہ اسے کہہ تو رہا تھا مگر اس کی نظروں میں بے حد وارفتگی تھی اتنی کہ انمول کی دھڑکنوں میں ارتعاش ہونے لگا۔

''ہاں تو اور کیا..... جب تم تین دن سے شکل نہیں دکھاؤ گے تو یہی ہو گا۔ جانتے بھی ہو کہ تمہارے بغیر ایک دن بھی نہیں گزرتا.....'' اعتراف کرتے ہوئے اس کی پلکیں بوجھل سی ہو گئیں۔

''تم سچ میں اتنی محبت کرتی ہو مجھ سے؟'' اس نے دھیمی سی سرگوشی میں پوچھا۔

''یوسف.....! کبھی، کبھی مجھے لگتا ہے جیسے تمہارے دل میں میرے لیے وہ چاہت نہیں ہے۔ تم..... تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے.....'' وہ سارے وہم

اور خدشے زبان پر لے آئی۔

''میں ہمیشہ تمہارا ساتھ دوں گا..... کیا ہوا اتنی بے اعتبار کیوں ہو؟'' وہ حیران ہوا۔

''یوسف..... میرا دل بہت اداس ہے۔ ماما بیمار ہیں، ان کا ڈائی لیسس ہو رہا ہے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ماما اتنی بیمار ہو جائیں گی۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ انسان جو سوچتا ہے وہ نہیں ہوتا..... پتا نہیں کیوں مجھے اپنے آپ سے اس زندگی سے ڈر لگنے لگا۔'' اس کی پلکیں بھیگ سی گئیں۔

''نو مور ٹیرز..... فضول باتیں نہ کرو..... الٹے سیدھے خیالات دل سے نکال دو، اچھا، اچھا سوچا کرو اور آنٹی کو اتنی بڑی بیماری نہیں ہے، ان کا بالکل ٹھیک علاج ہو رہا ہے۔ فکر مت کرو.....'' اس نے تسلی دی۔

''تم سے بات کر کے میں بہت ریلیکس ہو جاتی ہوں۔'' اس نے پھر اعتراف کیا۔

''اپنی تو بات ہی کچھ اور ہے.....'' یوسف نے شوخی سے کالر کھڑے کیا۔

''تمہاری انہی باتوں میں اپنائیت نظر آتی ہے لیکن یہ تو بتاؤ تین دن سے کہاں غائب تھے؟'' ایک دم ہی اس نے تیور بدلے۔ پہلے تو شیرینی میں ڈوبا لہجہ تھا اب تلوار سا تھا۔ یوسف نے جواب دیے بغیر گاڑی آگے بڑھا دی مگر اس کے لبوں پر بڑی دلفریب سی مسکراہٹ تھی۔

مسحور کن مسکراہٹ جو انمول کے دل و ذہن کو جکڑ لیتی تھی۔ اس کی چمکتی آنکھوں میں بہت سے ان کہے جذبات کے دیپ جلتے دکھائی دیتے تو وہ جیسے خود پر سے بھی اختیار کھونے لگی تھی۔

اس وقت بھی وہ مکمل طور پر یوسف کی خوابناک سی شخصیت کے سحر میں گرفتار تھی۔ وہ عجلت میں آیا تھا شاید کیونکہ اس نے کف کے بٹن نہیں لگائے ہوئے تھے بلکہ کف پلٹ کر موڑے ہوئے تھے۔ وہ شاید کہیں سے آیا تھا اس کا لباس خاصا معقول اور مناسب تھا۔ وہ کچھ تھکا، تھکا بھی لگ رہا تھا مگر اسے وہ ہر حلیے ہر انداز میں اچھا لگتا تھا۔

''اب دیکھ بھی چکو..... اور کتنا دیکھو گی؟'' معاً اس نے صاف لب و لہجے میں ٹوکا اور وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ ونڈ اسکرین پر نظر جمائے گاڑی چلا رہا ہے مکمل طور پر اسی کو دیکھ رہا تھا۔

''اچھا، زیادہ اترا ؤ مت..... اتنے اچھے نہیں ہو تم اور سیدھی طرح بتاؤ کیوں نہیں آ رہے تھے؟'' اس نے جھینپ مٹانے کے لیے کچھ جھلا کر اس کی مضبوط کلائی پر پلٹے کف کو کھینچا۔

''بتایا تو تھا کہ ماموں نے مجھے پارٹ ٹائم جاب پر لگوا دیا ہے۔ بوجھ بن رہا ہوں ان پر میں..... اولاد بھی ایک دی وہ بھی عجیب کھڑوس سی اتنا روپیہ پیسہ کہاں جائے گا..... میرا انتھا سا وجود ممانی کو برداشت نہیں ہو رہا۔ آرڈر مل گیا ہے کہ اپنی تعلیم کا خرچہ خود نکالو۔'' اس کے لہجے میں تلخی سی تھی۔

''میں تو انکل اور آنٹی کو ایسا نہیں سمجھتی تھی لیکن یوسف اگر ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ تمہارا ایکسپیرینس بھی بڑھے گا اور تم.....'' وہ رسان سے سمجھانے لگی۔

''اٹس اف..... میرے لیے ماموں کی نصیحتیں ہی بہت ہیں پلیز تم یہ کام نہ کرو۔'' اس کی بات کاٹ کر اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

الپائن کی آئس کریم کھاتے ہوئے ساری تلخی اور کڑواہٹ آئس کریم کی ٹھنڈک سے زائل ہو گئی۔

''صبح کے ٹائم فری ہوتا ہوں اب..... شام کو کوچنگ کے بعد جاب پر چلا جاتا ہوں اور رات کو واپسی ہوتی ہے۔'' گھر واپسی کے سفر میں یوسف نے اس کو تفصیل سے اوقات کار بتائے تو انمول کا دل ڈوب سا گیا۔

''تو اب تم ہمارے گھر نہیں آؤ گے؟ ہم کب ملا کریں گے؟'' وہ بے چین ہو گئی۔

''وہ تو خیر سیٹنگ ہو جائے گی لیکن مصروفیت بڑھ جائے گی بہت اور وہ شمع جی..... میری جان چھوڑیں تب ناں..... اُن سے ہنس کر بات کرو تو مصیبت اور خاموش رہو تو عذاب..... ایک ہی ایک اولاد اور وہ بھی مینٹل.....'' یوسف کے انداز میں بے پروائی اور بیزاری تھی۔

اسے دروازے پر چھوڑ کر اس نے گاڑی آگے

بڑھا دی بالکنی میں شمع جی کھڑی عجیب سی نظروں اسے دیکھ رہی تھیں۔

ان کی حسرت بھری نظروں میں عجیب سی حاسدانہ لپک تھی..... وہ یوسف کا کسی اور سے ملنا برداشت نہیں کرتی تھیں۔ یا پھر انہوں نے خود کو اپنی معذوری کے سبب گھر تک محدود کرلیا تھا اور جب کسی کو سیر سپاٹا کرتے دیکھتیں تو بہت برا لگتا تھا۔

وہ خفت سے ہونٹ کاٹتی اندر داخل ہوئی تو ماما اسی وقت شال لپیٹتی وہاں آئی تھیں۔

''اتنی دیر لگادی..... مل گئے نوٹس.....؟'' انہوں نے پوچھا۔ اور انمول ایک لمحے کو بری طرح گھبرا گئی کیونکہ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے اس کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔

''ماما..... وہ تو..... گاڑی میں ہی رہ گئے..... میں ابھی تھوڑی دیر بعد جا کر لے آؤں گی.....'' اس نے بمشکل بات بنائی۔

دھڑ، دھڑ کرتے دل کو سنبھالتی وہ جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس روز اس کا موڈ آف تھا۔ جویریہ کی ممانی نے وعدہ کیا تھا کہ جویریہ کو بھیج دیں گی مگر وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوجائے۔ اس نے جویریہ کو فون ملایا فون بزی آتا رہا۔ جھلا کر اس نے فون کرنے کا ارادہ ہی ترک کردیا۔

''کل اسکول میں خبر لوں گی جویریہ کی بچی کی..... ایک تو اسکول آنا بھی کم کردیا اور اکیڈمی جوائن کرلی..... بڑی پڑھاکو.....'' وہ غصے سے جویریہ کے بارے میں سوچنے لگی۔

''انمول..... آپ فری ہو بیٹا.....؟'' ماما نہ جانے کب وہاں چلی آئی تھیں اپنی سوچ میں اسے اندازہ ہی نہ ہوا۔

''جی ماما..... کیا ہوا؟'' وہ فوراً مستعد ہوگئی۔

''بیٹا، میتھے میں پیٹنگ بنانی ہے، بوا کو میں نے طریقہ تو سکھادیا ہے مگر وہ کبھی، کبھی کام غلط کردیتی ہیں میں چاہ رہی ہوں کہ تم ان کے ساتھ لگ جاؤ تاکہ کچھ گڑبڑ نہ ہو۔ یہ ریسیپی ہے اسے پڑھ لو ایک بار غور سے۔'' انہوں نے اس کے ہاتھ میں کتاب پکڑائی۔

''ماما..... بٹ ماما..... پیٹنگ تو میں نے پہلے کبھی نہیں بنائی۔'' اس نے منہ بسورا۔

ماما مسکرادیں اور ہولے سے اس کا گال تھپتھپایا۔

''تم کو چلنا آتا تھا نہ بولنا..... انسان دنیا میں رہ کر سب کچھ سیکھتا چلا جاتا ہے۔ کوئی بھی سیکھا سکھایا پیدا نہیں ہوتا اور لڑکیوں کو یہ چھوٹی موٹی آسان سی ڈشز آنی چاہیے..... اسی لیے تمہیں بوا کے ساتھ لگا رہی ہو تاکہ تم آہستہ، آہستہ سیکھنا شروع کردو.....'' انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بٹ ماما..... میرا موڈ نہیں ہے۔'' اس نے اکتا کر منع کیا۔ سچ تو یہ تھا کہ ان دنوں وہ بلاوجہ ہی اداس رہتی تھی۔ کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا تھا بس اسے یوسف کو سوچنا اچھا لگتا تھا۔

''زندگی موڈ سے نہیں، سمجھوتوں اور قربانیوں سے گزرتی ہے میری جان..... میں دیکھ رہی ہوں تم آج کل بہت خاموش رہتی ہو، شاید جویریہ سے دوری کی توجہ سے تنہائی محسوس کررہی ہو..... تو خود کو مصروف کرلو..... کسی اچھے کام میں وقت گزاروگی تو بوریت نہیں ہوگی۔ مجھے دیر سے صحیح مگر خیال تو آیا کہ تم کو بھی کچھ سیکھنا چاہیے۔ اب ان شاء اللہ امتحانوں کے بعد تم کوکنگ کورس کرلینا کوئی..... یہ ماں کی ذمے داری ہوتی ہے کہ بیٹیوں کو گھر داری سکھائے۔'' ان کے اندر کی ماں پوری طرح بیدار ہوگئی تھی۔

''کیا ہے ماما..... آپ بھی شروع ہوگئیں اب..... وہاں جویریہ کی ممانی اسے گھر داری سکھانے پر تلی ہوئی ہیں اور یہاں آپ بھی.....'' وہ بیزاری سے بولی۔

''تو بیٹا یہی عمر ہوتی ہے سیکھنے کی..... لڑکیاں تو جلدی بڑی ہوجاتی ہیں۔ ان کو آگے چل کر گھر بار سنبھالنا ہوتا ہے، تعلیم کے ساتھ یہ کام سیکھنے بھی ضروری ہیں۔ لڑکیاں تو بابل کی چڑیاں ہوتی ہیں جانے کب چپکے سے پھر کر کے اڑ جاتی ہیں۔'' ماما کے چہرے پر تفکر اور محبت کے رنگ پھیل گئے تھے۔

(باقی آئندہ)

کیسی ریت کیسے رواج

طیبہ عنصر مغل

گاڑی کے اردگرد اڑتی دھول بتا رہی تھی کہ اب بھی گاؤں نے ترقی نہیں کی ہے اور کچی سڑک کو پکا کروانے کا وعدہ صاحبِ اقتدار کا ہنوز وعدہ ہی ہے.....

تین گھنٹے لگاتار سفر نے کمر میں درد کروا دیا تھا۔ راستے میں کہیں رکنا بھی محال تھا جلد از جلد گاؤں پہنچنا لازم تھا جنازہ مغرب کے وقت تھا لیکن کچھ بھی تھا اظفر کی سگی پھپھو کی فوتگی کا معاملہ تھا۔

''وہ بہت اچھی اور مشفق خاتون تھیں۔'' جب اظفر کے ساتھ میری شادی ہوئی تو سب سے زیادہ محبت و خوشی کا اظہار ان کی طرف سے ہی ہوا تھا گالوں پر بے ساختہ بہتے آنسوؤں کو ٹشو سے صاف کرتے میں نے اظفر کی طرف دیکھا ان کی آنکھیں ضبطِ گریہ سے لال ہو رہی تھیں میں نے بے ساختہ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی۔

☆☆☆

میں اور اظفر یونیورسٹی میں ایک دوسرے سے ملے اور پہلی سے دوسری اور تیسری ملاقات تک ہم ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کے جذبات محسوس کرنے لگے۔ مجھے

اچھی طرح یاد ہے کہ یونی کے آخری سمسٹر تک ہم ایک دوسرے کا ہونے کا فیصلہ کر چکے تھے پسندیدگی سے بڑھ کر محبت نے دل میں ہر طرف ڈیرے ڈال لیے تھے۔

پھر وہی روایتی مخالفت کا سامنا دونوں جانب سے ہوا میرے والدین کو گاؤں کے رہائشی سسرال والوں سے اختلاف تھا تو اظفر کے گھر والے شہری بہو کے حق میں نہ تھے بہرحال ہم دونوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے والدین کو راضی کر ہی لیا کہ اظفر ایک آسودہ امیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور مجھے ان کے ساتھ گاؤں میں نہیں رہنا تھا۔ وہ شہر میں کاروبار کرنا چاہتے تھے اس لیے یہیں ایک شاندار گھر لیا گیا تھا البتہ رخصت ہو کر بجائے فوری گاؤں لے جایا گیا تھا اور شادی والے دن ہال میں بھی اظفر کے خاندان اور میرے فیملی والوں کے درمیان کسی قسم کی مماثلت نہیں لگ رہی تھی۔ بہت ساری چیزیں جو محبت کے نشے میں نظر انداز کی گئیں وہی اس وقت بہت کھل رہی تھیں۔ ولیمہ گاؤں میں رکھا گیا تھا بڑی ساری حویلی کے اندر خواتین کا میلہ تھا تو مردانے کے لیے حویلی کے باہر شامیانوں میں بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

یہ بات مجھے عجیب کلفت میں مبتلا کر رہی تھی میرے تو خوابوں میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ولیمے کا تصور تھا جہاں میں مختلف انداز میں اظفر کے ساتھ انٹری کا سوچ رہی تھی مگر اب کہاں یہ حال تھا کہ دالان کے صوفے پر بیٹھی میں صبح سے اظفر کو دیکھنے کے لیے ترس گئی تھی جس کا ازالہ اظفر نے رات کو کرنے کی کوشش کی لیکن میرا موڈ بہت آف تھا۔

''یار یہ گاؤں ہے، چند دن کی تو بات ہے پھر ہم اپنے گھر میں اپنی مرضی سے رہیں گے، یہ گاؤں ہے یہاں پر ہم مردوں کو اسی طرح رہنا ہوتا ہے۔ میں بھی تمہیں دیکھنے کو بے تاب تھا لیکن اگر میں تمہارے ساتھ بیٹھتا تو معیوب حرکت سمجھی جاتی۔''

''کیوں سمجھی جاتی معیوب؟ ہم میاں بیوی ہیں، نکاح ہوا ہے ہمارا'' میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔

''تو بیوی محترمہ آگے کی بھی سن لیں، یہ تو ہماری نئی شادی کی وجہ سے ہمیں ایک ہی کمرا ملا ہوا ہے اگلی بار یہ بھی نہیں ہوگا کیونکہ یہاں زنانے، مردانے الگ ہوتے ہیں۔'' اظفر کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی لیکن ان کی بات سن کر میں اچھل پڑی۔

''آپ کا گاؤں کچھ زیادہ ہی انوکھا نہیں، میری ایک دوست بھی گاؤں کی تھی اس کے گاؤں میں تو اس طرح کا کچھ بھی نہیں تھا۔''

''درست کہا بیگم صاحبہ لیکن ہمارا گاؤں دراصل ابھی تک پسماندہ ہے یہ ماننے میں مجھے کوئی عار نہیں ہے پر میں اکیلے سب کو نہیں بدل سکتا اب یہ گاؤں نامہ بند کر کے ہم اپنا محبت بھرا راگ الاپ لیں تو زیادہ اچھا نہ ہوگا'' اظفر نے بولتے ہوئے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا اور میرے ہاتھ کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا میں نے شرما کر اپنا چہرہ ان کے سینے میں چھپا لیا۔ جھٹکے سے گاڑی کے رکتے ساتھ میرے خیالات کا تسلسل بھی ایک دم ٹوٹ گیا میں نے دل ہی دل میں خود کو ملامت کی کہ یہ کون سا وقت تھا یہ باتیں سوچنے کا۔ گاڑی حویلی کے بڑے سے پھاٹک سے اندر داخل ہوئی گھر کے اندر بھی شامیانہ تھا اور باہر بھی شامیانہ لگا ہوا تھا شادی کے ٹھیک دو ماہ بعد میں نے سسرال میں گاڑی سے قدم باہر رکھا تھا۔

☆☆☆

پچھلے ایک گھنٹے سے میں پھپھو کی میت کی طرف جانے کی تگ و دو کر رہی تھی لیکن مسلسل ناکام تھی جانتے ہیں کیوں؟

اپریل کے مہینے میں بھی گاؤں میں شدید گرمی تھی۔ میرے جسم پر ہلکے گلابی رنگ کے لان کے کپڑے پسینے سے تر بتر تھے اور ایک کے بعد ایک خاتون میرے گلے لگ کر لمبا گھونگٹ کاڑھ لیتی اور آنسوؤں سے خالی آنکھوں سے بہت لمبے سُر تال والے بین کرتی جاتی۔ ابھی ایک لمبی قطار تھی جو کہ انتظار میں تھی کہ دلہن سے گلے لگ کر رسما دینا ضروری تھا ورنہ بڑی بیگم یعنی میری ساس نے انہیں گنتی میں رکھ لینا تھا جو میرے گلے لگنے سے رہ جاتیں یہ بات تو بعد میں حویلی کی ایک ملازمہ رانی نے بتائی تھی۔

گرمی اور پیاس سے نڈھال دو گھنٹے مختلف قسم کے مسالا جات کی خوشبو میں مدغم پسینے کی بدبو کے بھبکوں کے

درمیان میرے حواس نے میرا ساتھ چھوڑا تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میں دری پر بیٹھے، بیٹھے ایک طرف کو لڑھکنے لگی تو سب نے شور ڈال دیا۔

''ارے دوڑو پانی لاؤ دلہن تو مارے صدمے کے بے ہوش ہوگئی ہے، چیچ بھی لانا دانتوں کے درمیان رکھنی ہے کہیں دانت نہ جڑ جائیں۔'' میں نے ان کی زبان پر وضاحت دینی ضروری نہ سمجھی کہ یہ صدمے کی شدت نہیں ہے..... کیونکہ آپ تو جان گئے ہوں گے پانی ملنے اور تھوڑی دیر کے یہ گلے لگنے کے عمل سے نجات پر چپ کا سودا کچھ مہنگا نہ تھا۔

☆☆☆

میں دری پر آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھی۔ پھر بمشکل مجھے پکڑ کر پھوپی کی میت کے پاس جا کر ان کا آخری دیدار کرایا گیا اور اب نڈھال سی خواتین سے پرے ادھر ہی دری پر لیٹ گئی تھی، رات بھر کے جاگے ہوئے تھے ہم اوپر سے سفر کی تھکان بھی تھی اور ان دنوں طبیعت بھی اوپری، اوپری سی تھی۔ بس تھوڑی دیر کو آنکھ لگی ہی تھی کہ ایک دم یوں لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو، گھبرا کر اٹھ بیٹھی زلزلہ تو تھا لیکن عجیب حیران کن منظر تھا۔ خاندان کی ڈھیر ساری خواتین نے اپنے دوپٹے کس کر اپنی کمر پر باندھ رکھے تھے گول دائرہ بنا کر دونوں ہاتھوں سے منہ پیٹتے ہوئے دائرے میں بڑے نظم وضبط کے ساتھ گھوم رہی تھیں کچھ اپنی باری کے انتظار میں تھیں وہ جوں ہی دائرے میں سے کوئی خاتون اپنا فرض پورا کر کے نکلتی وہ چلتے، چلتے ان سب کے بیچ جگہ بنا لیتی، مجال ہے جو ردھم میں فرق آیا ہو، میں نے پھٹی، پھٹی آنکھوں سے رانی کو دیکھا جو لکڑی کی پنکھی سے مجھے ہوا دے رہی تھی۔

''پھوپی کی چھوٹی بیٹی پہنچ گئی ہے اس لیے یہ سب اس کے ساتھ پھوپی کو پیٹ رہی ہیں۔'' اس نے بے پروا سے انداز میں اپنی مخصوص زبان میں کہا۔

میں نے حیرت وتاسف سے اس طرف دیکھا جہاں سب عورتیں آرمی کے جوانوں کی طرح ایک جیسے قدم بڑھاتی آگے بڑھ کر منہ پیٹتیں پھر یک دم پیچھے ہو جاتی تھیں۔ ان کے قدموں کی دھمک اور ماتھے پر پڑتے ہاتھ زلزلہ لائے ہوئے تھے۔ ''اف خدایا!'' کہہ کر میں نے اپنا سر پکڑا تو رانی نے پریشانی سے مجھے دیکھا اور اٹھ کر میری ساس کے کان میں کچھ کہا۔ قطار میں سے نکل کر میری ساس میری طرف آئیں۔

''تم دوسرے جی سے ہو اور ویسے بھی شہر والی ہو ذرا نازک ہوتی ہو تم لوگ! کہیں کچھ الٹا نہ ہو جائے شاوا اندر کمرے میں چلی جاؤ، لیٹنے میں تو ویسے بھی تم شامل نہیں ہوئی ہو۔'' وہ کہہ کر واپس دائرے میں ترتیب سے شامل ہو گئیں۔

☆☆☆

نیم اندھیرے کمرے میں لیٹی آج میں شہری زندگی اور اس پسماندہ گاؤں کی غیر مذہبی روایات کا موازنہ کرنے لگی کتنی مختلف تھی یہ زندگی میرے میکے کی زندگی سے، کسی کی موت تو وہاں بھی قیامت لاتی تھی لیکن بہت الگ تھا سب، کوئی بھی اختیاری یا غیر اسلامی رسوم ورواج نہ تھے کچھ آنسوؤں سے روتے تھے تو کچھ غم کی شدت سے سسکیاں بھی لیتے تھے کچھ اپنے اوپر کنٹرول نہیں رکھ سکتے تو چلا بھی پڑتے تھے جیسے نانو کی وفات پر امی بار، بار بے ہوش ہو جا رہی تھیں لیکن کچھ ایسی مضبوط ہستیاں بھی تھیں جو ایک طرف آنسو بہاتے پھر کچھ اذکار پڑھنے میں بھی مصروف ہو جاتی تھیں سب سے کارآمد لوگ، سب سے کارآمد عمل، کتنا مختلف تھا سب سوائے ایک عمل کے.....

میت کے روانہ ہوتے ہی سب تعزیت کرنے والوں کا بریانی، قورمے پر ٹوٹ پڑنا گھر والوں کا اپنے غم کو بھلائے انہیں بوٹیاں، نان پہنچانا، ڈونگے بھر بھر دینا جانے وہ کون سے گاؤں شہر ہوں گے جہاں آج بھی یہ ہوتا ہوگا کہ تین، تین دن مرگ والے گھر میں چولھا نہ جلے۔

ان ساری سوچوں میں ایک سوچ نے مجھے ہلا دیا مجھے لگا کہ پھوپی کی جگہ میں ایک چارپائی پر موجود ہوں اور آج جو کچھ دیکھا وہ میرے لیے ہو رہا ہے اس وقت میں اپنے فیصلے پر پچھتا رہی تھی کیا میں بھی روایات کی بھیڑ میں اسی طرح رخصت ہو جاؤں گی۔ یہ سوچ مجھے اندر تک لرزا گئی تھی کہ میرا ایصال ثواب۔

☆☆☆

آج پھوپی کا قل تھا۔ میری آنکھیں دو دن تک جو

دیکھتی رہی تھیں وہ سب آج بھی جاری تھا۔ اونچے بین، فرق اتنا تھا سب دالان میں بیٹھیں تھیں اور جو عورت آتی لمبے گھونگٹ نکال کر ہر عورت سے میرے سمیت گلے لگ کر لمبے، لمبے بین کرتی پھر ایک طرف بیٹھ جاتی۔ آج تو اضع میں تمباکو والے حقے اور اسی طرح کی چلمیں بھی موجود تھیں جو باری، باری پینے والی عورتیں اپنے آگے کھسکا رہی تھیں جیسے مشاعرے کے شمع دان۔ اس دوران ماسی برکت کی بات نے مجھے ساکت ہی کر ڈالا۔

''نی کڑیو اک گل اے، اس دفعہ شیداں کی کمی نے بہت بدمزہ کیتا جے (ارے لڑکیو شیداں کی کمی نے بہت بدمزہ کیا ہے) جس طرح وہ بین کردی اے تساں نوں کجھ وچ نئیں اے قسمے'' (جس طرح وہ بین کرتی ہے تم میں سے کسی کو سلیقہ نہیں ہے)

''اس کو بھی تو اب ہی شہر جانا تھا'' ایک اور عورت بولی۔ ''اس کی بیٹی کے ہاں بیٹا ہوا ہے اسے تو جانا تھا کل کلاں اگر وہ مرگئی تو اس کی طرح بین کرنے والی اور کوئی نہیں ہے اس گاؤں میں''

''ایسا بھی ہوتا ہے کیا؟'' میں گنگ ہوئی کھلے منہ سے سن رہی تھی۔

جی میرے سسرالی گاؤں میں تو ہوتا ہے عجیب لگ رہا ہے ناں مجھے بھی لگا تھا۔

☆☆☆

میرا دل گھبرا رہا تھا سوچا تھا قل کے بعد واپس چلی جاؤں گی۔ تو موقع ملتے ہی جب اظفر رات کو دیکھیں سمٹوا رہے تھے ان سے کہہ بھی دیا لیکن انہوں نے سختی سے کہہ کر میرا منہ ہی بند کردیا تھا۔

''ہم چہلم سے پہلے نہیں جاسکتے، تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا میں نہیں چاہتا کسی کو بھی موقع ملے کہ تم میرا غلط فیصلہ ہو۔'' میں دل مسوس کر رہ گئی تھی میں سوگوار ماحول سے نہیں گھبرا رہی تھی نہ ہی ایسا تھا کہ میں پھوپی کے جانے کا غم محسوس نہیں کر رہی تھی مجھے تو صرف یہ عجیب روایات تکلیف دے رہی تھیں۔ کلام پاک، آیت کریمہ یا درود پاک کے ورد کے بجائے یہ سب ہو رہا تھا۔

ہر تھوڑی دیر بعد کشادہ صحن میں زلزلے کی سی کیفیت طاری ہوتی تو پتا چل جاتا کہ کوئی قریبی رشتے دار اب پہنچا ہے اس لیے اب پھر سے سب نے کمر کس لی ہے تھوڑی دیر بعد سب اندر آجاتیں اور غیبتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوجاتا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔

☆☆☆

میں ایک سپارہ لے کر ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور پڑھنے لگی۔ کچھ لڑکیاں اور بھی تھیں جو آج قرآن پاک پڑھ رہی تھیں میں نے بھی اپنی توجہ پڑھنے میں لگانے کی کوشش کی لیکن میرے پاس بیٹھی ساس کی گفتگو نے اس غم کے ماحول میں شاد کردیا آپ کو لگ رہا ہے ناں میں پگلا گئی ہوں مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے جانتے ہیں کیوں؟

''زینب تیری نند کے سسرال والے اتنی جلدی کیوں چلے گئے اور آج قل ہے ابھی تک نہیں پہنچے۔'' ماسی برکت نے میری ساس سے آکر پوچھا۔

''ارے ماسی، ان کی بیٹی دیر سے پہنچی تھی تو چھوٹے گوشت کے تورے میں اسے بوٹیاں کم لگیں اس نے شکایت لگائی کہ اس کی تو ناک کٹ گئی ہے اس کی سسرال میں، اس کی بیٹیوں کو کھانا ساتھ نہیں دیا، یہ بھی اس کو برا لگا، اب میری نند کا وہ باہ تھوڑی تھا جو میں ساتھ باندھنے والی بوٹیاں بھی دیکھتی کہ کم ہیں یا زیادہ، آپے من جائیں گے، یہ تو شکر کریں ہماری برادری میں لڑکی مرنے کے بعد اس کی میت میکے واپس لانے اور بھجوانے کا رواج ہے اس کی قبر تو میکے کے گاؤں میں ہوتی ہے ورنہ پچھتی کتنے تورے دیتے تخیل وڈے۔''

میری ساس کچھ اور بھی کہہ رہی تھیں لیکن میرے دماغ میں تو ایک ہی بات گونج رہی تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا میں خوشی سے ناچنے لگوں آپ کو پھر سے لگا میں پگلا گئی ہوں سچ میں کہ میرا دھیان تو بس اسی جملے میں ہے۔

''ہماری برادری میں لڑکی مرنے کے بعد اس کی میت میکے بھجوانے کا رواج ہے۔''

''ہے ناں اچھا رواج؟ یا شاید مجھے اپنے لیے یہ بات اچھی لگی۔

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی.....

سعدیہ قریشی

ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں، نیم کے درخت کی شاخیں ہوا میں مسلسل ہل رہی تھیں۔ وہ سخت کوفت کے عالم میں صحن میں آ کر بیٹھ گئی۔

''کیا میرے اندر احساسِ محرومی اور احساسِ کمتری پیدا ہونے لگا ہے۔'' اس نے دکھ سے ایک لمبی سانس لی۔

''میں کیا تھی؟ اور کیا ہوگئی ہوں۔'' بار، بار متعدی بیماری کی طرح مایوسی آج بھی اس پر حملہ آور ہوگئی۔

اس نے راجا گدھ میں کہیں پڑھا تھا وہ سوچنے لگی۔ ”شادی عورت کو ایک نام دیتی ہے وہ مرد کی نصف بن کر گھر والوں کو قبول کرتی ہے۔ شادی کی شکل میں معاشرہ عورت کو منتہائے مقصود عطا کرتا ہے۔“

”تم بھی بہت سست ہو دلہن! ٹائم تو دیکھو بی بی چار بجنے کو ہیں اور تم ابھی تک سر جھاڑ منہ پھاڑ بیٹھی ہو۔“ اماں نے جب اسے صحن میں بیٹھے دیکھا تو اُن کے تو گویا تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔

”سر میں درد ہو رہا ہے اماں.....“ وہ منمنائی۔

”ارے چھوڑو سر میں درد ہے..... ہونہہ بڑی کی طبیعت اگر بہتر ہوتی تو تمہیں نہ کہتی..... تف ہے تم پر۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے اندر چلی گئیں..... وہ بھی جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ چار بجے اسے اماں کے ساتھ میلاد کی تقریب میں جانا تھا۔

☆☆☆

اسے شادی کا بہت شوق تھا، تین بھائیوں کی اکلوتی اور لاڈلی بہن کا جب کوئی رشتہ آتا تو کبھی بڑے بھیا نقص نکال دیتے، کبھی عرفان بھائی کو اس رشتے میں کوئی خرابی نظر آتی..... جب کبھی وہ دونوں متفق ہوتے تو اماں، ابا کا دل مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت اسے بہت غصہ آتا، سارا دن بھوکی پیاسی بے چین اِدھر اُدھر گھومتی رہتی۔ وہ عادتوں میں بہت سلجھی ہوئی اور بہت با اخلاق تھی۔ شکل میں بہت خوب صورت تو نہیں تھی لیکن شخصیت کافی متاثر کن تھی۔

حنان شاہ کا جب اس کے لیے رشتہ آیا تو سب گھر والوں نے اس رشتے کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ حنان شاہ، فرحان بھائی کے اچھے دوستوں میں سے تھا۔ وہ بہت زیادہ خوش تھی۔ حنان شاہ کے گھر میں ایک بڑے بھائی، بھابی، ایک چھوٹی بہن اور اماں، ابا تھے۔

☆☆☆

حنان شاہ، نام ہی اتنا خوب صورت تھا کہ لیتے ہوئے ایسا لگتا جیسے کوئی لمبا چوڑا خوب صورت وجود، محبت کے احساس اور جذبات سے لبریز سامنے کھڑا ہو..... احساسات کے نئے در کھل گئے تھے اگرچہ اس نے اسے دیکھا تھا نہ ملی تھی آواز اور نہ لہجے سے کوئی شناسائی تھی لیکن دل تھا کہ بہکے ہی جاتا تھا۔ کس سے پوچھتی، اپنی سوچوں میں کس کو شریک کرتی، اماں سے کہنا۔ کچھ پوچھنا معیوب سا لگ رہا تھا، کوئی تو اسے اس کی عادات، چال ڈھال، بول چال کے حساب سے کوئی بات بتاتا۔ اس کی تصویریں دکھاتا، سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

ہاں اماں، ابا کے چہرے خوشی سے چمک رہے ہوتے، طمانیت کے بھرپور احساس نے ان سب کے وجود کو گھیر رکھا تھا..... بس ایک وہ تھی جو کوفت کے عالم میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بے چین سی بے مقصد گھومتی پھرتی۔ اس بے چینی اور اضطراب کے عالم میں آخر وہ دن آ ہی گیا۔ جب وہ حنان شاہ کی بنا دی گئی..... وہ ویسا ہی تھا جیسے اس نے سوچا تھا خوب صورت اور وجیہہ..... شروع، شروع کے دن تھے وہ سب سے محبتیں سمیٹ رہی تھی۔

”زندگی کتنی حسین ہے۔“ وہ سوچتی..... زندگی کا یہ رخ دیکھا تو عقل دنگ رہ گئی۔ حنان شاہ وجاہت کا شاہکار تھا، خاموش طبیعت اور رشتوں سے محبت اور ہر رشتے میں انصاف کرنے والا تھا۔

ہر صبح نزاکت لب کے ساتھ وہ حنان کو صبح بخیر کہتی..... سب کچھ اجلا، اجلا اور نکھرا نکھرا نظر آتا..... وہ جو کہتا اور جو کرتا اس پر خوشی کا اظہار کرتی۔ وہ خوابوں اور خیالوں میں رہنے والی ایک معصوم سی لڑکی تھی۔

”کیسی لگ رہی ہوں؟“ جب وہ تیار ہوتی تو اس سے بڑے مان سے پوچھتی۔

”اچھی.....“

”صرف اچھی..... آپ یہ بھی نہ بولتے۔“ وہ ناراضی سے بولی۔

”نہیں..... بہت اچھی لگ رہی ہو میری جان۔“ اب کی بار وہ مسکرایا۔

”رہنے دیں..... زبردستی تعریف نہ کریں۔“ وہ

منہ پھلا کر جانے لگی تو حنان نے اسے آگے بڑھ کر روک لیا۔

''کہاں؟'' وہ اشارے سے بولا اور اسے قریب کرلیا۔

''بہت خوب صورت..... بہت حسین..... میری نظر سے دیکھو تو تمہیں تیار ہونے کی ضرورت ہی نہیں..... تم مجھے ہر روپ میں پیاری لگتی ہو، ماسوائے جب تم منہ پھلاتی ہو۔'' اب کی بار اس نے چھیڑا تو وہ مسکرا کر ہاتھ چھڑا کر باہر بھاگ گئی۔

☆☆☆

وہ بھی ایک عورت تھی۔ بدلنا اسے بھی تھا، حسین اور دلکش نظر آنے کی بھرپور کوشش کرتی تاکہ شوہر کے قرب کو پاسکے۔ وہ تمام آرائش کرتی جو حنان کو پسند تھیں۔ وہ تو اس خوابناک ماحول کو زندگی سمجھ رہی تھی لیکن کچھ عرصے میں ہی اسے اندازہ ہوگیا۔ زندگی وہ نہیں..... زندگی تو اب شروع ہوئی۔

بڑی بھابی کا پورے گھر پر راج تھا۔ امی، ابا، منان بھائی، حنان کوئی ان کی کسی بات سے انحراف نہیں کرتا تھا۔ وہ لوگوں کے سامنے لفظوں کا ایسا جال بُنتیں کہ اگلا بندہ قائل ہوجاتا۔ وہ اسے ایسے ٹریٹ کرتیں جیسے... وہ عقلِ کُل اور یہ کم عقل، بدھو سی کم حیثیت کوئی لڑکی ہو۔ وہ گھر کا سارا نظام خود چلانے میں مسرت محسوس کرتیں۔ وہ سب کو اپنا محتاج کرنا چاہتی تھیں..... اور جیا..... اپنی ازلی بزدلی، انا، ظاہری رکھ رکھاؤ یا اخلاقیات کے تار و پود میں مقید رہتی۔

☆☆☆

وہ اس کے بازو کے اوپر آنکھیں موندے پڑی تھی۔

''حنان۔'' اس نے محبت سے پکارا۔

''ہوں۔'' وہ شاید کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''میں اپنی محبت کو کسی جامد لمحے میں بند کردینا چاہتی ہوں۔ یہ وقت، یہ لمحے ہمیشہ میری مٹھی میں قید رہیں۔'' وہ محبت سے چُور لہجے میں بولی۔

''پگلی محبت بھی کوئی قید کرنے کی چیز ہے اور تم کیوں اتنی دل دہلانے والی باتیں کررہی ہو..... ہماری محبت وقت کے ساتھ، ساتھ بڑھے گی۔'' وہ اس کے بال سہلاتے ہوئے آہستہ سے گویا ہوا۔

''آپ تو نہیں بدلیں گے ناں؟'' وہ پُرامید لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''نہیں میری جان..... کبھی نہیں..... ہاں اگر مر جاؤں تو۔''

''حنان۔'' وہ تیزی سے اٹھی اور تقریباً چیخ کر بولی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

''اب مجھ سے بات کرنے کی کوشش بھی مت کیجیے گا۔ کوئی ایسا بھی کہتا ہے کیا۔'' آنسو ٹپ، ٹپ اس کی آنکھوں سے نکل پڑے..... وہ تڑپ اٹھا..... اور شدت سے اسے سینے سے لگالیا۔

☆☆☆

وہ کمرے میں غصے میں ٹہل رہی تھی۔ اسے بھابی پر بہت غصہ آرہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے بھابی بری لگتی تھیں۔ اس کے ساتھ ان کی بہت دوستی تھی لیکن کچھ باتوں میں وہ اتنی شاطر تھیں کہ وہ پیچ و تاب کھا کر رہ جاتی..... اور لحاظ میں منہ سے کچھ نہیں نکلتا تھا..... آج بھی ایسا ہی ہوا..... اب وہ غصے میں کمرے میں آکر رونے لگی تھی۔ اسے رہ، رہ کر اُن کی باتیں یاد آنے لگیں۔

''جیا، جانوں ذرا آٹا تو گوندھ دو..... جیا دل چاہتا ہے کہ تمہارے ہاتھ میں لے لوں، برتن تم اتنے اچھے دھوتی ہو'' وہ مسکا لگاتیں۔

''ارے جانوں ذرا آٹھ دس روٹیاں ڈال لینا۔ سالن میں نے پکالیا ہے۔''

''جیا تم باہر جاؤ..... بہت گرمی ہے..... میں پکالوں گی کھانا..... تم برتن دھو دینا۔'' کھانے کی ٹیبل لگتی تو سب تعریف کرتے۔

''واہ! کیا سالن پکا ہے۔''

''پیٹ بھر گیا لیکن دل نہ بھرا۔'' ابا جی بولتے۔

''بس منان کے ابا..... جب سے بڑی دلہن گھر آئی ہیں میں تو بے فکر ہی ہوگئی ہوں..... ہیرا ہے میری

بہو.....'' ساس خوشی سے پھولی نہ سماتیں۔

''کچھ جیا کو بھی سکھا دیں بھابی۔'' حنان کہتے تو اس کی جان جل جاتی۔

''تو سکھانے کی کیا بات ہے.....اماں کے گھر سے کچھ سیکھ کر ہی آئی ہوں گی.....بس شوق کی بات ہوتی ہے، کیا کرایا کام کسے برا لگتا ہے۔'' اماں نخوت سے بولیں۔ آنسوؤں کا گولہ اس کے حلق میں اٹک جاتا پر وہ خاموش رہتی۔ اب کیا بتاتی اور کیسے بتاتی کہ لہسن' ادرک اس نے پیس کر دیا ہے۔ پیاز، ٹماٹر بھی بھابی نے اس سے کٹوائے ہیں۔ روٹی اس نے بنائی ہے.....سارا وقت برتن دھونے پر بھابی نے اسے کھڑا کر دیا تھا.....لیکن یہ سب بتانے کے لیے اسے اپنی سطح سے کافی نیچے آنا پڑتا۔

☆☆☆

وقت گزرنے کے ساتھ حنان تھوڑا چڑچڑا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جیا کو بار، بار بھابی کی مثالیں دیتا۔ ان دونوں کے درمیان تضاد بڑھتا جا رہا تھا۔ اتنا کہ تعلقات قطعی طور پر شکستہ ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

حنان کے لہجے میں ناگواری اور بے یقینی کا عنصر آ گیا۔ بھابی خاص طور پر حنان کے سامنے اسے بالکل بچوں کی طرح ٹریٹ کرتیں۔

☆☆☆

آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بہت اچھی سی ڈش پکائے، آج حنان کا موڈ صبح سے خوشگوار تھا۔ آفس بھی بہت اچھے موڈ میں گیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ کوئی خاص ڈش بنانی ہے.....کچن میں داخل ہوئی.....بھابی چائے بنا رہی تھیں۔

''جیا بچے ذرا منا ہل اور بلو کو میتھ کے ٹیسٹ کی تیاری کروا دو۔ جب تک میں کھانا تیار کر لوں۔''

''ارے بھابی آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں، آپ ان دونوں کو پڑھا دیں۔ آج کھانا میں پکا لیتی ہوں۔''

''نہیں بھئی، تمہیں تو پتا ہے کہ مجھے حساب وساب سمجھ نہیں آتا ہے۔ یہ کام تم کر لو.....کچن سے تم بے فکر ہو جاؤ۔''

اسے سخت کوفت نے آن گھیرا.....وہ کتنی چالاکی سے اپنی بات منواتی تھیں۔ یہ چالاکی اسے کیوں نہیں آتی تھی۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ اور ناچار اسے دونوں بچوں کو پڑھانا پڑا۔

کبھی اسے لگتا کہ بھابی واقعی بہت پُرخلوص ہیں اور کبھی لگتا کہ ان سے بڑا چالاک اور مکار اس نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا.....اس دن تو حد ہی ہو گئی.....اماں کی بہن گجرات سے آ رہی تھیں.....وہ اور بھابی صبح سے کام میں لگی ہوئی تھیں اس نے دل لگا کر پورے گھر کو چمکایا پھر کچن میں آ کر بھابی کا ہاتھ بٹانے لگی۔

''دلہن چچی، حنان چاچو کا فون آیا ہے۔'' منا ہل نے کچن میں جھانکا۔

''جاؤ جیا.....پہلے میاں جی سے بات کر لو.....بعد میں پیاز کاٹ لینا۔'' بھابی مسکرائیں۔

''بس بھابی.....دو منٹ میں آئی۔''

''ارے آرام سے آؤ.....کوئی فکر کی بات نہیں.....بلکہ فریش بھی ہو جانا اور اچھے سے کپڑے پہننا.....'' بھابی لگاوٹ سے بھرپور لہجے میں بولیں۔ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔

حنان کا فون سننے کے بعد وہ کمرے سے نکلی تو اس کے کانوں میں اماں اور بھابی کی آواز پڑی۔

''یہ بھی کوئی تُک ہے بھلا.....انہیں اٹھلانے سے ہی فرصت نہیں ہے.....مہارانی گپیں لگا رہی ہیں۔'' اماں شدید غصے میں تھیں۔

''کس کا فون ہے؟'' اماں نے سوال داغا۔

''مجھے نہیں پتا اماں.....میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔'' وہ بیزاری سے بولیں۔ اماں اور تپ گئیں۔

''میری پیاری اماں.....آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں، میں کر لوں گی ناں سب.....'' وہ اماں کے گرد بانہیں ڈال کر بولیں۔ ''ابھی شادی کو ٹائم کتنا ہوا ہے، کرنے دیں عیش.....''

''واہ بی بی.....یہ خوب کہی تم نے، انوکھی دلہن

ہیں کیا؟ میں پوچھتی ہوں اس سے۔''

''آپ کو میری قسم اماں..... اگر میری وجہ سے اسے آپ نے کچھ کہا ناں تو میں نہیں چاہتی گھر میں کوئی بدمزگی ہو..... وہ ہی تو بھائی ہیں..... بھائیوں میں بھی جب تک محبت رہتی ہے جب تک بیویاں ایک رہیں، کیوں؟ غلط کہہ رہی ہوں؟'' وہ مکاری سے بولیں۔

''ارے میں صدقے..... میں قربان..... خوش رہ میری بچی.....'' وہ واری صدقے ہوگئیں بھابی کے۔

اور وہ نم آنکھوں سے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اتنی ذلت، اتنی بے عزتی، آنسو تواتر سے اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے اسے بڑی بھابی سے نفرت اور چڑ محسوس ہونے لگی۔

''منافق.....'' وہ دل ہی دل میں بولی۔

''اتنا دوغلا پن..... اتنی چالاکی۔'' وہ بے آواز رونے لگی۔

''میرے اللہ! میں کیا کروں..... تو تو سب جانتا ہے..... مدد فرما میرے پیارے اللہ! میں بہت کمزور اور ناتواں ہوں..... تو رحم فرما۔'' اس نے گڑگڑا کر اللہ سے دعا کی اور جب دل سنبھلا تو جا کر کپڑے تبدیل کیے، بلش آن لگایا، ہلکی سی لپ اسٹک لگائی اور فریش ہو کر باہر آ گئی۔

☆☆☆

کل رات حنان کا موڈ سخت خراب تھا۔ اس نے جیا کو کمرے میں آ کر بے نقط سنائیں۔ اس کی کوتاہیوں کا احساس دلایا۔ وہ، وہ جرم عائد کیے، جس سے وہ تڑپ، تڑپ کر روئی۔ پھر غصے میں ہی گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ روتی رہی اور کب نیند اس پر مہربان ہوئی اسے پتا ہی نہیں چلا۔

لوگ کہتے ہیں وقت بہت بڑا مرہم ہے اور وہ سوچتی ہے کہ وقت سے زیادہ ظالم اور کٹھور چیز اور کوئی نہیں ہے بعض لمحات تو گزرنے کے ساتھ، ساتھ انسان کے اندر اتنی توڑ پھوڑ کر دیتے ہیں کہ ان لمحات کا اثر اس کی ساری زندگی پر حاوی ہو جاتا ہے۔ وہ خاموش، پتھریلا یا بے حس ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

حنان آفس سے آیا تو بے اختیار اس کی نظریں بے تابی سے جیا کو تلاش کرنے لگیں۔ صبح بھی وہ بہت چپ، چپ سی اور اداس تھی۔ حنان کے دل کو بہت دکھ ہوا۔ وہ خود ٹوٹ سا گیا۔ وہ کیسے اور کب جیا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی وجہ بن گیا..... اسے پتا ہی نہیں چلا..... دو تین دفعہ حنان نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نظر انداز کر گئی۔

وہ بے دلی سے کمرے میں آ کر جوتوں سمیت بیڈ پر لیٹ گیا۔ دل پر ایک بوجھ آن گرا۔ اسے جیا سے بہت محبت تھی۔ اسے وہ کیسے نظر انداز کر سکتا تھا۔ وہ گھر کے ماحول کی وجہ سے عجیب سی اکتاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ اماں کا شکایتی اور بھابی کا ناصحانہ انداز اب اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ بھابی جب سب کے سامنے جان بوجھ کر جیا کو کسی بات پر سمجھاتیں یا سرزنش کرتیں یا پھر کسی کوتاہی کا احساس دلاتیں تو وہ پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ اسے جیا پر غصہ آتا۔

''وہ کیوں اپنے دفاع میں کچھ نہیں بولتی..... بھابی یا اماں کچھ کہیں تو گھگیانے لگتی ہے۔ کیوں اتنی دبو ہے، کیوں گھبراتی ہے اتنا۔ وہ کیوں اعتراضات پر دلائل سے جواب نہیں کر دیتی.....'' اس کی کیفیت عجیب سی ہونے لگی..... وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور سر ہاتھوں میں تھام لیا۔'' وہ بہت معصوم، پاکیزہ سی اور بھولی ہے، چاہے جانے کے قابل اور پُرخلوص.....''

''جب انسان کو یہ محسوس ہونے لگے کہ وہ اپنی وقعت کھو چکا ہے تو اس کے لیے بہترین پناہ گاہ خاموشی ہوتی ہے۔'' کوئی چپکے سے اندر سے بولا..... ''اور جیا بھی یہی کر رہی ہے۔''

''وضاحتیں کبھی سچا ثابت نہیں کر سکتیں۔'' ایک اور آواز آئی..... وہ گھبرا کر ٹہلنے لگا۔

''شعور کی ایک سطح وہ ہے جہاں انسان منافقت اور بدکلامی کے جواب میں خاموشی اختیار کر لیتا ہے، وہ

پڑھی لکھی ہے۔ زبان درازی، بد لحاظی کیسے کرسکتی ہے۔'' شور تھا کہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ وہ پریشان ہونے لگا تو کمرے سے باہر نکل گیا..... قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ بھابی کی آواز کانوں میں پڑی۔ اپنا نام سن کر چونک جانا ایک فطری سا عمل تھا..... وہ شاید کسی سے فون پر بات کررہی تھیں۔

''ہاں شکل سے تو معصوم لگتی ہے لیکن ایک نمبر کی مینی ہے، حنان کو تو ایسے قابو میں کرلیا ہے کہ اسے جیا کے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا۔'' وہ چپ ہوئی تھیں لمحے کے لیے۔

''ابھی تک تو سب میرے ہی ہاتھ میں ہے۔'' وہ دوبارہ گویا ہوئیں۔ ''بڑی بی کو تو میں نے مٹھی میں کیا ہوا ہے۔'' کھی، کھی، کھی..... حنان سلگ گیا۔ ''میں نے اس گھر کو اتنے سال دیے ہیں لیکن مجال ہے منان نے ایک لفظ تعریف کا کبھی کہا ہو اور اِدھر حنان..... ایسے آگے پیچھے ہوتا ہے جیا کے کہ بس۔'' وہ نہ جانے کس کے کانوں میں زہر اگل رہی تھیں، حنان مزید نہیں سن سکا اور تیز قدموں سے ہی واپس پلٹ گیا۔ بھابی تو ان کا اپنا خون تھیں وہ کیسے اس گھر کی جڑوں کو کھوکھلا کرسکتی ہیں، لوگ اتنے منافق اور اتنے دوغلے کیسے ہوسکتے ہیں اور کیا اپنے ہی رویّے ان کے دل پر بوجھ نہیں ڈالتے..... وہ الجھ رہا تھا۔ کتنا عرصہ وہ بھابی کے فریب کو نہیں سمجھ پایا، دل کی بے چینی اور تشنگی مزید بڑھ گئی..... دماغ میں جھکڑ چلنے لگے۔ وہ آکر بے دم سا ہوکر پڑ گیا۔

☆☆☆

وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی حنان کو لیٹا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ ''یہ کب آئے'' قدم آگے بڑھانے مشکل ہوگئے۔ وہ بے مقصد الماری کی طرف بڑھی اور کھول کر کھڑی ہوگئی۔ ''کیوں آئی تھی وہ کمرے میں۔'' اس نے ذہن پر زور ڈالا۔

عجیب سی گھبراہٹ طاری ہوگئی تھی۔ الماری بند کرکے پلٹی، بے اختیار نظر حنان پر پڑی، وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''اِدھر آؤ میرے پاس۔'' وہ نیم دراز ہوکر بیٹھا اور پیار سے بولا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ اور باہر نکلنے لگی۔

''جیا!'' اس نے محبت سے چور لہجے میں پکارا۔ وہ رکی۔ قدم تھے کہ آگے بڑھنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ پلٹ کر اسے دیکھا۔ ان نظروں میں حنان کے لیے سب کچھ تھا۔ محبت، مان، شکایت، دکھ، غصہ وہ تڑپ ہی تو گیا اور تیزی سے اس کی جانب بڑھ کر اسے سینے سے لگالیا۔

''میں نے بہت زیادتی کردی اپنی جان کے ساتھ۔''

''زیادتی..... آپ بہت بے حس ہیں، زیادتی تو چھوٹا لفظ ہے۔'' دو موٹے، موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے نکلے۔

''اچھا پلیز..... اب رونا نہیں، میں ان آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے شرمندہ مت کرو.....'' اس کی نگاہوں میں التجا کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ مسکرادی۔

''مجھ سے ناراض مت ہوا کریں، میں ٹوٹ جاتی ہوں، اپنے آپ اندر ہی اندر مرسی جاتی ہوں، بس آپ جیسا چاہتے ہیں میں ویسا ہی آپ کو بن کر دکھاؤں گی۔ بالکل بھابی کی طرح..... پھر تو آپ مجھے بکھرنے نہیں دیں گے ناں۔'' وہ معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

حنان کی آنکھ سے ایک آنسو جیا کے ہاتھ پر گرا۔ وہ بے چین ہوگئی۔

''تم نے کبھی عقل و شعور سے نکل کر محبت کی ہے جیا۔'' حنان نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا۔ جیا کی آنکھوں سے جھرنے کی طرح آنسو بہنے لگے۔

''تم کیا سمجھتی ہو، محبت صرف تم کرتی ہو..... تم تو میری زندگی کا حاصل ہو۔'' وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''میں الجھ گیا تھا، مجھے معاف کروگی۔'' وہ مان سے بولا تو وہ اس کے سینے سے لگ کر طمانیت سے مسکرادی۔ اور امید کی ایک ہی کرن نے جیا کو بھرپور خواب دکھادیے۔

❁❁❁

سوا لاکھ کا ہاتھی

فوزیہ احسان

ہڈیوں کا گودا جما دینے والی سردی تھی۔ وہ دونوں اس کڑکتی ٹھنڈ میں بری طرح کانپ رہے تھے، ان کے دانت بج رہے تھے اور ہاتھ پاؤں ایسے سُن تھے جیسے بے جان چیز۔ دونوں کھلے آسمان تلے بچھی چارپائی پر تھے ان کے اوپر میلی چیکٹ رضائی تھی جو انہوں نے اپنے نحیف ولاغر وجود کے گرد لپیٹ رکھی تھی مگر بدن کو حرارت ملنے کے بجائے سردی کا احساس بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

''آہ، میری کمر۔'' مولوی فضل دین کراہا.....

بشیراں نے ذرا سا سر اٹھایا تو لحاف میں جھری سی بن گئی اور ٹھنڈی ہوا سرسراتی ہوئی لحاف میں گھسنے لگی۔ بشیراں نے لحاف گرایا اور اسی لحاف میں دُبک گئی۔

''ظالمو نے کتنا وزن اٹھوایا تم سے فضل دین جو کمر دُہری ہو گئی.....'' بشیراں دکھ کے احساس سے بوجھل آواز میں لحاف کے اندر سے ہی ہولے سے پوچھنے لگی۔

''بھاری سوٹ کیس تھا نیک بخت۔ وزن زیادہ نہیں تھا بس میں ہی بوجھ اٹھا نہیں پا رہا تھا۔'' فضل

دین پھر کراہا۔

''تو رکھ دیتے یا کسی جوان قلی سے کہہ دیتے وہ سوٹ کیس اٹھالیتا۔'' بشیراں نے اٹھ کر فضل کی کمر کو سہلایا۔

''جوان قلی بوجھ اٹھاتا تو معاوضہ بھی اسے ہی ملنا تھا ناں۔'' وہ آہ بھر کے بولا۔

''ہاں یہ تو ہے.....'' بشیراں گہری سوچ میں گم تھی پھر کچھ خیال آنے پر بولی۔

''یہ کام چھوڑ دو کوئی آسان کام کرلو'' اس نے اپنے تئیں آسان حل ڈھونڈا تھا۔ فضل دین ہائے ہائے کررہا تھا۔ کمر درد نے اسے بے حال کررکھا تھا، تھکن اور درد سے اس کی آنکھوں میں نیند نہیں آرہی تھی۔ بشیراں اپنے کمزور ہاتھوں سے اسے دبا رہی تھی مگر ان بوڑھے ہاتھوں میں اب دم خم کہاں رہا تھا جو فضل دین کے بدن کی تھکن اتار سکتا۔ کمرے میں زیبا کے بولنے کی آواز آرہی تھی شاید بچہ جاگ گیا تھا۔ زیبا کی آواز سن کر بشیراں جلدی سے اٹھ بیٹھی اگر بہو باہر آگئی تو کیا کہے گی۔

''کام آسان ہو یا مشکل، ایک بات یاد رکھنا بشیراں میں جیتے جی تمہیں کسی کا محتاج نہیں ہونے دوں گا، مرتے دم تک تمہیں خود کما کے کھلاؤں گا، محنت مزدوری کروں گا اور ہم دونوں کا پیٹ پالوں گا۔'' فضل کپکپاتے لبوں سے کہتا چلا گیا بشیراں اب بیٹھی ہوئی تھی۔

''کہیں لکھنے پڑھنے کا کام ڈھونڈ لو جیسے ساری زندگی کیا ہے۔'' بشیراں نے ماضی میں جھانکا۔

''وہ زمانے گئے نیک بخت جب لوگ کم پڑھے لکھے تھے اور میرے جیسا میٹرک پاس اندھوں میں کانا راجا ہوتا تھا، لوگ میرے پاس آتے تھے اپنی زمینوں کا حساب کتاب کرواتے تھے کوئی اپنے پردیسی بیٹے کو خط لکھوانے آجاتا تھا۔ اب وقت بدل گیا ہے کمپیوٹر کا دور ہے اب سارے حساب کمپیوٹر ہی رکھتا ہے۔'' فضل استہزائیہ ہنسا اس کی آواز لرز رہی تھی اس کو کھانسی چھڑ گئی اور ایسی شروع ہوئی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی بشیراں ہراساں سی اسے دیکھے گئی پھر کھانسی کا شربت اٹھا لائی دو چمچ بھر بھر کر فضل کے منہ میں انڈیلے۔ وہ کھانس، کھانس کر بے دم سا ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پانی آگیا تھا وہ اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں کو چہرے پر رکھے سانس اندر باہر کھینچ رہا تھا۔

فضل کی کہانی بھی ویسی ہی تھی جیسی بہت سے بد نصیب بیٹوں کے باپ کی ہوسکتی ہے۔ مولوی فضل دین اپنے زمانے میں ایک مسجد کا امام تھا بچوں کو سپارہ پڑھایا کرتا تھا۔ بہت ایماندار آدمی تھا لوگ اس کے پاس اپنی امانتیں رکھوایا کرتے تھے۔ لوگ اس کی بات مانتے تھے۔ اپنے مسئلے اس کے پاس لے کر آیا کرتے تھے سارا محلہ اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ بشیراں بہت نیک اور صابر بیوی تھی، پردہ کرتی تھی سو گھر کے اندر ہی رہتی تھی، فضل اس سے بہت محبت کرتا تھا وہ دونوں اپنی زندگی میں بہت خوش تھے بس اولاد کی کمی تھی۔ وہ ہر نماز کے بعد اللہ سے اولاد کے لیے دعا مانگا کرتے تھے مگر ان کی دعا قبول نہیں ہوتی تھی وقت گزرتا جارہا تھا سادہ طرز زندگی ہونے کی بنا پر وہ دونوں میاں بیوی معمولی سی تنخواہ میں بھی اچھی بھلی گزر بسر کررہے تھے۔

فضل اس وقت پچاس سال کے لگ بھگ ہوچکا تھا جب ویرانے میں بہار آگئی اللہ نے اس کی سن لی اور ان کے گھر بیٹا ہوا جس کا نام اذان رکھا گیا۔ فضل بہت خوش تھا اور اس نے بساط بھر خوشیاں بھی منائی تھیں۔ اذان کو ناز و نعم سے پالا تھا اسے کسی چیز کی کمی نہیں آنے دی۔ اذان نے میٹرک کے بعد پڑھنے سے انکار کردیا تو باپ نے اسے بہت سمجھایا کہ کالج میں ایڈمشن کرواؤ اور آگے پڑھو مگر وہ مان کے نہیں دیا۔ وقت بہت بدل گیا تھا لوگوں کا رہن سہن، ترجیحات کب بدل گئیں فضل کو کچھ خبر نہیں ہوئی۔ اسی محلے میں ایک لڑکا عمران دوسرے علاقے سے قرآن حفظ کرکے آیا تھا وہ لوگوں کو قرآن و سنت کی روشنی میں ان کے مسئلوں کے حل بتانے لگا۔ وہ جوان تھا بات کرنے کا ڈھنگ جانتا تھا لوگ اس کی طرف مائل ہورہے تھے اور یوں ایک دن عمران کو امام مسجد بنا دیا گیا اور فضل سے معذرت کرلی گئی۔ یہ فیصلہ نئی نسل کا تھا وہی لوگ جو فضل سے قرآن پڑھے تھے وہی اب فضل کو جھٹلا کر

جوان مولوی عمران کا انتخاب کر چکے تھے۔ فضل مسجد کا گھر چھوڑ کے کرایے کے گھر میں چلا گیا۔ ایک کمرے کا گھر تھا ایک غسل خانہ اور چھوٹا سا باورچی خانہ۔

فضل دین کے پاس کچھ جمع پونجی تھی۔ وہ اس نے بیٹے کی شادی میں لگا دی۔ ایک ہی بیٹا تھا اور اسے اس کی شادی کا بہت ارمان بھی تھا..... ان دونوں میاں بیوی کا دل کرتا کہ ان کی بہو ہو اور وہ اپنے پوتے... پوتیوں کو گودوں کھلائیں، ان کے ناز نخرے اٹھائیں۔ اذان ان کی بڑھاپے کی اولاد تھا بہت منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ فضل دین کسی بہت اچھی سی لڑکی کی تلاش میں تھا جو اس گھر کو اچھے سے سنبھال رکھے اور ان دونوں کا اور اذان کا خیال رکھے اور سب ہنسی خوشی مل جل کر رہیں لڑکی کی تلاش جاری تھی کہ اذان نے لڑکی خود ہی ڈھونڈ لی اور فضل پر اسی دن عقدہ کھلا کہ اذان سارا، سارا دن سیل فون کان سے چپکائے دھیرے، دھیرے مسکراتے ہوئے کیسیں لگاتا رہتا ہے۔ اس خبر پر فضل دین کا دل کافی کھٹا ہوا مگر اکلوتے بیٹے کی خوشی کی خاطر انہوں نے یہ کڑوا گھونٹ بھی بھر لیا اور دل بڑا کر کے اذان کی دلہن زیبا کو بیاہ کر گھر لے آئے۔ بشیراں اور فضل نے کھلے دل سے بہو کا استقبال کیا اور اس کے لاڈ اٹھانے لگے۔

زیبا نے چند دن بعد ہی اپنے رنگ ڈھنگ دکھانے شروع کر دیے..... وہ ایک نئے زمانے کی فیشن ایبل لڑکی تھی، شانوں تک کٹے ہوئے بال، تنگ کپڑے دوپٹے سے بے نیاز وہ گھر میں ایسے گھوما کرتی جیسے اس گھر میں صرف وہی رہتی ہے۔ کسی بزرگ کا کوئی لحاظ مروت نہیں، بڑوں کا احترام نہیں، آنکھ میں حیا نہیں، مولوی فضل دین اسے دیکھ، دیکھ کر کڑھتا رہتا، وہ کسی کو درخواعتنا سمجھتی نہیں تھی، ایک دو بار فضل دین نے بہو کو ٹوکنے کی غلطی کی تھی مگر وہ ہلکی سی سرزنش بھی سہہ نہیں پائی تھی۔ اس نے بوڑھے سسر سے اتنی بدتمیزی کی کہ الٹا لینے کے دینے پڑ گئے۔ اس دن زیبا نے شوہر کے بھی کان بھرے تھے جس کے نتیجے میں بیٹے نے باپ سے بدکلامی کی انتہا کر دی۔ بشیراں کے روکنے پر بھی اس نے ماں کا احساس نہیں کیا اور جلی کٹی سنا کر اپنے کمرے میں گھس گیا بس اس دن سے زیبا ان دونوں سے خار کھانے لگی تھی۔

زیبا نے ان کے اکلوتے بیٹے پر ہی نہیں اکلوتے کمرے پر بھی قبضہ جما لیا تھا، فضل اور بشیراں اس ساری صورت حال سے پریشان تھے مگر بہو سے کیا گلہ جب بیٹا ہی تو طوطا چشم ہو جائے۔ بیٹے اور بہو نے ماتھے پر آنکھیں رکھ لی تھیں فضل اور بشیراں ایک دوسرے سے چھپ، چھپ کر رویا کرتے، آنسو تھے کہ خشک ہی نہیں ہوتے تھے دامن بھگونے چلے آتے۔

☆☆☆

زیبا بہت بے حس لڑکی ثابت ہوئی تھی اس کو اپنے سوا کسی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ فضل کا دل جلتا رہتا ایسی بہو کا خواب کب دیکھا تھا؟ آنکھیں جھکا کے بات کرتی شرم وحیا کا پیکر بہو کا خواب دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ ان کے گھر کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا تھا۔ زیبا کا جو دل کرتا وہ کرتی تھی۔ اذان مٹی کا مادھو بنا بس جی حضوری ہی کرتا رہتا..... وہ بیوی کی آنکھوں سے ہی دیکھتا اور اسی کے کانوں سے سنتا تھا۔ اذان ایک فیکٹری میں نوکری کرنے لگا تھا، وہ شام کو آتا تو زیبا تیار ملتی، اذان اسے لے کر گھومنے نکل جاتا۔ وہ دونوں سیر سپاٹے کرتے اور رات کا کھانا کھا کر ہی واپس آتے۔ فضل اور بشیراں بھوکے بیٹھے رہتے مگر پروا کسے تھی۔

فضل دین نے محنت مزدوری کرنی شروع کر دی، وہ کمر پر بوجھ ڈھونے لگا۔ وہ اعظم مارکیٹ میں کپڑے کی بھاری گانٹھیں اپنے کندھوں پر لاد کر مالکان کی مرضی کے مطابق کبھی رکشے میں رکھواتا تو کبھی گدھا گاڑی پر۔ اس کی سانس اکھڑ جاتی، وہ کہیں بیٹھ جاتا تاکہ ... کچھ دیر سستا لے مگر کوئی اس پر ترس نہیں کھاتا تھا اس کو ڈانٹ کے اٹھا دیا جاتا، وہ دوبارہ کام میں جت جاتا۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا مگر مجبوری تھی۔ اس نے ساری زندگی حق حلال کی روزی کما کے کھائی تھی اپنی بیوی کو عزت سے گھر بٹھا کے کھلایا تھا اس کا فرض تھا اور وہ اپنے فرائض سے کوتاہی کیسے برت

سکتا تھا۔ اس کی کمر میں مسلسل خم کے ساتھ درد رہنے لگا تھا مگر وہ حوصلے اور ہمت سے مردانہ وار محنت کر رہا تھا کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے کہیں بہتر تھا کہ محنت کر کے دو ہاتھوں کی کمائی کھائی جاتی اور فضل .... بے غیرت نہیں تھا بس وقت کی ستم ظریفی کا شکار ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ایک دن فضل دین کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اسے کپڑوں کی گانٹھ اپنے کندھوں پر اٹھا کر گیٹ کے پاس ایک دکان دار کو دینے جانا تھا اس نے گانٹھ کندھوں پر رکھی اس کا دل بری طرح گھبرایا اور سانس رکنے لگی اور اگلے پل ہی وہ زمین پر گرا اور حواس باختہ سا چاروں طرف دیکھنے لگا۔ بس یہ اس کا جرم بن گیا پانی کا ایک گلاس فضل کو دکان دار نے دیا اور ساتھ ہی نوکری سے جواب دے دیا، وہ آنسو بھری آنکھوں سے التجا کرتا رہا مگر اس کی شنوائی نہیں ہوئی بالآخر وہ ٹوٹی سی چال چلتا گھر کی طرف چل پڑا۔

اس کے بعد اس نے قلی کی نوکری کرنا شروع کر دی، بار اٹھاتے وہ تھک جاتا اور نڈھال سا گھر میں داخل ہوتا اور ساری رات اس کی ہائے وائے گھر میں گونجتی رہتی مگر گھر کے بے حس لوگ جوانی کے نشے میں چور بے سدھ سوئے پڑے رہتے۔

☆☆☆

فضل دین کو دو ماہ ہو گئے تھے ریلوے اسٹیشن پر کام کرتے ہوئے وہ کوشش کرتا کہ ہلکا سامان اٹھائے مگر کبھی، کبھی بھاری سامان بھی اٹھانا پڑ جاتا تھا کچھ منچلے اپنی برتری جمانے کے لیے اس کی مٹھی میں کچھ نوٹ دبانے کی کوشش بھی کرتے تھے مگر اسے خیرات نہیں چاہیے تھی اسے اپنی اجرت کے سوا کسی سے کوئی لالچ نہیں تھا۔ ایک دن ایسے ہی کسی امیر زادے نے فضل کو پانچ سو کا نوٹ دینا چاہا مگر اس نے انکار کر دیا تو اس لڑکے نے اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا اور بوڑھے فضل دین سے خاصی بدتمیزی کی اور اس کا گریبان بھی پکڑ لیا کافی گرما گرمی ہوئی۔ تبھی ایک آدمی نے آ کر فضل کو اس خود سر لڑکے کے چنگل سے چھڑایا اور اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر اس کے گھر تک چھوڑنے آیا تو ساتھ ہی اسے نوکری کی آفر بھی کر دی۔

اس آدمی کا نام ارشد تھا وہ ایک بزنس مین تھا اور پچھلے دنوں وہ اپنے دادا کو گاؤں سے لے کر شہر آیا تھا۔ ارشد کو ایک ایسے بندے کی ضرورت تھی جو ارشد کے دادا کے حقے میں پانی ڈال کر ان کی چلم تیار کرے وہ حقہ پیتے تھے اور ارشد بزرگوں کا ایک گروپ صرف اپنے دادا کے لیے بنانا چاہتا تھا جو اس کے دادا کے پاس بیٹھیں، لوڈو کھیلیں، تاش کھلیں اور پرانی باتیں ان کے ساتھ کرتے رہیں، ہندوستان کی باتیں، بٹوارے کی باتیں، ماضی کی باتیں کرنا دادا کو اچھا لگتا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ ماضی پرست تھے ماضی میں رہنا ان کو اچھا لگتا تھا شاید سب بوڑھے اس عمر کو پہنچ کر ماضی پرست ہی ہو جاتے ہیں۔ ارشد اور اس کے گھر والوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا اس لیے وہ ایسے فارغ البال لوگوں کو ڈھونڈ کر ان کو نوکری پر رکھنا چاہتا تھا۔ واہ رے تیری قدرت۔ دنیا میں کیسے، کیسے کرشمے دکھاتی ہے کہاں فضل دو وقت کی روٹی کے لیے در، در کے دھکے کھا رہا تھا اور ارشد پیسے کے بل بوتے پر بزرگ خریدتا پھر رہا تھا جو اس کے دادا کا دل بہلا سکیں۔ ان کے ساتھ وقت گزار سکیں دادا کے ساتھ گپ شپ لگا سکیں۔

☆☆☆

فضل دین نے گھر کے پچھواڑے کچے صحن میں پائپ لگا کر پانی کا چھڑکاؤ کیا صحن سے کچی مٹی کی اٹھتی خوشبو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے پائپ اکٹھا کر کے ایک طرف رکھا موٹر بند کر کے صحن میں کرسیاں لگانے لگا چھ سات کرسیاں اور میز رکھ کر فضل نے چھوٹی، چھوٹی لکڑیاں اکٹھی کر کے ان کو آگ لگائی جب تک وہ آگ جلتی رہی وہ حقے میں پانی ڈالنے چلا گیا جب وہ یہ کام کر چکا تب تک لکڑیاں جل چکی تھیں۔ اس نے چلم میں تمباکو ڈالا اس کے اوپر ہاتھ سے مسل کر گڑ ڈالا اور چلم کو دہکتے کوئلوں سے بھر کر حقے کے اوپر رکھا اور حقہ تازہ ہو گیا کالونی کے فارغ بزرگ آنا شروع ہو

گئے۔ حقے کے سوٹے کے ساتھ تاش کھیلتے وہ مگن ہو چکے تھے، بہت خوش تھے گھر کے اندرونی حصے میں فضل ان کی چائے کا انتظام کرنے چلا گیا تھا۔

اس کی اچھی کارکردگی دیکھ کر ارشد نے فضل دین کی پانچ ہزار تنخواہ مقرر کر دی تھی۔ دو لوگوں کے روٹی پانی کے خرچے کے لیے کافی سے زیادہ تھی فضل دین نے بشیراں کے لیے چارپائی اور بستر خریدا تھا۔ ارشد کا دادا جمال، فضل سے خوش تھا وہ کام اچھا کرتا تھا اسے پسند آیا تھا۔

دونوں کی زندگی میں اب سکون آ گیا تھا بہو کا بھی موڈ اب کچھ بہتر رہنے لگا تھا اس کی وجہ یہ بالکل بھی نہیں تھی کہ اسے اپنی ہٹ دھرمی یا برے رویے کا احساس ہو گیا تھا اور وہ نادم ہو کر بدل گئی تھی ہرگز نہیں، موڈ کے بدلنے کی وجہ وہ پیسے تھے جو فضل نے اپنے پوتے زین کو دیے تھے۔ وہ زین کے لیے کھلونے بھی لے کر آیا تھا۔ اسے نوکری کرتے سات ماہ ہونے کو تھے سب ٹھیک چار رہا تھا بہت کچھ ٹھیک بھی ہو گیا تھا کہ ایک انہونی ہو گئی۔ دادا جمال وفات پا گیا، محفل اجڑ گئی، نوکری چھوٹ گئی فضل کی روزی کا یہ در بھی بند ہو گیا اس کا بوڑھا دل مارے خوف کے لرزنے لگا۔ اب کیا ہوگا۔

وہ کام نہیں کرے گا تو نوبت فاقوں تک آ جائے گی۔ وہ ایسا ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ بشیراں کا مرتے دم تک خیال رکھنا چاہتا تھا اسے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہیں آتا تھا اور فضل کی غیرت کو یہ گوارا بھی نہیں تھا کہ وہ یا بشیراں دو وقت کی روٹی کے لیے کسی اور کا در کھٹکھٹائیں۔ اسے اللہ کی ذات پر مکمل بھروسا تھا کہ وہ رب جو پتھروں میں کیڑے مکوڑوں کے رزق کا وسیلہ بنا دیتا ہے وہ ان دو بے بس بوڑھوں کو بھی بھوکا نہیں رہنے دے گا فضل کا اللہ کی ذات پر توکل کامل تھا۔

وہ کمر کس کر ایک بار پھر میدان میں اترا تھا۔ اس نے دل کڑا کیا... مشکل ضرور تھا اب اس عمر میں مزدوری کرنا مگر کچھ نہ کچھ کرنا تو تھا۔ کچھ کیے بنا گزارہ نہیں تھا۔ مگر اب لوگ اسے مزدوری کا کام آسانی سے دیتے بھی نہیں تھے، وہ کمزور جو بہت تھا۔

اس روز بھی اسی سلسلے میں فضل دین گھر سے نکلا چلتے، چلتے وہ دور نکل آیا، اس کی سانس اکھڑ گئی وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اتنی شدید دھند میں بھی وہ پسینے میں نہا گیا۔ وہ وہیں ایک تھڑے پر اس آس میں بیٹھ گیا کہ ابھی وہ سانس بحال کر کے اٹھے گا اور مزدوری کی تلاش میں نکلے گا۔ وہ آنکھیں بند کیے سانس لے رہا تھا اس پر نقاہت طاری تھی۔ اسے لگا اس کی جان نکلنے لگی ہے، سانس تنگ ہو رہی تھی۔ اسی حالت میں دیکھا ایک طرف ہجوم سا جا رہا تھا۔ آج مزدوروں نے جلوس نکالا تھا مزدوروں کا ایک جُتھ نعرے لگاتا ہوا وہیں سے گزر کر اسمبلی ہاؤس کی طرف جا رہا تھا ہاؤ ہاؤ کی آوازوں میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ فضل پر موت کا سناٹا چھا رہا تھا، نزع کا عالم تھا، موت کی سردی اس کے اندر سرایت ہو رہی تھی..... ہجوم اس کے قریب آتا جا رہا تھا فضل کی زبان پر کلمہ جاری تھا اور بالآخر اسی حالت میں اس نے اپنی جان اللہ کے سپرد کر دی۔ اس کا جسدِ خاکی وہیں ڈھیر ہو گیا تبھی اس جلوس میں کہیں دھماکا ہوا تھا۔ چیخ و پکار سے وحشت ناک سماں تھا۔ پولیس کی گاڑیاں اب چکراتی پھر رہی تھیں۔ میڈیا کے رپورٹرز کو اپنی پڑی تھی نیوز پہلے کون نشر کرتا ہے پہلی ویڈیو کس چینل سے آتی ہے۔ انسانی جان کتنی ارزاں ہے کسی کو پروا نہیں تھی خون کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔

''استغفر اللہ مولوی فضل دین کا منحنی سا وجود بھی کافی جل گیا تھا بس چہرہ سلامت تھا میں نے خود دیکھا تھا۔'' لوگ تیزی سے تصویریں بنا رہے تھے ویڈیوز بن رہی تھیں۔

☆☆☆

فضل دین کی موت کو بھی اس حادثے کا حصہ سمجھا گیا تھا۔ زیبا اور اذان مگر مچھ کے آنسو بہاتے ہوئے میڈیا کے نمائندوں سے بات چیت کر رہے تھے، بشیراں کو پانچ لاکھ روپے حکومت کی طرف سے ملے تھے۔ دونوں بیٹا، بہو اور اذان، بشیراں کو گلے لگا کے رو رہے تھے اور ان کی ویڈیو مختلف چینلز پر دکھائی جا رہی تھی۔

میں عشق ہوں

نایاب جیلانی

عشق، محبت، الفت، چاہت، انسیت، لگاؤ، پیار، اپنائیت . . . اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ حسین جذبے . . . کہیں یہ پھول برساتے ہیں، زندگی مہکاتے ہیں، سانسوں کو معطر کرتے ہیں، لبوں کو ترنم بخشتے ہیں، تاریک راہوں کو منور کرتے ہیں اور کبھی، کبھی یہ مردہ ہوتے وجود میں زندگی کی نئی لہر بھی دوڑاتے ہیں . . . غرضیکہ انسانی حیات انہی جذبوں کی سرہونِ منت ہے . . . لیکن یہی جذبے کبھی عمر بھر کی تلاش کا حاصل ہوتے ہیں اور کبھی ریت کے ذروں کی طرح ہاتھ سے پھسلتے چلے جاتے ہیں اور انسان تہی داماں رہ جاتا ہے . . . اسی حاصل اور لاحاصل کے گرد گھومتی حساس جذبوں کی آئینہ دار ایک دلکش و دل پزیر تحریر

ابھی تو عشق میں ایسا بھی حال ہونا ہے — کہ اشک روکنا تم سے محال ہونا ہے
ملیں گی ہم کو بھی اپنے نصیب کی خوشیاں — بس انتظار ہے کب یہ کمال ہونا ہے
ہر ایک شخص چلے گا ہماری راہوں پر — محبتوں میں ہمیں وہ مثال ہونا ہے
وصی یقین ہے مجھ کو وہ لوٹ آئے گا — اسے بھی اپنے کیے کا ملال ہونا ہے

سلسلے وار ناول

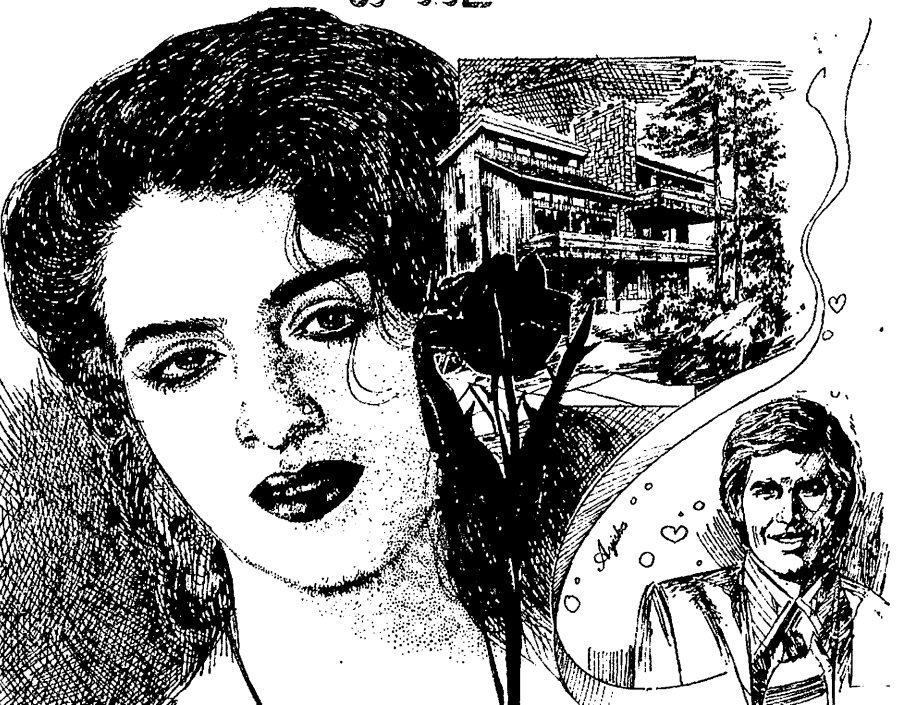

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

عمائم عالمہ بن رہی تھی، وہ اور عالی جامعہ میں ایک ساتھ پڑھتی تھیں عالی کی باتوں میں ہمیشہ ''وہ'' موجود ہوتا۔ وہ ایسا ہے..... وہ ایسا ہے لیکن عمائم نے کبھی اس کا نام بھی نہیں پوچھا تھا۔ عالی بہت حسن پرست تھی شاید اسی لیے وہ عمائم کے ساتھ تھی۔ عمائم، حریم سے لیپ ٹاپ مانگتی ہے تو ایمان وہیں کھڑا تھا اور احتشام باہر سے آیا تھا جب حریم واپس لیپ ٹاپ لینے آتی ہے تو عمائم کہتی ہے کہ ایمان کو شکریہ کہنا تو وہ بتاتی ہے کہ لیپ ٹاپ احتشام کا ہے اس پر عمائم حیرت زدہ رہ جاتی ہے، عمائم کو آج کل کچھ کال اور ایس ایم ایس آرہے تھے جو اس کی زندگی میں آنے والے ہر حادثے کی پیشگی اطلاع دے دیتے تھے، عمائم بچپن سے دیکھتی آئی تھی اُسے دو لوگوں سے چھپایا جاتا تھا۔ بابا صاحب اور اموجان اور تیسری شخصیت دادی پھپو۔ وہ بچپن سے اپنے ساتھ ایسا سلوک ہوتے دیکھ رہی تھی مگر حیران کُن بات تھی کہ وہ اس بات کی وجہ سے ناواقف تھی۔ بابا صاحب کا گھرانا مشترکہ خاندانی نظام کے تحت چل رہا تھا۔ حرم نے عمائم کو بتایا کہ ایمان نے ماما سے کہا ہے کہ تائی امی سے عمائم کا رشتہ مانگیں۔ ایمان، عمائم سے کہتا ہے کہ وہ اموکو راضی کرے گا تو عمائم کہتی ہے کہ یہ بات تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھی جائے گی۔ ثریم، عمائم کو اپنی بہن کی شادی پر بلاتی ہے، نورس، عمائم کے ذہنی نمائش کا کام کرتی ہے اس کی کامیابی سے ملنے والے پیسے سے یتیم لڑکیوں کی شادی ہوگی۔ اموء عمائم سے کہتی ہیں کہ ایمان کبھی اس کا نہیں ہوگا۔ امی، احتشام اور اذان میں دوریاں چاہتی تھیں لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ وہ چاہتی ہیں کہ ماہم کا رشتہ احتشام کے لیے مانگ لیں لیکن وہ کہتا ہے کہ ضرور مانگیں مگر اذان کے لیے۔ بسمہ چاچی، عمائم کو کہتی ہیں کہ تمہیں دیکھ کر اپنے خسارے یاد آتے ہیں۔ بسمہ چاچی بعد میں عمائم سے معافی مانگتی ہیں کہ یہ دن ہی ایسا ہے شاید تو وہ پوچھتی ہے آج کیا دن ہے تو بسمہ چاچی کہتی ہیں جیل والوں کی ملاقات کا دن۔ جس پر عمائم دنگ رہ جاتی ہے کیونکہ وہ نہیں جانتی تھی کہ جیل میں کون ہے۔ عمائم، نورس کے ساتھ ثریم کے گھر تقریب میں جاتی ہے تو نورس اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور عالی کہتی ہے کہ تم چلی جاؤ میں ایک کام میں پھنس گئی ہوں۔ نورس اپنی گاڑی چھوڑ کر گئی تھی۔ ایک لڑکی عمائم کو ایک پارسل دیتی ہے کہ یہ نوٹس ہیں تم نورس کو دے دینا۔ پولیس راستے میں گاڑی روکتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ میں ایس پی اذان کی کزن ہوں تو آفیسر اس سے معذرت کر لیتے ہیں۔ گھر واپس آتی ہے تو اس کے پاس میسج آتا ہے کہ منع کیا تھا ناں جانے سے۔ صبح عمائم کے کمرے سے وہ پیکٹ غائب تھا۔ صبح وہ امی کو بتاتی ہے کہ میرے ڈاکومنٹس چوری ہوئے ہیں جو امانت تھے۔ ثریم، عمائم سے پیکٹ کا پوچھتی ہے تو بتاتی ہے کہ پیکٹ چوری ہوگیا ہے۔ ثریم، عمائم کو بتاتی ہے کہ پیکٹ میں نوٹس نہیں تھے کچھ اور تھا اور اگر وہ نہ ملا تو تمہارے اور میرے لیے تباہی ہے۔ عمائم، جامعہ جانے لگتی ہے تو اس کے پاس میسج آتا ہے جہاں جارہی ہو بے فائدہ ہے واپس آجاؤ۔ عالی کا اس کے پاس میسج آتا ہے کہ نورس نے اسے اسٹرک آف کر دیا ہے۔ عمائم، نورس کو کال کرتی ہے تو وہ اٹینڈ نہیں کرتی میسج کرنے پر کال کرتی ہے تو کہتی ہے مجھے وہ پیکٹ ہر صورت میں چاہیے۔ عالی، احتشام کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتی ہے۔ عالی کہتی ہے کہ اس نے احتشام سے بات کی ہے اس کی اپروچ بہت اوپر تک ہے، بات بڑھ گئی تو نورس نہیں چھوڑے گی۔ عمائم کے پاس میسج آتا ہے احتشام اور عالی کے ڈرامائی ملاپ سے پریشان ہو تو وہ حیران رہ گئی۔ عمائم تیار ہو کر نکلتی ہے تو سب جا چکے ہوتے ہیں وہ لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگتی ہے۔ امی، احتشام کو اسے لینے بھیجتی ہیں وہ راستے میں کچھ باتیں کرتا ہے تو وہ حیران ہوتی ہے پھر دیکھتی ہے کہ اس کے ائرفون لگا تھا۔ عمائم جامعہ جاتی ہے تو گارڈ ڈھائی گھنٹے بعد اسے اندر جانے دیتا ہے، نورس کہتی ہے وہ پیکٹ تمہارے گھر سے غائب ہوا ہے تم کو وہ پیکٹ گم ہونے کی سزا بھگتنی ہوگی۔ نورس کو ہر صورت وہ پیکٹ چاہیے تھا، وہ عمائم کو معاف کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ اس نے عمائم کے گھر فون کر دیا تھا کہ وہ آج جامعہ میں رہے گی۔ عمائم سے اصلی بات جاننے کے لیے نورس، ثریم کو عمائم کے پاس بھیجتی ہے۔ انتظامیہ کی ہیڈ اسے کھانے کی ٹرے میں چھپا کر ایک پرچہ بھی دیتی ہے جس پر محمد غوری کا تاریخی واقعہ لکھا تھا۔ عمائم کو اس کی کچھ سمجھ نہیں آئی۔ کرن، عمائم کو بتاتی ہے کہ جب وہ مہندی کی رات عمائم کو پیکٹ دے کر واپس آئی تو ٹیرس پر اس نے نورس کو دیکھا تھا وہ کسی ضروری کام سے نہیں گئی تھی۔ اذان کی کسی غلطی سے ان کے کوڈ ڈی کوڈ ہو جاتے ہیں تو احتشام اس پر بہت غصہ کرتا ہے۔ اموء حریم کو بتاتی ہیں کہ عمائم کی وجہ سے ایمان ان سے بات نہیں کر رہا، ان کی یہ بات ماہم سن لیتی ہے اور کہتی ہے کہ آج ایمان تو کل کوئی اور بھی عمائم کے لیے کھڑا ہوگا۔ ثریم بتاتی ہے کہ کرن اغوا ہوگئی ہے، عمائم، نورس سے کہتی ہے کہ کرن اغوا ہوگئی وہ بے قصور تھی تو نورس کہتی ہے کہ تمہیں کیا پتا کہ وہ بے قصور تھی یا گناہ گار..... احتشام، روشان کو بتاتا ہے کہ کوڈ ڈی کوڈ ہو گئے ہیں اب محتاط رہنا ہوگا۔ عمائم، ماہم رومان کو جو

اسے کھانا دینے آتی ہے باتھ روم میں بند کر کے باہر نکلتی ہے اور ایک لڑکی سے بات کر کے اپنا گاؤن اور کارڈ چیچ کر کے جامعہ سے باہر نکل آتی ہے۔ وہ احتشام کو پھول دیتی ہے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ وہ اس کی خوشامد کر رہی ہے۔ عمائم کے پاس میسج آتا ہے تو وہ اپنی الماری میں دیکھتی ہے تو کپڑوں کے نیچے سے وہ پیکٹ مل جاتا ہے۔ صوفی صالح کے چھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی جس میں سے دو بیٹے اور ایک بیٹی حافظ قرآن تھی۔ ماں، عمامہ کو کہتی ہیں کہ ان کی وجہ سے انہیں بہوؤں سے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ عمامہ، شام سے ملنے آتی ہے تو وہ اسے واپس جانے کو کہتا ہے صوفی صاحب اسے دیکھ کر سوچتے ہیں کہ کہیں جانے کے لیے شام کو کہنے گئی ہوگی۔ شام، عمامہ کو کہتا ہے کہ اسے صرف عزت پیاری ہے۔ طاہرہ، ساس کے پوچھنے پر کہتی ہیں کہ وہ چاہتی ہیں کہ عمامہ ان کی نظروں کے سامنے رہے جس پر وہ کہتی ہیں کہ شام کا رشتہ ان کی بہن نے فیقہ کے لیے دیا تھا۔ لیکن عمامہ اپنی پسند سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔ شام کی غیر موجودگی میں اس کا رشتہ فیقہ سے طے پا کر کارڈ بھی چھپوا کر بانٹ دیے اس پر عمامہ، شام کو طیش دلانے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ کہتا ہے کہ مجھے تمہارے باپ کے سر پر رکھے عما سے اور اپنی عزت سے بہت پیار ہے۔ تم واپس لوٹ جاؤ۔ فیقہ اور عمامہ کی رخصتی ایک ساتھ طے کر دی گئی۔ طابہ (بھاوج) عمامہ کو کہتی ہے کہ شام بھی تمہیں بہت چاہتا ہے، وہ اسے مجبور کرے گی تو وہ ضرور بولے گا۔ عمامہ کہتی ہے کیا وہ سول میرج کے لیے مان جائے گا اور کیا وہ عمامہ کا ساتھ دے گی تو طابہ معذوری ظاہر کرتی ہے اور کہتی ہے میں تقی سے بات کروں گی۔ عمامہ، طابہ کے ذریعے شام کو بلاتی ہے اور اس کو سول میرج کے لیے راضی کرتی ہے ساری بات فیقہ سن لیتی ہے۔ عمامہ فون پر کہتی ہے صوفی صالح کی بیٹی عمامہ حادثاتی موت کا شکار ہوگئی ہے۔ آپ بارات مت لائیے گا۔ عمامہ کو یہ بات کرتے طاہرہ سن لیتی ہیں وہ اس پر غصہ کرتی ہیں وہ صوفی صالح سے کہتی ہیں ہم نے جلد بازی کر لی۔ فرخ (منگیتر عمامہ) اور اس کے بہنوئی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے جس میں بہنوئی کی ڈیتھ ہو جاتی ہے، دونوں شادیاں نامعلوم مدت کے لیے کینسل ہوگئیں شام کہتا ہے شادی ٹلنے کی نہیں رکنے کی دعا مانگ لیتیں عمامہ اسے بزدل کہتی ہے تو شام کہتا ہے میں احسان فراموش نہیں۔ طابہ، عمامہ کو کہتی ہے کہ وہ اماں سے بات کرے گی وہ آگے پڑھنے کے بارے میں سوچے، عمامہ ہامی بھر لیتی ہے۔ شمسہ بھابی، عمامہ کو کہتی ہیں کہ طابہ سے دور رہو وہ تمہیں نقصان پہنچائے گی۔ عمامہ کا کالج میں ایڈمیشن ہوتا ہے تو دادی کہتی ہیں کہ وہ کوئی چاند چڑھائے گی۔ طابہ اپنے شوہر تقی سے کہتی ہے کہ فیقہ پھپھو کو شام اور عمامہ کے حوالے سے کچھ شبہات ہیں تو تقی کہتا ہے کہ شام جس سے بھی بات کرے وہ اسے شک کی نگاہ سے دیکھیں گی۔ عمامہ کو کالج چھوڑنے شام جاتا ہے تو گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو جاتا ہے اور ایک آدمی ملتا ہے جو عمامہ کے لیے گھٹیا الفاظ استعمال کرتا ہے اور شام کے پوچھنے پر خود کو اس کا باپ بتاتا ہے۔ منصور سیال، شام کو بتاتا ہے کہ وہ فیکٹری گیا تھا اور وہاں تقی نے اس کی پٹائی کر دی تھی۔ منصور سیال پھر فیکٹری جاتا ہے اور منیجر سے شام کی تنخواہ مانگتا ہے تو وہ اسے منع کر دیتا ہے۔ لیکن وہ شام سے دس ہزار لے کر ہی جاتا ہے۔ عمامہ، منصور سیال کے بارے میں تصدیق کرتی ہے تو شام اسے جھڑک دیتا ہے۔ کالج میں جانے سے عمامہ گھبراتی ہے تو وہاں اسے سونیا ملتی ہے جس سے بات کر کے شام کو کافی تسلی ہوتی ہے۔ سونیا کے ساتھ عمامہ کالج میں جلد ایڈجسٹ ہو جاتی ہے۔ سونیا جب عمامہ کے ساتھ گھر آتی ہے تو دادی کو وہ بالکل پسند نہیں آتی۔ دادی، شام کو عمامہ کی ذمے داری اٹھانے سے منع کرتی ہیں تو وہ کہتا ہے مجھے صالح بھیا نے کہا تھا وہ منع کریں گے تو میں اسے لے کر نہیں جاؤں گا۔

اب آگے پڑھیے

قسط نمبر 8

سونیا اس کی زندگی میں بڑے غیر متوقع اور "بے دھڑک" انداز میں داخل ہوئی تھی۔ وہ بہت کم عرصے میں عمامہ کی زندگی میں جگہ پا گئی تھی۔ وہ کھلے ذہن، خیال اور سوچ کی بڑی اچھی مگر جذباتی لڑکی تھی۔ بہت کھری، نڈر اور ضدی تھی۔ دل میں آئی بات کہے بغیر رہ نہ پاتی تھی۔ عمامہ کو ہر نئے دن وہ نئی سی لگتی۔ اس میں جوش تھا، جذبہ تھا، ولولہ تھا، زندگی سونیا سلیم میں دھڑکتی نہیں، تھرکتی تھی۔ کالج ہو یا گھر وہ عمامہ کے ہر مسئلے ہر پریشانی کے سامنے ڈھال بن جاتی تھی۔

سونیا سے اس کی ملاقات غیر متوقع صورتِ حال میں ہوئی تھی۔ وہ اپنی چمکتی گاڑی سے نکل کر خود میں مگن سی کالج جا رہی تھی جب ایک نم، نم سی آواز نے سونیا کے قدموں کو زنجیر پا کر دیا تھا۔ وہ آگے بڑھ ہی نہیں سکی تھی، نہ رکنا

اس کے لیے محال تھا، وہ گردن موڑ کر بے ساختہ دیکھنے لگی۔ وہ کئی مرتبہ دیکھتی رہی۔ وہ بار، بار دیکھتی رہی۔ حسن اس کی کمزوری تھا..... اور وہ دو لوگ بلا کے خوب صورت تھے۔ وہ ایک نوجوان خوش پوشاک لڑکا اور وہ گھبرائی، گھبرائی لڑکی..... کالج کا فرسٹ ڈے ایسی لڑکیوں کو عموماً کنفیوز کر دیتا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

نئی بات تو یہ تھی وہ لڑکی کوئی دیہاتن نہیں لگ رہی تھی اور نہ وہ لڑکا کوئی اجڈ تھا۔ وہ دونوں اچھے گھرانے کے لگتے تھے۔ اور ایک نئے ماڈل کی کار سے برآمد ہوئے تھے سو سونیا کو اپنی سوچ میں تبدیلی لانا پڑی تھی۔

وہ ان دونوں کی باتیں سنتی رہی اور محظوظ ہوتی رہی۔ وہ اُن کی گفتگو سے اندازہ لگا چکی تھی کہ دونوں میں کم از کم بہن، بھائی کا رشتہ نہیں ہے۔ لڑکے کی وجاہت میں تفکر تھا، لڑکی ملاحت میں گھبراہٹ تھی۔ سونیا خود کو روک نہیں پائی تھی۔ وہ ان کے قریب چلی آئی۔ اور پھر باتوں کا لامحدود سلسلہ نکل پڑا۔ اس نے اپنی خوش اخلاقی سے شام کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

پھر یہ ایک روٹین بن گئی تھی۔ وہ عمامہ کو چھوڑنے اور لینے آتا، دونوں اوقات میں سونیا سے دس منٹ کی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ اس دوران شام اور عمامہ کی بہت سی عادتوں اور باتوں کو جان گئی تھی۔ پھر یہ تین کی تکون بن گئی..... وہ تینوں ایک دوسرے کے رفیق بن گئے۔ شام کے پاس اب بھی ملاقات کے وہی دس منٹ ہوا کرتے تھے۔ پھر بھی تشنگی کہیں نہیں تھی۔ سونیا، عمامہ کے توسل سے اس کے گھر آنے جانے لگی تھی۔ اس کی تنہائی لمحوں میں تقسیم ہوگئی، وہ اپنی بہن اور باپ کی مصروفیات سے بہت تنگ تھی۔ عمامہ کی صورت میں اس کی تنہائی کا سامان ہو گیا تھا۔ وہ عموماً عمامہ کے گھر پائی جانے لگی۔ اگر گھر نہ آسکتی تو گھنٹوں فون پر بات کرتی۔ عمامہ کے گھر میں دو خواتین سونیا کو شدید ناپسند تھیں ایک عمامہ کی دادی اور دوسری پھپھو..... سونیا کی فیقہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی یہ تب کی بات ہے۔ وہ اچانک عمامہ کے گھر چلی آئی تھی۔ دادی کی شدید ناپسندیدگی کے باوجود سونیا نے اپنا آنا ترک نہیں کیا تھا۔ دادی، سونیا کو کچوکے لگانے سے باز نہیں آتی تھیں۔ اور سونیا بھی ایسی ڈھیٹ کے دادی کو ایک کی چار سنا کر دم لیتی تھی۔

یہ اس وقت کی بات تھی جب سونیا نے فیقہ کو نہیں دیکھا تھا۔ اور جب دیکھا تو حیران نہیں خوفزدہ رہ گئی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت بہت عجیب تھی، نقش معمولی نہیں تھے تاہم رنگت کی وجہ سے دب گئے تھے۔ اس کی آنکھیں خوب صورت تھیں اگر چہرے پر دھبے نہ ہوتے، اس کا جسم سڈول اور خوب صورت تھا۔ متناسب سراپا اور گورا وجود، ہاتھ پاؤں بلا کے ملائم، نازک اور نفیس تھے۔ حتیٰ کہ گردن تک اس کا سراپا بہت دلربا قسم کا تھا۔ صراحی دار گردن پر عمامہ جیسا خوب صورت تل، اگر چہرے پر سیاہی یا دھبے نہ ہوتے تو بلاشبہ فیقہ ایک خوب صورت دوشیزہ ہوتی۔ یہ سونیا تھی جس نے پہلی مرتبہ فیقہ کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ سونیا کو فیقہ بری نہیں لگی۔ وہ کسی بھی مرد کو اٹریکٹ کر سکتی تھی اگر گردن سے اوپر چہرے میں اتنی تبدیلی نہ ہوتی۔ سونیا کو خوف تب آیا جب اس نے اتنے خوب صورت جسم پر ایسا بے رنگ چہرہ دیکھا۔ فیقہ کی ساری خوب صورتی جیسے ماند پڑ گئی تھی۔ اسے فیقہ پر ترس آیا۔ کیا وہ اپنا چہرہ بدلنے پر اختیار رکھتی تھی؟ کبھی نہیں..... وہ کتنی بے بس تھی۔ سونیا کا ترس بڑھتا رہا۔ پھر عمامہ نے سونیا کے پوچھنے پر بتایا۔

''میٹرک تک فیقہ پھپھو ایسی نہیں تھیں۔ وہ بہت شوخ، چنچل اور زندگی سے بھرپور لڑکی تھیں۔ اسکول کی لڑکیاں میری پھپھو کو دیکھنے کے بہانے آتی تھیں۔ فیقہ بہت پیاری تھی۔ اتنی بھولی بھالی سی..... ان کے اسکول میں ایک لڑکی صائمہ ہوا کرتی تھی۔ وہ فیقہ کے حسن سے جلتی تھی۔ یہ اس کی شرانگیزی تھی جو وہ عجیب سی ایک کریم فیقہ کے لیے لے آئی۔ پھر اس نے کریم کی افادیت پر طویل لیکچر دے کر زبردستی فیقہ کے منہ پر مل دی۔ اگرچہ فیقہ نے گھر آکر منہ دھولیا تاہم جلن ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ ان کا چہرہ رات تک سوج گیا۔ صبح تک دانے سے نکل آئے..... اور اگلی شام تک چہرے کی رنگت سنولانے لگی تھی۔ فیقہ نے رو، رو کر برا حال کر لیا۔ درد اس کی جان نکال رہا تھا۔ دادی

کے سارے ٹوٹکے بیکار گئے..... گھر بھر سخت پریشان تھا۔ پھر فیقہ کے چہرے پر دھبے سے بننے لگے، دانے پھنسیاں بنتے چلے گئے۔ تاہم کھڈے نہیں بنے تھے۔ دادی نے مشہور کر دیا... فیقہ کو چیچک کے داغ بن رہے ہیں.. حالانکہ وہ چیچک نہیں تھی۔ ایک غلط کریم کا سائڈ ایفکٹ تھا۔ فیقہ نے بتایا بھی لیکن دادی اپنی ضد پر اڑی رہیں۔ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانہ سکے۔ اگر ڈرماٹولوجسٹ سے بروقت ٹریٹمنٹ لیا جاتا تو فیقہ کی زندگی اتنی تاریک نہیں ہوتی۔ فیقہ نے چہرہ چھپانے کے خوف سے تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔ وہ بہت غمگین اور اداس رہنے لگی تھی۔ وہ تنہا ہوگئی تھی، ورنہ بہت پہلے میری اور فیقہ کی بہت دوستی تھی۔ فیقہ کو میرے بغیر نیند نہیں آتی تھی۔ ہم ایک کمرا شیئر کرتے تھے۔ فیقہ کو مجھ سے بہت پیار تھا۔ پھر سب کچھ بدل گیا۔ جس فیقہ کے لیے رشتوں کا انبار لگا رہتا تھا۔ اب اِکّا دُکّا بھی کوئی رشتہ نہ آتا۔ اور جو لوگ فیقہ کے طلب گار بنتے وہ دادی کے معیار پر پورا نہ اترتے۔ یوں فیقہ دادی کی ہٹ دھرمی کا شکار ہوگئی.....'' عمامہ افسردگی سے بتاتی چلی گئی تھی۔

سونیا کا چہرہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ فیقہ کے معاملے میں حساس ہوتی گئی۔ اس نے فیقہ کی زندگی پر جیسے ریسرچ کر ڈالی تھی۔ سونیا دلی طور پر ہمدرد اور غم گسار تھی۔ وہ سہیلی کی دشمن کے لیے بھی حساس ہو رہی تھی۔ فیقہ کی زندگی کے اس کرب کو جانتے بوجھتے اس کے دکھ سمجھتے ہوئے بھی شام کا معاملہ ایسا تھا جس پر عمامہ، فیقہ کو کوئی رعایت دینے پر تیار نہیں تھی۔ عمامہ کہتی تھی..... فیقہ کا شام پر کوئی حق نہیں بنتا۔ وہ ایسی نہیں تھی جو شام جیسے ہم سفر کو ڈیزرو کر سکے۔ فیقہ کے لیے فیقہ کے معیار جیسا ہونا چاہیے تھا۔ اُدھر عمر بھر کی تنہا، غمگین، دکھی فیقہ کو امید کی ایک کرن دکھائی دے رہی تھی۔ وہ کرب سے سوچتی، کیا تھا جو عمامہ میرے لیے اپنا حق چھوڑ دیتی۔ عمامہ کو کیا کمی تھی۔ جسے چاہتی پالیتی، جس پر نگاہ ڈالتی، وہ اس کے قدموں میں ہوتا۔ اسے نہ رشتوں کی کمی تھی نہ چاہنے والوں کی..... اگر وہ فیقہ کے لیے قربانی دے ڈالتی تو عظیم بن جاتی۔ یہ سوچنے تک محدود باتیں تھیں۔ جس پر گزرتی ہے وہ خوب ہر اذیت کے ذائقے کو سمجھتا ہے۔ فیقہ بھی سمجھ رہی تھی، عمامہ بھی اپنی فہم کے مطابق سمجھتی تھی۔ عمامہ میں اتنی عقل اور فہم تھی۔ نہ فیقہ بہت فراست رکھتی تھی۔ وہ دونوں اپنے، اپنے دائروں میں چکر لگاتیں خود کو حق بجانب سمجھتی تھیں۔ پھر نشان دہی کرتا کون؟ غلطیوں پر کراس کون لگاتا؟

ایسے ہی عذاب دنوں میں سونیا ان کی زندگیوں کے بوجھل پن کو ختم کرنے بے دھڑک ان کے معمولات میں گھس گئی تھی۔ عمامہ کو اس کی آمد ہوا کا جھونکا لگی تھی تاہم فیقہ کے لیے سونیا کا وجود بوجھ سے کم نہیں تھا۔ وہ عمامہ کی سہیلی تھی۔ اور عمامہ سے وابستہ کچھ بھی ان دنوں فیقہ کو پسند نہیں تھا۔

ایک دن سونیا کی فیقہ پر ریسرچ ختم ہوگئی..... وہ عمامہ کا بازو دبوچے بالکونی میں گھس گئی۔ اس نے فیقہ پر لکھی اسائنمنٹ مکمل کر لی تھی۔ عمامہ کو یہ جان کر دھچکا لگا تھا کہ سونیا، فیقہ کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتی تھی۔ عمامہ کو کم از کم سونیا سے یہ امید نہیں تھی۔

''جانتی ہو عمامہ! مجھے فیقہ کو قریب سے جاننے کا موقع نہیں ملا۔ تمہاری بتائی معلومات سے میری تحقیق یہاں پہنچی ہے۔'' اس نے جوش کے عالم میں عمامہ کا ہاتھ دبایا۔ پھر اسی ولولے سے مزید بتانے لگی۔

''فیقہ فطرتاً بری نہیں..... وہ ایک غمگین، اداس اور تنہا لڑکی ہے، کچھ اس گھر کے لوگوں نے اسے مزید تنہا اور اکیلا کر دیا ہے۔ خاص طور پر تمہاری بھابیاں..... اور تمہاری دادی... جو فیقہ سے محبت کی آڑ میں اس کی کمزوریوں کو بخشنے پر تیار نہیں..... انہوں نے عمر بھر اسے کچوکے لگائے، اس کا بروقت علاج نہیں کرایا۔ اب وہ احساس ہونے پر ''مداوے'' کی اسٹیج سے گزر رہی ہیں اور اس کے لیے بہترین آپشن اُن کا اکلوتا بھانجا ہے۔ انہوں نے شام اور تمہاری محبت سے نگاہیں چرا رکھی ہیں، محبت کا کیا ہے؟ مردوں کو ایک چھوڑ ہزار ہوتی ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کو مرنے سے

پہلے ''خوشحال'' اور آسودہ دیکھنا چاہتی ہیں، فیقہ کا جو وقت انہوں نے اپنی ہٹ دھرمی سے ضائع کیا ہے..... اس کا مداوا کرنا چاہتی ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ شام کی زندگی کو داؤ پر لگا ئیں یا تمہاری..... وہ اپنے عمل میں خود کو ٹھیک سمجھتی ہیں.....'' سونیا کا دبا، دبا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ فیقہ پر بہت اچھا پیپر ورک کر چکی تھی۔ باقاعدہ ایک فائل بنا کر لائی تھی۔ جس میں بڑے اہم پوائنٹ نوٹ تھے۔ عمامہ دنگ سی اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

''اب سنو، فیقہ کیا ہے؟ وہ کیوں ایسی ہے؟ وہ دو شخصیتوں میں بیک وقت بٹ چکی ہے۔'' سونیا کے انکشاف نے عمامہ کو ''ہلا'' کر رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔

''اگر فیقہ کی زندگی میں کوئی خوب صورت موڑ نہ آیا تو اس کی زندگی مزید شخصیتوں میں بٹتی جائے گی۔ وہ ایک جسم اور ایک دماغ کے ساتھ بہت سی پرسنالیٹیز میں ادغام کر جائے گی۔'' سونیا نے عمامہ کو اور بھی دہلایا تھا۔ عمامہ گم صم رہ گئی۔ اس کی آنکھیں پھیلتی گئیں۔ وہ نفسیات کی طالبہ تھی سو اس نے بڑا عمیق تجزیہ کیا تھا۔

''وہ پہلے پہل انٹرو ورٹ (introvert) تھی، یعنی اپنی بات خود تک محدود رکھنے والی، جو دوسروں سے مل کر شرم محسوس کرتی تھی۔ اس چیز نے اسے تنہا، اکیلا اور غمگین کر دیا تھا..... وہ کسی کا بھی سامنا کرنے سے کتراتی تھی۔ اس نے خود کو تنہائی کے پردے میں چھپا لیا تھا۔ تم یہ سن کر حیران رہ جاؤ گی۔ فیقہ اب ایک اور شخصیت میں داخل ہو گئی ہے۔ اب وہ sadistic ہے۔ دوسروں کو ستانے یا ان کو اذیت دینے، تکلیف دینے پر خوش ہونے والی، دوسروں کو ستا کر اُن پر حکومت کرنے والی..... یہ بہت نازک اسٹیج ہے.....'' سونیا کے تاثرات خوفناک ہو گئے تھے۔ وہ کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ ماہر نفسیات نہیں تھی۔ نہ اس کا تجربہ بڑا کمال کا تھا..... تاہم اس نے فیقہ پر ریسرچ ضرور کمال کی تھی۔ عمامہ کی سانس تک رک گئی۔ اس کے تنفس کا زیر و بم کم پڑ گیا۔ اس کی سانس سینے میں گھٹنے لگی تھی۔

''اور جانتی ہو، اس گھر کے لوگوں نے فیقہ کو احساس دلایا ہے۔ وہ ان میں مس فٹ ہے خاص طور پر تمہاری بھابیاں..... اور فیقہ اس لیے عجیب لگتی ہے کہ وہ بہت خوب صورت سڈول جسم کی مالک ہے۔ گردن تک بے داغ حسن رکھتی ہے۔ گردن سے اوپر ٹھوڑی سے شروع ہونے والا چہرہ کملایا ہوا بے رنگ سیاہ ہے۔ جیسے بلیک اینڈ وائٹ کا امتزاج، وہ اتنی عجیب ہرگز نہیں لگتی اگر اس کے ہاتھ پیر اتنے خوب صورت، ملائم اور گورے نہ ہوتے۔ اس کا جسم بے داغ نہ ہوتا..... اگر کا باقی جسم سنولایا ہوتا..... گندمی، کالایا سانولا تو چہرہ کہیں سے بھی برا نہ لگتا..... اس کے چہرے پر دانے نہیں ہیں۔ کھڈے بھی نہیں ہیں..... بس رنگت سنولائی ہے اور چہرے پر اس کریم کی وجہ سے دھبے پڑ گئے ہیں۔ اگر بروقت ٹریٹمنٹ ہوتا تو یہ دھبے بھی ختم ہو جاتے۔ رنگت میں بہتری آتی۔ اور وہ اتنی بری یا عجیب نہ لگتی، دیکھنے والا اس سے کراہیت نہ کھاتا۔'' سونیا کا انداز پُرسوچ قسم کا تھا۔ جیسے اب وہ کسی نکتے پر پہنچ گئی تھی۔ کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہو گئی جیسے کسی بات پر غور کر رہی تھی۔ عمامہ اس کی باتوں سے مرعوب ہو گی..... سونیا کا مشاہدہ بڑا گہرا تھا۔ عمامہ تو اگلے دس سال تک بھی ایسی گہرائی میں نہیں اتر سکتی تھی۔ سونیا جیسی معلومات اکٹھی نہیں کر سکتی تھی۔

سونیا کی ایکا ایکی فیقہ میں دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ وہ عمامہ سے اکثر کہتی۔ فیقہ اس کا ہارٹ فیورٹ سبجیکٹ تھا۔ بہترین ٹاپک تھا۔ وہ فیقہ پر گھنٹوں بول سکتی تھی۔ سونیا کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک بہترین حل تھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ دادی اور فیقہ، سونیا کو ایک آنکھ پسند نہیں کرتیں۔ وہ فیقہ کی بہتری پر اسائنمنٹ بنا رہی تھی۔ پیپر ورک کر رہی تھی۔ وہ ہر کام بڑے سلیقے اور قرینے سے کرنے کی عادی تھی۔ اس میں جذبہ تھا، لگن تھی، ولولہ تھا۔ وہ نت نئے ایڈونچرز کی شوقین تھی۔ اور فیقہ سے بہتر شاید کوئی ایڈونچر اسے ملتا۔

☆☆☆

پھر مشرق سے ابھرتے سورج نے بھی دیکھا..... دادی کا جلال قدرے کم ہو گیا۔ شام کے جواب نے انہیں

اندر سے پسپا کر دیا تھا۔ اب وہ پہلی سی اکڑ میں نہیں تھیں۔ شاید اسی لیے دادی نے دوبارہ شام کو عمامہ کی ڈیوٹی لگانے سے روکا نہیں تھا۔ دن ایک روٹین کی پازیب میں بجتا رہتا تھا۔ شام کے گھنگرو ''شام'' کی ہمراہی میں تھرکتے تھے۔ کیونکہ مغرب کی نماز کے بعد عمامہ قرآن پڑھتی تھی۔ بلا کی سحر انگیز خوب صورت آواز میں..... طاہرہ کی چوکی پر برآمدے میں بیٹھ کر ماتھے تک دوپٹا لپیٹے آنکھیں موندے ہل، ہل کر منزل سناتی تھی۔ یہ عمر بھر سے اس کی روٹین تھی۔ اماں نے کہا تھا۔ ''عمامہ! قرآن یاد کیا ہے۔ اسے بھلانا مت۔'' سو وہ ہر روز سبق کو تازہ کرتی تھی..... طاہرہ آتے جاتے، کام کرتے، چیزیں سمیٹتے عمامہ کی تلاوت سنتی تھیں۔ کہیں بھی ضمہ، کسرہ، فتحہ کی غلطی نہ ہونے دیتیں، وقف، کھڑی زبر، شد، مد پر ایک تنبیہ میں دور کھڑی بھی روک دیتیں..... طاہرہ بڑی باکمال حافظہ تھیں۔ زیر، زبر کی غلطی پر بھی چوکنی ہو جاتی تھیں۔ اور یہ وقت ایسا رقت آمیز ہوتا کہ بس..... ایسا مقناطیسی ہوتا جو فیقہ کو کمرے کی تنہائی سے باہر کھینچ لاتا..... وہ لاؤنج کی جالی دار کھڑکی سے لگ کر بیٹھ جاتی۔ ہزار اختلاف کے باوجود عمامہ کی دلفریب، دل میں اترتی، دل کو مسلتی آواز میں قرآن سننا اسے شروع سے پسند تھا۔ وہ جالی سے ناک چپکائے بیٹھی رہتی۔ وہیں برآمدے کے دوسری طرف، ماربل کے ستون سے ٹیک لگائے، قدمچے پر سر جھکائے شام بھی بیٹھا ہوتا..... عمامہ کی سحر طراز آواز کا جادو اسے بھی اسیر کر لیتا تھا۔ ایسی پُرسوز، دل کو باندھ لینے والی آواز تھی۔ خالص عربی لہجے اور عربی مٹھاس بھرے انداز میں..... قرآت میں عمامہ کی ٹکر کا کوئی نہیں تھا۔ پھر وہ منزل کے بعد سورۂ رحمٰن پڑھتی تھی۔ ترجمہ بھی سناتی۔

''تم اپنے رب کی کون، کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟'' عمامہ کی آواز مدھم ہوئی پھر اونچی ہوئی۔ پھر رواں پانی کی طرح بہنے لگتی۔ جیسے کسی آبشار سے پانی کی بوندیں ٹپ، ٹپ گرتی ہوں۔

''ایسے بچھونوں پر تکیہ لگائے جن کا استر قادیر کا اور دونوں کے میوے اتنے جھکے ہوئے کہ پنجے سے چن لو۔ تم اپنے رب کی کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔'' اس کی آواز ڈوب کر ابھرتی، دل کے اندر سے نکلتی۔ کبھی، کبھی بھرا جاتی۔ اور پھر آنکھوں کے فرش گیلے ہونے لگتے۔ پلکیں پانیوں میں ڈوب جاتیں۔

''ان بچھونوں پر وہ عورتیں ہیں کہ شوہر کے سوا کسی کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتیں، ان سے پہلے انہیں نہ چھوا کسی آدمی اور نہ جن نے..... تو اپنے رب کی کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔'' اس کا دل سر بسجود ہو جاتا..... کسی کھائی میں گرتا، ابھرتا، ڈوبتا، دھڑکتا، تھرکتا، کپکپاتا، خوفزدہ ہوتا اور اللہ کے خوف سے سہم جاتا۔ وہ آنسو بھری آنکھوں سے دائیں، بائیں دیکھتی، سوچتی، غور کرتی پھر سے دُہرانے لگتی۔

''ان سے پہلے انہیں نہ چھوا کسی آدمی اور نہ جن نے۔'' اس کے دل پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آتا..... پیشانی بھیگنے لگتی، چہرہ تپنے لگتا..... وہ عقیدت سے قرآن چومتی، آنکھوں سے لگاتی اور جزدان میں لپیٹ کر رکھ آتی۔ پھر دوبارہ چوکی پر بیٹھ جاتی..... اس کا چہرہ سوچوں کا غماز ہوتا..... تب برآمدے کے پہلے قدمچے سے شام اٹھ کر سامنے آ جاتا۔

''اے عمامہ! اور پڑھتی ناں..... تمہاری آواز میں سوز ہے گداز ہے۔ دل کم بخت پانی کی طرح بہنے لگتا ہے۔ مجھے سورۂ رحمٰن کی ان آیات کا ترجمہ پھر سناؤ..... دل میں چین بھرتا ہے۔'' وہ فرمائش کرتا..... عمامہ اس کی خواہش پوری کرتی۔ پھر کرتی، بار، بار کرتی، سہ بار کرتی..... شام کی تشنگی بڑھتی جاتی۔ وہ کان لگا کر سنتا، آنکھیں موند کر سنتا..... دل میں لہریں اٹھتیں..... سکون بڑھتا۔

''جیسے مونگا اور لعل.....'' وہ سر جھکا لیتا، آنکھوں کے کونوں سے پانی نکلتا..... چہرہ بھیگتا رہتا..... پھر طاہرہ کی آواز سارا فسوں توڑ ڈالتی تھی..... وہ عمامہ کو کتابیں پڑھنے کا اشارہ کرتیں..... عمامہ چوکی سے اٹھ جاتی۔ اندر سے

کتابیں لاتی.....اور شام کے قریب بیٹھ جاتی۔

''سمجھ نہیں آتا کیا پڑھوں؟ کتاب جہاں سے کھولتی ہوں.....نصاب تمہارا نکلتا ہے۔'' عمامہ کی بھیگی آواز نکلتی۔ وہ بے قراری سے اونچے درختوں کو دیکھتی۔ پھدکتی چڑیوں کو دیکھتی۔ شاخوں سے جھولتے پرندوں کو دیکھتی۔ شام دھک سے رہ جاتا۔ اس کا دل دھڑکنا بھول جاتا۔

''عمامہ!'' وہ لرز کر بولتا.....مضطرب ہو جاتا۔ بدحال ہو جاتا۔ سانس، سانس نڈھال ہو جاتا۔

''کوئی بھی جذبہ انسان کی بساط سے وسیع اور طاقت ور نہیں ہوتا.....تم ایسی کمزور تو نہیں عمامہ.....'' وہ دھیمی پُرسوز آواز میں اسے سمجھاتا.....عمامہ سمجھ بھی لیتی۔ غور بھی کر لیتی۔ پھر بے بس بھی ہو جاتی۔ اس کی بے کسی کا کوئی انت جو نہیں تھا۔ وہ اپنے درد کا کسی کو بتا نہیں سکتی تھی اور جو راز دار تھا وہ اکثر انجان بن جاتا۔

''شام! ایک پھانس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ ایک گھٹن کے علاوہ کچھ بھی نہیں.....اندر کہیں دور بہت دور بڑے زوروں کا حبس ہے، اس حبس کا کوئی توڑ نہیں۔'' وہ سر جھکا کر بولتی رہتی۔ اسے ایک، ایک حکایت بتاتی۔ وہ سنتا بھی پھر جھٹلا بھی دیتا۔ آگے بڑھتا نہ پیچھے ہٹتا۔ اسی ایک ہی مقام پر کھڑا تھا۔

''عمامہ! ہر حبس کا توڑ موجود ہے۔ اللہ کی حسین دنیا کو دیکھو غور کرو، سوچو.....اس خود ساختہ محدود دائرے سے نکل کر دیکھو تو سہی.....عمامہ ایک حبس سے زیر ہو کر قطرہ، قطرہ مرنے کے لیے نہیں بنی.....شام سے بہت آگے رات کا اندھیرا ہے، رات کے اسرار میں زندگی کا ''راز'' پوشیدہ ہے۔ اس راز کو سمجھو، غور کرو سوچو، پھر آگے کی طرف نکلو، اس رات کی دہلیز پر اترتی سپیدی سحر تمہاری راہ تک رہی ہے۔ تم نوید صبح جمال کا ایک حصہ ہو عمامہ.....! تم ایک ''شام'' کی دہلیز پر سسک، سسک کر مرنے کے لیے نہیں بنائی گئیں۔'' وہ نرمی سے بولتا، بوند بوند امرت اس کی سماعتوں میں اتارتا۔ اسے زندگی جینے کا ڈھنگ سکھاتا یہ اکثر بھول جاتا تھا کہ محبت میں بندھے ہوؤں کی سحر بھی محبوب ہے، شام بھی محبوب ہے، رات بھی محبوب ہے، وہ کسی اور طرف نکل ہی نہیں سکتے، محبوب انہیں باندھ لیتا ہے، جکڑ لیتا ہے۔ اور آج عمامہ، شام سے کہہ رہی تھی۔ وہ کیسے بے بس لگ رہی تھی۔

''شام! کیا تمہیں نہیں لگتا، نصاب میں ایک محبت اور ایک ہجر کا باب ہونا چاہیے۔ ایک عشق کا استاد ہونا چاہیے۔ جو محبت میں ہارے ہوؤں کو زندگی جینے کا قرینہ سکھا سکے۔'' عمامہ نے کپکپاتی آواز میں کہا تھا۔ وہ سر جھکائے نوٹ بک پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔

''عشق کا استاد ہے ناں۔'' شام کی مدھم آواز اسے چونکا گئی تھی۔ اس نے بے ساختہ شام کی طرف دیکھا تھا۔ پھر نگاہ جھکا گئی۔ شام کی طرف دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

''کون.....؟'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔

''وقت.....'' شام نے کتاب سے پوائنٹ نوٹ کیے، ایک سادہ ورق پر کانسیپٹ سمجھائے، عمامہ بے خیالی میں دیکھتی رہی۔ لفظ، لفظ سر کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے نیا نصاب کھل جاتا، ہر لفظ میم سے شروع ہوتا۔ میم پر ختم ہوتا۔ وہ میم سے محبت لکھتے، لکھتے تھکی نہ تنگ پڑی نہ عاجز آئی۔ اسی ایک لفظ میں محبت کا قرینہ تھا۔ مٹھاس تھی، چاشنی تھی۔ وہ سحر زدہ سی لکھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ شام نے نوٹ بک کو جھک کر دیکھا۔ پھر ذرا برہم ہوا، کاغذ ہاتھ میں لیا اور ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا..... جب وہ کاغذ پیچھے کی طرف اچھال رہا تھا تب اس کی نگاہ طابہ پر پڑی تھی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے چونک سا گیا۔ طابہ معنی خیزی سے مسکرا رہی تھی۔ پھر اپنے آنے کی وجہ بتانے لگی۔

''عمامہ نے ''سبق'' اچھی طرح سمجھ لیا ہو، سارے ''میم'' سے لکھے فارمولے حل کر لیے ہوں، سارے ''عین'' کے فریضے سمجھ لیے ہوں تو تلقی کی بات سن لو.....وہ تمہیں بڑے کتب خانے میں یاد فرما رہے ہیں.....آخر تمہیں

دیکھے بغیر عمامہ کے بھائیوں کو چین نہیں پڑتا۔ نہ آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں..... نہ دل قرار پکڑتا ہے۔'' طابہ ذومعنی انداز میں بولتی شام کو بہت بری لگی تھی۔ اگر وہ تقی کی محبوب بیوی نہ ہوتی تو شام اسے دو چار تو لازمی سنا دیتا..... اب بھی کمال ضبط سے عمامہ کو پڑھنے کا مشورہ دے کر اندر کی طرف چل دیا تھا۔ جبکہ عمامہ وہیں سر جھکائے بیٹھی رہی۔ طابہ بھی اس کے قریب بیٹھ گئی۔ موقع مناسب تھا سو گنوانا کم عقلی تھی۔

''عمامہ..... میری جان، کیا سوچتی ہو؟'' طابہ نے دو انگلیوں سے عمامہ کے رخسار چھوئے تو وہ چونک کر حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ جیسے اس کی موجودگی سے قطعاً لاعلم تھی، ایسی غائب دماغی جس کی مثال نہیں ملتی تھی۔ طابہ قائل سی ہوگی۔ آخر اس محبت میں کچھ تو تھا جس نے عمامہ کو خود سے بیگانہ کر دیا تھا۔

''سوچتی تو بہت کچھ ہوں..... بھلا کیا، کیا بتاؤں ہے'' عمامہ کچھ سمجھ کر آزردگی سے بولی۔

''جو کچھ بتانا مناسب سمجھو.....'' طابہ نے حلاوت کی انتہا کر دی تھی۔ لہجے میں ڈھیروں مٹھاس بھر لی تھی۔ عمامہ بے خیالی میں اسے دیکھتی چلی گئی۔ پھر سر جھکا کر آہستگی سے کہتی رہی۔

''اپنا ''انجام'' سوچتی ہوں۔'' اس کے بھیگے الفاظ نے طابہ کو تھرا دیا تھا۔ ابھی تو شروعات بہت دور تھی۔ عمامہ انجام پر پہنچ گئی۔ اس کا دل ذرا سا کپکپایا۔

''انجام برا نہیں ہوگا۔'' طابہ نے بے ساختہ کہا۔

''کون جانے؟'' عمامہ نے ایک مرتبہ پھر آنکھ اٹھا کر غائب دماغی سے کہا تھا۔ گلابی آنکھوں میں بکھرے راز سسک، سسک کر ٹپکنے کو تھے۔

''ایسا نہ کہو..... تم اپنی مراد ضرور پاؤ گی۔'' طابہ کا انداز تسلی دینے والا مگر برا ذومعنی سا تھا۔

''کس نے کہا.....؟'' عمامہ نے غائب دماغی سے اونچے درختوں کی اداس شاخوں کو دیکھا..... ہر شاخ سے امید کا ایک، ایک پتا گر رہا تھا۔

''میں نے۔'' طابہ نرمی سے مسکرائی۔ ''تم مایوس کیوں ہوتی ہو، میرے پاس ایک حل موجود ہے۔'' وہ اس کا ہاتھ دبا کر جوش سے بولی۔ عمامہ ٹکر، ٹکر اس کی صورت دیکھنے لگی۔ جیسے بات سمجھنا چاہتی ہو۔

''تم اپنے بھائی تقی سے صاف بات کرو، ان کو شام کے متعلق سب بتا دو..... دیکھنا، کیسے معاملہ سلجھ جاتا ہے۔'' طابہ نے چٹکی بجا کر عمامہ کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ وہ اسے کھائی سے نکال رہی تھی یا کھائی میں پھینک رہی تھی؟ عمامہ سمجھ ہی نہیں پائی۔ بھائی کو بتانے کا مطلب بھلا کیا تھا؟ ایک نئی جنگ یا ایک نیا جہنم؟

☆☆☆

گراؤنڈ میں معمول کی چہل پہل نہیں تھی۔ لڑکیاں کینٹین میں گھسی تھیں، کوئی کوک پکڑے دکھائی دیتی، کوئی سموسہ کاغذ کے ٹکڑے پر رکھے بھاگی چلی آتی۔ کوئی سوڈے کی بوتل کو منہ سے لگائے نظر آتی۔ وہ اس وقت گراؤنڈ کے تنہا گوشے میں بیٹھی گھاس کا تنکا، تنکا نوچ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اداسی کا غماز تھا۔ سونیا نہ جانے کہاں تھی؟ کلاس سے نکل کر دکھائی نہیں دی تھی۔ عمامہ اس کی... کمی محسوس کر رہی تھی۔ قریب ہی اس کی کلاس فیلو مدحت بھٹا کھاتی دکھائی دی۔ عمامہ کی بے چین نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر لپکتے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھی تھی۔

''سونیا کو ڈھونڈ رہی ہو؟'' مدحت نے دانے چباتے حیرت سے پوچھا تھا۔ عمامہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہاں..... نہ جانے کہاں ہے وہ۔'' وہ بیزاری سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

''لائبریری میں.....'' مدحت نے اس کو نئی اطلاع دی تھی۔ عمامہ حیران رہ گئی۔ سونیا اور لائبریری میں؟ یہ کوئی کمال بات ہی تو تھی..... وہ تو امتحان کے دنوں میں لائبریری جانے والی نہیں تھی۔ پھر اب کیا معجزہ ہوا تھا؟

''میں نہیں مانتی.....''اس نے نفی میں سر ہلا کر مدحت کو جھٹلایا۔

''نہ مانو۔یہی حقیقت ہے۔''مدحت مسکرائی۔''آج کل تو سونیا پر کوئی جنون سوار ہے۔ہر وقت لائبریری میں گھسی رہتی ہے۔''

''کیا واقعی.....؟''عمامہ حیران ہوتی رہی۔کیا وہ اتنی غائب دماغ تھی۔اسے اردگرد کی کچھ خبر نہیں تھی۔وہ سونیا سے بھی اتنی بے نیاز تھی؟ جو اُس کی سانسوں کے اتار چڑھاؤ تک کو سمجھ لیتی تھی۔عمامہ خود کو ڈپٹنے لگی۔اپنی بے خیالی پر تاؤ کھانے لگی۔پھر واقعی سونیا لائبریری سے برآمد ہوگئی۔موٹی،موٹی کتابیں اٹھائے،وہ عمامہ کو ڈھونڈتی ہوئی اسی تنہا گوشے میں پہنچ گئی۔چہرے پر سرخی لیے،آنکھوں میں جوش سجائے،وہ عمامہ کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گئی۔پھر ایک پھڑ پھڑاتا صفحہ کھول لیا۔اب وہ ازلی جوش سے فیقہ نامہ سنا رہی تھی۔

''تمہاری پھوپی کی کیس ہسٹری بڑی دلچسپ ہے۔''سونیا نے مسکرا کر کسی ماہر نفسیات کی طرح کہا تھا۔عمامہ گہری سانس کھینچ کر رہ گئی تھی۔سونا کی غیر معمولی بڑھتی دلچسپی،فیقہ کی ذات میں چھپے اسرار عمامہ کو حیران کر رہے تھے کیونکہ سونیا ہر دفعہ کوئی نیا بھید کھولتی،کسی نئے اسرار کا کھوج لگاتی۔

ٹھیک ہے،یہاں تک تو قابلِ قبول تھا،سونیا کے اگلے اقدام ہلا دینے والے تھے۔وہ بغیر فیقہ کی رضامندی جانے اس کی ذات کے ہر اسرار،بے ترتیبی کو سنوارنے کی کوشش میں لگ گئی تھی۔اس نے فیقہ کو سنوارنے کا بیڑا اٹھالیا تھا۔

''مجھے اندازہ ہے،فیقہ جیسے لوگوں کی حساسیت بہت اعلیٰ پیمانے پر ہوتی ہے،ذرا سی ٹھیس ایسے لوگوں کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔''اس نے بال پوائنٹ منہ میں دبایا۔بڑی،بڑی کتابوں میں سر دیا اور سنجیدگی سے عمامہ کو بتانے لگی۔

''اور یہ لوگ آخری امید کے مرتے ہی خود بھی مر جاتے ہیں۔''سونیا نے ایک صفحے پر کراس لگایا۔سنجیدگی سے عمامہ کی آنکھوں میں جھانکا۔عمامہ حیرت سے منجمد ہوگئی تھی۔

''یعنی اتنی آسانی سے؟''وہ متحیر رہ گئی تھی پھر اسے اپنے الفاظ کے نامناسب ہونے کا خیال آیا۔وہ جھک کر خاموش ہوگئی۔سونیا بغور اس کا مطالعہ کر رہی تھی...کچھ سوچتی کچھ سمجھتی۔

''میں نے ایک فیصلہ کیا ہے عمامہ۔''کچھ دیر بعد سونیا نے قدرے آگے کو جھک کر عمامہ سے کہا تھا۔وہ گہری سانس کھینچ کر رہ گئی۔نہ جانے کیسا فیصلہ کیا تھا؟ اس سرپھری سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی تھی۔

''پوچھو گی نہیں کیا فیصلہ.....؟''سونیا نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں،بتاؤ ناں.....''عمامہ کو بالآخر جھک کر کہنا پڑا۔سونیا پھر سے سوچ میں گم ہوگئی تھی۔کچھ دیر سوچتی رہی۔پھر گلا کھنکھار کر بولی۔

''فیقہ کو ایک پرفیکٹ انسان بنانے کا،وہ بہت سے لوگوں کی نگاہوں میں عجیب ہوگی،بدصورت بھی ہوگی۔لیکن میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا۔یقین مانو عمامہ!میں ابھی تک حیران ہوں،مجھے فیقہ کبھی بدصورت نہیں لگی۔میں ہر دفعہ اسے سوچوں کے خانوں میں فٹ کرتی ہوں.....پھر تھرا جاتی ہوں،مجھے وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت لگتی ہے۔''سونیا نے آنکھیں میچ کر بے بسی سے کہا تھا۔پھر کچھ دیر بعد وہ دوبارہ بولی۔

''اور میں وہ عجیب بات چاہتی ہوں۔''وہ لمحہ بھر کو رکی۔''کہ فیقہ تمہیں بھی خوب صورت لگے۔''اس نے ایک جذب سے کہا تھا عمامہ ہل کر رہ گئی۔وہ بے یقینی سے سونیا کو دیکھتی رہی۔جیسے یقین نہیں آتا ہو۔

''اور جو ہمیں اچھا لگتا ہے،ہم اس کے لیے اچھا سوچتے ہیں،دیکھو عمامہ!کل تک میں بھی فیقہ اور شام کے بے جوڑ رشتے کے خلاف تھی۔ایک لحاظ سے نفرت کرتی تھی پھر میں بہت دنوں تک سوچتی رہی،غور کرتی رہی،کوئی

نہ کوئی حل ڈھونڈتی رہی، مجھے تمہاری محبت کا بڑا خیال ہے..پر یقین مانو، فیقہ کی بے بسی کا احساس بہت بھاری ہوتا جارہا ہے، دل پر ایک بوجھ ہے جو ہٹتا نہیں..... پھر میں ایک فیصلہ کر کے مطمئن ہوگئی..... فیقہ کی آخری امید جوڑنے کا فیصلہ..... اسے شام کے لیے پرفیکٹ بنانے کا فیصلہ..... عمامہ! تم ہجوم میں کھڑی ہو، فیقہ تنہا ہے..... اس کی آخری امید تمہارا ''شام'' ہے۔ فیقہ کی شام پر قربانی کا ایک دیپ جلادو..... یہ دیپ فیقہ کی اگلی منزل آسان کردے گا۔ اسے رستہ سجھائی دے گا..... تم..... تم عمامہ! شام کی محبت سے دستبردار ہوجاؤ۔'' سونیا نے بھیگی آواز میں عمامہ کے حلق پر خنجر چلادیا تھا۔ اس شدت سے کہ عمامہ چلّا بھی نہ سکی۔

زمین اپنے مرکز سے ہٹ جاتی تب بھی عمامہ اتنی حیران، متحیر اور شاکڈ نہ ہوتی۔ جس قدر سونیا کے ان الفاظ نے اسے گویا منجمد ہی کردیا تھا۔

عمامہ بے یقینی سے اپنی پیاری سہیلی کو دیکھتی رہی۔ بلاشبہ وہ عمامہ کی بہترین سہیلی تھی۔ پھر وہ فیقہ کی دیوار اپنے اور عمامہ کے بیچ کیوں کھڑی کررہی تھی۔ اوپر سے سونیا کی خواہش نے عمامہ کو آسمان سے زمین پر پٹخ دیا تھا۔ اس کے الفاظ نہیں، خنجر کی کوئی تیز دھار تھے، وہ عمامہ کو شام کی محبت سے دستبردار ہونے کا مشورہ دے رہی تھی۔ دوسرے معنوں میں عمامہ کے جسم سے روح کو کھینچ کر کانٹوں پر گھسیٹ رہی تھی۔ کیا سونیا اتنی سنگ دل اور بے رحم تھی۔

عمامہ بے یقین تھی، ششدر تھی، منجمد تھی۔ جیسے کوئی پتھر کا مجسمہ ہو جیسے اس میں سانس تک باقی نہ ہو، اس کی رنگت برف کے مانند سفید پڑگئی۔ سونیا کو ایک لمحے کے لیے یوں لگا جیسے عمامہ بیٹھے بیٹھائے گزر چکی ہے، سونیا کا دل کانپ سا گیا۔ اس نے بے ساختہ اس کا بازو دبوچا اور جھنجوڑ دیا۔ عمامہ خالی، خالی نگاہوں سے سونیا کو دیکھتی رہی گئی تھی۔ سونیا زرد سورج مکھی کے پھول کی طرح کملا گئی۔

''عمامہ!'' اس نے بے قراری سے اس کا بازو ہلایا۔ وہ ہولے، ہولے لرز رہی تھی۔ سونیا کو اپنے الفاظ کی سنگینی کا اب احساس ہوا تھا۔ وہ شرمسار ہوگئی، گھبرا گئی۔ عمامہ کے اتنے خاموش ردِعمل کی اسے توقع کہاں تھی۔ وہ تو لب سیے کسی اور جہان میں گم ہورہی تھی۔ صرف اتنی سی بات پر.. پر یہ بات اتنی معمولی کہاں تھی؟ سونیا کو تب سمجھ نہیں آیا۔ سونیا کو اب سمجھ آرہا تھا۔

''میری بات سنو عمامہ.....!'' سونیا نے دہل کر عمامہ کو پھر سے جھنجوڑا تھا۔ عمامہ اب بھی خالی نگاہ سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کے لب خاموش تھے اور آنکھیں سوال کررہی تھیں۔ لفظ کرلا رہے تھے۔

''تم نے مجھے ''سزائے موت'' کا حکم کیوں سنادیا سونیا! تم تو میری سہیلی تھیں پھر میرے خلاف تلوار کیوں نکال لی؟ مجھے خنجر سے کیوں کاٹ ڈالا؟ میرے وجود کو ٹکڑوں میں تقسیم کیوں کردیا؟'' خاموش آنکھوں سے گرتا ایک، ایک آنسو سوال کررہا تھا۔ سونیا کے دل پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اپنے جوش، ولولے اور خالص جذبات پر سو مرتبہ لعنت بھیجی..... آخر فیقہ سے ہمدردی کی انتہا پر وہ عمامہ کے معصوم خواب اور محبت کو کیسے نظر انداز کرگئی تھی؟ سونیا کا سر شرم سے جھک گیا؟ کیا وہ عمامہ کی محبت سے ناواقف تھی؟ کیا وہ شام کے خالص جذبوں سے انجان تھی؟ کیا وہ عمامہ کے دل پر لکھے ایک، ایک حرف کو نظر انداز کرسکتی تھی؟ کیا وہ عمامہ کی آنکھ سے خواب کو نوچ سکتی تھی؟ کیا وہ شام کے نام کو عمامہ کے دل کی زمین سے کھرچ سکتی تھی؟

سونیا کو لگا، وہ اب کبھی عمامہ سے نگاہ ملا کر بات نہیں کرسکے گی، اسے احساس ہوگیا تھا۔ اتنے سنگین الفاظ کم از کم اتنی روانی میں نہیں بولنے چاہیے تھے، بات کسی اور پیرائے میں بھی تو کی جاسکتی تھی؟ کسی اور انداز میں بھی تو نقطۂ نظر واضح کیا جاسکتا تھا۔ سونیا اپنے ہی الفاظ کے خوف سے کپکپاتی رہ گئی۔

''عمامہ! میری بات کو غلط معنوں میں مت لو.....'' سونیا لرزتی آواز میں بمشکل بولی تھی۔ عمامہ نے ریزہ، ریزہ وجود کو سمیٹا، لفظوں کے توڑ جوڑ میں کسی ملامت کو تلاشا، وہ درد اور کرب کی انتہا پر پہنچ کر بھی سونیا کے لیے تکلیف دہ الفاظ کا استعمال گناہ اور حرام سمجھتی تھی۔ یہ اس کی کمٹ منٹ اور دوستی کی اخلاقیات کے خلاف تھا۔ وہ سونیا کا دل نہیں دکھا سکتی تھی۔ سونیا چاہے عمامہ کا دل دکھائی یا لرزاتی، وہ سونیا جیسی بہادر جو نہیں تھی۔

''میں غلط معنوں میں نہیں لیتی۔'' عمامہ بہت دیر بعد بولنے کے قابل ہو سکی تھی۔ ''میں تمہارے خلوص کو سمجھتی ہوں۔ تم فیقہ کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہو لیکن کیا فیقہ کے لیے کچھ کرنے کے دوران عمامہ کے دل کا خون ضروری تھا سونیا۔'' وہ شکوہ نہیں کرنا چاہتی تھی مگر دُکھا ہوا دل شکوے کی راہ گزر کا اہتمام خود کرتا ہے، سونیا کا سر مارے ندامت کے جھک گیا۔

''ہمدردی کے اور بھی سو طریقے ہوتے ہیں سونیا.....'' وہ بھیگی آواز میں بولتی رہی۔ ''تم فیقہ کے لیے کچھ ضرور کرو، میری بھی خواہش ہے فیقہ ایک آسودہ زندگی گزارے۔ مگر اس کے لیے عمامہ کے ''مقتل گاہ'' پر نگاہ نہ رکھو سونیا! میں بھی فیقہ پھپو کو پرفیکٹ اور خوشحال دیکھنا چاہتی ہوں، کیا اس کے لیے شام کی محبت سے دستبردار ہونا ضروری ہے؟ کیا فیقہ کے تم کسی بہترین جگہ شادی نہیں کروا سکتیں مجھے بھی ان سے محبت ہے، میں نے تو کبھی ان کی صورت سے کراہیت نہیں کھائی۔'' اس نے مدھم آواز میں اپنی بات مکمل کی تھی۔ سونیا کی آنکھوں کے سامنے سے جالے ہٹ گئے تھے۔ اس پہلو پر سونیا نے غور نہیں کیا تھا ورنہ یہ تو بڑا آسان حل تھا، بڑا پرفیکٹ حل تھا، اس نے کیوں نہیں سوچا۔ کیا شام اور عمامہ کی محبت قربان کرنا ضروری تھی؟ ہرگز نہیں..... سونیا سوچتی رہی اور پشیمان ہوتی رہی لیکن ایک بات جو وہ کر چکی تھی اس کے حق میں دلیل دیے بغیر کیسے رہتی؟ اس کے پاس دلائل کی کمی نہیں تھی۔

''عمامہ! شام تمہاری محبت ہے اور فیقہ کی ضرورت، محبت کے بغیر رہا جا سکتا ہے مگر ضرورت کے بغیر ممکن نہیں۔'' اس کا لہجہ کھوکھلا نہیں تھا نہ الفاظ معمولی تھے۔ عمامہ ''فق'' رنگت سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''مجھے شام سے محبت ہے سونیا۔'' اس کا لفظ، لفظ کرلایا تھا۔ وہ پھر سے دم بخود ہو رہی تھی، وہ پھر سے منجمد ہو رہی تھی۔

''شام سے اور بھی لوگوں کو محبت ہوگی، تمہیں بھی ہے، کیا پتا مجھے بھی ہو، شام کی کولیگز میں سے بھی کسی کو ہو، کیا خبر فیقہ کو بھی ہو، وہ محبت کے لائق ہے تو سبھی اسے محبوب بنا سکتے ہیں۔'' سونیا کا تبصرہ بڑا نرم قسم کا تھا پھر بھی عمامہ کو بہت بے رحم لگا۔ وہ ساکت سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

''لیکن شام کو کسی اور سے نہیں، بس عمامہ سے محبت ہے۔'' اس نے کتنے تفاخر سے کہا تھا، کتنے مان سے کہا تھا، کس قدر یقین سے کہا تھا، سو نیا اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ اس کا یقین کبھی نہ توڑتی۔

''تمہارا پلڑا یہیں پر بھاری ہے۔'' سونیا نے اثبات میں سر ہلایا جیسے قائل ہو رہی تھی۔

''لیکن عمامہ! محبت لامحدود جذبہ ہے۔ کیا خبر شام فیقہ سے بھی محبت کر لے.....'' وہ نرم انداز میں ایک آپشن بتا رہی تھی۔ عمامہ اندر تک ہل گئی..... یہ بھلا ممکن تھا؟ شام کیوں فیقہ سے محبت کرے گا؟ وہ ''تھرا'' اٹھی۔

''ایسا ممکن نہیں.....'' عمامہ کرلائی..... یہ تصور بڑا اذیت ناک تھا، وہ اندر سے مرجھا کر رہ گئی۔

''اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں.....'' سونیا کی آواز ہلکی پڑ گئی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ سونیا کے پاس دلائل نہیں تھے، مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ عمامہ کے چہرے پر پھیلی اذیت دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔

''کیا تم چاہتی ہو عمامہ بے موت مر جائے۔'' اس نے پھٹی، پھٹی آواز میں کہا۔

''اللہ نہ کرے.....'' جذباتی سی سونیا گھبرا کر بولی۔ ''تم تو ہمیشہ جیو عمامہ!'' اس نے صدقِ دل سے دعا دی تھی۔

''شام کے ہمراہ.....'' عمامہ نے بے ساختہ کہا۔ ''اگر جی نہ سکوں تو مر ضرور جاؤں۔'' وہ آنکھیں موندے جذب سے کہہ رہی تھی۔ سونیا ہل کر رہ گئی۔

''عمامہ.....!'' اس نے تڑا کر کہا۔ ''مرنے کی بات مت کیا کرو، ورنہ خون کر دوں گی تمہارا.....'' سونیا نے دھمکایا۔

''تو کیا پھانسی چڑھو گی۔'' عمامہ مسکرا دی تھی۔ اتنے اعصاب شکن لمحات میں عمامہ کی مسکراہٹ سے سونیا کو ڈھارس پہنچی تھی۔ اس کا دل قدرے رواں ہو کر چلنے لگا تھا، ماحول کی کثافت زائل ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد سونیا نے ذرا مناسب انداز میں عمامہ کا ہاتھ دبا کر کہا۔

''میں فیقہ کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں عمامہ! کچھ ایسا جو فیقہ کو نقرئی قہقہہ بنا دے۔ کیا تم میری مدد کرو گی؟'' وہ اس سے عہد لے رہی تھی۔ سونیا کی نیت پر شک مناسب نہیں تھا، عمامہ بھی نہ کر سکی۔ اس نے سونیا سے بالآخر عہد کر لیا تھا، وہ بھی فیقہ کی زندگی کا خوشگوار انجام چاہتی تھی۔ فیقہ کے چہرے کی سیاہی مٹ جائے اور وہ حقیقی خوشی اور ہنسی کو محسوس کر سکے۔ اس کی کسی بہترین انسان سے شادی ہو جائے، اگر شام کے نام کو فیقہ سے ہٹا کر دیکھا جاتا تو فیقہ نہ عمر رسیدہ تھی نہ بہت بدنما تھی..... ہاں، دادی نے وقت سے پہلے اس پر بڑھاپا ضرور طاری کر دیا تھا۔ ویسے بھی جس خاندان کا وہ حصہ تھی، وہاں پر لڑکی سولہ، سترہ سال میں بیاہ دی جاتی تھی۔ اکیس، بائیس سال میں لڑکا بھی بیاہ دیا جاتا تھا، اس لحاظ سے فیقہ تیس سال کی ہو چکی تھی، یوں دادی نے فیقہ کو عمر رسیدگی کے طعنے مار، مار کر اور بھی حساس، متنفر اور زندگی سے بیزار کر دیا تھا۔

دادی کی بھی عجیب فطرت تھی، وہ فیقہ سے بے پناہ محبت کرتی تھیں، اس کی خوشی کے لیے ہر حد سے گزر سکتی تھیں تاہم غصہ آنے پر اپنی ''بھڑاس'' بھی اسی پر نکال دیتی تھیں۔ اسے بدصورتی کے طعنے دیتیں، بڑھتی عمر پر چوٹ کرتیں۔ ان دنوں چونکہ ''مین ٹارگٹ'' عمامہ تھی، سو دادی نے فیقہ پر ہاتھ ہولا رکھا ہوا تھا۔ کچھ شام سے فیقہ کا رشتہ جوڑ کر وہ مطمئن ہو چکی تھیں جیسے فیقہ کا مستقبل اب محفوظ تھا۔ انہیں فیقہ پر غصہ نہیں، پیار آنے لگا تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ اسے اپنے ساتھ لگائے رکھتی تھیں، بے پناہ خیال رکھتیں، بے انتہا محبت کرتیں، تاہم عمامہ ان کی نگاہ کا ایک کانٹا بن چکی تھی۔ وہ شام کے حوالے سے عمامہ کو سوچتیں تو دل میں نفرت کا طوفان امڈ آتا تھا۔ یہ نفرت نہ جانے کہاں سے امڈتی، ابھرتی ان کے دل میں پیوست ہو رہی تھی۔ وہ چاہتی تھیں عمامہ کا عفریت جلد از جلد فیقہ کی زندگی سے ٹل جائے۔ عمامہ کی شادی سے بہتر کوئی آپشن نہیں تھا، اس گھر سے عمامہ کا دور ہونا ہی مناسب تھا مگر یا تو فیقہ کے نصیب بہت ٹھنڈے تھے یا عمامہ کی قسمت بڑی بلند تھی۔ طے ہوئی شادی ناگہانی آفت سے رک گئی تھی۔ فرخ تین مہینے کے لیے اسپتال جا پڑا تھا۔ اس کا بہنوئی حادثے کا شکار ہو گیا تھا اور عمامہ شادی رکنے پر غمگین ہونے کے بجائے کتابیں بغل میں دبا کر خود کو پڑھائی کی آڑ میں محفوظ کر چکی تھی۔ دادی کو عمامہ کی ہوشیاری پر بڑا تاؤ آتا تھا۔ اوپر سے صالح اور طاہرہ کی ''اجازت'' نے سونے پر سہاگے کا کام کر دیا تھا۔ آخر ضرورت کیا تھی بیٹی کو مزید پڑھانے کی۔ جب بیٹے پر زور نہ چل سکا تو مجبوراً اپنی بھڑاس انہوں نے ماں، بیٹی تک محدود کر لی تھی۔ وہ اپنی عادت سے مجبور تھیں۔ عمامہ کو کالج آتا جاتا دیکھ کر طنز کرنے سے باز نہیں آتی تھیں۔ پھر ان کے پاس سونیا کا فیورٹ ٹاپک بھی تھا۔ جس پر گھنٹوں بول کر وہ اپنی جلن باہر نکال سکتی تھیں۔

عمامہ عصر کے بعد سو کر اٹھی، نماز ادا کی اور پھر طویل گیلری سے گزر رہی تھی جب فون کی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اس نے سستی سے بجتے فون کی طرف دیکھا۔ کیا پتا بابا یا بھائیوں کا فیکٹری سے فون ہو؟ یہی سوچ کر وہ سستی سے فون کے قریب آ گئی تھی۔ فون اٹھایا تو دوسری طرف اجنبی آواز تھی۔ عمامہ لحظہ بھر کو حیران ہوئی۔

''سوری، پہچانا نہیں..... اپنا تعارف کروا دیں۔'' عمامہ نے شائستگی سے ''ہیلو'' کے جواب میں کہا تھا۔ دوسری

طرف بڑے جوش وخروش کا مظاہرہ کیا گیا۔

''تم صوفی صالح کی بیٹی ہو کیا؟'' اس کا سوال یکسر نظر انداز کر کے بڑے وثوق سے کہا گیا تھا۔ عمامہ لمحہ بھر کے لیے چپ کر گئی تھی۔ جیسے آواز پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی جب اس کوشش میں ناکام ہوئی تو دبی آواز میں بولی۔

''جی..... مگر آپ کون.....؟'' اس کی الجھن بدستور قائم تھی۔ سوال بھی ہنوز وہی تھا۔ تاہم فون کے دوسری طرف کوئی بہت شدت سے چہکا تھا۔

''زہے نصیب، تم سے فون پر آدھی ملاقات ہوگئی۔'' بھاری مردانہ آواز میں بہت مٹھاس بھرے لہجے میں کہا گیا۔ عمامہ کو جھٹکا سا لگا۔ یہ اتنا بے تکلف انسان کون تھا؟ عمامہ کو سخت ناگواری نے گھیرا۔

''آپ کون ہیں؟ اور کس لیے فون کیا ہے؟'' اب کے عمامہ کرختگی سے بولی تھی جو کہ اس کی شخصیت اور مزاج کا خاصہ نہیں تھا۔ مگر اسے اجنبی بے تکلف کالر پر بہت غصہ آ رہا تھا۔

''فون تو کسی اور کے لیے کیا تھا۔ ملاقات تم سے ہوگئی۔ فون آدھی ملاقات ہوتا ہے ناں.....'' جواباً اس کی کرختگی کے بدلے میں بے ساختگی کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ عمامہ کو اور بھی برا لگا۔ اس نے غصے سے فون پٹخ دیا۔ پھر زیر لب بڑبڑا کر جانے لگی۔ تب دوبارہ فون کی گھنٹی نے ناک میں دم کر دیا تھا۔ لاؤنج میں تخت پر دادی اونگھ رہی تھیں۔ بھابیاں اپنے کمروں میں بند بچوں کو دُبکائے آرام فرما رہی تھیں۔ عمامہ نے ڈسٹربنس کے خیال سے فون بادلِ ناخواستہ اٹھا لیا۔

''عمامہ! فون نہ بند کرو..... میں ہوں منصور، شام کا بدنصیب باپ۔'' عمامہ کے فون اٹھاتے ہی وہ لجاجت سے بولا۔ مبادا عمامہ فون بند کر دیتی۔ منصور نے اپنا تعارف کروایا تو عمامہ سوچ میں پڑ گئی۔ اسے دور وہ درختوں کی قطار والی سیدھی تارکول پر کھڑا شام کی منتیں کرتا ایک اسٹائلش بڈھا اچانک یاد آ گیا تھا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے آخر منصور نے یہاں کال کیوں کی؟

''مجھے شام سے بات کرنی ہے..... کیا تم بات کروا سکتی ہو۔'' عمامہ کو منصور کی آواز بھیگی سی لگی تھی۔ وہ جو کوئی سخت جملہ بولنا چاہتی تھی لحظہ بھر کے لیے رک گئی۔ اتنا تو وہ جانتی ہی تھی شام کو اپنے باپ سے کوئی لگاؤ نہیں تھا اور نہ ہی اس گھر کا کوئی فرد منصور کو پسند کرتا تھا۔ اب وہ بھلا کیا جواب دیتی؟

''پلیز عمامہ! تم کو زندگی سے پیاری چیز کی قسم، میں بہت بیمار ہوں، بہت مصیبت میں ہوں، شام سے بات کروا دو.....'' عمامہ کی خاموشی پر وہ اس شدت سے گڑگڑایا کہ مجبوراً عمامہ کو ہامی بھرنی ہی پڑی تھی۔

''شام اپنے پورشن میں ہے، فون وہاں ہے تو، خیر میں شام کو ادھر ہی بلا لیتی ہوں۔'' عمامہ نے بادلِ ناخواستہ کہا۔ منصور کی بیچارگی پر اسے ترس آ گیا تھا۔ جانے کتنا بیمار تھا؟ کیسی مصیبت میں تھا؟ ہے تو شام کا باپ ہی، وہ سوچتی ہوئی دبے قدموں گیلری کا جالی دار دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ باغیچے میں منال ٹہل رہے تھے۔ ایک بھاگتا ہوا عمامہ کو دیکھ کر آ گیا۔ عمامہ نے اسے گودی میں لیا..... پیار کیا..... اس کا لاجوردی کنٹھ زور سے کھینچا اور منال کو اٹھائے، اٹھائے شام کے پورشن میں آ گئی۔ داخلی گرل کا دروازہ کھلا تھا۔ عموماً کھلا ہی رہتا تھا۔ عمامہ نے اندر جھانک کر دیکھا۔ شام بنیان، ٹراؤزر میں استری اسٹینڈ کے قریب کھڑا شرٹ پریس کر رہا تھا۔ قریب ہی کپڑوں کی ایک گانٹھ پڑی تھی۔ جس میں سے ڈھیروں شرٹس ابل، ابل کر گر رہی تھیں۔ عمامہ کو اتنے کپڑے دیکھ کر ہول اٹھنے لگے۔ شام کھٹکے پر چونکا اور بے ساختہ اچھل پڑا۔ اس کے پیچھے عمامہ کھڑی تھی۔ وہ لحظہ بھر کے لیے گڑبڑایا۔ کھونٹی سے شرٹ کھینچ کر پہنی اور برہم انداز میں بولا۔

''اندر آنے سے پہلے دستک دینا ضروری ہوتا ہے۔'' اس کا انداز صاف جتانے والا تھا۔ جیسے عمامہ کا بغیر اطلاع کے آنا اسے شرمندہ کر رہا تھا۔

''سوری.....'' عمامہ نے جلدی سے کہا تھا۔ مبادا شام کا غصہ زیادہ بڑھ جائے۔ شام اس ادا پر کیا کہتا؟ عمامہ کے ترکش میں تیر ہی بہت تھے، وہ گھائل نہ ہوتا تو کیا کرتا۔ اب عمامہ نچلا ہونٹ لٹکا کر منہ بسورے کان پکڑے کھڑی تھی۔ شام نے گہری سانس بھر کر استری کی طرف دھیان لگایا۔

''اٹس اوکے، آئندہ احتیاط کرنا..... جو کہ تم کبھی نہیں کرو گی۔'' وہ دلجمعی سے شرٹ پریس کرتا رہا۔ عمامہ بے خودی سے اسے دیکھتی رہی۔ شام کو کام کرتا دیکھنا بڑا دلفریب قسم کا تجربہ تھا۔

''جب جانتے ہو تو نہ کہا کرو۔'' عمامہ نے کھوئے، کھوئے انداز میں کہا۔

''بس، پاگل کتے نے کاٹ رکھا ہے تبھی بھینس کے آگے بین بجاتا رہتا ہوں۔'' وہ تاسف سے بولا۔ عمامہ ہنسنے لگی۔

''ویسے تم کام کرتے بہت کیوٹ لگتے ہو۔'' عمامہ نے اپنے دل کی بات بے ساختہ کہی۔

''کیوٹ تو لگوں گا، تمہیں سہولت جو رہے گی۔'' شام اپنی ہی دُھن میں مگن روانی سے کہہ گیا تھا۔ جیسے اسے اپنے کہے الفاظ کا احساس تک نہیں تھا۔ وہ غائب دماغی میں نہیں، بے خیالی میں کہہ گیا تھا جبکہ عمامہ پر کسی نے فسوں طاری کر دیا تھا۔ وہ کسی مورت میں ڈھل کر گم صم ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں تک ساکت تھیں۔ ہونٹ تک منجمد تھے اور خیالوں کی اڑان اسے بہت دور بلندی پر اڑائے لے جا رہی تھی۔ وہ بادلوں کے رتھ پر سوار تھی، ہوا کی نرم لہروں پر تیر رہی تھی۔ وہ اس جہان میں نہیں تھی۔ وہ کسی جہان میں نہیں تھی۔ وہ خود میں بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ وہ ''میں'' سے ''تم'' تک کا سفر طے کر رہی تھی۔

''اس بات سے میں کیا سمجھوں؟ کیا عمامہ اتنی بانصیب ہونے والی ہے؟ کیا عمامہ کا نصیب بدلنے والا ہے۔ کیا شام عمامہ سے اظہارِ محبت کرنے والا ہے؟'' شام کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ لمحوں میں سیدھا ہوا اور سانس روک کر سوچتا رہا۔ اپنے کہے الفاظ پر غور کرتا رہا اور کپکپاتا رہا۔ یہ اس نے کیا بول دیا تھا..... وہ عمامہ کی آنکھ میں ''امید'' بھر رہا تھا۔ کیوں آخر کیوں؟ عمامہ کی آنکھ میں امید بھر کر رستے توڑنے والا وہ کون ہوتا ہے۔

''کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں'' شام بے خیالی میں سر جھٹکتا رہا۔ جیسے اپنے کہے الفاظ کا اثر زائل کرنا چاہتا تھا۔

''تم کیوں آئی تھیں کوئی کام تھا تو فون کر کے بلا لیتیں۔'' معاً اسے عمامہ کا یہاں آنا کھٹک گیا تھا۔ پھر وہی کسی کے دیکھ لینے کا دھڑکا۔ وہ اپنے ساتھ، ساتھ عمامہ کی عزت کو بھی بچانا چاہتا تھا۔ پھر اسے طابہ اور اپنی خالہ کی سطحی ذہنیت کا بھی خوب علم تھا۔ وہ کسی تماشے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بھی اس صورت میں جب عمامہ بھی پابند تھی اور وہ خود بھی ''پابند سلاسل'' تھا۔

''آں..... کام تو تھا ہی.....'' عمامہ بے ساختہ چونکی تھی۔ جیسے ابھی، ابھی کوئی خیال آیا ہو۔

''وہ تمہارا فون آیا تھا'' اس نے عجلت میں بتایا۔ شام چونک گیا تھا۔

''میرا فون.....؟'' شام نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں، ناں تمہارے والد کا..... بہت پریشان تھے بیچارے..... تم سے بات کے لیے بے چین.....'' عمامہ نے تفصیل بتائی۔ پھر شام کی طرف دیکھا اور سہم گئی۔ وہ استری کا پلگ جارحانہ انداز میں بورڈ سے کھینچ کر عمامہ کو خون رنگ آنکھوں سے گھورنے لگا تھا۔ عمامہ اس کے تیور دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ وہ اپنے باپ کو ناپسند کرتا تھا۔ یہ تو عمامہ جانتی تھی۔ منصور کی کال عمامہ اٹینڈ کر چکی تھی۔ اس بات پر شام کا شدید ردِعمل عمامہ کو ہلانے کے لیے کافی تھا۔

''تم نے..... تم نے اس آدمی کی کال پک کی؟ کیوں کی؟'' وہ شدید غصے میں عمامہ پر دہاڑ رہا تھا۔ عمامہ کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے تھے۔ وہ خوفزدہ ہو چکی تھی۔ کیا اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا تھا؟ اس نے سہم کر سوچا۔

شام اتنا غصے میں کیوں تھا؟ یعنی منصور کی کال عمامہ نے سنی محض اتنی سی بات پر..... مگر یہ اتنی سی بات کہاں تھی؟

☆☆☆

بڑا کتب خانہ صوفی صالح کی بڑی قیمت لائبریری تھی۔ یہاں ہر موضوع پر لکھی کتاب دستیاب تھی۔ صوفی صالح فیکٹری کے بعد کا فارغ وقت اسی لائبریری میں گزارتے تھے۔ یہ گھر سے الگ تھلگ پچھلی طرف کے برآمدے سے جڑا بڑا وسیع کمرا تھا۔ گھریلو چہل پہل سے دور، گویا ممنوعہ علاقہ..... جس میں گھر کے بچوں اور بدذوق افراد کا داخلہ منع تھا۔ عموماً طاہر، حاذق، حاشر یا تقی میں سے کوئی نہ کوئی یہاں ضرور پایا جاتا تھا۔ حاشر تھوڑا بھنورا صفت تھا۔ حاذق بھی کچھ، کچھ حاشر کی صفات رکھتا تھا۔ سو یہ دونوں بھائی عموماً بیرونی دوروں اور سیر سپاٹوں میں مگن رہتے تھے۔ حاشر شادی شدہ دو بیٹیوں کا باپ ہونے کے باوجود ابھی تک لاابالی تھا۔ حاذق شادی سے فی الحال محفوظ تھا۔ سو سیاحت کا شوق فرمالیا کرتا تھا۔ یہ دونوں بھائی بڑے دو بھائیوں کی طرح عموماً گھریلو سیاست سے کوسوں دور رہتے تھے۔ کبھی رافعہ اپنے شوہر حاشر کو کچھ بتانا بھی چاہتی تو حاشر دلچسپی لینے سے صاف انکار کر دیتا۔ سو کچھ باتیں اس کی سمجھ میں آتی تھیں اور کچھ سر کے اوپر سے گزر جاتیں..... تنگ آ کر رافعہ نے حاشر کو گھریلو خبروں سے بے خبر رکھنا شروع کر دیا تھا۔ تاہم تقی اور طاہر گھر سے اتنا بے پروا نہیں تھے..... خاص طور پر تقی کیونکہ اس کی بیوی طابہ ہر باہر کی ''خبر'' اس کے گوش گزار کرتی تھی۔ خبر اچھی ہوتی چاہے بری..... تقی کے غصے کو ایک طرف رکھ کر وہ اپنا پیٹ ضرور ہلکا کرتی تھی۔

بڑے کتب خانے میں موجود تقی کو اچانک کوئی گزشتہ بات یاد آئی تو اس نے شام کو بلوالیا۔ شام کسرت گاہ سے واپس آیا تھا۔ ابھی لباس بدلا ہی تھا کہ تقی کا پیغام مل گیا۔ وہ اپنے پورشن سے نکل کر اندرونی عمارت کی طرف بڑھ آیا۔ یوں ہی گیلری میں سے گزرتے ہوئے اس نے لکڑی کے گول زینے کی طرف دیکھا..... کارنر والے کمرے کی دونوں جہازی سائز کھڑکیاں کھلی تھیں۔ دروازہ بند تھا۔ تاہم دریچوں کے سارے پٹ کھول کر عمامہ بیچ میں اچک کر بیٹھی دکھائی دی تھی۔ منہ پھولا ہوا سوج رہا تھا۔ آنکھیں گلابی تھیں حتیٰ کہ ٹھوڑی بھی گلابی ہو رہی تھی۔ گھنگرالے بالوں کے لچھے گردن سے لپٹ، لپٹ کر کچھ آگے، کچھ پیچھے لمرتک جھولتے دکھائی دیتے تھے۔ آج عمامہ ہمیشہ کی طرح نک سک سے درست نہیں لگ رہی تھی۔ وہ اداس اور کسی حد تک غصے میں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ عمامہ کے غصے کا پس منظر جانتا تھا۔ اسی لیے نگاہ چرا کر گیلری کی طرف جانا چاہتا تھا جب عمامہ نے شام کی طرف دیکھا اور کچھ اور منہ پھلالیا۔ یہ اس کی ناراضی کا واضح اظہار تھا۔ گویا جتا دیا ہو۔

''تم نے مجھ پر دوسری مرتبہ اپنے باپ کا غصہ اتارا کیوں؟ آخر کیوں؟'' عمامہ کی چبھتی نگاہ کا سوال سمجھ کر وہ نادم سا آگے بڑھ گیا۔ حالانکہ وہ عمامہ کی نگاہوں کا گرم تاثر اپنی پشت پر محسوس کرتا رہا تھا..... تاہم ابھی وہ عمامہ کو ''منانے'' کے موڈ میں نہیں تھا۔ بڑے کتب خانے کا منقش دروازہ کھول کر وہ اندر آیا تو تقی کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ شام نے گلا کھنکھار کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ تقی چونک کر سنبھل گیا تھا۔ تاہم شام نے نوٹ کیا تھا وہ کچھ متفکر ہے سو گفتگو کا سلسلہ یہیں سے جڑا۔

''خیریت تو ہے تقی بھائی.....! تم کچھ پریشان لگتے ہو؟'' شام نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔ تقی بے ساختہ گہری سانس کھینچ کر رہ گیا۔

''ہاں یار! پریشانی تو ہے.....'' تقی نے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

''کیا ہوا؟'' وہ اور بھی متفکر ہوا۔ تقی نے دھیرے، دھیرے کنپٹی مسلتے ہوئے اسے پریشانی کی وجہ بتائی تھی۔

''فیکٹری کے سامنے بیس کینال موجود جگہ پر شفعہ کا جو مقدمہ چل رہا تھا وہ ہم ہار گئے۔'' تقی غصے، بے بسی اور ناکامی کے باعث افسردہ تھا۔ شام کو بھی حیرت ہوئی۔

''یہ ممکن تو نہیں تھا..... مقدمہ کیسے ہارے؟'' اس کا تفکر بڑھ گیا۔

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03015215229	منڈی بہاؤالدین	03460827027
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میرپور AK	03460397119
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	0300694678	قصبہ ڈنگہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بوروالہ	03347193958	لورالائی	03023844266
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یار خان	03009672096	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	کوہاٹ	03325465062
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	پتوکی	03454678832
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	مغل آباد	0301-7681279	مانسہرہ	0333-5021421
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	کوٹ رادھا کشن	03004992290

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C بلاک 7 گلشن اقبال، شاہراہ فیصل کراچی 35895313
E-mail:jdpgroup@hotmail.com

''جس خاتون ایڈووکیٹ کے پاس مقدمہ تھا۔اس سے طاہر کے کچھ اختلافات چل رہے تھے۔ مجھے لگتا ہے اسی وجہ سے مقدمہ ہار گئے یا ہرایا گیا۔'' وہ لب بھینچ کر بولا تھا۔آنکھوں میں اشتعال ،غصہ اور ناکامی کا تاثر ہلکورے لے رہا تھا۔

''یہ تو برا ہوا.....وہ بڑی آئیڈیل جگہ تھی۔'' شام نے دکھ سے کہا.....حقیقتاً مقدمہ ہارنے کا اسے سخت افسوس تھا۔

''غصہ یہ نہیں...ہمیں ناکامی ہوئی۔اصل بے عزتی تو یہ ہے۔جیتنے والے نے وہ جگہ کسی اور کو فروخت کردی ہے۔اگر...اسے جگہ بیچنی ہی تھی تو ہمیں فروخت کردیتا۔'' تقی نے مٹھیاں بھینچ کر غصہ ضبط کرنے کی کوشش کی تھی۔''ہم تو منہ مانگی رقم دینے کو تیار تھے۔'' وہ زہر خند ہوا۔

''طاہر تو بہت غصے میں ہوگا؟'' شام نے خیال ظاہر کیا۔

''غصے میں تو بہت ہے لیکن حیرانی زیادہ ہے۔'' تقی نے بگڑے انداز میں کہا۔

''حیرانی کیسی؟'' شام کو بھی حیرت ہوئی۔

''سنو گے تو تم بھی شاکڈ رہ جاؤ گے۔'' تقی اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔شام اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ٹہل، ٹہل کر غصہ کم کرتا تقی، شام کو دیکھنے لگا۔

''جانتے ہو، اس زمین کا نیا خریدار کون ہے؟'' تقی نے بہت ضبط کے ساتھ آنکھیں دباتے ہوئے بات جاری رکھی تھی۔شام اب کے کچھ چونک گیا تھا۔تقی کا غصہ غیر معمولی تھا۔جیسے مقدمہ ہارنے کا اتنا دکھ نہیں تھا۔جس قدر نئے ''خریدار'' پر تاؤ چڑھ رہا تھا۔

''کون ہے؟'' شام نے سانس تک روک لی تھی۔اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی۔کچھ غلط سا ہونے والا ہے۔

''تمہارا باپ، منصور سیال.....'' تقی نے دانت چبا کر کہا تھا۔جیسے منصور کو دانتوں تلے ''رڑک'' دینا چاہتا ہو۔

''میرا نکما باپ؟ اس کے پاس اتنا ''سرمایہ'' کہاں سے آیا؟'' شام کا دماغ گھوم گیا تھا۔اسے اپنے باپ کی روتی، تڑپتی صورت یاد آئی۔وہ تو بھوکوں مر رہا تھا۔شام سے پیسے مانگ کے گیا تھا۔اس کے پاس دوائی تک کے روپے نہیں تھے۔وہ ایک مہنگی پراپرٹی کو کیسے خرید سکتا تھا؟ شام چکرا کر رہ گیا۔

''وہ ایک کمینہ اور جھوٹا انسان ہے، بہت حرام مال اکٹھا کر رکھا ہے۔'' تقی نے زہر خند لہجے میں کہا۔''اب جانتے ہو اس کے ارادے کیا ہیں؟'' اس نے پھیرتے ہوئے شام کی طرف دیکھا۔

''کیا؟'' شام بے چین سا ہوا۔

''وہ ہماری فیکٹری کے بالمقابل اپنا گوڈا اسٹور بنانے والا ہے۔'' تقی کے انکشاف نے شام کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔وہ جتنا بھی حیران ہوتا کم تھا۔اپنے باپ کے جھوٹ اور غلط بیانی پر اسے بہت غصہ آیا تھا۔

''یعنی وہ صوفی صالح کے مقابل آکر انہیں چیلنج کر رہا ہے، وہ اپنا بدلہ لے رہا ہے۔'' تقی نے پیشانی مسلتے ہوئے بتایا۔

''بدلہ کیسا؟'' شام ناسمجھی سے تقی کو دیکھتا رہ گیا۔اس کے دل اندر پکڑ دھکڑ ہونے لگی تھی۔

''بہت سال پہلے جب اس نے تمہاری ماں کو ایک امیر ٹھیکیدار کے ہاتھ بیچ دیا تھا تب بابا نے اس پر مقدمہ چلوا کر اندر کروا دیا تھا۔وہ کئی سال جیل میں رہا، ذلیل ہوتا رہا۔بعد میں جیل سے نکل کر وہ پھر تمہاری ماں کے پاس چلا آیا۔اپنے دکھ، درد کی داستان سنا کر روٹھی بیوی کو منا کر گھر لے گیا۔پھر تم پیدا ہوئے، تمہاری ماں مر گئی۔منصور نے اپنی روایت دُہراتے ہوئے ایک بے اولاد جوڑے کو تمہیں فروخت کردیا تھا۔بابا اور دادی کو پتا چلا تو وہ تمہیں کسی طرح چھین کر لائے۔منصور کو پھر جیل کی ہوا کھانی پڑی تھی۔اس دفعہ بڑی تنگی کے بعد رہائی ملی۔بڑا خوار ہوا۔پھر عرصہ دراز

تک یہ عفریت ہمارا پیچھا چھوڑ گیا۔ اب پھر سے پرانی ریت دُہرا رہا ہے۔ کوئی تگڑی آسامی ٹکرا گئی ہے اسے..... اب ''وار'' کا طریقہ مختلف ڈھونڈ رہا ہے..... اس دن فیکٹری میں میرے ہاتھوں پٹ کر بھوکے شیر کی طرح غرّاتا رہا تھا۔ مجھے فکر ہے وہ تمہیں یا کسی..... اور کو نقصان نہ پہنچا دے۔ تمہیں محتاط رہنا ہوگا۔'' تقی نے بہت سال پرانی داستان دُہرا کر شام کو پھر سے ریزہ، ریزہ کر دیا تھا۔ اس کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔ شام کا باپ اس کے لیے باعثِ ندامت تھا۔ اس نے سیکڑوں مرتبہ یہ قصہ مختلف راویوں سے سن رکھا تھا۔ پھر بھی ہر دفعہ تکلیف کا ذائقہ الگ محسوس ہوتا تھا۔ شام نے ماں نہیں دیکھی تھی لیکن ماں پر گزرے غم اور اذیتیں اسے بہت تکلیف دیتے تھے۔ خالہ نے یہ قصہ کبھی بھولنے نہیں دیا تھا۔ وہ چاہتا بھی تو کبھی بھلا نہ پاتا۔ بچپن سے لڑکپن اور پھر جوانی تک خالہ اس کی ماں پر گزرنے والے صدمات کی دردناک داستان سنا سنا کر اپنے احسان ضرور جتاتی تھیں۔ کس طرح وہ شام کی امی کو مہینے بھر کا راشن بھجواتی تھیں، گرمیوں، سردیوں کے کپڑے دلواتی تھیں۔ جب بھی جاتیں ڈھیروں روپے دے کر آتیں۔ منصور شروع سے نکما اور ہڈحرام تھا۔ صورت شکل ایسی بے مثال لیکن کرتوت ساحروں کے بداعمال جیسے بھیانک.....

شام کی ماں کا پیدائشی ایک پاؤں ذرا سا نقص والا تھا۔ اسی وجہ سے کوئی اچھا رشتہ نہیں ملتا تھا، منصور کا رشتہ آیا تو سب ہی حیران رہ گئے تھے۔ منصور بہت خوش شکل تھا اور تب وہ کسی آڑھتی کے ساتھ کام کرتا تھا۔ یعنی برسرِ روزگار تھا۔ شادی کے بعد منصور کے اصل جوہر کھل کر سامنے آئے تھے۔ وہ بڑا ہی ہڈحرام تھا، ایک جگہ ٹک کر کام نہیں کرتا تھا۔ ہر دو مہینے بعد نوکری کو ٹھوکر مار آتا۔ عیاشی میں اس کی مثال نہیں ملتی تھی۔ بندے، بندے سے قرض پکڑ رکھا تھا۔ گلی، گلی میں منصور کے ادھار کھاتے کھلے ہوئے تھے۔ مکان بھی کرایے کا تھا۔ اور منصور کو آوارہ گردی سے فرصت نہیں تھی۔ سینما جانا، فلمیں دیکھنا، سٹہ بازی، جوا، اچھا کھانا بہترین پہننا، اس کی زندگی کا حاصل حصول بس یہی تھا۔

شام کی ماں رابعہ بڑے صبر کے ساتھ حالات کی چکی میں پس رہی تھی۔ میکے کے نام پر ایک بہن تھی۔ جسے اپنے دکھوں کا حال سنا کر دل ہلکا کیے رکھتی۔ منصور کی بدفطرتی کا کوئی انت نہیں تھا..... وہ رابعہ کو مارتا، پیٹتا، سلائی کر کر کے جمع کیے اس کے پیسے چھینتا اور آٹھ، آٹھ دن گھر کی خبر نہ رکھتا۔ حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے پھر ایک دن قرض دینے والوں نے گھر کی دہلیز پکڑ لی۔ منصور کی دُھنائی کی۔ مار سے بچنے کے لیے منصور نے ٹھیکیدار سے مک مکا کر لیا اور رابعہ کو فروخت کر دیا..... بعد ازاں تاج بیگم اور صوفی صالح کو خبر ہوئی۔ انہوں نے منصور کو وہ مزہ چکھایا کہ جیل میں کئی سال سڑتا رہا۔ رہائی کے بعد جب کسی نے گھاس نہ ڈالی تو پھر رابعہ کی دہلیز چاٹنے پہنچ گیا۔ رو دھو کر دعا تلافی کے بعد دوبارہ شیخوپورہ لے گیا۔ وہیں شام کی پیدائش ہوئی۔ رابعہ خون کی کمی کے باعث چل بسی..... منصور پر شام کے وجود کی وجہ سے مصیبت آ ٹوٹی تھی۔ اتنا چھوٹا بچہ سنبھالنا مشکل تھا۔ اوپر سے بچے کے اخراجات، دودھ، دلیہ، دوائی دارو، رات، رات بھر جاگنے کی ذلالت الگ..... منصور نے بہت بچار کے بعد شام کو ایک بے اولاد جوڑے کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ تاج بیگم کو اطلاع ملی تو انہوں نے شیخوپورہ جا کر منصور کا جینا محال کر دیا تھا۔ صوفی صالح نے منصور پر کیس کر دیا۔ بچہ بڑی مشقتوں کے بعد واپس ملا۔ اور تاج بیگم بہن کی اکلوتی نشانی کو سینے سے لگا کر واپس پنڈی لے آئی تھیں۔ یہاں آ کر انہوں نے بچہ اپنی بہو طاہرہ کی گود میں ڈال دیا۔ بڑا صابر اور خاموش طبع بچہ تھا۔ طاہرہ کو کبھی تنگ نہ کیا..... اور ان کے بچوں میں ہی کھیل کود کر جوان ہو گیا۔ طاہرہ کو شام سے حقیقی محبت تھی۔ شام کو اپنے بیٹوں سے بڑھ کر چاہتی تھیں۔ انہوں نے اس کی پرورش بڑی محبت اور بغیر صلے کی امید رکھے کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شام اپنی سگی خالہ سے زیادہ طاہرہ سے قریب تھا۔ صوفی صالح اور ان کے بیٹوں کی بہت عزت کرتا تھا۔ اور کبھی اپنی طرف سے انہیں تکلیف دینے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ صوفی صالح نے شام کو بڑے ناز و نعم سے پالا تھا۔ اپنے بیٹوں اور شام میں کبھی تفریق نہیں کی تھی۔

اپنے تئیں شام نے کبھی صوفی صالح کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ پھر بھی شام کا بے غیرت باپ پچھلے کئی سالوں سے وقتاً فوقتاً انہیں ٹارچر کرنے پہنچ جاتا تھا۔ کبھی اسے پیسوں کی ضرورت ہوتی اور کبھی نوکری کی۔ پھر جب سے منصور کو شام کی جاب کا پتا چلا تھا وہ اس کی جان نہیں چھوڑتا تھا۔ کبھی فون کر کے پیسے مانگتا، کبھی صوفی صالح سے لے جاتا۔ اب کچھ عرصے سے وہ اپنے خود ساختہ دکھوں کی کہانیاں اٹھا کر شام کو سنانے پہنچ جاتا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا..... شام کو اپنے باپ کی مدد کرنا ہی پڑتی تھی۔ جیسا بھی تھا... برا یا اچھا؟ شام کا باپ تو تھا..... وہ منصور کو پسند نہیں کرتا تھا مگر منصور کے ساتھ صلہ رحمی ضرور کرتا تھا۔

اور اب تقی بتا رہا تھا۔ اس کا غریب، بھوکا، مفلس اور کنگلا باپ اتنی مہنگی پراپرٹی خرید چکا ہے۔ شام کے دماغ کی شریانیں گرم ہو رہی تھیں۔ اسے اپنے باپ کی غلط بیانی اور دھوکا دہی پر شدید غصہ تھا۔ وہ بڑے کتب خانے سے نکل کر گیلری میں سے گزر رہا تھا۔ جب لکڑی کے زینے پر عمامہ کھڑی دکھائی دی۔

اسے سر جھکائے گزرتے دیکھ کر وہ دھڑ دھڑ سیڑھیاں اتر کر آئی۔ پھر پھولی سانسوں سمیت شام کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ قدرے چونک کر رک گیا تھا۔ پھر عمامہ کے پھولے چہرے کی طرف دیکھ کر اسے کچھ یاد آیا۔

''تم سے ہرگمان کی توقع فضول ہے۔'' وہ خفا، خفا سی اپنے کرلی بالوں کی لٹ کو انگلی پر لپیٹ کر بولی۔

''تمہیں تو اتنی بھی خبر نہیں.....'' اس نے تیکھے چتون سے شام کو گھور کر بات جاری رکھنی چاہی تھی۔ جب شام نے بیچ میں سے فقرہ اچک لیا۔

''کوئی روٹھا ہو تو اسے مناتے کیسے ہیں؟ ہے ناں.....؟'' شام کو سابقہ تلخ موڈ بھلا کر ذرا مسکرانا ہی پڑا تھا۔ آخر سامنے عمامہ کھڑی تھی۔ اس سے حد درجہ خفا اور ناراض.....

''ہونہہ.....'' عمامہ نے بسور کر کہا۔ ''تم کیا جانو.....''

''میں نے ''ناراضیات'' پر ریسرچ نہیں کی عمامہ.....'' وہ بمشکل مسکراہٹ چھپا کر بولا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے منصور، اس کے فراڈ، جھوٹ سب ذہن سے محو ہو گئے تھے۔

''کاش اسی پر کر لیتے۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''میں تم سے ناراض ہوں شام! تمہیں مجھے منانا ہوگا۔'' اس کا انداز صاف دھمکانے والا تھا۔ گویا بتا رہی تھی نہ منا کر جاؤ گے کہاں؟

''تم کیسے مان سکتی ہو عمامہ! مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' وہ نچلا لب دانتوں تلے دبا کر مسکرایا۔

''یہ تو تم سوچو پاگل۔'' عمامہ ذرا بھنائی..... اب اندر سے وہ خوش ہو رہی تھی۔ گویا شام اسے منانے والا تھا۔

''مجھے ایسا کوئی تجربہ نہیں۔'' اس نے لاچاری کا عظیم الشان مظاہرہ کیا۔

''تو ابھی کر لو۔'' عمامہ نے گھور کر کہا۔

''پر کیسے؟'' شام کی بے بسی بھی کمال کی تھی۔ عمامہ کو بری طرح تاؤ آیا۔

''کیا یہ بھی میں بتاؤں؟'' وہ بھنائی۔

''ہاں، ناں تھوڑا گائڈ کر دو..... پھر میں ریہرسل کروں گا بعد میں تمہیں مناؤں گا۔'' اس کی آنکھیں مسکراتی رہیں۔ عمامہ سمجھے بغیر موڈ آف کیے کھڑی رہی۔ گویا شام کی بے بسی پر سخت غصہ کھا رہی تھی۔ ''کوئی اتنا بھی ڈفر ہوتا ہے؟'' عمامہ کو اپنی قسمت پر رونا آ گیا۔

''اس احمق کو تو کچھ بھی نہیں آتا۔ محبت کرنا، نہ محبت نبھانا، نہ منانا..... اور نہ ہی ڈھنگ سے محبت، جذبات، احساسات سے چھٹکارا پانا۔''

''پاگل! محبت سے کون چھٹکارا پانا چاہتا ہے.....؟'' اس کا ایک، ایک تاثر پڑھتا، غور کرتا، سمجھتا وہ دھیمی آواز

میں بولا تھا۔ پھر بھی عمامہ نے سن لیا۔ وہ حیران رہ گئی تھی۔ بھلا شام نے کیسے اس کی سوچ کو پڑھا؟

''میں نے تمہیں ''حفظ'' کر رکھا ہے عمامہ! تمہارا اگلا، پچھلا نصاب سب مجھے زبانی یاد ہے..... میں تمہیں بتاؤں تو حیران رہ جاؤ، یا تم جی نہ سکو یا تم میری محبت کی شدت کو سہہ نہ سکو..... یہ جو میرے دل کی کتاب ہے..... اس کا لفظ، لفظ سوال ہے..... یہ تیرے ''غم'' سے نڈھال ہے، سو میرا جینا محال ہے.....'' وہ پلکیں جھکائے کسی اور جہان میں گم ہو گیا تھا۔ عمامہ کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔ شام بتاتا یا نہ بتاتا..... عمامہ تو جانتی تھی۔ سفرِ عشق میں وہ تنہا... تو کہیں نہیں..... کوئی تو ہے جو اس کا ہم سفر ہے۔

''شام! تم..... تم ہمارے ہو ناں.....؟'' عمامہ نے بے خیالی میں کہا تھا۔ وہ ''میرے'' کہتے، کہتے جھجک کر رک گئی تھی۔

''ہاں، ناں تمہارا۔'' اس کی آواز بوجھل ہو کر گم ہو گئی تھی۔ عمامہ کو بس ''ہاں'' کی سمجھ آئی۔ اس کے قناعت پسند دل کے لیے بس یہی احساس کافی تھا۔ وہ جیسے ہواؤں میں اڑنے لگی۔ شام اس کے چہرے پر پھیلی سرخی کو دیکھتا رہا۔ اس خوشی کو دیکھتا رہا جو عمامہ محسوس کر رہی تھی۔ بوند برابر لفظ کسی کو اتنا سرشار کر دیتے ہیں۔ شام کو پہلے معلوم نہیں تھا۔ وہ بے خود سا عمامہ کو دیکھتا رہا۔

''کیا اب بھی ناراض ہو؟'' اس نے بے خیالی میں پوچھا۔

''نہیں..... کبھی نہیں، عمامہ تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی شام۔'' وہ نرمی سے مسکرائی تھی۔ شام کو لگا کسی گلاب کی کلی نے اپنی خوشبو بکھیر دی ہو۔ کہیں سبز گھاس پر شبنم اتر آئی ہو، کسی بادل کی اوٹ سے سورج نکل آیا ہو، کسی شام کو سویرل گئی ہو۔

''اور شام بھی تم سے کبھی خفا نہیں ہو سکتا عمامہ.....!'' اس نے نرمی سے گل بابونہ کے حسن کو محسوس کیا۔ وہ اپنے دل میں ایک لہر اٹھتی محسوس کر رہا تھا۔ عمامہ سامنے کھڑی مسکراتی رہی۔ معاً لاؤنج سے ہلکی آواز ابھری تھی۔ عمامہ بھاگ کر لکڑی کا زینہ چڑھنے لگی۔ اس کے کمر پر جھولتے گھنگرالے بالوں کے گچھے دلفریب ارتعاش کے ساتھ خم کھا رہے تھے۔ لہراتے جا رہے تھے، شام دیکھتا رہا، دیکھتا رہا، وہ آخری سیڑھی پر جا کھڑی ہوئی تھی۔ پھر کارنر والے کمرے میں جا گھسی۔ دروازہ تھوڑا سا کھول کر اس نے منجمد کھڑے شام کو احساس دلایا تھا۔ ''دادی'' اس کا اشارہ پیچھے کی طرف تھا۔ شام گہری سانس کھینچتا عمامہ کو دیکھتا پیچھے کی طرف پلٹ گیا۔ ابھی وہ عمامہ کو منع کرنا چاہتا تھا اگر دوبارہ منصور کی کال آئے تو کبھی اس کا فون نہ سنے..... تاہم خالہ کی آواز پر واپس مڑ گیا تھا۔ وہ تخت پر لیٹی تھیں شام کو دیکھ کر اٹھ گئیں..... آنکھوں میں محبت امڈ، امڈ آئی تھی۔ کچی نیند کا غم بھی جاتا رہا۔

''میں نے سمجھا عمامہ ہے، دھڑ دھڑ کی آواز آ رہی تھی۔ جیسے زینہ چڑھتی ہو، کم بخت کو دوپہر، شام چین نہیں..... بے چین روح، گرمیوں میں سوتی ہے نہ سردیوں میں..... بندہ دوپہر کو آرام تو کرے.....'' وہ بولتی ہوئی اٹھ گئی تھیں۔ پھر شام کو اشارے سے اپنے قریب بٹھا لیا۔

''یہ سردی کی دوپہر ہے خالہ! یوں آتی ہے، یوں چلی جاتی ہے، بس اس گھر کی خواتین کو آرام کا چسکا ہے۔'' وہ مسکرا کر صوفے پر نیم دراز سا ہو گیا..... دادی نے فوراً تائید کی۔

''خوب کہا..... طاہرہ کی بہوؤں کو سرما گرما سونے کا سودا ہے۔ اِدھر ظہر کی اذان ہوئی، اُدھر یہ سب کمروں میں بند عصر سے پہلے نہیں اٹھتیں۔'' دادی نے جلے دل سے کہا تھا۔ ''سر چڑھی ہیں ساری کی ساری.....'' وہ سب سے بیزار تھیں۔

''شمسہ اور صباحت بھابی بہت اچھی ہیں خالہ۔'' شام کہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ دادی نے پھر سے پینترا بدل لیا تھا۔

''ہاں..... ہاں ٹھیک ہیں بس۔'' وہ عینک تلاش کر کے آنکھوں پر لگا چکی تھیں۔ پھر شام کا چہرہ بغور دیکھنے لگیں۔ وہ ان کی نگاہوں سے نظر چرانے لگا تھا۔

''کیسی بدشگونی ہوگئی میری جان.....'' دادی نے بے ساختہ ہاتھ ملے تھے۔ شام چونک گیا۔ جیسے ان کی بات سمجھنا چاہتا ہو۔ ''فرخ کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ سارے ارمان دھرے رہ گئے۔'' انہوں نے بڑی دلگرفتگی سے کہا تھا۔ شام جز بز سا ہو گیا۔

''اچھا ہوا۔'' اس نے بڑبڑا کر کہا۔ پھر میز سے پرانا اخبار پکڑ کر دیکھنے لگا۔ گویا اس ٹاپک پر مزید بات سننا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن دادی کو آج موقع ملا تھا..... وہ اسے گنوانے سے تو رہیں۔

''اس عمامہ کو ذرا پروا نہیں..... ہونے والا شوہر اسپتال میں پڑا ہے۔ یہ پڑھائیوں میں لگ گئی، فیقہ بیچاری تو صدمے سے کملا کر رہ گئی ہے۔'' دادی نے لگے ہاتھوں عمامہ کی غائبانہ گرد جھاڑ کر فیقہ کی غمزدگی بھی باور کروادی تھی۔ گویا فیقہ شادی ٹوٹنے بلکہ رکنے پر اپ سیٹ تھی۔ شام نے پہلو سا بدلا تھا۔ گویا اپنی بے چینی چھپانی چاہی ہو، فیقہ کا ذکر اسے ڈسٹرب کر دیتا تھا۔ شادی اسٹارٹ ہونے سے لے کر رکنے تک ایک دن بھی اس نے دانستہ یا غیر دانستہ فیقہ کو نہیں سوچا تھا۔ جیسے شادی بھی کسی اور کی ہو رہی تھی۔ اور رکی بھی کسی اور کی تھی..... نہ شادی ہونے کی خوشی تھی نہ رکنے کا غم تھا۔ اس کے سر سے تو بلا ٹل گئی تھی۔ یہی حال عمامہ کا تھا..... اب دادی کو کون سمجھاتا؟

''ایک دن بھی عمامہ نے ساس کو فون نہیں کیا۔ جانا تو اُدھر ہے آخر، خود ہی نپٹ لے گی قدسیہ۔'' دادی نے تخت کے نیچے سے پاندان نکالا..... اچھی طرح تانک جھانک کر پونگی پھل دریافت کیا۔ قوفل، سپاری، چھالیا یا پونگی پھل..... شام کو کچھ بھی پسند نہیں تھا، دادی کی آفر پر اس نے برا سا منہ بنایا۔

''میں ایک بات بتادوں.....'' دادی نے اس کی ''بیزاریت'' محسوس کر لی تھی۔ وہ جواٹھنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ پھر سے بیٹھ گیا۔

''یا اللہ خیر.....!'' وہ زیر لب دہل کر بڑبڑایا۔

''صالح سے میں نے کہہ دیا ہے، عمامہ کو چاہے سال بعد بیاہے یا دو سال بعد..... یہ اس کی دردِ سری ہے، ویسے بھی فرخ چلنے پھرنے کے قابل ہوگا بھی شادی کا معاملہ نپٹے گا۔ ابھی اس کا لمبا علاج ہے، عمامہ کے نصیب..... بہر حال میں تین مہینے سے اوپر ایک دن بھی انتظار نہیں کروں گی۔ تم اپنا ذہن تیار کر لو..... پورے تین مہینے بعد تمہاری فیقہ سے شادی ہوگی۔ بہت دھوم دھام سے کروں گی، زمانہ دیکھے گا۔'' وہ بڑی محبت کے ساتھ دھیرے، دھیرے شام کے ''حواس'' گم کر رہی تھیں۔ وہ آنکھیں کھولے ''خالہ'' کی تفصیلات سنتا رہا۔

☆☆☆

چھٹی کا دن بڑے اہتمام سے طلوع ہوتا تھا۔ صوفی صالح کی تین منزلہ وسیع و عریض کوٹھی کے اندرونی حصے کی چاروں جانب صحن میں کھلنے والی گیلری کے جالی دار دروازوں میں چہل پہل معمول سے ہٹ کر ہوتی۔ بڑی خوب صورت لوکیشن پر یہ گھر تھا۔ ڈیزائن بھی بہت اچھا تھا۔ کھلا اور ہوادار گھر تھا۔ چاروں جانب طویل کاریڈور تھے۔ ہر کاریڈور کے سرے پر ایک جالی دار دروازہ تھا اور اس سے آگے چاروں جانب بیرونی برآمدے۔

اور اس وقت ہر گیلری میں گرم، گرم گلگلوں کی خوشبو اُڑتی پھر رہی تھی۔

روا (سوجی) اور کھانڈ گھول کر دیسی گھی میں تلے ہوئے گلگلے اماں بہت اہتمام سے بناتی تھیں۔ اتنے نرم، خستہ، میٹھے اور خوشبودار..... گرم، گرم الائچی والی بھاپ اڑاتی چائے، بھوک نہ بھی ہوتی تو چمک اٹھتی۔ جیسے عمامہ کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی دھڑ، دھڑ لکڑی کا زینہ اتر کر نیچے آئی تھی۔ گیلری میں پہنچ کر باہر برآمدے کی

طرف بھاگی تھی۔ حسبِ معمول صحن میں رونق لگی تھی۔ چھٹی والے دن کے علاوہ ایسی رونق کا سوال ہی نہیں تھا۔ آج ساری بھابیاں اور سارے بھائی گھر پر دکھائی دے رہے تھے۔ حتیٰ کہ حاشر اور حاذق بھی۔ اماں کے ہاتھ سے بنے نرم، نرم میٹھے گلگلے چائے کے ساتھ اڑائے جا رہے تھے۔ عمامہ نے کچی آنکھوں سے باہر دیکھا۔ سنہری دھوپ آنکھوں میں گھسنے لگی تھی۔ اس نے بے ساختہ ماتھے پر ہاتھوں کا چھجا بنالیا۔ اب برآمدے اور صحن کا منظر تھوڑا واضح ہوا تھا۔ بڑے بھائی ہاتھ ہلا، ہلا کر سیاست پر گفتگو فرما رہے تھے۔ چھوٹے دونوں تازہ، تازہ سیاحت کے مزے لے کر لوٹے تھے ان کے پاس اپنے قصے بہت تھے جو ایک دوسرے کو سنا، سنا کر خود ہی لطف اندوز ہو رہے تھے کیونکہ تقی، طاہر اور شام کو ان کی ''آوارہ گردی'' سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کے اپنے ''دکھ'' بہت تھے جن پر تعزیتی تبصرے ہو رہے تھے۔ بھابیاں بچوں کو کھلانے میں ہلکان ہو رہی تھیں۔ شمسہ اور صباحت چھوٹی دیورانیوں کا ایک، ایک پیس اٹھا کر انہیں بہلا رہی تھیں۔ یہ ان دونوں کی بڑی پیاری عادت تھی۔ وہ دیورانیوں کے بچوں سے بہت پیار کرتی تھیں۔ صباحت کے بچے زندہ نہیں بچتے تھے جبکہ شمسہ بے اولاد تھیں۔ سو دونوں دیوروں کے بچوں سے دل بہلا لیتی تھیں۔ سدا کی صابر شاکر یہ دونوں بھابیاں عمامہ کی ''جان'' تھیں۔

عمامہ نے گردن گھما کر دیکھا۔ سیڑھی کے آخری قدمچے پر شام بیٹھا طاہر کی بات بہت غور سے سن رہا تھا۔ اس نے سیاہ پوستین پہن رکھی تھی۔ چمڑے کی بالدار پوشاک جو نہایت گرم اور نرم تھی۔ تقی بھائی، شام کے لیے دبئی سے لایا تھا اور اس پر بہت سجتی بھی تھی۔ رنگت نکھر کر دمکنے لگتی۔ کالا رنگ جیسے شام کے لیے بنا تھا۔ اس کی گوری رنگت پر بہت اچھا لگتا۔

عمامہ آنکھیں میچے وہیں موڑھے پر بیٹھ گئی۔ طاہر کی اچانک عمامہ پر نگاہ پڑی تھی۔

''اوآئے جے.....'' اس کا انداز بڑا دھچکا پہنچانے والا تھا۔ عمامہ بھونچکی ہوئی۔

''جناں ڈھاکے بم چلائے جے۔'' تقی نے ٹکڑا لگایا تھا پھر مسکرا کر ہونق بنی عمامہ کو دیکھتا رہا جو اُن کی ''بکواس'' سمجھنے سے قاصر تھی۔

''لگ گیا پتا عمامہ تمہاری ویلیو کا۔'' تقی نے جلے دل کا پھپھولا پھوڑا تھا۔ عمامہ کے ہونق پن میں اضافہ ہوا تھا۔ وہ حیرت سے دیکھتی رہی۔ بات اب بھی کچھ پلے نہیں پڑی تھی۔

''ویلیو نہیں، اوقات کہو۔ یہ اوقات ہے تمہاری سونیا کی نگاہ میں۔'' طاہر نے کلس کر کہا۔ عمامہ کی آنکھیں کھل گئیں۔

''کیا مطلب؟ سونیا کو کیا ہوا؟'' عمامہ پریشان ہوئی تھی۔ بھائیوں کے ''طنز'' سمجھ سے بالاتر تھے۔ اتنا تو وہ جان گئی تھی۔ دونوں بھائی بھگو، بھگو کر مار رہے تھے۔

''سونیا کو کیا ہونا ہے؟ ہٹی کٹی ہوگی۔ ہوا تو ہمیں ہے۔ بُھرکس نکال دیا ہمارا۔'' طاہر سرد آہ بھر کر بولا تھا۔

عمامہ الجھ گئی۔

''بتا بھی چکو، پہیلیاں کیوں بجھواتے ہو۔'' اس نے اکتا کر کہا۔ شام مسکرا کر ان کی تکرار انجوائے کر رہا تھا۔

''بڑی سفارش کروائی تھی تم سے۔ پکڑ کے مقدمہ ہروا دیا۔'' تقی نے سنجیدگی کی انتہا کر دی تھی۔ عمامہ کو کچھ، کچھ بات سمجھ میں آ گئی۔

''میں نے کب سفارش کروائی؟ تم نے کہا تھا کیا مجھے طاہر بھائی؟'' اس نے طاہر کا بازو دبوچ کر پوچھا۔ وہ گڑبڑا کر چونکا۔

''کہا تو تھا۔'' وہ جز بز سا ہوا۔

''جھوٹ تو نہ بولو۔ صرف بات کی تھی۔ سفارش کا نہیں بولا تھا۔ سونی کا کیا قصور؟'' اس نے خفگی سے جتلایا تھا۔ اب طاہر آئیں، بائیں کرنے لگا۔ تقی کی گھوریوں سے بچنا جو تھا۔

''مجھے تو تاریخ کا بھی نہیں بتایا۔ ورنہ سونیا سے کہہ کر سفارش کرواتی۔'' عمامہ سنجیدی سے گویا ہوئی تھی پھر اچانک خیال آیا۔

''تو کیا مقدمہ ہار گئے؟'' اس نے حیرت سے چیخ کر پوچھا۔

''جی ہاں، بدنصیبی سے، بڑی چوٹی کی وکیل کر رکھی تھی جناب طاہر صحبانی نے..... پہلی پیشی پر مقدمہ ہار گئی۔'' تقی بھنا تا رہا۔ مقدمہ ہارنے کا دکھ تو تھا ہی۔ زیادہ غصہ یہ تھا کہ پلاٹ منصور نے خرید لیا ہے۔ اب بس نہیں چل رہا تھا کہ منصور کی گردن مروڑ کر زبردستی اس سے پلاٹ کے مالکانہ حقوق حاصل کرتے۔

''وکیل تو بڑی اچھی تھی۔ سلیم ہمدانی کی بیٹی۔ جانے کیا ہوا؟ ہماری قسمت خراب تھی۔'' طاہر سے بات نہ بن پڑی تھی۔ پھر جو اس نے وکیل صاحبہ کی جھوٹی سچی تعریفوں میں زمین آسمان ایک کیے عمامہ کے ساتھ، ساتھ تقی کا بھی ماتھا ٹھنکا تھا۔

''طاہر صحبانی! خیر تو ہے میرے لال، مقدمہ تو ہروا چکے ہو، کہیں دل بھی تو ہار نہیں آئے؟'' تقی نے بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا تھا۔ طاہر لال ٹماٹر بن گیا۔ اب تو شام اور تقی دونوں نے اس کا ریکارڈ لگا دیا تھا۔

''پیشی پر کون گیا تھا؟'' عمامہ نے چونک کر پوچھا۔

''مابدولت۔'' طاہر نے پھنسی، پھنسی آواز میں کہا۔

''او..... ہو۔'' عمامہ ہونٹ سکیڑ کر رہ گئی تھی۔ تقی نے بھنا کر طاہر کو جھانپڑ رسید کیا۔

''مقدمہ کبھی نہ ہارا جاتا اگر یہ منحوس نہ جاتا۔ مجھے سو فیصد یقین ہے یہ وکیل صاحبہ کو اور وکیل صاحب اسی کو ٹکر، ٹکر دیکھتی رہی ہوں گی۔ مقدمے کا بیڑا غرق تو ہونا تھا۔'' تقی کا دکھ کم نہیں ہو رہا تھا۔

''تم بھی جاتے تو یہی کچھ ہونا تھا۔'' طاہر نے بھنا کر کہا۔ ''سارا قصور عمامہ کا ہے۔ اس نے سفارش نہیں کی تھی۔'' اس نے پھر سے عمامہ پر ملبہ گرانا چاہا۔ وہ ہونق سی اسے دیکھتی رہی تھی۔

''سونیا کی بہن کو ''لامہ'' دے کر آؤ۔'' اب وہ عمامہ کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ عمامہ چونکی پھر بھنائی تھی۔

''حد ہو گئی۔ ایک مقدمہ ہی تھا ناں کوئی ''دل'' تھوڑی تھا۔'' اس نے بے تکی بات کی۔ شام نے بے ساختہ اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔ عمامہ سے ایسی سمجھ داری کی امید تھی۔

''دل بھی تھا۔'' طاہر زیر لب بڑبڑایا۔ اب کے تقی نے طاہر کو دھموکا جڑا تھا۔

''یعنی مقدمہ بھی ہارا اور دل بھی۔'' عمامہ نے وضاحت چاہی۔ شام نے پھر سے ''لاحول'' پڑھا تھا۔ عمامہ کا تو دماغ چل گیا تھا۔ بھائیوں سے ایسی باتیں؟ شام کو شرم آتی رہی۔

''جی..... ی ی ی.....'' طاہر نے کراہ کر کہا۔ تقی نے ایک گرم گلگلا اس کے منہ میں ٹھونس دیا تھا۔ طاہر چیختا رہ گیا۔ سارے اس چیخ و پکار پر متوجہ ہو گئے تھے۔

''کیا ہوا؟'' بڑے بھائی سیاست بھول کر پریشان ہوئے۔

''جل گیا۔'' طاہر بمشکل بولا۔

''کیا جل گیا؟'' سب کی آنکھوں میں تفکر تھا۔

''دل۔'' تقی نے غصے سے کہا اور ایک مزید گرم، گرم گلگلا طاہر کے منہ میں بطور سزا کے ٹھونس دیا۔

''جی نہیں، منہ۔'' طاہر پھنسی، پھنسی آواز میں چیخا تھا۔ تقی اسے ایک دھموکا جڑ کر اٹھ گیا جبکہ طاہر بھنا تا رہا تھا۔ عمامہ اور شام ہنس رہے تھے۔ باقی سب انہیں یوں دیکھ رہے تھے جیسے ان کے دماغ اپنی، اپنی جگہ سے کھسک گئے تھے۔ فیقہ نے جالی دار کھڑکی سے ناک چپکا کر دیکھا اور غصے سے کھڑکی کے پٹ بند کر دیے۔ عمامہ اور شام کو ہنستا دیکھنا محال تھا۔

(جاری ہے)

''شمع..... شمع..... شمع اٹھ جا کام پر نہیں جانا کیا؟'' ستارہ بولی۔

''مجھے کہیں نہیں جانا..... سمجھی کہ نہیں۔''

''کیا فرق پڑتا ہے ان سب باتوں سے؟''

''کیوں فرق نہیں پڑتا۔ بہت فرق پڑتا ہے۔''

''یہی ہماری پہچان ہے۔''

''کوئی پہچان نہیں ہے ہماری سمجھ آئی۔ ہم جیسوں کی کوئی پہچان نہیں ہوتی اس معاشرے میں۔''

''ارے کیوں دل جلاتی ہے صبح صبح، چل ری اٹھ ناشتا کر۔'' یہ شبنم تھی جو تیار ہوتے ہوئے بولی۔

''میں نے کہہ دیا ناں مجھے کہیں نہیں جانا۔ تو جا شوق سے اور کر یہ ناچ گانا مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب۔''

''ہائے اللہ کیا کہا تو نے۔'' ستارہ بولی۔ ''اگر یہ ناچ گانا نہ کرے گی تو کھائے گی کہاں سے اور جو اتنے مزے سے اس چھت کے نیچے سوتی ہے ناں کہاں سوئے گی؟ سڑک پر سونا بھول گئی کیا؟''

''میں کوئی اور عزت دار کام ڈھونڈوں گی اور عزت کی روٹی کھاؤں گی۔''

''ہاہاہا..... کیا پگلا گئی ہے جو ایسی باتیں کر رہی ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجا

ہمت کرے انسان.....

عقیلہ اکبر

کراس کا دل جلایا۔ ''چل اٹھ ناشتا کر اور اچھا سا تیار ہو جا اور سن نئے گھنگرو آئے ہیں وہ بھی پہن لیو، آج ملک صاحب کے گھر جانا ہے۔ وہاں سے بلاوا آیا ہے۔ باجی نے کہا ہے خوب جم کر ناچنا ہے بڑا پیسہ ملے گا چل جلدی اٹھ.....''

وہ اپنی بے بسی پر رونے لگی۔

''کیا یہی ہے ہم جیسوں کی زندگی؟ کیا ہماری اپنی کوئی پہچان نہیں۔ پر اب بہت ہو گیا میں یہ سب نہیں کروں گی ہاں۔''

''چل شمع تیار ہو جا جلدی سے۔'' ایک دفعہ پھر ستارہ بولی۔

مگر وہ منہ لپیٹے پڑی رہی۔

''یہ کیا تو اب تک تیار نہیں ہوئی۔ یہ تو نے کیا لگا رکھا ہے، میں تو سوچ رہی تھی کہ تجھے ایسے ہی کوئی بھوت سوار ہو گیا ہو گا جو اب تک اتر چکا ہو گا پر تو، تو اب تک وہی بات لے کر بیٹھی ہوئی ہے۔ چل اٹھ شاباش، نہیں تو باجی کو پتا چل گیا ناں تو بہت غصہ ہوں گی۔'' پھر وہ چارو ناچار کھڑی ہوئی اور تیار ہو گئی۔

وہ ملک صاحب کے گھر پہنچیں تو آنکھیں چندھیا گئیں اوپر سے نیچے تک برقی قمقموں سے سجا ہوا تھا۔

''لگتا ہے آج بڑی محفل جمی ہے ملک صاحب کے۔'' یہ شبو تھی جو سرگوشی کر رہی تھی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اندر جائے پر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ شبو، شبنم اور ستارہ خوب دل بہلا رہی تھیں اور ساتھ تو وہ بھی دے رہی تھی ان کا مگر ست روی سے۔ پر کوئی تھا جو اسے دیکھ رہا تھا، اسے ٹٹول رہا تھا۔ اس کا دل گھبرانے لگا اور وہ سرکتے، سرکتے گھر کے پیچھے والے حصے میں جا کر بیٹھ گئی اور زور، زور سے اللہ سے شکوہ کرنے لگی۔

''یا اللہ تو نے کیوں ہمیں نامکمل بنایا ہے ہمیں تو ہمارے ماں باپ نے بھی نہ اپنایا، ہاں پیدا کر کے احسان ضرور کر دیا اور چھوڑ دیا اس بے رحم دنیا کی ٹھوکروں پر۔ یا اللہ ہم کیوں آئے اس دنیا میں جب ہماری اپنی کوئی پہچان نہیں..... لوگ تو ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہم بے بس لوگ پھر ان کے در پر پہنچ جاتے ہیں، کبھی شادی بیاہ میں تو کبھی کسی کے گھر ولادت پر۔ ہر کوئی ہمیں اس طرح کی محفلوں میں دل بہلانے کے لیے بلا لیتا ہے۔'' اس کا دل کٹ رہا تھا یکا یک اسے کندھے پر کوئی لمس محسوس ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو چونک گئی۔ ملک صاحب کی بیٹی کھڑی تھی۔ اس نے جلدی، جلدی اپنے آنسو صاف کیے اور اٹھ کر جانے لگی۔

''بہنے دو ان آنسوؤں کو مت روکو پر شکوہ مت کرو، شکوہ کرنا اللہ کو پسند نہیں۔ اللہ کے تو ہر کام میں حکمت ہے۔'' اس کے قدم چاہتے ہوئے بھی نہ بڑھ سکے۔

''میں کافی دیر سے تمہیں دیکھ رہی تھی۔ تم وہاں سے اِدھر آ گئیں، تمہارا وہاں دل نہیں لگ رہا تھا..... آخر کیوں؟''

''بس میرا دل گھبرا رہا تھا۔''

''پر میں نے تمہارے سارے شکوے سن لیے..... جب تم یہ سب کرنا نہیں چاہتیں تو کیوں کرتی ہو؟ مت کرو یہ سب۔ شکوہ انسان کو اللہ سے دور کر دیتا ہے۔ شکوہ تمہیں اللہ سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے کرنا چاہیے..... تم میں حوصلہ نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ نے تمہیں بھی ہماری طرح دو آنکھیں، دو ہاتھ، دو پیر اور ہماری ہی طرح عقل دی ہے اور پھر بھی شکوہ! پھر بھی شکوہ کہ تم اوروں کی طرح کیوں نہیں ہو۔ مانا کہ تم میں کچھ کمی ہے پر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم صرف اس کو وجہ بنا کر اور باقی نعمتوں کو نظر انداز کر دو۔ مانا کہ دنیا تمہیں غلط نظر سے دیکھتی ہے۔ تم پر ہنستی ہے..... پر تمہیں دنیا والوں سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔''

''آپ کو کیا پتا باجی، جس کے ماں باپ ہی گھر سے نکال دیں اسے یہ دنیا والے کیا جینے دیں گے۔ ہم پر طرح، طرح کے طعنے کسے جاتے ہیں۔ ہم جہاں عزت سے جینے کی کوشش کرتے ہیں وہیں سے ہمیں دھتکار دیا جاتا ہے ہم کریں تو کیا کریں؟''

''تم لوگ بہت کچھ کر سکتے ہو، تم خود کو بدل سکتے ہو اگر تم چاہو تو۔''

''پر کیسے؟'' شمع نے پوچھا۔ ''جہاں کہیں میں نوکری تلاش کرنے نکلتا ہوں تو لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں کہتے ہیں تم پر یہ کام نہیں جچتا۔ تم وہی کرو جو کرتے ہو، اس طرح کے جملوں سے مجھے چھیڑتے ہیں، آپ خود

بتائیں میں کیا کروں؟''

''میں جانتی ہوں یہ لوگ تمہیں کوئی کام نہیں کرنے دیں گے۔ تم بس اپنا کام کرو۔''

''اپنا کام۔''

''ہاں کوئی بھی اپنا کام جیسے کہ کوئی چائے کا ٹھیلا لگا لو۔ اس کام میں زیادہ خرچہ بھی نہیں ہے اور تم آرام سے کر بھی لو گے۔''

''ٹھیک ہے پر ایک مسئلہ ہے کہ مجھے ہماری باجی یہ کام کرنے نہیں دیں گی۔''

''اب یہ تمہارا مسئلہ ہے کہ تم کس طرح ہینڈل کرو گے۔ کل پانچ بجے تم میرے پاس آجانا ٹھیک۔''

''ہاں ٹھیک ہے'' پھر وہ وہاں سے چلی گئیں اور وہ سب واپس آگئے۔ ان کی اچھی کمائی ہوئی تھی۔ سب ہی بہت خوش تھیں پر شمع اپنی ہی سوچوں میں گم تھی کہ ان سب سے کیسے بات کرے۔ ساری رات گزر گئی اور وہ یہی سوچتی رہی کہ کیا بات کرے، کیسے شروع کرے، یہ سب اتنا آسان نہیں تھا پر اس نے بھی ٹھان لیا تھا کہ وہ سب کو صاف، صاف بتا دے گی۔ اگلی صبح جب شمع نے انہیں کام کا بتایا تو وہاں تو جیسے ہنگامہ کھڑا ہو گیا غداری کے الزام لگے۔ طرح، طرح کے الزام لگائے گئے۔ پر بھلا ہو باجی ستارہ کا جنہوں نے سب کو ٹھنڈا کیا اور اسے ایک موقع فراہم کرنے کا ارادہ کیا اور کہا کہ ''کر کے دیکھ لے اپنی مرضی، یہ دنیا والے تجھے واپس نہ ہماری دنیا میں بھیج دیں تو پھر مت رونا۔ جا تجھے آزاد کیا۔ پر یاد رکھنا یہ دروازے بند کر کے جا رہی ہے تو.....''

''ٹھیک ہے باجی ستارہ اللہ میری مدد کرے۔''

وہ ٹھیک پانچ بجے ملک صاحب کی بیٹی کے پاس پہنچا۔ باجی عائشہ اسے پہلے سیلون لے کر گئیں اس کے بال کٹوائے مزدوری والے کپڑے دلوائے اور تو اور نیا نام بھی رکھا۔ ''محمد علی'' اور کہا آج سے تمہارا یہی نام ہے اسے یہ سب بہت اچھا لگا۔ اسے لگا وہ کوئی نئی زندگی شروع کرنے والا ہے پر وہی ساتھ میں دنیا والوں کی فکر بھی ستانے لگی۔

باجی عائشہ نے اسے کچھ پیسے دیے اور چائے کا ٹھیلا لگانے کے لیے انتظام کروایا۔ کسی دکان والے سے بات کر کے اس کی دکان کے سامنے ٹھیلا لگوا کر دیا۔ سارے کام بہت اچھے سے ہو گئے۔

آج اس کا پہلا دن تھا وہ بہت خوش تھا۔ لوگوں کا انتظار کرتا رہا پر پورا دن گزر گیا اور کوئی چائے پینے نہیں آیا۔ اس کا دل بہت دکھا ساری چائے ضائع ہو گئی پر اس نے ہمت نہیں ہاری پھر دوسرے دن بھی یہی ہوا ... باجی عائشہ نے کہا علی ہمت نہ ہارنا، اس نے سوچا کیوں نہ چائے کے ساتھ، ساتھ بچوں کے کھانے کی کچھ چیزیں بھی رکھ لوں جیسے بسکٹ، ٹافیاں وغیرہ بچے ان چیزوں سے کشش حاصل کر کے ضرور خریدنے آئیں گے پر اس کے پاس تو اور پیسے نہیں تھے۔ باجی عائشہ نے اس کی یہ مشکل بھی حل کر دی اور کچھ اور پیسے دیے اور پھر وہی ہوا بچے جوق در جوق آتے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام چیزیں بک گئیں محمد علی (شمع) نے ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ کم از کم اسے آج رات بھوکا سونا نہیں پڑے گا اور پھر ایک دن اس کی چائے بھی بکنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا کاروبار چل پڑا۔ یہ سب دیکھ کر لوگ جو اس کا مذاق اڑاتے تھے آج وہی اس کی دکان کی چائے پی کر تعریف کرتے اور مزے، مزے سے چسکیاں بھرتے۔

ستارہ اور شبو نے یہ تبدیلی دیکھ کر اس کا ساتھ دینے کو کہا۔ اسے اور کیا چاہیے تھا ایک سے بھلے دو، دو سے بھلے تین اور اس کا یہ چھوٹا سا ٹھیلا ایک چھوٹے سے عرصے میں چھوٹا سا ہوٹل بن گیا۔ اب وہ سوچتا ہے تو بہت اطمینان محسوس ہوتا ہے سر اٹھا کر عزت سے روٹی کھانے میں جو مزہ ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔

''میں محمد علی ..... اللہ کے بعد باجی عائشہ کو ان سب کا ذمے دار ٹھہراتا ہوں اگر وہ مجھے ہمت نہ دلاتیں اور میری مدد نہ کرتیں تو وہ آج میں وہی سب کر رہا ہوتا جس کا... ذکر کرنا بھی اچھا نہیں سمجھتا تھا خیر..... برا وقت گزر گیا'' محمد علی نے یہ ثابت کر دیا کہ حوصلہ، لگن اور کسی کام کی جستجو انسان کی تقدیر بدل سکتی ہے چاہے وہ مرد ہو، عورت ہو یا اس کے جیسا ادھورا انسان۔ اس دنیا میں جینے کا حق ہر کسی کے پاس ہے کیونکہ ہم سب اللہ کی ہی مخلوق ہیں۔

آئیں تیاری کرلیں

راشدہ سعدیہ

''بیگم! تمہیں ایک بات معلوم ہے؟'' میاں جی نے چائے کا خالی کپ دیتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

''کون سی بات؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت عجیب بات ہے کہ ساری دنیا کو ''کورونا وائرس'' کی وجہ سے خوف کا سامنا ہے۔ جبکہ پاکستانی مردوں کو اس کے ساتھ مزید ایک خوف کا سامنا کرنا ہے۔'' میاں صاحب نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

''مجھے سمجھ نہیں آئی آپ کی بات۔'' میں نے ناسمجھی سے دوبارہ استفسار کیا۔

''سارے بیوٹی پارلرز بند ہوگئے۔ اب شوہر حضرات کو جن خوفناک حالات اور مصائب کا سامنا کرنا ہے۔ وہ بھی ''کورونا'' سے کم نہیں۔'' میاں صاحب نے تفصیل ذرا مسکراتے ہوئے سمجھائی۔

''پاکستانی مرد حضرات کو اتنا ڈرنے یا خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہم خواتین میک اپ کے حوالے سے اتنی تیاری تو لازمی رکھتے ہیں کہ ہنگامی صورتِ حال میں اپنے آپ کی حفاظت کرسکیں۔'' میں نے بھی چڑ کر جواب دیا۔

''اور جن خواتین کو ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنا نہ آتا ہو یا بالفاظ دیگر اپنی تیاری نہ کی ہو تو؟'' میاں

صاحب نے ایک اور سوال داغ دیا۔

''ایسی خواتین اور ان کے شوہر حضرات کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔'' میں نے مزید سوالات سے بچنے کے لیے جلدی سے جواب دے کر کچن کا رخ کیا۔

☆☆☆

''سنیں! کل سے نمازِ فجر کے بعد کوئی نہیں سوئے گا۔'' میں نے شام کی چائے پر شوہر صاحب سے کہا۔

''مگر کیوں؟ ایسا بھی کیا نیا کام پیش آ گیا؟'' میاں جی نے پوچھا۔

''پہلے آپ میری مکمل بات سن لیں پھر سوالات جاری کیجیے گا۔'' میں نے ان کے سوالات کی کثرت سے عاجز ہو کر کہا۔

''جی...جی فرمائیں۔ آج کل حکومت نے چھٹیاں بیویوں کی ہی سننے کے لیے تو دی ہیں۔ بے فکر ہو کر کہیے۔'' میاں جی پھر شرارتی انداز میں بولے۔

''دیکھیں..... جب آپ نے کہا بیوٹی پارلرز بند ہیں اور آپ خوفزدہ ہیں اور میں نے کہا ہماری تیاری تو ہے۔'' میں جملوں کو ربط دینے لگی۔

''تم اتنی سنجیدگی سے کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' اب کی بار میاں جی سنجیدہ دکھائی دیے۔

''اب میری بات مکمل ہونے سے پہلے آپ نے کچھ نہیں بولنا۔ دیکھیں، جب سے آپ نے سوال کیا ہے کہ جن خواتین کی تیاری نہ ہو تو؟ اس وقت سے میں پریشان ہو گئی ہوں۔ کیونکہ میک اپ یا دنیاوی امور کے حوالے سے حالات کا سامنا کرنے کی تیاری تو ہے مگر اچانک موت یا اللہ پاک کا سامنا کرنے کی تیاری تو نہیں ہے ناں ہماری؟'' میں نے فکرمندی سے کہا۔

''یہ اچھا موقع ہے کہ ہم پانچوں وقتوں کی نمازیں ادا کرنے کے ساتھ بالترتیب قرآن پاک کی تلاوت بھی کریں اور ان نمازوں کی قضائیں جو کسی بھی وجہ سے رہ گئی تھیں اور اب تک غفلت کی وجہ سے پڑھی نہیں جا سکیں اور'' میں ذرا سانس لینے کے لیے رکی۔

''اور.....؟'' میاں جی نے فوراً پوچھا۔

''اور یہ کہ پلیز آپ شرعی داڑھی رکھ لینے کا ابھی سے عہد کر لیں پلیز۔'' اس کے ساتھ، ساتھ کچھ اور نصیحتیں بھی میں نے انہیں فرما دیں۔

''دیکھو.....!'' میاں جی نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے کہ میں پھر بول پڑی۔

''دیکھیں! اللہ پاک قرآن پاک میں ارشاد فرماتے ہیں ....''خود بھی بچو اور اپنے گھر والوں کو بھی آگ سے بچاؤ.....اور میں نے کہا تھا ناں جن کی تیاری نہ ہو وہ ڈریں۔ آپ کے گھر والوں کی بھی تیاری نہیں ہے۔ اب وقت ہے عملی مسلمان بننے کا۔ اس سے پہلے کے وقت ختم ہو جائے اور ہمیں زبردستی کورونا کے مریض کی طرح جکڑ، جکڑ کر دوزخ میں پھینک دیا جائے۔ اس وقت ہمارے پاس پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں ہوگا پلیز۔'' اب کی بار میرے آنسو نکل پڑے۔

''ہم.....م! میں بھی کل رات یہی سوچ رہا تھا کہ کورونا کے بجائے اگر آج ہی بستر پر موت آ گئی تو کیا ہوگا؟ ان شاءاللہ ہم ضرور عمل کریں گے مگر کل سے نہیں۔'' میاں جی نے پھر سے ابھرتی امید کو توڑنے کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا۔

''پھر کب سے؟'' میں نے دم توڑتی امید سے پوچھا۔

''بلکہ آج ہی سے ناں لگی۔ کیا پتا کل تک بچ سکیں گے یا نہیں اور ہاں بہت، بہت شکریہ نیک بیوی ہونے کے لیے۔ اور جناب صرف اپنی عبادتوں کے لیے نہیں سوچنا بلکہ حقوق العباد کا بھی برابر سے خیال رکھنا ہے.....اس کی پکڑ زیادہ ہوگی۔'' میاں جی نے نکتہ تو بہت اچھا اٹھایا تھا اور میرے ذہن میں فوری خالہ ثریا کی بیوہ بیٹی کا خیال آ گیا کہ جو دو کم سن بچوں کے ساتھ پتا نہیں کیسے زندگی کی گاڑی چلا رہی تھی، کل کا انتظار کیے بغیر میں نے اپنے بیٹے کو کچھ رقم دے کر حفاظتی تدابیر کے ساتھ اس کے گھر دوڑا دیا جو دو تین گلی پیچھے ہی رہتی تھی۔

''بے شک حقوق اللہ تو بندے اور خدا کا معاملہ ہے۔ وہ جانے مگر حقوق العباد میں کوتاہی وہ ہرگز معاف نہیں کرنے گا بلکہ وہ مظلوم بندہ اپنے پروردگار کے حضور ہماری شکایت یا پھر شفاعت کا.....'' اس کے آگے میں کچھ نہ سوچ سکی اور الحمدللہ کہتے ہوئے کچن کی جانب بڑھ گئی۔

انا کی قربانی

حوریہ بتول

''حیا، کہاں گم ہو یار، بے وفا کہیں کی، شادی کر کے بھول گئیں اور جو ہم نے ملنا تھا وہ بھی یاد نہیں، کال بھی پک نہیں کی اتنا ڈرتی ہو شوہر سے تم۔'' احد، حیا کا فون اٹھا کر اونچی آواز میں ٹیکسٹ پڑھنے لگا۔

''یہ کس کا نمبر ہے؟'' احد نے شکی انداز میں پوچھا۔

''مجھے نہیں پتا آپ ایسے کیوں پوچھ رہے ہیں، لائیں اِدھر دیں فون، میں کال کر کے پوچھتی ہوں شاید فائزہ ہو۔'' حیا حیرانی سے اس کا انداز دیکھ کر بولی۔ احد نے حیا کی طرف دیکھ کر خود ہی کال ملائی اور غصے سے سرخ ہو گیا۔ لڑکے کی آواز سن کر شدتِ غصے سے فون دیوار پر دے مارا، حیا سہم گئی۔ اس نے کبھی احد کو اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

''یہ کرتی ہو تم میرے پیچھے۔'' احد کے دماغ میں امی کی کہی باتیں گھومنے لگیں۔ ''امی ٹھیک کہہ رہی تھیں عورت کا کوئی اعتبار نہیں، بس تم کل لاہور واپس جا رہی ہو۔'' وہ اونچی آواز میں بولا۔ حیا سراسیمگی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''آپ میری بات تو سنیں احد۔'' پر وہ زور سے دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ حیا انتظار کرتے، کرتے سو گئی۔ وہ کمرے میں نہ آیا اور حیا کی ہمت نہیں ہو رہی تھی وہ اس سے بات کرے جا کر۔ حیا سو کر اٹھی تو وہ آفس جا چکا تھا۔ اس نے بے دلی سے اپنے لیے ناشتا بنایا، اس کا دل ہی نہیں کیا کچھ کھانے کو صرف چائے پینے پر ہی اکتفا کیا، وہ سوچنے لگی آخر کیسے احد کو یقین دلائے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ بوجھل دل سے اٹھی اور گھر سمیٹنے لگی۔ صفائی وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ سوچنے لگی کہ آج کیا پکایا جائے۔

''احد کی پسند کا کچھ بناتی ہوں، اس کا غصہ اب تک تو ضرور اتر گیا ہو گا وہ یقیناً شرمندہ ہو گا میرے ساتھ ایسا رویہ رکھنے پر۔ شاید کل کوئی آفس کا مسئلہ ہو گا جبھی اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔'' حیا نے سر ہلاتے ہوئے خود سے کہا۔ ''احد عام مردوں جیسا نہیں ہے جو اتنی سی بات پر مجھ پر شک کرے۔ ارے ہاں پتا نہیں کس کا ٹیکسٹ ہو گا اگر فائزہ ہوئی تو مجھ سے بہت خفا ہو گی۔ احد کو کہوں گی مجھے نیا فون لا دیں۔ ثنا بھی فون کرتی ہو گی۔'' اس نے اپنی چھوٹی بہن کا سوچا۔ ''اور امی خواہ مخواہ پریشان ہوں گی۔ امی کو تو مجھ سے بات کیے بغیر سکون ہی نہیں آتا۔ اوہو۔'' حیا نے سر پر ہاتھ مارا۔ ''میں بھی کتنی پاگل ہوں لینڈ لائن سے کر لیتی ہوں۔'' حیا نے کچھ سوچتے ہوئے فون کا کریڈل اٹھایا اور وہ وہیں فریز ہو گئی۔ فون کا کنکشن کٹ چکا تھا۔

''نہیں، احد ایسا نہیں کر سکتا۔'' حیا نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ ''شاید فون میں کوئی مسئلہ ہے یا لائن میں کوئی مسئلہ ہو گا۔ مری کا موسم بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے چلو احد آئے گا تو اس کے موبائل سے کر لوں گی۔'' اس نے کریڈل واپس رکھتے ہوئے سوچا اور کچن میں آ گئی۔ ''ایسا کرتی ہوں۔ بریانی اور کھیر بنا لیتی ہوں یاں ویسے بھی احد کو میرے ہاتھ کی کھیر بہت پسند ہے۔'' بریانی، کھیر، سلاد اور رائتہ بنا کر حیا نے ایک طائرانہ نگاہ سب چیزوں پر ڈالی اور مطمئن ہو کر کمرے میں چلی آئی۔ گھڑی کی طرف دیکھا ابھی کچھ دیر تھی، وہ تیار ہونے چل دی۔ وہ تیار ہو کر اپنے گرد شال لپیٹتی ٹیرس میں آ کھڑی ہوئی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اسے یہ نظارے کتنے بھاتے تھے۔ بارش، یہ طلسماتی نظارے جو انسان کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔ یہاں کی پُراسرار خاموشی جو انسان کو خود سے ملنے کا موقع دیتی ہو جیسے...

وہ دبئی، سوئٹی پانچ ماہ پیچھے چلی گئی جب شادی کے دو ماہ بعد احد کی پوسٹنگ مری ہونے پر وہ بہت خوش تھی۔

''ہائے احد کتنا مزہ آئے گا، ہم روز باہر کافی پینے جایا کریں گے، بہت انجوائے کریں گے۔ سارا مری گھومیں گے اور ہاں بہت یادگار تصویریں بھی بنائیں گے، ہم ہر لمحہ قید کر لیں گے۔'' حیا نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا احد ہنسنے لگا۔

''جی بیگم صاحبہ، میں وہاں کام کم کروں گا، تمہیں زیادہ گھمایا کروں گا اگر جاب چلی گئی تو لاہور آتے ہوئے رونا نہیں تم۔'' احد نے اسے چھیڑا۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں جاہی نہیں رہی۔'' وہ ناراضی سے منہ موڑ کر لیٹ گئی۔

''اچھا بابا سوری، چلو بتاؤ اور کیا پلاننگ ہے تمہاری۔'' حیا پھر جوش سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہم اپنا روم ایسا سیٹ کریں گے کچن ایسا لاؤنج ایسا وہ بتانے لگی۔

''اچھا جیسا مرضی کر لینا ابھی تو سو جاؤ کل بہت کام ہیں مجھے۔'' احد تو سو گیا پر حیا کو خوشی سے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک جاگتی رہی۔ اگلی صبح ناشتے پر احد نے سب کو بتایا۔

''امی میری پوسٹنگ مری ہو گئی ہے۔''

''واؤ بھائی کتنا مزہ آئے گا بھابی، میں آپ کے پاس رہنے آیا کروں گی۔'' رائنہ نے جوش سے حیا کی طرف دیکھ کر کہا وہ مسکرانے لگی۔

''تم چپ رہو رائنہ زیادہ نہ بولا کرو۔'' سحر بیگم نے بیٹی کو ڈانٹا۔ ''تم سے کس نے کہا کہ حیا جا رہی ہے احد کے ساتھ۔'' رائنہ ایک دم چپ ہو گئی۔

''امی کیوں ڈانٹ رہی ہیں، ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے رائنہ۔ اب حیا نہیں جائے گی میرے ساتھ تو میرا

خیال کون رکھے گا۔ میں باہر کا کھانا نہیں کھا سکتا۔''

''بیٹا تو حیا کا کون خیال رکھے گا۔ عورت کو اکیلے چھوڑنا پیٹرول کو آگ دکھانا ہے۔ زمانہ دیکھو کیسا پُرآشوب ہے۔'' ساس کی بات پر حیا نے شکوہ کناں نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا۔

''اُف امی کیسی باتیں کرتی ہیں مجھے پورا یقین ہے حیا پر، آپ پریشان نہ ہوں۔'' احد نے بھرپور یقین سے کہہ کر حیا کا مان بڑھا دیا۔ وہ خود پر ایک بار پھر رشک کرنے لگی۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ احد کی آواز پر چونک گئی۔

''ثنا کی کال کئی بار آچکی ہے۔ کر لو فون اسے۔'' احد نے موبائل اسے پکڑایا۔ اس نے موبائل پکڑ کر واپس مڑتے احد کو پکارا مگر وہ ان سنی کرتا اندر چلا گیا۔ حیا کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ حیا کے صبح سے خود کو دیے سب دلاسے احد کے انداز پر دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اس نے آنسو ضبط کرتے ہوئے ثنا کو کال ملائی۔ فون اٹھاتے ہی ثنا بغیر سلام دعا شروع ہوگئی۔

''آپی حد ہوگئی ہے ویسے اتنا بھی شوہر کے عشق میں فنا نہیں ہو جانا چاہیے کہ آپ دنیا ہی بھول جائیں۔'' حیا جھلملاتی آنکھوں سے مسکرانے لگی کمرے کی کھڑکی سے یہ منظر احد نے دیکھا اس کے دل کو کچھ ہوا، ایک لمحے کے لیے اسے افسوس ہوا کہ اسے حیا پر شک نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن فون پر کوئی لڑکا ہی تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ غصے سے سوچنے لگا۔ حیا بات کر کے کمرے میں آئی تو احد آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹا ہوا تھا۔

''یہ فون لے لیں۔'' حیا نے بہانے سے اسے مخاطب کیا۔

''رکھ دو۔'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔

''وہ ثنا پوچھ رہی تھی کہ آپ کا فون کیوں بند ہے، میں نے کہا خراب ہوگیا ہے نیا لوں گی۔'' حیا نے کن انکھیوں سے احد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ فون کے بغیر گزارہ نہیں ہو رہا۔'' احد نے طنزیہ انداز میں جتانے کی کوشش کی۔

''میں کھانا لگاتی ہوں۔'' حیا خود پر ضبط کرتی جانے کے لیے مڑی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' احد نے فوری جواب دیا۔ ''اور ہاں سنو کل شام کو ڈنر پر جانا ہے، تیار ہو جانا۔'' حیا نے مڑ کر سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا شاید احد کو احساس ہوگیا اپنے رویے کا۔

''آفیشل ڈنر ہے جانا ضروری ہے ورنہ میں منع کر دیتا۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔

''احد کیا ہوگیا ہے آپ کو؟''

''چلو اب سونے دو تنگ نہ کرو۔''

حیا شکوہ کناں نظروں سے دیکھنے لگی۔ احد نے نظریں چرا کر رخ موڑ لیا۔ حیا اس کی پشت تکتے ہوئے سوچنے لگی۔

پتا نہیں کیسے وہ یہ روپ برداشت کرے گی اپنے اتنی محبت کرنے والے شوہر کا..... کوئی سرا بھی نہیں مل رہا کیسے احد کی غلط فہمی دور کرے۔

اگلا دن بھی ایسے ہی گزرا۔ شام میں اس نے موسم کی مناسبت سے گرے کلر کا پلین سوٹ پہنا جس کے ساتھ نیوی بلیو رنگ کی شال پہنی۔ یہ سوٹ احد نے اپنی برتھ ڈے پر گفٹ کیا تھا۔ وہ ہنستی رہی تھی۔

''سالگرہ تمہاری ہے اور گفٹ مجھے دے رہے ہو۔'' اس نے ساتھ ڈائمنڈ کا نازک سا سیٹ پہنا۔ ایک ہاتھ میں نازک سا بریسلیٹ اور ایک میں خوب صورت رسٹ واچ۔ لائٹ سا میک اپ کر کے جب وہ بال بنانے لگی تو یہ سوچ کر بال کھلے رہنے دیے کہ احد کو اس کے گھنے لمبے بال بہت پسند ہیں۔ حیا نے ایک اچٹتی سی نگاہ خود پر ڈالی اور مطمئن ہو کر بیڈ پر بیٹھ کر سینڈلز پہننے لگی۔ احد کمرے میں آیا تو اسے دیکھ کر تھم سا گیا۔ وہ اتنی سی تیاری میں ہی قیامت ڈھا رہی تھی، یک دم اپنی سوچ کو جھٹک کر وہ بہت روکھے لہجے میں بولا۔

''کتنا ٹائم لگاؤ گی دیر ہو رہی ہے۔''

''بس میں تیار ہوں۔'' حیا نے کلچ اٹھاتے ہوئے کہا۔ احد نظر چرا کر آگے بڑھ گیا۔

احد نے سب کولیگز سے حیا کا تعارف کروایا۔

''آپ کی وائف بہت سادہ اور کیوٹ ہیں۔''

اس کی کولیگ عائزہ نے کہا وہ مسکرانے لگا۔ حیا بیزار و تاثر لیے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ احد خوش گپیوں میں مصروف تھا۔

''ارے حیا، کیسی ہو؟'' جبھی ایک شوخ آواز پر احد نے مڑ کر دیکھا۔ حیا اس لڑکی سے بہت مسکرا کر مل رہی تھی۔

''تم یہاں کیسے فائزہ؟'' اس نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

''تمہیں بتایا تو تھا کہ عادل کی پوسٹنگ مری ہوگئی ہے جب رہنے آؤں گی ایک ماہ کے لیے پھر دونوں مل کر انجوائے کریں گے۔'' احد آکر عادل سے ملنے لگا۔

''یہ میری وائف ہیں فائزہ۔'' عادل نے تعارف کروایا۔

''اور یہ مسز احد ہیں۔'' فائزہ نے حیا کا تعارف کروایا۔

''فائزہ تم کیسے جانتی ہو مسز احد کو؟'' عادل نے اپنی بیوی فائزہ سے پوچھا۔

''یہ میری اکلوتی دوست ہے، وہ جس کا آپ کو بتایا تھا ناں میں نے۔'' فائزہ نے یاد دلایا۔

''اچھا تو یہ ہیں تمہاری بے وفا دوست، جسے فون کر کر کے تم پاگل ہو رہی تھیں۔'' عادل ہنسا۔

''فائزہ مجھے تمہارا کوئی ٹیکسٹ نہیں ملا نہ ہی تمہاری کوئی کال آئی۔'' حیا شرمندگی سے بولی۔

''وہ اصل میں حیا یہاں آتے میں میرا فون کھو گیا تھا۔ میں نے عادل کے نمبر سے بہت رابطہ کرنے کی کوشش کی، بہت کالز کیں پھر ٹیکسٹ بھی کیا تم نے کوئی رسپانس ہی نہیں کیا۔ جب تم نے کال بیک کی عادل کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے سوچا کال پک کر کے تمہیں بتا دیں کہ میں گھر جا کر فائزہ سے بات کرواتا ہوں لیکن تم نے کال کر کے کوئی بات کیے بغیر ہی فون بند کر دیا۔ میں نے دوبارہ بہت کالز کیں پر تمہارا نمبر ہی بند جا رہا تھا۔ پھر عادل نے مجھے منع کر دیا کہنے لگے شاید تمہاری دوست ملنا نہیں چاہتی۔''

''سوری فائزہ، ایسی کوئی بات نہیں میرا فون مسئلہ کر رہا تھا۔ اس لیے رابطہ نہیں ہو سکا۔'' حیا نے کچھ جتاتی نظروں سے احد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے احد بھائی کے فون سے بھی تو کال کر سکتی تھیں۔'' فائزہ نے شکوہ کیا۔ ''اور حیا تم رہنے ہی دو اب تو میں خود ڈھونڈ لوں گی تمہارا گھر۔ کیوں عادل ٹھیک کہا ناں...؟'' فائزہ نے حیا کو چڑاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بیگم تم فکر نہ کرو۔ میں باتوں باتوں میں مسٹر احد سے پوچھ لوں گا۔'' عادل نے مسکراتے ہوئے فائزہ کو تسلی دی۔

''اس کی نوبت نہیں آئے گی، میں اور حیا خود آپ کو انوائٹ کرنے آئیں گے۔'' احد شرمندگی سے

غزل

دل میں چبھتی ہوئی یادوں کی طرح ہوتا ہے
اس کا انداز بھی غیروں کی طرح ہوتا ہے
زخم پہ زخم لگانے کے ہنر میں ماہر
اس کا ہر کام تو اپنوں کی طرح ہوتا ہے
جو کہ لڑتا ہے بہت چھوڑ نہیں پاتا کبھی
ذہنی مفلوج بھی بچوں کی طرح ہوتا ہے
یہ ہی بہتر ہے کہ وہ مجھ سے کبھی بھی نہ ملے
اس کا آنا بھی بھمبیلوں کی طرح ہوتا ہے
کس قدر چھوڑ کے جانے کی جلدی ہے اسے
فیصلہ عام سے لوگوں کی طرح ہوتا ہے
اس کے ہونے سے گھٹا ٹوپ اندھیرا بھاگے
ایک شعلہ بھی اجالوں کی طرح ہوتا ہے
اس کو کس طرح میں دوست سمجھ سکتی ہوں
آستیں میں جو چھپے سانپوں کی طرح ہوتا ہے
اس سے ملنے پہ ہمیشہ ہی مرا دل ٹوٹا
اس کا ملنا بھی تو خوابوں کی طرح ہوتا ہے
اب تو حیرت ہے شگفتہ کہ تصور اس کا
چند بے ربط سی سوچوں کی طرح ہوتا ہے

شاعرہ: شگفتہ شفیق، کراچی

گویا ہوا۔

''مجھے انتظار رہے گا۔'' فائزہ نے حیا سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

واپسی پر احد کار ڈرائیونگ کرتے ہوئے حیا کو منانے کے طریقے سوچے جارہا تھا جو اس سے منہ موڑے باہر کے نظارے بے دلی سے دیکھ رہی تھی۔

''میں بہت شرمندہ ہوں، مجھے معاف کردو۔'' احد نے اس کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے کل ہی لاہور جانا ہے۔'' حیا نے آنسو پیتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔ میں مانتا ہوں میری غلطی ناقابلِ معافی ہے لیکن میں سوری بول تو رہا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔''

''اچھا تو آپ کے یہ سب کہنے سے میرے کردار پر لگائے گئے سب داغ دھل جائیں گے، ہے ناں؟ اس تذلیل کی چبھن مٹ جائے گی جو آپ نے صرف ایک انجان کال پر بنا سوچے سمجھے کی، وہ بھی کوئی صفائی کا موقع دیے بغیر..... سات ماہ کے اعتبار کی ایک پل میں دھجیاں اڑادیں۔ اور آپ مجھے ایک بات بتائیں۔'' حیا نے نم آنکھوں اور گلوگیر لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اگر فائزہ ساری زندگی نہ ملتی تو کیا آپ ساری زندگی مجھے اس جرم کی سزا دیتے جو میں نے کیا ہی نہیں۔''

''حیا یقین کرو میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن سے اپنی شرمندگی کا اظہار کرسکوں، مجھے پتا نہیں کیا ہوگیا تھا اور پھر امی کی وہ زمانہ خراب ہے والی باتیں ذہن میں آرہی تھیں لیکن میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں آئندہ شکایت نہیں ہوگی مجھ سے۔''

''اچھا آپ گاڑی چلائیں دھیان سے، گھر جاکر بات کرتے ہیں۔'' حیا نے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا۔

''ہم ابھی بات کریں گے۔'' احد نے گاڑی سائڈ پر روک دی اور گاڑی سے باہر نکل کر حیا کی طرف آکر دروازہ کھولا۔

''دیکھو کان پکڑ کر معافی مانگتا ہوں پلیز۔''

''احد کیا پاگل پن ہے بارش میں بھیگ کر بیمار ہو جاؤ گے پھر مجھے ہی خدمت کرنی پڑے گی۔'' حیا نے منہ بنا کر کہا۔

''اسی لیے کہہ رہا ہوں جلدی سے ایک خوب صورت مسکراہٹ میری طرف اچھالو جو سیدھا میرے دل پر ٹھاہ کرکے لگے۔''

حیا ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''ایک سیکرٹ بتاؤں تمہیں، یہاں جنگلی جانور بہت ہوتے ہیں اور بندر تو ہزاروں کی تعداد میں، ابھی دیکھنا چالیس پچاس تو ابھی آجائیں گے بندر میرے ساتھ تمہیں منانے۔'' احد نے اسے ڈرایا اور حیا واقعی ڈر بھی گئی۔

''اچھا میں نہیں ہوں ناراض بس آپ جلدی سے گاڑی میں آکر بیٹھیں، مجھے باہر کے اندھیرے سے ڈر لگ رہا ہے۔'' احد مسکراہٹ دباتے ہوئے گاڑی میں آبیٹھا اور اس کی طرف محبت سے دیکھ کر بولا۔

''یار حیا آج تم جتنی حسین لگ رہی تھیں ناں دل بار، بار اکسا رہا تھا کہ سب ناراضی ختم کردوں لیکن یہ کم بخت انا نے آگے بڑھنے سے روکا ہوا تھا۔''

اور حیا اس کی طرف دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ قربانی ہمیشہ عورت کو ہی دینی پڑتی ہے چاہے وہ اپنی انا کو توڑ کر یا پھر عزتِ نفس کو کچل کر دے۔ احد اگرچہ بہت اچھا شوہر تھا ہر خواہش کو کہنے سے پہلے پوری کردینے والا، کبھی کسی بات پر روک ٹوک نہ کرنے والا۔ اس کی ہر چھوٹی، چھوٹی بات کا خیال رکھنے والا..... لیکن ہر چھوٹی بات کا خیال رکھنے والا یہی شخص صرف ایک فون کال پر اس کے سب جذبات روند گیا تھا۔ لیکن ایک اچھی بیوی بننے کے لیے عورت کو اپنی انا توڑنی پڑتی ہے۔ چاہے اس کی غلطی نہ بھی ہو۔ یہی سب سوچتے ہوئے اس نے سیٹ کی پشت پر سر ٹکا دیا تھا۔

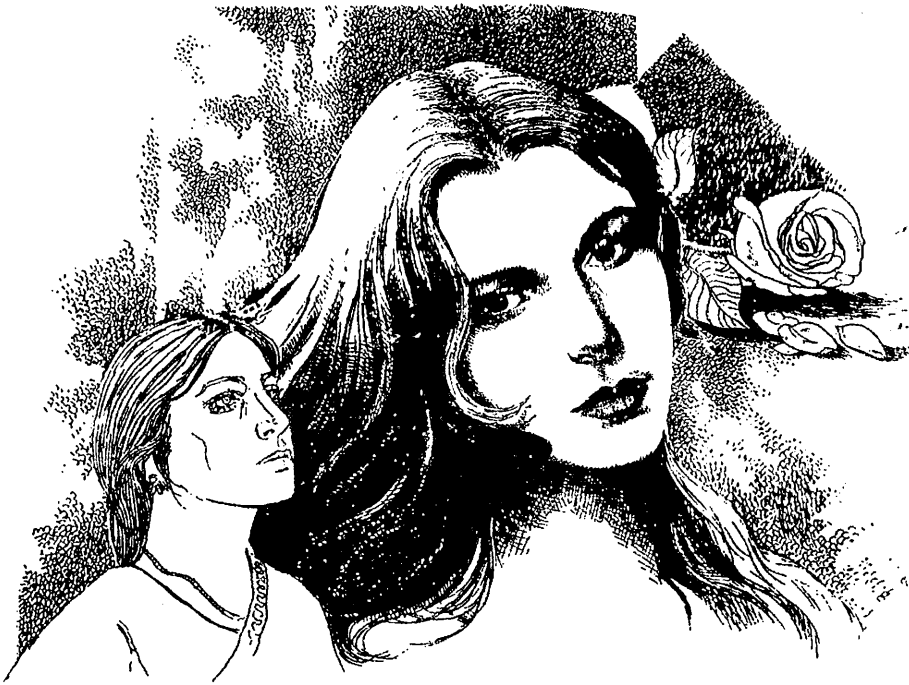

کام اور کورونا

وردہ بخاری

''اللہ شبانہ اس قدر تھک گئی ہوناں میں آج کہ کیا بتاؤں، ماسی سے الماری کے سارے کپڑے نکلوا کر سیٹ کروائے۔ نگرانی کرتے، کرتے کمر تختہ ہوگئی یار میری تو..... میرا فیورٹ ڈراما بھی ریپیٹ آنا تھا وہ بھی مس ہوگیا۔'' ردا گھنٹے بھر سے اپنی دوست سے بات کر رہی تھی۔ بھلا ہو whats app اور free call کا۔

''قسم سے یار، یہ ماسیاں بہت خوار کرتی

ہیں.....آج اگر میں سالن میں نمک چیک نہ کرتی تو سمجھو ہوگیا تھا کام.....دوپہر ایک بجے جونہی سو کر اٹھی کچن کی طرف دوڑ لگادی کہ دیکھوں ماسی کھانے میں کوئی گڑبڑ نہ کردے۔ میرا تو ایک پاؤں نیچے ہوتا ہے اور ایک اوپر۔ (کچن اور لاؤنج نیچے اور بیڈروم اوپر کی منزل میں تھے)

''کیا کریں بھئی ملازموں کی دیکھ ریکھ سے مشکل کوئی کام نہیں۔'' دوسری طرف شبانہ اپنے چمکتے ناخن فائلر سے فائل کرتے ہوئے بولی۔

دونوں تھوڑی دیر اپنی ماسیوں کو کوسنے کے بعد اگلے ہفتے ہونے والی پارٹی ڈسکس کرنے لگیں۔ بات کرتے، کرتے نگاہ گھڑی پر پڑی تو احساس ہوا کہ شام، رات میں ڈھلنے لگی تھی۔

''ارے سات بج گئے پتا ہی نہیں چلا.....چلو شکر ہے کہ بچے آسیہ.....(ماسی) کے پاس تھے۔'' شبانہ کو الوداعی کلمات کہتے ہوئے ردا نے سوچا.....''آدھا گھنٹا سوجاتی ہوں۔ پھر تو میاں جی آجائیں گے۔'' اس نے سستی سے سوچا اور اونگھنے لگی۔

''تڑاق.....'' کسی برتن کے کچن میں ٹوٹنے کی آواز سے اس کی حسیات بیدار ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی اس کے شوہر کی زور، زور سے بولنے کی آواز بھی تھی۔

''اللہ خیر.....یہ کب آئے.....؟'' دوپٹا سنبھالتی، وہ بیڈروم سے نیچے سیڑھیوں کی طرف لپکی تھی۔ لاؤنج میں ہی اس کا بیٹا سسکیاں لیتا ہوا نظر آگیا۔

''ارے کیا ہوا میرا بچہ.....'' وہ بے ساختہ بولی۔ جبھی شوہر نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا تھا۔

''کیا کرتی رہتی ہو تم سارا دن۔ سارا گھر ماسی پر چھوڑ کر سو رہی ہو.....پتا بھی ہے کچھ، آج میں ٹائم پر نہ آتا تو تمہارے بیٹے نے تو یہ پورا برتنوں کا ریک ہی سر پر گرا لینا تھا۔''

''ارے کیا ہوا زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔'' میں نے اپنے چار سالہ بیٹے کو ٹٹولا۔

''بچ گیا ہے شکر کرو اور وہ تمہاری ماسی اسے تو میں ابھی کام سے نکالتا ہوں.....اسد کو اکیلا چھوڑ کر کوارٹر جانے کی کیا ضرورت تھی۔''

''ارے نہیں.....آپ چھوڑیں میں دیکھ لوں گی اسے۔ آپ چینج کریں جا کر۔'' ماسی نکالنے کی بات پر ردا کی ساری حسیات الرٹ ہوگئی تھیں۔

''بھلا میرا کیا بنتا ماسی کے بغیر۔'' ردا نے.... جھرجھری سی لی''اتنے ڈھیر کام اور اکیلی جان بھلا کیسے کرسکتی تھی۔'' ماسی کو تھوڑی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد اس نے پھر سے رکھ لیا تھا اور پھر وہی بے ڈھنگی روٹین.....لمبی، لمبی کالیں کی جاتی face book پر اپنی خوبیاں بیان کر کے شریکوں کو جلانے کے علاوہ snapchat کے ذریعے لحہ بہ لحہ اپنی زندگی کے رنگین لمحات کی اطلاعات دی جاتیں۔ غرض موبائل، ٹی وی اور netflix کے درمیان راوی چین ہی چین لکھتا تھا کہ یکا یک ٹی وی پر کچھ عجیب سی خبریں آنے لگیں۔

کورونا اور اس کی احتیاطی تدابیر پہلے تو اس نے بھی خبریں ہی میں اڑا دیں۔ لیکن جب واقعی لاک ڈاؤن شروع ہوگیا تو وہ بھی کچھ سنجیدہ ہوئی..... میاں صاحب کی پہلی تجویز ماسی نکالنے کی تھی اور وہ اس معاملے میں ان سے پوری طرح متفق تھی۔ اس وبا کے بارے میں وہ کیسے کسی پر اعتبار کرسکتی تھی۔ اپنا گھر اور بچہ اسے خود ان کی حفاظت کرنی تھی۔

اگلی صبح اٹھ کر ناشتا بنایا اور بیٹے اور میاں جی کو ناشتا کرانے کے بعد خود بھی ڈٹ کر ناشتا کیا۔

''کتنا اچھا پھولا، پھولا آملیٹ بنا ہے'' خود کو..... بے اختیار شاباش دی۔'' ماسی تو کبھی ایسا نہیں بنا سکتی تھی۔'' برتن دھو کر کچن صاف کرتے تھکاوٹ سی ہو چلی تھی۔ سو کچھ دیر لیٹ گئی اور حسب عادت آنکھ لگ گئی۔ آنکھ بیٹے کی آواز سے کھلی جو اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا جس کے سارے کپڑے کیچ اپ سے بھرے تھے اور ہاتھ پاؤں بھی بے حد گندے ہو رہے تھے۔

''ارے یہ کیا، کیا آپ نے..... چلو نہاؤ چل کے.....'' بیٹے کو... صاف ستھرا کر کے کھلونوں کے ساتھ بٹھا کر نیچے آئی تو کاموں کا جم غفیر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ زندگی ماسیوں پر اس قدر ڈیپینڈ ہو چکی تھی کہ وہ ایک کام کرتی تو دوسرا خراب ہو جاتا۔ دن بھر کام والی کے کاموں میں نقص نکالنے والی کو جب خود کام کرنا پڑا تو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ میاں الگ ناراض، ناراض رہتے کہ ہر کام میں دیر اور بے قاعدگی روز کا معمول بن چکی تھی۔

نہ جانے کتنے دنوں سے کسی سہیلی کو کال بھی نہیں کی تھی۔ پارٹی کا گروپ بھی خاموش تھا۔ نہ فیس بک کی لڑائیاں تھیں اور نہ انسٹا..... گرام کی فیشن اپ ڈیٹس..... بے اختیار امی کو فون ملایا کہ اس کو پتا تھا کہ اس کے ہر درد کی دوا صرف امی کے پاس تھی۔

''کیسی ہو ردا بیٹا اور اسد کیسا ہے؟'' فون ملتے ہی امی کی محبت بھری آواز آئی۔

''ٹھیک ہے امی بس.....'' اس کا دل بھر آیا۔

''کیا ہوا..... ایسے کیوں بات کر رہی ہو؟'' اس کی اداس آواز سن کر امی کا ماتھا ٹھنکا۔

''بس امی کام ہی ختم نہیں ہوتے، جب سے ماسی گئی ہے تھک جاتی ہوں۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

''لو بھلا گھر کے کاموں سے کیا تھکنا۔ اگر صحیح طریقے سے کرو تو کام وقت پر بھی ہوں اور سلیقے سے بھی۔'' امی کی تسلی آمیز آواز ابھری۔ ''دیکھو میں سمجھاتی ہوں.....'' اس کے کچھ مزید بولنے سے پہلے وہ بولیں۔

''صبح اسد کو اسکول اور میاں کو دفتر بھیجنے کے بعد سویا نہ کرو، بزرگ کہتے ہیں کہ صبح کے وقت برکت ہوتی ہے اور برتن ہاتھ کے ہاتھ دھویا کرو..... اکٹھے مت کیا کرو..... جیسے ہانڈی بھونتے یا..... کوئی اور کام کرنے کے ساتھ ہی برتن دھوتی رہا کرو، اس طرح ایک وقت میں دو کام ہو جاتے ہیں اور بسم اللہ پڑھا کرو بیٹا ہر کام کرنے سے پہلے..... اللہ برکت ڈالتا ہے اور درود شریف کا ورد کرتی رہا کرو اس طرح سوچیں اِدھر اُدھر نہیں جاتیں۔''

امی کی باتوں سے دل کو عجیب سا سکون ملا تھا۔ خیر اسکول تو بند ہو چکے تھے مگر شوہر آفس جا رہے تھے سو صبح تو اٹھنا ہی تھا۔ رات انہی باتوں پر غور کرتی و سو گئی تھی۔

اگلی صبح روشن تھی، اس نے دل لگا کر کام کر شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ کام اتنے بھی مشکل نہیں تھے، بس بات تھی انہیں طریقے سے کرنے کی۔ کچھ دن لگے مگر سب کچھ معمول پر آنے لگا تھا۔ فضول کی سوچوں سے بھی جان چھوٹ گئی تھی۔ اب نہ تو ہر وقت سر درد ہوتا اور نہ رات کو نیند نہ آنے کی شکایت ہوتی۔ اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ گھر چمکنے لگا تھا۔ کھانے میں ذائقہ آنے لگا تھا اور بچے کی صحت بھی اچھی ہونے لگی تھی۔ یہ ضرور تھا کہ اسے تھکاوٹ ہو جاتی لیکن اس کے دل کو سکون تھا کہ وہ یہ سب اپنی فیملی کے لیے کر رہی ہے، ان کے سکون کے لیے اور ان کی حفاظت کے لیے..... اسے اللہ پر یقین تھا کہ حالات جلد ٹھیک ہو جائیں گے اور سب چیزیں معمول پر آ جائیں گی..... لیکن یہ بات نہ طے تھی کہ اب وہ سب کچھ ماسیوں پر نہیں چھوڑے گی۔

یہ بھی اچھا ہوا کہ شوہر بھی اس کے ساتھ جس حد تک ممکن ہوتا ہاتھ بٹاتے، مثلاً فریج میں پانی کی بوتلیں بھر کر رکھ دیں۔ پودوں میں پانی دینے کے ساتھ، ساتھ صحن میں بھی پانی ڈال کر وائپر کر دیتے۔ کھانا سرو کرنا اور سمیٹنا اور اسی طرح کے کئی چھوٹے، چھوٹے کام اپنے گھر کا کام خود کرنے میں اب اسے کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ یہ کورونا اس کے لیے تو واقعی ''گھر کا کام خود... کرو ناں'' ثابت ہوا تھا۔ بے اختیار اپنی سوچ پر وہ ہنستی چلی گئی اور طمانیت سے اپنے روشن اور چمکتے ہوئے گھر کو دیکھ کر اللہ کے حضور شکر ادا کرنے لگی۔

❁❁❁

ناولٹ

ایک سجدہ

عائشہ خان

چوتھا اور آخری حصہ

گیٹ کی بیل دیتے ہوئے حنان ہر طرح کی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔ وہ زارا کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس شخص کے آگے ہاتھ جوڑنے پڑتے تو وہ بھی جوڑ سکتا تھا۔

''اشیر صاحب کو بتاؤ حنان صاحب آئے ہیں۔''

گیٹ رات والی لڑکی نے کھولا۔

''حنان صاحب.....'' فیروزاں چونکی تھی اور اس کے اس چونکنے کو حنان نے بھی محسوس کیا تھا۔

''صاحب جی تو گھر پر نہیں ہیں..... بڑے صاحب جی فوت ہو گئے ہیں ناں تو سب ساہیوال چلے گئے ہیں۔''

ایک لمحے کے لیے تو اس کی بات سن کر حنان ہکا بکا رہ گیا۔ ''کب ڈیتھ ہوئی ہے بڑے صاحب کی.....؟''

''پتا نہیں جی..... سرگی کا تھا ٹیم شید..... جب چھوٹے صاحب آئے تھے۔''

''اشیر صاحب.....؟''

''نہیں جی چھوٹے صاحب، شہیر صاحب.....''

''وہ کیا کرنے آئے تھے؟''

''اثیر صاحب کو لینے کے لیے..... صاحب جی کا فون رات گاڑی میں ہی پڑا رہا تھا اس لیے پہلے چھوٹے صاحب فون کرتے رہے پھر خود لینے آئے۔''

''تم حامد کی بہن ہوناں؟''

''جی صاحب جی.....''

''حامد کدھر ہے؟''

''وہ سو رہا ہے۔''

''اور تمہارے ابا.....؟''

حنان کو علم تھا کہ حامد کا باپ بطور مالی یہاں کام کرتا تھا اور کبھی کبھار حامد کے پاس ہی کوارٹر میں رک جاتا تھا۔

''ابا نماز پڑھ کے لیٹ گیا ہے۔''

''اچھا فیروزاں..... زارا بی بی آئیں تو تمہارے صاحب جی نے کیا کہا ان سے.....؟''

''مجھے نہیں پتا صاحب جی.....''

''تمہیں پتا ہے فیروزاں..... شاباش بتاؤ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ تم جانتی ہو فیروزاں، زارا بی بی رات سے بے ہوش ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اگر اسے 24 گھنٹوں میں ہوش نہ آیا تو.....''

''اللہ نہ کرے۔'' دل میں اس نے فوراً کہا تھا اور وہ چند لمحوں کے لیے گم صم سا کھڑا رہ گیا تھا پھر گہری سانس لیتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''چلو بتاؤ شاباش.....''

''صاحب جی آپ کے ساتھ آنے پر ناراض ہو رہے تھے۔''

''میرے ساتھ آنے پر.....؟'' بے اختیار حنان کے منہ سے نکلا تھا۔

''ہاں جی وہ بار، بار آپ ہی کا نام لے کر ناراض ہو رہے تھے پھر انہوں نے بی بی کو گھر سے نکال دیا کہ وہ آپ کو بلائیں اور چلی جائیں یہاں سے.....'' طلاق کی بات وہ گول کر گئی تھی... اسے لگا تھا اتنی بڑی بات اسے باجی کے گھر والوں کو نہیں بتانی چاہیے تھی۔

''آہ.....'' ساری احتیاطوں کے باوجود وہ زارا کے لیے اتنی بڑی تکلیف کا باعث بن گیا تھا۔ کب سوچا تھا اس نے ایسا..... وہ تو اسے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے خوشیوں کی دعائیں کرتا تھا پھر یہ کیوں ہوا..... کس لیے.....! بے حد بھاری ہوتے دل اور بوجھل قدموں سے چلتا وہ گاڑی میں آ بیٹھا۔

☆☆☆

''اثیر.....'' عابدہ بیگم نے انہیں آواز دی تھی۔

''بات ہوئی تمہاری زارا سے..... کب پہنچ رہے ہیں وہ لوگ؟'' وہ جو ماں کے اسی سوال سے بچتے پھر رہے تھے چند لمحے گومگو کی کیفیت میں انہیں دیکھتے رہے پھر آہستگی سے کہہ دیا۔

''پتا نہیں امی جان..... زارا کا موبائل بند ہے۔''

''تو بیٹے اس کی والدہ یا والد کے نمبر پر کر لو ناں۔'' ایسے موقع پر ان کے اس غیر ذمے دارانہ رویے پر انہیں غصہ آیا تھا لیکن انہوں نے ضبط کر لیا۔

''دونوں نمبر میرے پاس نہیں ہیں امی جان.....

کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔'' ان سے نگاہیں چراتے ہوئے انہوں نے دبے، دبے سے انداز میں کہا تھا۔

''اثیر..... اللہ تمہیں عقل دے..... جانے تم کب سدھرو گے.....'' پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے بے حد دلگرفتگی سے کہا تھا۔

''کیسی بات کر رہے ہیں آپ اثیر بھائی..... آپ کے پاس زارا بھابی کے علاوہ کسی اور کا نمبر ہی نہیں ہے..... ان کے ماموں، چچا، کزنز کسی کا تو ہوگا۔'' خاموش کھڑے شہیر نے ماں کو پریشان دیکھ کر ناگواری بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''نہیں، میرے پاس کسی کا بھی نمبر نہیں ہے جب بھی کبھی بات ہوئی ہے ان ہی کا فون آیا ہے۔

''اب تو آپ رشتے نبھانا سیکھ لیں اثیر بھائی۔'' شہیر کہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا.....؟'' انہوں نے ناگواری سے پوچھا تھا۔

''کچھ نہیں۔'' شہیر سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔

''اثیر..... باقیوں کے نہیں تو زارا کے گھر کا اور اس کے والد، والدہ کا نمبر تو ہونا چاہیے تمہارے پاس..... اب تک تو میں یہ کہہ رہی تھی سب سے کہ بہو کی والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں..... صبح نکلیں گے وہ لوگ..... اب جانے زارا کا نمبر کیوں بند ہے؟ اس کی ماں کی طبیعت زیادہ تو خراب نہیں ہوگئی کہیں؟ اگر زیادہ بھی خراب ہے تمہاری ساس کی طبیعت تو زارا کو تو کسی کے ساتھ بھجوا دینا چاہیے تھا انہیں..... خیر تم فون ٹرائی کرتے رہنا.....'' بیٹی اور داماد کو پاس آتے دیکھ کر انہوں نے دھیمے سے لہجے میں بات ختم کر دی تھی۔

☆☆☆

''مجھے تو شروع سے ہی یہ اثیر احمد کے انداز نبھانے والے نہیں لگتے تھے۔ آپ نے غور نہیں کیا شاید..... جب بھی آتا تھا یوں بیٹھتا تھا جیسے گردن میں سریا فٹ کروا کر آیا ہے۔ سچی بات ہے عثمان مجھے تو ایسے لوگ ایک آنکھ نہیں بھاتے..... جانے زارا کو کیا نظر آیا تھا اس میں..... کہ دیوانی ہوئی پھرتی تھی اس کے پیچھے..... دکھا دی ناں اس نے اوقات اپنی.....''

''فضول باتیں مت کرو..... ابھی تو پتا ہی نہیں ہے کہ ہوا کیا ہے۔''

''کمال کی باتیں کرتے ہیں آپ عثمان، زارا کے چہرے پر انگلیوں کے نشان اور اس خبیث کا بند موبائل بتا نہیں رہے کہ کیا ہوا ہے۔''

''کیا پہلے بھی کوئی لڑائی جھگڑا تھا دونوں کے درمیان؟''

''لڑائی جھگڑے کا تو مجھے پتا نہیں لیکن کچھ پریشان سی تھی زارا..... میں نے پوچھا تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کتنی خواہش تھی میری، حنان کے لیے.....''

''نرجس کچھ ہوش کرو کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' ان کے حسرت بھرے لہجے پر عثمان صاحب نے خفگی سے انہیں دیکھا تھا۔

''آپ نے فون کر دیا..... حنان کی سسرال.....''

''نہیں ابھی نہیں..... ان شاء اللہ ہوش آجائے گا ابھی زارا کو..... فنکشن کینسل کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔''

''ان شاء اللہ۔'' نرجس بیگم نے بھی دل کی گہرائیوں سے کہا تھا۔ زارا انہیں حقیقتاً بے حد عزیز تھی۔

☆☆☆

کیسا اداس کر دینے والا ہے انسان کی زندگی کا اختتام..... جان سے پیارے رشتے جن سے لمحہ بھر کی جدائی گوارا نہیں ہوتی..... منوں مٹی کے نیچے ڈالتے ہیں اور واپس لوٹ آتے ہیں اور آتے ہی وہی روٹین کھانا، کھلانا، ملنا، ملانا، سونا جاگنا..... لیکن نہیں، کچھ زندگیوں میں تو سب کچھ بدل جاتا ہے کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہتا..... انہوں نے اداس نگاہوں سے خالی بستر کو دیکھا تھا جسے اب خالی ہی رہنا تھا۔

بیڈ کے ساتھ پڑی کرسی کو دیکھا تھا جہاں وہ رات دیر تک بیٹھ کر کچھ نہ کچھ پڑھا کرتے تھے..... اور وہ کئی بار ٹوکا کرتی تھیں ''بستر پر آجائیں اب..... آپ یہاں بیٹھے تھکتے نہیں ہیں۔''

''آپ تھوڑی دیر آرام کر لیں امی جان..... ابھی پھر کوئی آجائے گا۔'' اثیر احمد نے کہا تھا اور انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

''عجیب بات ہے کہ ہم جتنا بھی کہتے رہیں کہ یہ دنیا جائے بقا نہیں ہے ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے لیکن صحیح معنوں میں دنیا کی ناپائداری کا احساس ہمیں کبھی ہوتا ہے

ب ہم سے ہمارا کوئی پیارا جدا ہوتا ہے کیا ہوتا اگر یہ جدائی نہ بنائی ہوتی رب نے۔'' گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے عابدہ بیگم نے گہری سانس لی تھی اور اپنی متورم آنکھوں کو انگلیوں سے دباتے ہوئے چند لمحے خاموشی سے بیٹھی رہی تھیں پھر گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھی تھیں اور اپنے بستر پر آ گئی تھیں۔

''پتا نہیں کیا حال ہے تمہاری ساس کا..... اچھی بھلی صحت تھی ان کی تو..... لیکن بیماری اور دکھ آتے ہوئے کب پتا چلتا ہے۔''

''آج شام کو زارا کے کزن حنان کی منگنی بھی تو ہے ناں۔''

''حنان کی منگنی.....'' اثیر احمد نے بے حد چونک کر حیرانی سے انہیں دیکھا تھا۔

''ہاں..... زارا بتا رہی تھی کہ اچانک ہی منگنی طے ہوئی ہے۔ لڑکی کا بھائی کہیں پڑھنے وڑھنے جا رہا تھا..... مجھے کہہ کر گئی تھی زارا چلنے کے لیے اور تمہیں بھی شرکت کے لیے تیار کرنے کی خاص تاکید کی تھی۔ تم دونوں کے درمیان کیا کوئی ناراضی چل رہی ہے اثیر؟''

''نہیں.....'' انہوں نے بمشکل پھنسی، پھنسی آواز میں کہا تھا۔

''زارا کی ممانی بلا رہی تھیں اسے شاپنگ پر ساتھ لے جانے کے لیے..... زارا بار، بار انکار کر رہی تھی۔ آخر میں نے کہا کہ اسے جانا چاہیے۔'' وہ بتا رہی تھیں اور اثیر احمد گنگ سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

''کوئی بات ہے تو بتاؤ بیٹے.....؟''

''نہیں امی جان کوئی بات نہیں۔'' وہ جیسے کسی گہری کھائی سے بول رہے تھے۔

''دیکھو بیٹے..... زندگی بس اتنی سی ہے۔ کل اس وقت تمہارے بابا جان بالکل ٹھیک ٹھاک اسما اور شہیر کے ساتھ بیٹھے تھے شام کو حسبِ معمول اذان کو پارک لے کر گئے تھے اور آج..... بیٹے یہ زندگی محبتوں کے لیے کم ہے اسے نفرتوں میں ضائع نہیں کرنا چاہیے..... زارا بہت اچھی لڑکی ہے، تم سے محبت بھی بہت کرتی ہے کل جب فون پر بار، بار اپنی والدہ اور ممانی کے ساتھ نہ جانے کے لیے بھی کوئی تو کبھی کوئی عذر تراش رہی تھی تو میں نے ہی اصرار کیا کہ چلی جاؤ..... میرے بہت اصرار کے باوجود بھی وہ کوٹو میں کبھی میرے کافی پوچھنے پر کہ تم دونوں کے

مجاہدوں کے نام

اے پاک وطن کے مجاہدو
ذرا سنو کیا کہہ رہی ہے فضائے وطن
تم بڑھے چلو، بڑھے چلو
عدو کی نہ پروا کرو
کہ تمہارے سروں پر سایہ فگن
رحمتِ رب کریم ہے
یوم آزادی مبارک

از: حدیث اختر، حاصل پور

درمیان کوئی مسئلہ چل رہا ہے تب بھی کچھ نہیں بتایا..... بس جاتے ہوئے مجھے یہ کہا کہ کل مجھے بھی ضرور انگیجمنٹ کے فنکشن میں چلنا ہے اور تمہیں بھی تیار کرنا ہے..... لیکن جاتے ہوئے بہت جھجک کر کہا گیا اس کا ایک جملہ ''امی جان! بس تھوڑے سے خفا ہیں اثیر مجھ سے..... یہ نہ ہو، جانے سے انکار کر دیں۔'' مجھے سمجھ آ گیا کہ وہ بے حد پریشان تھی۔'' وہ کہہ کر انہیں دیکھنے لگیں۔

''جانتے ہو بیٹے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سب سے پہلے جو رشتہ بنایا وہ میاں بیوی کا رشتہ ہے..... یہ رشتہ بے حد عظیم بھی ہے اور حسین بھی..... فولاد کی طرح مضبوط ہے اور کانچ کی طرح نازک بھی..... زندگی کو خوب صورت بھی بنا دیتا ہے اور بدصورت بھی.....'' وہ بہت رسان سے کہہ رہی تھیں اور اثیر احمد کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔

''میاں، بیوی کا اچھا تعلق ایک اچھے گھر کی ہی نہیں اچھے خاندان اور اچھے معاشرے کی بھی بنیاد ہوتا ہے..... اس لیے اس رشتے کو محض نبھانے کی نہیں بہترین بنانے کی کوشش کرنی چاہیے..... دونوں فریقین کو ایک دوسرے پر اس قدر اعتماد اور بھروسا ہو کہ بات بے بات ایک دوسرے کو صفائیاں نہ دینی پڑیں..... جواز نہ پیش کرنے پڑیں۔ محبت کا نعم البدل تو کوئی چیز نہیں ہو سکتی لیکن اگر محبت نہ ہو تو خلوص تو لازمی ہو، ایک دوسرے کے مخلص ساتھی ہوں، ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار ہوں..... اور تم تو خوش نصیب ہو بیٹے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ

نے نیک، سلجھی ہوئی اور محبت کرنے والی ساتھی دی ہے۔ بہت بڑی نعمت ہے یہ اللہ کی..... اس کی قدر کرو..... اور اس کے لیے اللہ کا شکر ادا کرو۔'' اثیر احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھے وہ دھیرے، دھیرے انہیں سمجھا رہی تھیں اور وہ خالی، خالی نگاہوں سے انہیں دیکھ کر رہ گئے تھے۔ وہ انہیں کیا بتاتے کہ وہ کیا کر بیٹھے تھے۔

☆☆☆

گاڑی کے بریک اس کے بالکل پاس آکر چرچرائے تھے۔ اس کا دل ایک دم جیسے دہل گیا تھا۔ ابھی، ابھی تو فیروزاں نے کہا تھا۔

''آپ اب گھر چلی جائیں باجی جی..... اتنی رات کو آپ کا یہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں ہے..... زمانہ بہت خراب ہے۔''

''فیروزاں.....'' اس نے پکارنا چاہا تھا لیکن آواز حلق میں ہی پھنس کر رہ گئی تھی۔ اس نے مضبوطی سے گیٹ کو پکڑنا چاہا تھا لیکن گرفت جو پہلے ہی ڈھیلی پڑ رہی تھی چھوٹ گئی تھی۔ زمین پر گرتے ہوئے، خوف سے مفلوج ہوتے ذہن کے ساتھ اس نے کسی کو پکارا تھا۔ اسے جو اپنے بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اسے جو اپنے بندے کے ساتھ اس کے والدین سے بہن بھائیوں سے اولاد سے بھی بڑھ کر محبت کرتا ہے۔

کیا اس نے اس کی پکار سن لی تھی؟ اس کی ساری نافرمانیوں کے باوجود..... اس کی ساری خطاؤں کے باوجود..... اس کے باوجود کہ اس نے ایک انسان کو اس کے مقام پر لا بٹھایا تھا..... ایک انسان کو اس سے بھی زیادہ چاہا تھا۔

ہاں..... وہ رحیم ہے..... بے حد رحیم..... اپنے بندے کی سو غلطیاں بھی معاف کر دیتا ہے..... لیکن اس نے معافی مانگی ہی کب تھی.....

پھر.....؟

آہ.....! کاش معافی مانگنے کا، توبہ کرنے کا موقع ہی مل جاتا۔ دادی جان نے کہا تھا۔ ''جو بھی انسان کو رب کی طرح چاہتا ہے..... اسے رب کے مقام پر لا بٹھاتا ہے..... وہ بڑی ذلت اٹھاتا ہے۔''

لیکن..... انہوں نے یہ بھی تو کہا تھا۔

''اللہ اپنے بندے سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے جب ایک ماں کی محبت ہی لامحدود ہوتی ہے تو ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت کتنی ہو گیا آخر.....!''

اس کا دل چاہا وہ دھاڑیں مار، مار کر روئے۔

ایسے محبت کرنے والے اپنے رب سے دور تھی وہ..... ایک انسان کی محبت کے حصول کے لیے پاگلوں کے مانند دوڑتی رہی تھی جبکہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں اپنے رب کو کبھی ایک لمحے کے لیے بھی محبت سے نہیں پکارا تھا پھر اب وہ کیوں اس کی پکار سنتا.....

اس کا مقدر یقیناً ذلت تھی۔ صرف ذلت..... مارے کرب کے اس کا دل پھٹنے لگا، ذہن پھر تاریکی میں ڈوبنے لگا۔

☆☆☆

''راشد صاحب..... شناخت ہوئی اس لڑکی کی.....؟'' بھاری سی مردانہ آواز، مدھم سی سرگوشی اس کے قریب کہیں ابھری تھی۔

''کون تھا اس کے پاس.....؟'' اس نے آنکھیں کھولنے کی، ذہن کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔

شعیب بتا رہا تھا کہ ریڈ لائٹ ایریا سے تعلق ہے اس کا۔''

اب کے آواز واضح تھی۔

''ریڈ لائٹ ایریا.....''

اس کا دل جیسے کسی گہرے پاتال میں ڈوبا۔

''کیا وہ ریڈ لائٹ ایریا میں تھی؟''

''نہیں میرے اللہ..... نہیں.....'' اس کے دل نے جیسے دہائی دی تھی اور ذہن نے ایک بار پھر تاریکی کی دبیز چادر اوڑھ لی تھی۔

☆☆☆

''آخر ایسا کیوں ہوا..... کیا میری نیت میں ہی کہیں فتور تھا۔'' دور تک نظر آتی سیاہ تارکول کی صاف و شفاف سڑک پر اپنی پُرسوچ نگاہیں مرکوز کیے حنان نے خود سے سوال کیا تھا۔ اس کا دل بے حد بوجھل تھا۔ بے حد اداس اس نے کبھی ایسی صورتِ حال کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

یہ درست تھا کہ وہ اب بھی زارا سے محبت کرتا تھا۔ اس لیے کہ اس محبت کو دل سے نکال دینا اس کے بس میں نہیں تھا لیکن جو کچھ اس کے بس میں تھا اسے کرنے میں تو اس نے ذرا برابر دریغ نہیں کیا تھا۔

اس کے گھر وہ اس تمام عرصے میں صرف دو بار گیا تھا۔

فون پر بات بھی چند ایک بار ہوئی تھی۔ ٹیکسٹ بھی کسی نہ کسی خاص موقع پر ہی کرتا رہا تھا۔ پھر آخر کیا وجہ تھی کہ نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ اس کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر آیا تھا۔

کیسی حالت میں اس نے زارا کو اٹھایا تھا..... کس دل سے اسپتال پہنچایا تھا۔ یہ صرف وہی جانتا تھا اور اس کی اس حالت کے پیچھے اس کی اپنی ذات تھی۔ یہ حقیقت کس قدر تلخ تھی۔ کیسی تکلیف دہ..... آپ کسی کو فائدہ پہنچانا چاہیں اور ان جانے میں نقصان پہنچا بیٹھیں..... خوشیاں دینا چاہیں اور دکھ دے بیٹھیں۔

کتنا بڑا المیہ ہے یہ.....! کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔

☆☆☆

''اُف یہ کیا کر بیٹھا میں..... یہ کیسا جرم سرزد ہوا ہے مجھ سے.....'' کمرے میں اِدھر سے اُدھر چکراتے وہ نڈھال ہو چکے تھے۔ سوچ، سوچ کر تھک چکے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسے کیوں کرتے تھے۔ کیوں ان کا دماغ یک دم خراب ہو جاتا تھا۔

''کیا مجھے کوئی سائیکالوجیکل پرابلم ہے؟'' انہوں نے تھک کر خود سے سوال کیا تھا۔

''ہاں، یقیناً ایسا ہی ہے۔'' ان کے اندر سے کسی نے جیسے خود اقرار کیا تھا۔

لیکن انہیں اس اقرار سے انکار تھا۔ اختلاف تھا۔ وہ خود کو یہ باور کروا رہے تھے کہ کچھ شزا احمد نے ان کا لڑکیوں پر سے بھروسا ختم کیا تھا اور کچھ زارا کے اظہار محبت میں پہل کرنے اور بار، بار فون پر رابطہ کرنے نے انہیں اس کے کردار کی جانب سے مشکوک کر دیا تھا جس کی بنا پر وہ اس پر مکمل اعتبار نہیں کر پا رہے تھے اور بار، بار بدگمانی کا شکار ہو جاتے تھے ورنہ اور کوئی بات نہیں تھی۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ خود کو یہ باور کروا کر وہ ایک بار پھر ایب نارمیلٹی کا ثبوت دے رہے تھے۔

جی ہاں نیگیٹیویٹی بھی تو ایب نارمیلٹی کی ہی ایک قسم ہے اور کوئی معمولی نہیں اچھی خاصی خطرناک قسم.....

☆☆☆

کاش وہ کبھی ہوش میں نہ آتی..... کاش وہ اسی طرح بے ہوشی میں ہی اس سنگدل دنیا کو چھوڑ جاتی..... کرب و اذیت کے صحرا میں چکراتی وہ اپنی کھلنے کے لیے بے تاب آنکھوں کو زبردستی بھینچے جیسے درد کے پل صراط پر تھی۔

کاش یہ آنکھیں کبھی نہ کھلیں..... وہ کبھی نہ دیکھے کہ وہ کہاں پر تھی.....؟ کسی ڈیرے پر تھی..... کسی فارم ہاؤس پر یا کسی گھر میں..... اور اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ اسے اخبار میں پڑھی کئی خبریں، ڈراموں میں دیکھے گئے کئی واقعات یاد آئے۔

دادی جان دعا کیا کرتی تھیں..... ''یا اللہ عزت والی زندگی اور عزت والی موت عطا فرمانا۔''

اسے نہیں یاد تھا کہ اس نے کبھی بھی یہ دعا کی تھی۔ لیکن اس وقت اس کے جسم کا رواں، رواں یہ دعا کر رہا تھا اور آنسو اک تواتر سے اس کی آنکھوں کے کناروں سے بہتے اس کے کانوں کو اور تکیے کو بھگو رہے تھے۔ کبھی کسی نے نہایت نرمی سے اس کے بازو کو سیدھا کیا تھا۔ اس کے آنسوؤں کو صاف کیا تھا۔

اس نے زور لگا کر تیزی سے آنکھیں کھولی تھیں۔ روشنی سے اس کی آنکھیں جیسے چندھیا گئی تھیں۔

''ان کے والدین کو بتا دیں کہ یہ ہوش میں آ گئی ہیں۔'' یہ لفظ تھے یا کوئی مژدۂ جاں فزا۔ زارا کو لگا اس کے نیم مردہ وجود میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی تھی..... اس آواز اور جملے نے۔

اس نے فوراً آنکھیں کھولی تھیں۔ اس کے ایک طرف نرس کھڑی تھی اور دوسری طرف سفید اوور آل پہنے ان کے فیملی ڈاکٹر صفدر صاحب..... پھر اس کی نگاہ اس چہرے پر پڑی جس کی دید ایسی زندگی بخش کبھی نہیں رہی تھی جیسی اس وقت لگ رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اٹھے اور سجدے میں گر جائے اپنے پیارے رب کے حضور.....

''میرے اللہ جی..... پیارے اللہ جی..... بڑے رحیم بڑے کریم اللہ جی.....'' دل کی گہرائیوں سے یہ لفظ نکلے تھے اور وجود میں ایک ایسا سکون سرائیت کرتا محسوس ہوا تھا جو اس سے پہلے اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

''زارا..... میری جان.....'' خوشی سے بہتے آنسو کو دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے سمیہ نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ فرطِ مسرت سے اُن کے لب کانپ رہے تھے۔

''ماما..... مے..... ری..... پیاری ماما.....'' اس کے خشک ہونٹوں سے ٹوٹ، ٹوٹ کر یہ لفظ نکلے تھے اور آنکھوں سے جیسے آنسوؤں کا اِک جھرنا پھوٹ نکلا تھا۔

''مسز علی..... اب فکر کی کوئی بات نہیں..... ابھی

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد زارا بیٹی بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں گی۔ اس انجکشن کے بعد روم میں شفٹ کر دیں گے، جتنی دیر سوئے، سونے دیں جاگنے پر سب مل سکتے ہیں۔''

''اب میں نے سونا نہیں ہے ڈاکٹر انکل..... مجھے نماز پڑھنی ہے..... مجھے اللہ کا شکر ادا کرنا ہے۔'' اس نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن نرس نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے روک دیا تھا۔

''ضرور بیٹا جی لیکن تھوڑا ریسٹ کرنے کے بعد۔'' ڈاکٹر صاحب نے نرمی سے کہتے ہوئے نرس کو اشارہ کیا تھا۔ وہ آگے بڑھی تھی اور اسے انجکشن لگا دیا تھا۔

☆☆☆

''بھابی..... اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ہے زارا کو ہوش آ گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں دو تین گھنٹے اسے سونے دیں۔ آپ سب گھر جائیں اب اور فنکشن کی تیاری کریں..... زارا اب بالکل ٹھیک ہے۔'' مسرت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے سمیہ بھابی کے گلے لگی تھیں۔

''زارا کو ہوش آ گیا ہے..... تھینک گاڈ.....''

نرجس کا لہجہ بھی خوشی سے بھرپور تھا۔

''مبارک ہو بھابی.....'' وسیم احسن نے قریب پہنچتے ہوئے مبارک باد دی۔

''میں علی بھائی کو بتا کر آتا ہوں..... وہ کہہ رہے تھے میں اب بھی مسجد سے واپس آؤں گا جب زارا کو ہوش آئے گا۔''

''اور اللہ نے ان کی سن لی۔'' سمیہ نے نم آنکھوں کے ساتھ تشکر بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''روم میں کب شفٹ کریں گے؟'' نرجس بیگم نے عثمان صاحب سے پوچھا تھا جو زارا کو دیکھ کر خوش، خوش آ رہے تھے۔

''ابھی کرنے کا کہہ رہے تھے۔''

''اچھا پھر میں روم میں شفٹ کروا کر جاتا ہوں علی بھائی کو بتانے کے لیے۔'' وسیم احسن باہر کی جانب بڑھتے ہوئے واپس پلٹے تھے۔

''سمیہ..... دل تو چاہ رہا ہے کہ زارا کو اٹھنے پر اس سے مل کر جائیں لیکن.....''

''نہیں بھابی، آپ لوگ فوراً جائیں..... پہلے ہی ٹائم بہت کم ہے..... اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ہے کہ زارا اب بالکل ٹھیک ہے۔''

☆☆☆

''تیرے وصل کی بے خودی کہہ رہی ہے
خدائی تو کیا ہم خدا کو بھلا دیں''

وہ گنگناتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی جب دادی جان نے آواز دے کر اسے پاس بلایا تھا۔

''کس کا شعر ہے یہ.....؟''

''اختر شیرانی کا..... اچھا ہے ناں دادی جان..... پوری غزل سناؤں؟'' اس نے پُرشوق لہجے میں کہتے ہوئے ڈائری کھولی تھی۔

''وہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بھلا دیں
محبت کریں، خوش رہیں، مسکرا دیں
غرور اور ہمارا غرورِ محبت
مہ و مہر کو ان کے در پر جھکا دیں
جوانی ہو گر جاودانی تو یارب!
تیری ساری دنیا کو جنت بنا دیں
تیرے وصل کی بے خودی کہہ رہی ہے
خدائی تو کیا .....''

انہوں نے ایک دم اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''نہ میرے بچے، یہ شعر نہیں..... اللہ سے آگے نہ کسی کو شاعری میں رکھتے ہیں نہ کہیں اور..... اچھی بھلی غزل ہے لیکن یہ شعر..... اس کو ابھی کاٹ دو بچے..... دوبارہ اس کو تمہاری زبان پر نہیں آنا چاہیے، بے شک شاعری پڑھو، ناول پڑھو، ڈراما دیکھو لیکن ایسی کوئی چیز نہیں جس میں کوئی انسان رب سے آگے ہو کیونکہ ہر گناہ کی معافی ہے لیکن شرک کی معافی نہیں ہے۔'' وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی تھیں پھر اس کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا تھا۔

''بس میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا رب کو کبھی مت بھلانا اور انسان کو رب کی طرح کبھی مت چاہنا میرے بچے..... جو بھی انسان کو رب کی طرح چاہتا ہے..... اسے رب کے مقام پر لا بٹھاتا ہے..... وہ بڑی ذلت اٹھاتا ہے..... بے حد ذلت۔''

''دادی جان۔'' ان کے لہجے کی کپکپاہٹ پر اس نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کو تھامے ان کے ہاتھوں پر اپنا

دوسرا ہاتھ رکھتے ہوئے ان کی بات کو یاد رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر وہ یہ وعدہ..... ہاں یہ وعدہ بھول گئی تھی۔

''کیوں..... کیوں بھول گئی تھی وہ یہ وعدہ.....''

بے حد مضطرب ہوتے دل کے ساتھ اس نے سوچا تھا اور کسی بہت بھاری بوجھ سے لدی اپنی پلکوں کو کھولنے کی کوشش کی تھی۔ مندی، مندی آنکھوں سے کمرے کی چھت کو دیکھتے ہوئے اس نے گہری سانس لی تھی۔

پھر کھوئے، کھوئے سے انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے سامنے کیا تھا اور کئی لمحے بے چین نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں تھا ان ہاتھوں میں..... اس کے دامن کی طرح یہ ہاتھ بھی بالکل خالی تھے۔ اور..... ان خالی ہاتھوں اور خالی دامن والی زارا کو اس کے رب نے معاف کر دیا تھا۔

''اگر معاف نہ کرتا تو اور ذلت سے دوچار کرتا..... پھر اور..... پھر اور.....'' اس نے بے اختیار جھرجھری لی تھی۔ روئیں، روئیں کو کھڑا ہوتا محسوس کیا تھا۔ پھر وہ بے تابانہ اٹھی اور بیڈ پر ہی سجدے میں گر گئی تھی۔

''میرے اللہ! بے حد عظیم..... میرے اللہ..... بے حد کریم..... میرے اللہ.....'' آنسوؤں کی یورش کے درمیان..... ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان..... اس کے لبوں سے بس بار، بار یہی لفظ نکل رہے تھے۔

اس نے دادی جان سے اللہ کی اپنے بندوں سے محبت اور رحمت کے بہت سارے واقعات سنے تھے۔ اس نے امی جان سے سوتیلی کرنے والے کو معافی ملنے کا واقعہ بھی سنا تھا لیکن کبھی اس کے دل پر یوں اثر نہیں ہوا تھا جیسے اس وقت ہو رہا تھا۔

اسے لگ رہا تھا وہ ان سب سے زیادہ گناہ گار تھی۔ اسے وہ پورا جملہ یاد آ گیا تھا جو وہ روتے، بلکتے ہوئے گیٹ پر دونوں ہاتھوں کو مارتے ہوئے کہنا چاہ رہی تھی مگر لفظوں نے اس کے لرزتے لبوں پر دم توڑ دیا تھا اور یہ یقیناً اس کی دادی جان کی اس کے لیے کی گئی بے تحاشا دعاؤں اور اللہ کے خصوصی کرم کی وجہ سے تھا کہ وہ لفظ اس کے لبوں سے نہیں نکلے تھے۔

لیکن لبوں سے نہیں نکلے تھے تو کیا ہوا..... اس کے دل میں تو تھے اور اللہ تعالیٰ تو دلوں میں بستے ہر خیال، ہر بات سے آگاہ ہے۔ اس کے آنسوؤں میں کچھ اور روانی آئی تھی۔ ہچکیاں اور سسکیاں کچھ اور بلند ہوئی تھیں۔ اس نے کہا تھا۔

''یا اللہ! میں کیسے اس شخص کو یقین دلاؤں کہ میں.....'' اس کے آگے لفظ اس کے لبوں پر دم توڑ گئے تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ لفظ کیا تھے..... کہ ''میں اس شخص سے کتنی محبت کرتی ہوں..... اتنی محبت کہ اتنی تو شاید میں اپنے رب سے بھی نہیں کرتی۔''

''نہیں..... نہیں..... میرے..... اللہ..... میں یہ نہیں کہہ سکتی..... کبھی نہیں کہہ سکتی۔'' اس نے روتے ہوئے تکیے پر سر مارا تھا جو وہ کہہ نہیں سکتی تھی، وہ کر کیسے سکتی تھی لیکن وہ کرتی رہی تھی..... اس کا دل کہیں بہت دور..... کسی گہرے پاتال میں ڈوب کر ابھرا تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس حقیقت کو جھٹلا دیتی۔ کسی بھی طرح چھپا لیتی..... لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ انسان ساری دنیا کو جھٹلا دے مگر وہ خود کو نہیں جھٹلا سکتا۔ خود کو..... خود سے نہیں چھپا سکتا۔

آہ یہ کیسا گناہ سرزد ہوا تھا اس سے..... اور وہ اب کیا کرے..... کیسے اس گناہ کی معافی مانگے، کیسے اس کی تلافی کرے، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بس وہ زار و قطار روتے ہوئے ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان ''اللہ..... میرے اللہ'' کہتی کبھی دعا کی صورت ہاتھ اٹھاتی تھی، کبھی سجدے میں چلی جاتی تھی۔ اس وقت اسے یہ قطعاً یاد نہیں تھا کہ کل اس کے ساتھ کیسی قیامت گزری تھی۔

کائنات کیسے اس کے لیے ہر رنگ، نور اور رعنائی سے خالی ہو گئی تھی۔ زمین کیسے ایک جھٹکے سے اس کے قدموں تلے سے کھینچ لی گئی تھی۔ اس کے ہر طرف کیسا تاریک اور مہیب خلا تھا جس میں اس کا وجود معلق تھا اور اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اب یہ خلا ہی اس کا مقدر تھا۔ اس وقت اسے لگا تھا یہ اذیت جس سے وہ دوچار تھی کبھی ختم ہونے والی نہیں تھی۔ دنوں اور مہینوں تک تو کیا سالوں تک فراموش کی جانے والی نہیں تھی۔

لیکن ہوا کیا تھا..... صرف ایک دن اور ایک رات میں ہی وہ سب بھول گئی تھی۔ مقامِ حیرت تھا لیکن کائنات میں اس سے زیادہ حیرت ناک واقعات موجود ہیں۔ ایک مقدس لفظ ''کن'' کہہ کر پوری کائنات کی تخلیق کا معجزہ دکھانے والے بے حد عظیم رب کو حیران کرنے میں لطف

آتا ہے شاید..... تبھی تو جب چاہتا ہے کائنات کے ذرے، ذرے میں پنہاں اپنی عظمت اور قدرت کو کسی پر عیاں کرتا ہے اور پھر اسے خوب ہی حیران کرتا ہے۔

☆☆☆

ماما نے اسے کچھ دیر سونے کی تاکید کے ساتھ کمرے میں بھیجا تھا اس نے سونے کی کوشش بھی کی تھی لیکن شدید تھکن اور ساری رات کی بے خوابی کے باوجود نیند کا دور دور تک کہیں نام ونشان نہیں تھا۔

لیٹ کر کروٹیں بدلنے سے اسے ویسے ہی بے حد کوفت ہوتی تھی اس لیے وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

قدم خود بخود الماری کی جانب بڑھے تھے چند لمحوں بعد جب وہ کئی البمز ہاتھوں میں تھامے بیڈ کی جانب آرہا تھا تو اس کے دل کے عجیب سے احساسات تھے۔ چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

آج آخری بار وہ اسے جی بھر کر دیکھنا چاہتا تھا۔

اس نے البمز بیڈ پر رکھی تھیں اور بیڈ پر آلتی پالتی مارتے ہوئے تسلی سے بیٹھ گیا تھا۔ اس کی شادی کے بعد جب بھی اس کا خیال آیا اس نے دل کو ڈپٹا تھا لیکن آج اس نے دل کی مان لی تھی۔ آج وہ اس کے ساتھ گزرے ایک، ایک لمحے کو یاد کرنا چاہتا تھا۔

کیسے وہ ہر بات میں اس کی حمایت کیا کرتا تھا۔ اس کے پیچھے دوسرے کزنز سے لڑ پڑا کرتا تھا۔ ضد کر کے ہر کھیل میں اس کا پارٹنر بنا کرتا تھا۔ بنا ذرا سا تھکے یا بیزار ہوئے اس کے ساتھ شاعری کی کتابوں کے لیے بک شاپ پر پھرا کرتا تھا۔ لیکن ابھی..... وہ بیٹھا ہی تھا کہ اس کے سیل کی بیپ بجنے لگی تھی۔ اس نے سیل فون اٹھایا تھا۔ اجیہ کی کال تھی۔ اس نے فون سائلنٹ کر دیا۔ وہ اس سے کیا بات کرتا۔ کیسے خود کو کمپوز کرتا..... ویسے بھی اس وقت اس کا اس سے بات کرنے کا موڈ نہیں تھا۔

اس نے موبائل رکھتے ہوئے ایک البم اٹھائی ہی تھی کہ کال پھر آئی تھی۔ اس نے موبائل کی روشن اسکرین پر نگاہ ڈالی اور تیزی سے موبائل اٹھاتے ہوئے کال ریسیو کی۔

''جی پھپھو..... سب ٹھیک ہے ناں.....؟''

دھڑکتے دل سے پوچھتے ہوئے وہ گھڑی کے چوتھائی پل میں ان کا جواب سن لینا چاہتا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے حنان..... سب ٹھیک ہے، زارا سو رہی ہے میرا دل چاہ رہا تھا تم سے بات کرنے کو..... مجھے سچ، سچ بتاؤ حنان..... تم گئے تو کیا واقعی اثیر گھر پر نہیں تھا؟''

''میں جھوٹ بھلا کیوں بولوں گا پھپھو.....؟'' ان کے لہجے پر وہ سب کچھ بھول کر جلدی سے سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

''تو پھر کیا وہ زارا کو یوں بے ہوش چھوڑ کر کہیں نکل گیا تھا.....'' اسے لگا وہ ابھی رو دیں گی۔

''پھپھو..... اس وقت آپ کسی اور بات پر غور نہ کریں..... صرف یہ دیکھیں کہ زارا ہوش میں آگئی ہے ناں..... اللہ نے آپ کی، ہم سب کی دعائیں سن لی ہیں۔'' پھر وہ ان کو ریلیکس کرنے کے لیے کتنی ہی دیر ان سے بات کرتا رہا تھا۔

جب فون بند کیا تو البمز دیکھنے کا ٹائم ہی نہیں رہ گیا تھا اس کے پاس..... ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے وہ اٹھا تھا اور البمز اٹھا کر الماری میں واپس رکھ دی تھیں۔

☆☆☆

وہ وضو کر کے واش روم سے نکلی تھی جب سمیہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ حیران و پریشان سی بھاگتے ہوئے اس کی جانب آئیں۔ وہ تو اس لیے حنان کو فون کرنے کے لیے باہر چلی گئی تھیں کہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق اسے انجکشن کے زیر اثر ابھی کافی دیر تک سویا رہنا تھا لیکن وہ تو جانے کس وقت کی اٹھی ہوئی تھی۔ آنکھیں گریہ وزاری سے سرخ اور متورم ہو رہی تھیں۔ اتنی دیر باہر جانے پر خود کو ملامت کرتی سمیہ نے جلدی سے ٹاول اٹھا کر اس کا چہرہ اور ہاتھ خشک کیے تھے اس کی سرخ آنکھوں اور سرخ ناک کے برعکس اس کے چہرے پر سکون تھا۔

''ماما مجھے نماز پڑھنی ہے..... کیا بچھاؤں نیچے.....''

''زارا ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میری جان..... دیکھو جسم کیسے کانپ رہا ہے۔ اچھا بستر پر آجاؤ لیٹ کر اشارے سے پڑھ لو۔''

''ماما! مجھے جائے نماز یا پھر کوئی چادر چاہیے۔'' اس نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

''اچھا، تم بیڈ پر بیٹھو میں لے کر آتی ہوں۔'' اسے بیڈ پر بٹھا کر وہ چند لمحوں میں جائے نماز لے کر آئیں تو اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگ رہے تھے۔ جائے نماز ان کے ہاتھ میں دیکھتے ہی اس نے اٹھ کر تیزی سے

جائے نماز ان کے ہاتھ سے لے لی تھی۔

''ماما! کیسے بچھاؤں.....'' سمیہ نے جائے نماز اس کے ہاتھوں سے تھامی اور بچھا دی۔ وہ یوں بے تابی سے جائے نماز پر آئی تھی اور ایسی بے قراری سے نماز شروع کی تھی کہ سمیہ اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔

جب تک وہ نماز پڑھتی رہی وہ ٹکر، ٹکر اس کے چہرے کو دیکھتی رہی تھیں۔ پھر ان کی آنکھوں سے بھی خود بخود آنسو بہنے لگے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی انسان کے روتے ہوئے چہرے پر آنسوؤں میں اتنے رنگ نہیں دیکھے تھے جتنے اس وقت ان کی بیٹی کے آنسوؤں میں گھلے ہوئے تھے۔ کبھی لگتا تھا یہ آنسو خوف سے بہہ رہے تھے۔ کبھی لگتا تھا یہ آنسو پچھتاوے اور ملال کے تھے اور پھر اس کے چہرے کی ملائمت اور طمانیت دیکھ کر انہیں محسوس ہوا کہ شاید یہ آنسو خوشی کے تھے، شکر کے تھے۔

''آخر اتنی سی دیر میں کیا ہوا تھا اس کے ساتھ.....''

ابھی انہوں نے پریشانی سے سوچا ہی تھا کہ اس نے آہستگی سے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے تھے۔

''ماما! آپ کو پتا ہے اللہ اپنے بندے سے کتنی محبت کرتے ہیں..... نہیں آپ نہیں جان سکتیں۔'' اس نے تیزی سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ تھا۔ [illegible] ہیں ماما! [illegible] میں ایسا [illegible] ابھی ابھی پریشان ہوں [illegible] رہیں۔

''ماما آپ کو دادی جان کا سنایا ہوا بنی اسرائیل کے اس نوجوان کا واقعہ یاد ہے جو بے حد گناہ گار تھا۔'' سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

''نہیں میری جان، مجھے تو یاد نہیں۔'' انہوں نے اپنی ہتھیلیوں سے اس کے رخسار صاف کرتے ہوئے دھیمی سی آواز میں کہا تھا۔

''ماما..... بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا دنیا کی ہر بری عادت اس میں موجود تھی۔ اس کی بری عادات سے تنگ آکر بستی والوں نے اسے بستی سے نکال دیا۔ بستی سے دور وہ ایک صحرا میں جا پڑا جہاں دور، دور تک ویرانی ہی ویرانی تھی۔ نہ کوئی آواز نہ کوئی چاپ..... ہر سو بس سناٹا اور تنہائی۔ چند ہی دنوں میں وہ اس سناٹے اور تنہائی سے گھبرا گیا اور بیمار پڑ گیا۔ کھانے پینے کا سامان ختم ہوا تو فاقوں کی نوبت آ گئی۔ بھوک اور بیماری سے تنگ بے بسی کی حالت میں اس نے آسمان کی جانب دیکھا اور پکارا۔

''اے میرے رب میں تیرا نافرمان تھا۔ میں نے بڑے گناہ کیے، بڑی نافرمانیاں کیں لیکن اب میں بہت بے بس ہوں اور بے یار و مددگار ہوں۔ اگر مجھے معاف کر دینے سے تیری خدائی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی تو مجھے معاف کر دے..... میں تنہا ہوں مجھ پر رحم فرما اور میرا ساتھی بن جا۔''

یونہی اللہ کو پکارتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے اور فریاد کرتے ہوئے اس کی جان نکل گئی۔ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فلاں ویرانے میں ہمارا ایک دوست ہے اس کا جنازہ پڑھو اور اس کے کفن کا انتظام کرو اور اعلان کر دو کہ جو اس کے جنازے میں شرکت کرے گا میں اس کی بخشش کر دوں گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اعلان کیا تو لوگ فوراً صحرا کی طرف بھاگے۔ وہاں پہنچے تو اس شخص کو پڑا دیکھا جس میں دنیا کی ہر برائی تھی۔ جس نے اللہ کی نافرمانی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ہر شخص حیران و پریشان تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا۔

''یا اللہ! اس شخص نے تو ہمیشہ آپ کی نافرمانی کی۔ آپ [illegible] پھر یہ آپ کا دوست کیسے ہو گیا.....؟''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ''اے موسیٰ! تم ٹھیک کہتے ہو یہ میرا نافرمان تھا لیکن جب بے بسی اور بیماری کی حالت میں اس نے مجھے پکارا تو میری رحمت یوں جوش میں آئی کہ مجھے میرے جلال کی قسم اگر یہ مجھ سے تمام دنیا کے مسلمانوں کی بخشش طلب کرتا تو میں سب کو معاف کر دیتا۔''

زارا کو پورا واقعہ جیسے لفظ بہ لفظ یاد آ گیا تھا۔ وہ کمزوری کے باوجود بہت بول رہی تھی۔

''پتا ہے ماما..... جب دادی جان نے یہ واقعہ سنایا تھا تو مجھے لگتا تھا کہ ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے لیکن اب مجھے پتا چلا ہے کہ واقعی ایسا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سچ میں اپنے بندے سے بے حد محبت کرتے ہیں ماما..... تبھی تو اس کی صرف ایک پکار پر اس کی ساری خطاؤں کو اس کے سارے گناہوں کو معاف فرما دیتے ہیں۔'' وہ بے حد جذب کے عالم میں کہہ رہی تھی اور سمیہ حیران سی اس کی سرخ ہوتی ناک اور آنکھوں کو دیکھ رہی تھیں۔

کس قدر بدلی ہوئی لگ رہی تھی وہ..... آخر ایسا کیا ہوا تھا جس نے اسے یک دم یوں بدل کر رکھ دیا تھا۔

''ماما! میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیسے شکر ادا کروں اس قدر محبت کرنے والے رب کا..... ماما میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اللہ کو اپنے بندوں سے اتنی محبت ہے کہ وہ عبادتیں لے کر آنے والوں سے ہی نہیں ندامتیں لے کر آنے والوں سے بھی اتنی ہی محبت کرتا ہے۔ وہ یاد رکھنے والوں کو ہی نہیں بھول جانے والوں کو بھی قریب رکھتا ہے۔ وہ رو کر تڑپ کر مانگنے والوں کی تو سنتا ہی ہے..... یوں ہی بلا ارادہ پکارا اٹھنے والوں کو بھی مایوس نہیں کرتا۔ ماما! انسان کیسے بھول جاتا ہے اپنے اللہ کی اس قدر محبتوں کو..... کیسے وہ دور ہو جاتا ہے اپنے اس قدر چاہنے والے رب سے.....'' بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہ اس قدر دلگداز لہجے میں کہہ رہی تھی کہ بے اختیار سمیہ کے آنسو بھی بہہ نکلے تھے۔

☆☆☆

کتنی ہی دیر سے وہ فون ہاتھوں میں لیے اس سے بات کرنے کی ہمت باندھ رہے تھے لیکن ہر بار اپنی ہی کوئی بات یاد آتی تھی اور ہمت ٹوٹ جاتی تھی۔ اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

''سچ، سچ بتاؤ..... کہاں گلچھرے اڑائے ہیں؟''

اُف، شرم سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ وہ جیسے خود سے بھی نگاہیں ملانے کے قابل نہیں تھے۔

''جاؤ چلی جاؤ اپنے اسی عاشق کے پاس جس کے ساتھ عیاشی کر کے آئی ہو۔'' اپنا ایک اور جملہ ان کے کانوں میں گونجا تھا اور انہوں نے بے اختیار اپنے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑا تھا۔ ان کا دل چاہا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔ کس قدر گرا لیا تھا انہوں نے خود کو اس کی نگاہوں میں۔

''اور اپنی نگاہوں میں؟'' ان کے اندر سے کسی نے تمسخرانہ سوال کیا تھا۔

☆☆☆

حنان جانے کب سے خاموش اور گم صم سا در یچے میں کھڑا آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آسمان پر دور تک بادل چھائے ہوئے تھے لیکن ہوا بند ہونے کی وجہ سے فضا میں عجیب سا حبس تھا۔ اس کے دل میں بھی تو ایسا ہی حبس تھا۔ نظر نہ آنے والی لیکن محسوس کی جانے والی اداسی تھی۔

بظاہر تو وہ حدید بھائی اور صبا کے ہنسی مذاق کو انجوائے کر رہا تھا۔ ماما کی مسرت بھری مصروفیات پر مسکرا رہا تھا لیکن اس کے دل میں گہرا سکوت تھا اور اسپتال میں بے ہوش پڑی زارا کا چہرہ بار، بار تصور میں آ کر اس سکوت کو کچھ اور بڑھا رہا تھا۔

☆☆☆

''ایک بہت بڑی خوش خبری ہے میرے پاس آپ کے لیے سمیہ میم..... آپ نانی جان بننے والی ہیں.....'' سسٹر طاہرہ نے کمرے میں داخل ہوتے بڑے پُرجوش لہجے میں کہا تھا۔

''کیا.....؟'' سمیہ نے حیرانی اور مسرت کے ملے جلے تاثرات سے سسٹر طاہرہ کو دیکھا تھا۔

''دیکھا ماما..... میں کہہ رہی تھی ناں آپ سے.....'' آدھی سوتی آدھی جاگتی زارا بے حد پُرجوش لہجے میں کہتے ہوئے جھٹ سے اٹھ بیٹھی تھی۔ آنکھیں مارے خوشی کے بھر آئی تھیں۔

''اب تو آپ کو پتا چل گیا ناں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے بے حد پیار کرتے ہیں۔'' وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔

''دیکھا آپ نے..... پیارے اللہ جی نے..... نہ صرف مجھے معاف کر دیا ہے بلکہ اتنی بڑی گڈ نیوز دے کر مجھے اپنے راضی ہونے سے آگاہ بھی کر دیا ہے۔'' وہ کچھ روتے کچھ مسکراتے لبوں کے ساتھ مسرت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی اور سمیہ پیار بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

ہال کے داخلی دروازے سے لے کر اسٹیج تک پھولوں کی بے حد منفرد آرائش نے اسے متاثر کیا تھا نہ اسٹیج کی بے حد دلکش سجاوٹ نے..... بقول سب کے مائرہ کا خیرہ کن حسن تو اسے آج ضرور ہی چاروں شانے چت کر دینے والا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس حسن نے اس کی نگاہ تک کو بے اختیار نہ کیا تھا۔

مگر زندگی کے ہر معاملے میں فیئر رہنے کی اس کی نیچر نے مائرہ کو انگوٹھی پہناتے ہوئے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اب اسے ہر حال میں زارا کو اپنے دل و دماغ سے نکالنا تھا۔ گو یہ سوچتے ہوئے اسے بڑی تکلیف ہوئی تھی لیکن یہ بات اس کے لیے اس سے بھی زیادہ

تکلیف دہ تھی کہ وہ مائرہ سے زندگی بھر کا بندھن باندھتے ہوئے بھی زارا کو سوچتا، اسے دیکھتے ہوئے اس سے بات کرتے ہوئے زارا کو دیکھتا۔ اسے یہ نہیں کرنا تھا۔ اس کے لیے وہ اپنے دل کو جیسے بھی سمجھاتا، جس طرح بھی مناتا..... اسے منانا تھا۔ اسے باقی رشتوں کی طرح اس رشتے کو بھی پوری ایمان داری سے نبھانا تھا۔

مائرہ کے عقب سے ابھرتے زارا کے عکس سے نگاہ بچاتے ہوئے حنان نے خود سے عہد کیا تھا۔

☆☆☆

''علی..... آپ.....'' سمیہ نے کچھ کہتے ہوئے یک دم لبوں کو بھینچ لیا تھا۔ اگر ان کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا تو وہ کیوں دھیان دلا کر انہیں ایک اور فکر سے دوچار کرنا چاہتی تھیں۔

''کیا بات ہے.....؟''

''کچھ نہیں.....'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

علی رضا خاموش ہو گئے لیکن وہ جیسے کسی گہری سوچ میں تھے۔

''آپ کچھ سوچ رہے ہیں؟ اور صرف سوچ نہیں رہے اچھے خاصے پریشان بھی ہیں۔''

''تم نہیں ہو گیا؟'' انہوں نے ایک دم پوچھا تھا اور [illegible] آنکھوں [illegible] انہیں دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

''[illegible] تم نے حنان لوگوں کو بتایا [illegible] وہ زارا کو لینے آئے تو [illegible] پانچ منٹ ہوئے تھے زارا کو گھر چھوڑے ہوئے اور پانچ منٹ ہی لگے ہوں گے اسے واپس جانے میں..... وہ واپس گیا تو زارا پورچ میں بے ہوش پڑی تھی۔ گھر میں ملازمہ کے سوا کوئی نہیں تھا تو پھر آخر زارا کے چہرے پر انگلیوں کے نشان کیسے ہیں اور تم نے دیکھا تھا ناں زارا کی آنکھیں اور چہرہ متورم تھا جیسے وہ بہت دیر تک روتی رہی ہو۔ سمیہ! کیا اثیر مار سکتا ہے زارا کو..... جسے ہم نے کبھی ڈانٹا تک نہیں..... اونچی آواز میں بلایا تک نہیں، مارنا تو بہت دور کی بات ہے۔'' وہ دکھ بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

سمیہ جو اب تک اس خیال سے ضبط کیے ہوئے تھیں کہ انہیں پتا نہیں تھا۔ اب انہوں نے بات کی تو..... بے اختیار ان کے آنسو بہہ نکلے۔

''آپ کو کیا پتا اس وقت میرے دل پر کیا گزر رہی ہے..... ہماری اتنی پیاری بیٹی جسے ہم نے کبھی دو انگلیوں سے نہیں چھوا اس ظالم نے اس سے جانے کیا سلوک کیا ہے کہ وہ برداشت نہیں کر سکی اور صدمے سے بے ہوش ہو گئی اور اسے اس حالت میں چھوڑ کر جانے خود کہاں دفع ہو گیا۔ اگر میں فون نہ کرتی..... حنان واپس نہ جاتا۔'' وہ گلوگیر لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''لیکن آخر ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ اثیر احمد نے یوں بی ہیو کیا، وہ بھی ایسی حالت میں جبکہ وہ.....'' ان کے متغیر اور پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے سمیہ نے فوراً خود کو سنبھالا تھا۔ ''وہ تو زارا کو بھی ابھی پتا چلا ہے..... اثیر کو تو [illegible] ہی نہیں ورنہ شاید وہ ایسا نہ کرتا.....''

''ہوں..... شاید.....'' انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کنپٹیوں کو دبایا تھا۔

''میں سوچ رہا ہوں صبح کال کروں تاکہ پتا چلے کہ وہ کہتا کیا ہے۔''

''حد کرتے ہیں آپ بھی علی..... کوئی ضرورت نہیں آپ کو بالکل بھی فون کرنے کی۔''

''اچھا تم اس بات کو زیادہ دل پر نہ لو..... میاں بیوی میں سو باتیں ہو جاتی ہیں..... دیکھنا یہ خوش خبری ملتے ہی بالکل سیدھا ہو جائے گا۔'' سمیہ نے ایک لمحے کے لیے شکوہ کناں نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا پھر بنا کہے ان کے دل کی بات کو جان کر ہمیشہ کی طرح خاموشی سے ان کی خوشی پر سر جھکا دیا تھا۔

☆☆☆

''ماما! تھوڑی دیر کے لیے زارا سے ملنے چلتے ہیں۔'' میرج ہال سے نکل کر گاڑی کی جانب بڑھتے ہوئے حنان نے ماں سے سرگوشی کی تھی۔

انہوں نے ایک گہری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی تھی پھر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''عثمان صاحب..... کیا خیال ہے اسپتال سے ہوتے ہوئے نہ گھر چلیں..... کیونکہ گھر جا کر کپڑے وغیرہ چینج کرتے تو بہت دیر ہو جائے گی۔''

''ہاں بالکل ٹھیک ہے..... ہوتے ہوئے چلتے ہیں۔''

''کیوں احسن.....؟'' انہوں نے مڑ کر احسن صاحب سے پوچھا تھا۔

''بہت تھکن ہو گئی ہے..... میرا خیال ہے صبح پر

رکھتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے تم اور بھابی گھر چلو..... ہم چکر لگا کر آتے ہیں۔'' عثمان صاحب نے کہا تھا اور حنان نے گاڑی اسپتال کی جانب موڑ لی تھی۔ کچھ دیر ہی میں وہ لوگ اسپتال پہنچ گئے تھے۔ دروازے پر ایک لمحے کے لیے حنان کے قدم رکے تھے۔ اس کے ذہن میں فیروزاں کی باتیں گونجی تھیں۔

کوئی غلطی نہ ہوتے ہوئے بھی اسے اپنا آپ مجرم محسوس ہوا تھا لیکن پھر اس نے سر جھٹک کر خود کو کمپوز کیا تھا۔ جب اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا پھر وہ شرمندہ کیوں تھا۔

وہ لوگ کمرے میں داخل ہوئے تو زارا اور سمیہ ایک دوسرے کی گردن میں بازو ڈالے باتیں کر رہی تھیں۔ حنان نے فوراً اس خوب صورت سین کو کیمرے میں قید کرلیا تھا۔ صبا بھاگ کر زارا کے گلے لگ گئی۔ حنان نے ہاتھ میں تھامے بوکے میں سے سرخ گلاب نکال کر پتیاں توڑ کر ان کے اوپر پھینکی تھیں۔

سب باری، باری اس سے مل رہے تھے۔ حنان سب سے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں بار، بار اس کے زرد چہرے پر جا ٹھہرتی تھیں جبکہ وہ اس سے نگاہیں چرا رہی تھی۔

اس نے اسے منگنی کی مبارک باد تو دی تھی لیکن اور کوئی بات نہیں کی تھی۔ کیا وہ اسے قصوروار سمجھ رہی تھی لیکن وہ ایسا کیسے سمجھ سکتی تھی۔ نفی میں سر جھٹکتے ہوئے وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر ایک طرف بیٹھے ہوئے اشیر احمد کو ٹیکسٹ کیا تھا اور پھر اپنی انگیجمنٹ کی اور زارا کی سمیہ کے ساتھ لیٹے ہوئے اور سب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تصویریں واٹس ایپ کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھر چکی تھی اور کمرا دھوئیں سے..... جسم تھکن سے شل تھا اور دماغ سوچ، سوچ کر..... لیکن کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کریں۔ یونہی بے خیالی میں موبائل اٹھا کر واٹس ایپ آن کیا تھا اور الجھے، الجھے سے انداز میں سر میں انگلیاں پھیرنے لگے تھے۔

تبھی واٹس ایپ ہپ بجی تھی۔ انہوں نے چونک کر وال کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے واٹس ایپ چیک کیا اور پھر ان کی نگاہیں موبائل کی اسکرین پر ہی جم کر رہ گئی تھیں۔

وہ یقیناً اسپتال کا کمرا تھا جس میں وہ بچوں کی طرح اپنی ماما کے گلے میں بازو حمائل کیے دراز تھی۔ وہ سب لوگ شاید انگیجمنٹ فنکشن کے بعد سیدھا اسپتال آئے تھے بے شمار لمحے ان کی نگاہیں اس کے زرد چہرے کا احاطہ کیے رہی تھیں۔

بے حد کمزور دکھتے، زرد چہرے اور آنکھوں کے نیچے پڑے حلقوں کے ساتھ بھی وہ انہیں اتنی اچھی لگ رہی تھی جتنی پہلے کبھی نہیں لگی تھی۔

''اشیر بھائی! آپ کے اور زارا کے بغیر میری انگیجمنٹ کا فنکشن ادھورا سا رہا۔ زارا نے تو اسپتال میں بستر سنبھالا ہوا تھا مگر آپ کہاں غائب ہیں..... سیل بھی بند ہے..... سب بے حد فکرمند ہیں آپ کے بارے میں.....'' موبائل رکھتے ہوئے وہ خود کو ندامت کے گہرے پاتال میں اترتا محسوس کر رہے تھے۔ اب وہ اچھی طرح جان گئے تھے کہ سارا کیا دھرا اس بدگمانی کا تھا جو اُن کے دل کی گہرائیوں میں پنجے گاڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ ایسے ہی تو اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ:

''اے ایمان والو! بہت سی بدگمانیوں سے بچو۔ یقین مانو کہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں۔'' (سورۂ حجرات:12)

اور وہ گناہ بار، بار کرتے رہے تھے۔ حالانکہ امی جان نے انہیں سمجھایا تھا اور پھر کتنی بار تو یہ حدیث ان کی نگاہوں سے گزری تھی۔

آپ نے فرمایا: ''تم بدگمانی سے بچو اس لیے کہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔'' (بخاری:5143، مسلم:2563)

اور وہ اس سب سے بڑے جھوٹ کو سب سے بڑا سچ جان کر اپنی زندگی، اپنی خوشیاں داؤ پر لگا بیٹھے تھے۔

یہ تو اللہ تعالیٰ کا ان پر خاص احسان تھا کہ وہ بدگمانی اور جھوٹ کے اس جال میں پھنس کر بھی کسی بڑے نقصان سے بچ گئے تھے۔ اگر اس دن اچانک پورچ سے کچھ گرنے کی زوردار آواز نہ آتی اور وہ زارا کو جھٹکے سے چھوڑتے ہوئے پورچ میں نہ جاتے.....

صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے میں جو چند لمحے لگے تھے انہوں نے ان کے غصے کی بے پناہ شدت میں تو کمی کی تھی یا نہیں لیکن شام کو ٹی وی پر سنا ہوا مولانا صاحب کا بیان یاد آگیا تھا جس میں انہوں نے ایک ہی وقت میں تین مرتبہ طلاق دینے کو شدید گناہ قرار دیا تھا۔

''میں اس ذلیل عورت کی خاطر خود کو گناہ گار کیوں

کروں ابھی دفعان کرتا ہوں۔ باقی دو طلاقیں بعد میں منہ پر ماروں گا۔'' سوچتے ہوئے انہوں نے اسے نجاست کی طرح گھر سے تو نکال دیا تھا لیکن خود گناہ گار ہونے کے خیال سے دوبارہ طلاق کے الفاظ نہیں دُہرائے تھے۔

یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں بڑی بربادی سے بچانا چاہتا تھا ورنہ انہوں نے تو اسے اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکال دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ تک نہیں سوچا تھا کہ اس کے نیم بے ہوش وجود کو گیٹ کے باہر پھینک رہے تھے جہاں ساری رات سڑک پر سے ٹریفک گزرتی تھی۔

کیسے سنگ دل انسان تھے وہ..... اور کس قدر چھوٹے دل و دماغ اور انتہائی کم ظرف..... اس وقت کے اپنے رویّے اور استعمال کی گئی زبان کو یاد کر کے شرمندہ بھی تھے اور حیران بھی۔

پتا نہیں اس وقت انہیں کیا ہو گیا تھا۔ شاید وہ اپنے ہوش میں ہی نہیں تھے ورنہ..... اس قدر بھی پست ذہنیت کے مالک نہیں تھے وہ۔ لیکن جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا تھا۔ اب وہ کیا کریں۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنی کنپٹیاں دباتے ہوئے سوچا تھا۔

کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد آخر ان کی سمجھ میں یہی آیا تھا کہ فی الحال وہ بیگ کے ذریعے حنان کو بابا جان کی وفات [illegible] میں بتا دیں اور پھر انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔

حنان کو جوابی واٹس ایپ کیا تھا کہ کل شام کو ان کے بابا جان وفات پا گئے تھے۔ انہوں نے زارا کے نمبر پر کال کی تھی لیکن نمبر بند تھا اور ان کے پاس کسی اور کا نمبر نہیں تھا اس لیے اطلاع نہیں کر سکے۔ زارا کے متعلق انہوں نے اور کوئی بات نہیں کی تھی کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیسے گھر پہنچی تھی اور سب کو اس نے کیا بتایا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

حنان نے چونکہ فیروزاں سے ملاقات کا ہی کسی کو نہیں بتایا تھا اس لیے اس سے ملنے والی توفیق احمد کی وفات کی خبر کا بھی کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔ آتے ہوئے کچھ سوچ کر اس نے فیروزاں کو منع کر دیا تھا کہ وہ اس کے آنے کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ اب جب اشیر احمد نے خود اپنے والد کی وفات کے بارے میں بتایا تو اس نے صبح سب کو آگاہ کر دیا۔

صبح زارا بھی کلینک سے گھر آ گئی تھی اس لیے عثمان صاحب، احسن صاحب، مسز احسن، سمیہ اور علی رضا ساہیوال جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ کلینک سے گھر آ کر زارا سو گئی تھی، اٹھی تو اسے اس صورتِ حال کا پتا چلا۔ ماما، پاپا اور انکل آنٹی کے ساہیوال روانگی کا سن کر وہ سخت پریشان ہو گئی۔

اس نے تو ماما، پاپا کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ اب جب وہاں جا کر ان کو پتا چلے گا کہ اشیر احمد نے ان کی بیٹی کو طلاق دے دی تھی تو ان پر کیا گزرے گی وہ کیسے اس ساری صورتِ حال کو برداشت کریں گے۔

''اُف..... کیا کروں اب۔ مجھے فون کر کے ماما، پاپا کو بتا دینا چاہیے۔'' سخت پریشانی سے اس نے سوچا تھا۔

''کیا بات ہے زارا..... طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

نرجس بیگم نے اس کے چہرے کے آتے جاتے رنگوں کو دیکھ کر فکرمندی سے پوچھا۔

''جی ممانی جان۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''کچھ سوچ رہی ہو؟''

''کچھ خاص نہیں..... ماما، پاپا کس وقت نکلے ہیں ساہیوال کے لیے؟''

''صبح ہی نکل گئے تھے پہنچ گئے ہوں گے اب تو.....''

''اچھا۔'' مرے، مرے سے انداز میں کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

''تو یہ تھا انجام میری محبت کا۔ صرف اپنے لیے نہیں اپنے ماں، باپ کے لیے بھی ذلت اور رسوائی.....'' تکیے میں منہ دیتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ وہ شاید..... بے حد پریشان ہوتی، روتی دھوتی اگر اس پر وہ لمحہ نہ بیتا ہوتا..... اس نے وہ خوف نہ جھیلا ہوتا۔

وہ لمحہ جب گاڑی کے بریک اس کے پاس آ کر چرچرائے تھے اور اس نے گیٹ کو ہاتھوں سے چھوٹتے اور ہوش و حواس کو ساتھ چھوڑتے محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

''کیسی طبیعت ہے اب آپ کی سمیہ بہن؟''

''میری.....؟'' سمیہ نے حیرانی سے عابدہ بیگم کو دیکھا اور اشیر احمد نے پہلو بدل کر چہرے کے تاثرات کو چھپایا۔

''ہاں اشیر نے بتایا تھا آپ کی طبیعت کافی خراب ہے۔''

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے..... میری نہیں زارا کی طبیعت خراب تھی پرسوں رات سے بے ہوش تھی وہ..... کل عصر سے کچھ پہلے ہوش آیا ہے.....'' سمیہ نے کن انکھیوں سے اثیر احمد کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بتایا۔

''اللہ رحم..... کیا کہہ رہی ہیں آپ..... کیا ہوا زارا بیٹی کو؟'' عابدہ بیگم ایک دم بے حد پریشان ہوگئیں۔

''یہ تو ہمیں بھی پتا نہیں..... شاپنگ سے واپسی پر حنان نے گھر ڈراپ کیا تھا اسے..... مجھے اچانک خیال آیا کہ حنان کی انگیجمنٹ پر پہننے کے لیے جو ڈریس لے کر دیا ہے وہ گاڑی میں ہی نہ بھول جائے وہ..... کیونکہ تھک بھی کافی گئی تھی اور طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی اس کی۔ حنان کو فون کیا تو اس نے بتایا کہ پھپھو دس منٹ پہلے میں نے زارا کو ڈراپ کر دیا ہے اور ڈریسز کا بیگ تو گاڑی میں ہی پڑا ہوا ہے۔ میں نے حنان کو واپس بھیجا کہ وہ ڈریس زارا کو دے کر آئے..... کیونکہ میں نے خاص طور پر اپنی ساڑی کے ساتھ میچ کرتے کلر کا ڈریس لے کر دیا تھا انگیجمنٹ پر پہننے کے لیے..... حنان جب وہاں پہنچا تو زارا پورچ میں بے ہوش پڑی تھی۔''

اثیر احمد نے چونک کر انہیں دیکھا اور بمشکل اپنے چہرے کے اڑتے رنگ پر قابو پانے کی سعی کی۔ شرمندگی اور پریشانی کے ساتھ، ساتھ حیرانی بھی ہوئی کہ حنان نے یہ کیوں کہا کہ زارا پورچ میں تھی جبکہ وہ تو گیٹ کے باہر تھی اور گیٹ اندر سے بند تھا۔

''حنان نے بھاگم بھاگ اسپتال پہنچایا جہاں ڈاکٹر نے بتایا کہ کوئی شدید صدمہ پہنچا ہے۔ اگر چوبیس گھنٹوں میں ہوش نہ آیا تو کوما میں جانے کا خدشہ ہے۔ ہمیں تو ابھی تک یہ معما سمجھ میں نہیں آیا کہ زارا آخر..... بے ہوش کیسے ہوئی اور وہ کون سی بات تھی جس نے اسے اس قدر صدمہ پہنچایا کہ اس کی یہ حالت ہوگئی.....'' انہوں نے آخری جملے کے ایک، ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا اور بغور اثیر احمد کا چہرہ دیکھا تھا۔

''شاید فیروزاں سے توفیق..... کی وفات کا پتا چلا ہو تو اس بات کو برداشت نہ کر پائی ہو..... ذرا سا تو دل ہے آج کل کی لڑکیوں کا..... کا کروچ، چھپکلی دیکھ لیں تو چیخیں مارنے لگتی ہیں اور طبیعت تو زارا کی مارکیٹ جانے سے پہلے بھی ٹھیک نہیں تھی۔'' عابدہ بیگم نے ایک نظر اثیر احمد پر ڈالتے ہوئے بات سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ تبھی علی رضا، احسن صاحب اور مسز احسن کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

''کیا خیال ہے سمیہ اب چلا نہ جائے.....''

''جی چلیں..... زارا کی طبیعت بھی ابھی مکمل ٹھیک نہیں.....'' سمیہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

''زارا بیٹی کو میری طرف سے بہت سارا پیار دیجیے گا۔''

''جی ضرور..... زارا کے لیے تو ابھی سفر ٹھیک نہیں ہے۔ آپ لاہور آجائیں تو چکر لگائیے گا۔ ماشاء اللہ سے دادی جان بننے والی ہیں آپ.....''

''ارے..... اتنی بڑی خوشخبری اب سنا رہی ہیں آپ.....''

''موقع ہی کچھ ایسا تھا کہ.....''

''بس یہی زندگی کا نظام ہے..... خوشی اور غم ساتھ، ساتھ چلتے ہیں، اثیر کے بابا کی بڑی خواہش تھی..... اس کی اولاد دیکھنے کی۔'' عابدہ بیگم آبدیدہ ہوگئیں، پھر فوراً ہی خود کو سنبھال کر زارا اور آنے والے بچے کے لیے دعائیہ کلمات کہتے ہوئے اثیر احمد کی جانب رخ کیا۔

''کل سے بس یہی کہتے جا رہے تھے نہ زارا کا نمبر بند ہے..... یہ نہیں کیا کہ گھر میں کسی اور کو فون کرلو..... اللہ خیر کا وقت لائے اب باپ بننے والے ہو ذرا ذمے دار ہو جاؤ..... جاؤ فون کرو زارا کو اور خیریت معلوم کرو.....''

ان کی اڑی رنگت دیکھتے ہوئے انہوں نے بہانے سے انہیں وہاں سے ہٹایا تھا۔

وہ شکر کا کلمہ پڑھتے تیزی سے وہاں سے نکلے تھے اور سیدھا اپنے کمرے میں آکر سانس لی تھی۔

کل سے لے کر اب تک وہ جتنی ندامت سے دوچار ہوئے تھے جتنا خود کو ملامت کیا تھا۔ وہ ساری ندامت، وہ ساری ملامت اس وقت کم محسوس ہو رہی تھی۔ موبائل بار، بار سیدھا کرتے تھے مگر پھر نمبر ملانے کی ہمت نہ پا کر موبائل دونوں ہاتھوں میں دبا کر ماتھا ٹھوڑی کے نیچے ٹکا کر سوچوں کی عمیق وادی میں کھو جاتے تھے۔

کیسے بات کرتے اس سے۔ کیا کہتے اس سے..... اپنے آپ کو کچھ کہنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا تھا انہوں نے۔

☆☆☆

ممانی جان نے کھانے کا پوچھا تو اس نے بھوک نہ ہونے کے باوجود تھوڑا سا کھایا تھا اور سونے کا کہہ کر ماما،

پاپا کے آنے سے پہلے ہی کمرے میں آ گئی تھی۔

اس میں ہمت نہیں تھی ان کا سامنا کرنے کی وہ اسی فکر میں تھی کہ جاتے ہوئے ... گھر والے نہیں جانتے تھے کہ جس گھر میں وہ تعزیت کے لیے جا رہے تھے..... جن لوگوں کو اپنا سمجھ کر وہ ان کا دکھ بانٹنے جا رہے تھے اس گھر کے ساتھ، ان لوگوں کے ساتھ اب ان کا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ کیا، کیا تھا انہوں نے ان کی بیٹی کے ساتھ۔

جب وہاں جا کر اچانک انہیں اس حقیقت کا پتا چلا ہوگا تو..... اور جانے اشیر احمد نے کن لفظوں میں بتایا ہوگا انہیں..... کیسے برداشت کی ہوگی انہوں نے وہ ذلت..... کیسے سہا ہوگا یہ صدمہ..... خانساماں کی بیٹی کو طلاق ہوگئی تھی تو ماما نے کتنے دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''اللہ کسی کو بیٹی کا دکھ نہ دکھائے.....'' اور ان کی بیٹی کو تو اشیر احمد نے صرف طلاق نہیں دی تھی..... ساتھ بدکرداری کی سند بھی دی تھی۔

''اُف.....! کیا انہوں نے وہ سارے الزامات دُہرائے ہوں گے.....؟'' ایک، ایک کر کے اسے وہ ساری باتیں یاد آئیں جو اشیر احمد نے کی تھیں۔

وہ وضو کر کے عشا کی نماز پڑھنے کے لیے کھڑی ہوئی تھی کہ ماما، پاپا کے آنے سے پہلے سونے کی کوشش کرے گی لیکن اب اسے اشیر احمد کی ایک، ایک بات یاد آ رہی تھی اور بری طرح رُلا رہی تھی۔

وہ اپنے ماں باپ کو کبھی اپنی وجہ سے دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اس نے کر دیا تھا۔

☆☆☆

دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے بس وہ رو رہی تھی..... چپکے، چپکے گھٹ، گھٹ کر۔

''زارا.....'' دروازہ کھولتے ہی سمیہ اور علی رضا صاحب تڑپ کر آگے بڑھے تھے۔

''ماما..... میں آپ کو..... شرمندہ کرنا نہیں چاہتی تھی..... میں، میں جانتی ہوں..... ہماری فیملی میں ڈیورس کو کتنا برا سمجھا جاتا ہے..... ماما، میں بڑا روئی..... میں نے بڑی منتیں کیں..... لیکن انہوں نے میری کوئی بات نہیں سنی..... وہ مجھے اتنا برا سمجھتے ہیں..... مجھ سے اتنی نفرت کرتے ہیں مجھے تو کبھی..... پتا ہی نہیں چلا.....''

روتے ہوئے، سسکتے ہوئے سمیہ سے لپٹی وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کہہ رہی تھی اور وہ دونوں ہکا بکا سن رہے تھے۔

تو یہ تھا وہ صدمہ جو وہ اپنے دل پر سہہ رہی تھی..... یہ تھا وہ دکھ جو اسے ہوش و خرد سے بیگانہ کر گیا تھا۔ ایسا کچھ بھی ہو سکتا ہے یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

زمین انہیں اپنے پاؤں کے نیچے سے سرکتی محسوس ہوئی تھی لیکن.....

اس زمین کو انہوں نے پاؤں کے نیچے سے نکلنے نہیں دینا تھا کیونکہ اس پر ان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی کھڑی تھی..... جو انہیں اپنی جان سے بھی پیاری تھی۔

☆☆☆

ان سب کے جاتے ہی امی جان نے اشیر احمد کو بلایا تھا اور سختی سے باز پرس کی تھی۔ تب نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں ساری صورتِ حال سے ماں کو آگاہ کرنا پڑا تھا۔ پہلے تو وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہ گئی تھیں۔ پھر خوب لعن طعن کرتے ہوئے فوراً زارا کے پاس جانے اور اس سے معذرت کر کے اسے ساتھ لانے کے لیے کہا تھا۔

ان کے کمرے سے نکلتے ہی خود انہوں نے شکرانے کے نفل پڑھے اور کتنی ہی دیر تک اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتی رہی تھیں کہ اللہ نے ان پر بڑا رحم کیا تھا جو عین اسی وقت باہر گملا گرا تھا اور وہ باہر نکل گئے تھے اور دوسری اور تیسری بار وہ منحوس لفظ ان کی زبان سے نہیں نکلا تھا۔

☆☆☆

دادی جان کا بک ریک صاف کرنے کے خیال سے کتابیں نکالتے ہوئے اچانک اس کی نگاہ ایک کتاب پر پڑی تھی..... کتاب کے ٹائٹل نے اس کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی تھی۔ عجیب سی کیفیت میں گھری وہ کتاب ''آیئے! اللہ کو راضی کریں۔'' ہاتھ میں لیے آرام چیئر پر آ بیٹھی تھی اور کتاب کھولی تھی۔

''اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی یہ کائنات بلاشبہ بے حد حسین ہے، زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، دریا، پھل، پھول، پودے ہر چیز میں ہر منظر میں ایک دلکشی ہے۔ ایک خوب صورتی ہے، ایک تناسب اور توازن ہے۔ لیکن یہ ایک اداس کر دینے والی حقیقت ہے کہ یہ سب چیزیں ناپائدار ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم ہمیشہ ایک ایسی حسین دنیا میں رہیں جس کا حسن کبھی ماند نہ ہو تو ہمیں جان لینا چاہیے کہ وہ دنیا ہمیں یہاں نہیں مل

سکتی اس لیے اسے یہاں پانے کی بے فائدہ کوششوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے کہیں اور اس کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔

وہ دنیا جو دائمی اور ابدی ہوگی..... جس کی خوب صورتی کبھی ماند نہیں ہوگی..... اور ہمارے لیے اہم اور یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اس دنیا میں انجام دیا جانے والا ہمارا ہر کام، اس دنیا میں ہمارا ایک مقام بنا رہا ہے۔ یہ مقام کیسا ہے؟ جنت کے باغات میں یا جہنم کے بھڑکتے شعلوں میں.....؟ اس کا اندازہ ہم دنیا میں رہتے ہوئے بھی کر سکتے ہیں۔ جنت کے باغات اور جنت کے محلات سے وہ شخص نوازا جائے گا جس نے اس دنیا میں اللہ کو پانے کی کوشش کی..... نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقوں کو اپنانے کی کوشش کی..... جس نے اللہ کو اپنا رب مانا اور ہر لمحہ بندگی کے تقاضوں کو نبھانے کی کوشش کی..... جس نے آخرت میں رب سے ملاقات کو حق جانا اور اس ملاقات کے لیے بھرپور تیاری کرنے کی کوشش کی۔''

زارا کا رواں رواں یک دم کھڑا ہو گیا تھا..... اور پورا جسم پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ ٹھنڈے یخ ہاتھوں میں کتاب کو تھامے رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ بے تحاشا دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے کتاب بند کر کے سینے پر رکھ لی تھی اور تاسف سے کتاب پر دونوں ہاتھ دھرے، لب بھینچے، سوچوں کی عمیق گہرائیوں میں کھو گئی تھی۔

اپنی آخرت کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے اللہ کو راضی کرنے کے لیے اس نے کیا، کیا تھا.....؟ کچھ بھی تو نہیں..... ندامت کی اِک گہری دلدل تھی جو اسے اپنی جانب زندگی کے کتنے ماہ و سال تھے جو اس نے غفلت میں گزار دیے تھے..... جانے اب ان کی تلافی ہو سکتی تھی یا نہیں..... اس نے نم آنکھوں سے سوچا تھا۔ کتنی خطائیں تھیں..... کتنی کوتاہیاں اور بے پروائیاں تھیں..... جانے ان کی معافی مل سکتی تھی یا نہیں.....

آنکھوں کی نمی نے آنسوؤں کی صورت دھاری تھی..... لیکن پھر فوراً ہی جیسے کسی نے امید کی قندیل جلائی تھی، آس کی ڈور تھمائی تھی۔ اس کا رب بے حد کریم اور رحیم ہے..... اپنے بندے پر بے حد مہربان..... اپنے بندے کی آنکھ سے نکلنے والے ایک آنسو پر اس کے بڑے سے بڑے گناہ کو بخش دینے والا..... جو وقت گزر گیا تھا وہ واپس نہیں لوٹ سکتا تھا لیکن جو موجود تھا اس کے ایک، ایک لمحے کو کارآمد بنایا جا سکتا تھا..... اپنے رب کی رضا کے حصول کے لیے صرف کیا جا سکتا تھا۔ اس نے ایک نئی لگن کے ساتھ کتاب سیدھی کی تھی۔ اور پڑھنا شروع کیا۔

''فرمان باری تعالیٰ ہے.....

ترجمہ: اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو نصیحت ہے..... اور دلوں میں جو (برے کاموں سے) روگ ہو جاتے ہیں ان کے لیے شفا ہے اور رہنمائی کرنے والی ہے، اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے، آپ کہہ دیجیے کہ بس لوگوں کو اللہ کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہیے وہ اس سے بدرجہا بہتر ہے جس کو وہ جمع کر رہے ہیں۔'' (سورۂ یونس ۵۷، ۵۸)

بے شک قرآن کی نعمت دنیا کی ہر نعمت سے عظیم تر ہے۔ دنیا کی تمام تر نعمتیں صرف اسی وقت تک ہماری ہیں جب تک سانسیں باقی ہیں، اِدھر دل دھڑکنا بند ہوا آخری سانس نکلی اور دنیا کی ہر نعمت ختم..... مگر اللہ کا کلام قرآن مجید ایک ایسی نعمت ہے جو ان ختم ہو جانے والی تمام نعمتوں کو ہمیشہ رہنے والی نعمتوں میں بدل دیتا ہے۔ انسان کو اس کی زندگی کے اصل مقصد سے آگاہ کر کے، زندگی کو کامیاب و کامران بنانے کے لیے درست راہ کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے اس کتاب ہدایت کو صرف پڑھا ہی نہیں اسے سمجھا بھی جائے..... اس کی تعلیمات پر ایمان و یقین لانے کے ساتھ، ساتھ ان پر پوری طرح عمل کیا جائے..... یہ قرآن پاک کا ہم سب پر حق ہے۔

عبیدہ ملیکیؓ، نبی اکرمؐ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں۔

''قرآن والو! قرآن مجید سے تکیہ نہ لگاؤ، اس کی تلاوت شب و روز ایسی کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔ کلام پاک کی اشاعت کرو..... اس کو اچھی آواز سے پڑھو اور اس کے معانی میں تدبر کرو تاکہ تم فلاح کو پہنچو..... اس کا بدلہ دنیا میں طلب نہ کرو کیونکہ آخرت میں اس کا بڑا اجر ہے۔''

تو آیئے..... آج سے اور ابھی سے اللہ کے کلام کو ترجمے کے ساتھ پڑھنے، اس کے پیغام کو سمجھنے، اس پر عمل کرنے اور اس کو دوسروں تک پہنچانے کی ابتدا کریں۔ آج سے اور ابھی سے.....''

اسے بے اختیار دادی جان کی بات یاد آئی۔

''کسی بھی نیک عمل کا خیال دل میں آتے ہی اسے کر گزرنا چاہیے، کل پر نہیں ٹالنا چاہیے۔'' وہ اٹھی اور وضو کرنے کے لیے واش روم کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

ناشتا کرتے ہی وہ لاہور کے لیے نکل پڑے تھے۔ گھر آتے ہی حامد نے انہیں زارا کا موبائل لا کر دیا تھا جو فیروزاں گیٹ سے اٹھا کر لائی تھی۔ گہری سانس لیتے ہوئے انہوں نے موبائل کو دیکھا تھا اور کئی لمحے دیکھتے رہے تھے۔ راستے میں انہوں نے ہمت کرتے ہوئے کئی مرتبہ اسے کال کی تھی۔ اور ہر مرتبہ ریسیو نہ ہونے پر پریشان ہوئے تھے اور اب قدرے اطمینان ہوا تھا کہ فون یہاں تھا..... جانے بے خیالی میں یا کسی خیال کے تحت انہوں نے ان باکس کھولا تھا اور ایک کے بعد دوسرا ٹیکسٹ پڑھنے لگے تھے۔ وہ ایک کے بعد دوسرا میسج پڑھ رہے تھے اور ہر ٹیکسٹ پڑھنے کے بعد خود کو اور چھوٹا اور کمتر محسوس کر رہے تھے۔

حال احوال، ہلکی پھلکی باتیں، ان کے حوالے سے اجیہ کی چھیڑ چھاڑ..... وہ کیسے معذرت کریں گے..... کیا معافی کے معذرت کے چند الفاظ ان کے رویے کا ازالہ ہو سکتے تھے۔ کبھی نہیں..... جتنا وہ اپنے اس دن کے رویے کو، اپنے الفاظ کو یاد کرتے تھے۔ خود کو ندامت کے گہرے پاتال میں اترتا محسوس کرتے تھے۔ بہت گرا لیا تھا خود کو انہوں نے اس کی نظر میں..... بہت زیادہ..... اب اس کا سامنے کرنا بے حد مشکل لگ رہا تھا لیکن یہ مشکل سر تو کرنی تھی۔

بالآخر ہمت کر کے اٹھے تھے اور اس کے پاس جانے کا قصد کیا تھا..... لیکن راستے میں جا کر پھر ارادہ بدلنے لگا تھا۔

سڑک کے کنارے گاڑی کھڑی کر کے وہ نہر کے کنارے آ بیٹھے تھے اور پھر دو بجے سے ساڑھے چھ بج گئے تھے۔ انہیں نہر کے ساتھ، ساتھ چلتے، درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے گہری خاموشی کو دل میں اترتا محسوس کرتے، سگریٹ کے دھوئیں میں سکون کھوجتے..... لیکن سکون کہیں نہیں تھا اندر اور نہ باہر.....

اب انہیں کون بتاتا کہ سکون انسان کے اندر نہ ہو تو باہر کہیں نہیں ملتا چاہے انسان صحراؤں میں چکراتا پھرے یا نخلستان میں جا بیٹھے۔

جس وقت تھکن سے چور جسم نے انہیں واپسی پر مجبور کیا تو انہوں نے کلائی سیدھی کرتے ہوئے ریسٹ واچ پر نگاہ ڈالی شام کے ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ دوپہر دو بجے سے شام کر دی تھی انہوں نے پاگلوں کے مانند ادھر سے ادھر چکراتے ہوئے۔

نیچے سے اٹھتے ہوئے انہوں نے خالی الذہنی کی کیفیت میں درخت کے ساتھ پڑا ہوا پتھر اٹھا کر نہر میں اچھالا تھا۔ پانی کی سطح پر ذرا کی ذرا ہلچل مچی تھی پھر سطح ویسی ہی پُرسکون ہو گئی تھی۔ بے اختیار ان کا دل چاہا تھا کہ ان کے اندر جو بھنور اٹھ رہے تھے، جو ہلچل مچی ہوئی تھی وہ بھی یونہی تھم جاتی، بالکل پُرسکون ہو جاتی لیکن وہ تو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔

آخر بوجھل دل اور تھکے ہوئے جسم کے ساتھ وہ اس سے ملے بنا گھر لوٹ آئے تھے۔ پھر کئی دن گزر گئے اسی طرح کرتے..... گھر سے وہ اس سے ملنے کے لیے نکلتے اور شام گئے بنا ملے گھر لوٹ آتے۔

امی جان فون پر پوچھتیں تو کبھی ایک تو کبھی دوسرا عذر تراشتے رہتے۔

☆☆☆

''زارا! آخر کیا پرابلم ہے تمہیں..... کیوں اس قدر اوائڈ کر رہی ہو تم حنان کو..... کتنے دن ہو گئے ہیں، ہر روز وہ تم سے ملنے آنے کا کہتا ہے اور تم ہو کہ کبھی ایک بہانہ تو کبھی دوسرا بہانہ..... اب تو مجھے بھی شرم آنے لگی ہے، بس کہنے ہی ہوں میں کہ آ جائے وہ.....'' ان کے خراب موڈ کو دیکھتے ہوئے اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''کتنا خیال رکھتا ہے وہ تمہارا اور تم ہو کہ تمہیں احساس ہی نہیں۔''

''ماما میں چاہتی ہوں وہ میرا اتنا خیال نہ کیا کرے.....'' وہ ایک دم بے حد رنجیدہ ہو گئی تھی۔

اس کے حوالے سے کیا کچھ نہیں کہا تھا اثیر احمد نے اسے..... اگر وہ اس کا اتنا خیال نہ رکھتا..... اگر وہ اس کے اتنے قریب نہ ہوتا تو وہ یہ سب نہ کہتے..... اسے اتنا برا، اتنا غلط نہ سمجھتے۔

ماما آپ جانتی ہیں دادی جان نے ایک بار مجھے کیا کہا تھا۔ ''اچھی لڑکیاں، لڑکوں کے ساتھ نہیں کھیلتیں۔'' مجھے ان کی بات سمجھ نہیں آئی تھی لیکن میں نے ان سے پرامس کیا تھا کہ آئندہ میں حنان کے ساتھ نہیں کھیلوں گی..... کاش وہ مجھے پوری بات سمجھاتیں، مجھے بتاتیں کہ اچھی لڑکیاں، لڑکوں سے دوستی نہیں کرتیں، ان سے بہت فرینک نہیں ہوتیں، ان سے ہمیشہ ایک فاصلے پر رہتی ہیں اور ان کو ہمیشہ ایک فاصلے پر رکھتی ہیں۔''

''زارا.....! حنان نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی کی ہے کیا؟'' سمیہ نے حیران و پریشان ہوتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

''کیا کہہ رہی ہیں ماما..... حنان ایسا کرسکتا ہے کیا..... کتنا نائس ہے وہ..... کیا آپ نہیں جانتیں۔''

''تو پھر یہ سب باتیں۔''

''آپ نہیں سمجھیں گی ماما..... میں بھی نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے لگتا تھا جیسے اجیہ میری کزن بھی ہے اور دوست بھی ایسے ہی حنان بھی میرا کزن بھی ہے اور دوست بھی..... لیکن میں غلط تھی ماما..... جب اثیر احمد نے حنان کے حوالے سے وہ سب کہا جو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی تو مجھے پتا چلا کہ دادی جان مجھے کیا سمجھانا چاہتی تھیں۔ ان کی ہر بات درست تھی ماما..... بزرگ جو بھی کہتے ہیں، ہمارے فائدے کے لیے کہتے ہیں.....'' دھیمے سے ملول لہجے میں کہتی وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئی۔ وہ ماما کو رفتہ رفتہ اپنی بےہوشی کی داستان سنا چکی تھی۔

''اس وقت چاہے ہمیں ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آئیں، ہم خود کو ان پر عمل کے لیے آمادہ نہ کرپائیں لیکن کبھی نہ کبھی یہ باتیں ہم سے اپنا آپ ضرور منواتی ہیں۔ ماما.....!'' ایک دم اس نے اپنے لہجے کو ہلکا پھلکا کیا تھا۔ ''آپ بھی تو نانی جان بننے والی ہیں..... آپ بھی دادی جان کی طرح میرے بچے کو اچھی، اچھی باتیں بتائیں گی ناں بلکہ صرف بتانی نہیں سکھانی بھی ہیں..... عمل کروانا ہے۔''

ان کے گلے میں بازو حمائل کیے جانے وہ خود کو بہلا رہی تھی یا انہیں..... وہ نہیں جانتی تھیں..... لیکن وہ ہر وقت کچھ بھلانے کے لیے کوشاں تھی یہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔

☆☆☆

گاڑی کا ہارن بجاتے ہی چوکیدار کسی جن کی طرح فوراً نمودار ہوا تھا۔ بجائے گیٹ کھولنے کے اسے اپنی جانب آتے دیکھ کر ان کا دل تیزی سے دھڑکا تھا۔ اچھی خاصی خنکی کے باوجود پیشانی نم ہوگئی تھی۔ انہیں لگا ابھی وہ ان کے سر پر پہنچ کر کہے گا۔

''صاحب! آپ اندر نہیں آسکتے..... آپ کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''اُف.....! یہ کیا ہوگیا تھا ان سے.....!''

''السلام علیکم! صاحب جی.....'' خلافِ توقع اس کا انداز ویسا ہی مؤدبانہ تھا۔

''وعلیکم السلام.....''

''گھر پر کوئی نہیں ہے صاحب جی.....''

''خیریت.....؟ سب لوگ کدھر گئے ہیں۔'' اس کے مؤدبانہ سلام پر ان کی جان میں جان آئی۔ لیکن اگلے جملے پر ایک بار پھر وہ قدرے کھٹکے تھے۔

''صاحب جی ابھی آفس سے نہیں آئے اور بیگم صاحبہ اور چھوٹی بی بی باہر گئی ہیں۔''

''اچھا.....''

''بیٹھیں گے آپ.....''

''نہیں چلتا ہوں..... پھر آؤں گا۔ اور سنو..... میرے آنے کا ذکر مت کرنا بی بی سے۔''

جانے کیا سوچ کر انہوں نے یہ کہا تھا وہ خود بھی جانتے تھے۔

☆☆☆

''زارا کی بچی! اتنی زبردست نیوز تم چھپا کر بیٹھی ہو..... بجائے اس کے کہ سب سے پہلے مجھے یہ گڈ نیوز سناؤ الٹا فون ہی بند کر رکھا ہے۔''

''تم جو باز نہیں آرہی تھیں بار، بار فون کرنے سے..... تو میں نے سوچا میں کیوں سمیر کی بددعائیں لوں..... اللہ، اللہ کر کے بیچارے کو چند دن کا آف ملا ہے.....''

''سمیر کی تو فکر نہ ہی کیا کرو تم..... وہ خود کافی ہے اپنی فکر کرنے کے لیے..... تمہاری بات سے پہلے ہی اس نے مجھے آرڈر دے دیا تھا کہ اب باقی دن میں کہیں لمبی کال نہیں کروں گی۔ اچھا چھوڑو یہ باتیں..... یہ بتاؤ ہیلتھ کیسی ہے؟ عام چیک اپ کے لیے ہی آئی ہو ناں.....''

''ہاں..... بالکل فٹ فاٹ ہوں..... طبیعت کچھ سست ہو رہی تھی تو ماما ڈاکٹر سونیا کے پاس لے آئیں۔''

''ہاں تو نانی جان بننے والی ہیں وہ..... بڑی خوش

تھیں تم سے زیادہ تو ان کا لہجہ مسرت بھرا ہوا تھا۔''

''اچھا.....'' اس نے بمشکل خود کو سنبھالا تھا، حلق میں پھنستے آنسوؤں کے گولوں کو پیچھے دھکیلا تھا۔ ورنہ بچپن کی ساتھی سے بات کرتے ہوئے دل بھر بھر آ رہا تھا۔ کتنی دور بیٹھی تھی وہ..... لیکن کیا دل سے بھی دور ہو گئی تھی کہ جانتی ہی نہیں تھی اس پر کیا قیامت بیت گئی..... لیکن جانتی بھی کیسے اس نے کچھ بتایا ہی کب تھا۔

☆☆☆

''اثیر! آخر تم چاہتے کیا ہو..... غضب خدا کا..... پورا ہفتہ لاہور گزار کر آ گئے تم اور زارا سے نہیں مل سکے..... کیا چل رہا ہے آخر تمہارے دل و دماغ میں..... مجھے بھی تو کچھ پتا چلے۔'' عابدہ بیگم تیز نگاہوں سے انہیں گھورتی بے حد ناراض لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''آپ یقین کریں امی جان..... میں ملنا چاہتا تھا مگر..... سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر کس منہ سے ملوں اس سے جا کر.....''

''کیا مطلب کس منہ سے ملوں..... کیا اب ساری زندگی یہی سوچتے رہو گے تم..... حماقتیں کرو تو ان کی سزا بھی بھگتنا پڑتی ہے.....'' ابھی وہ اچھی طرح ان کی خبر لینا چاہتی تھیں لیکن اسما نے آ کر مہمانوں کی آمد کی اطلاع دی تو انہیں اٹھنا پڑا۔

☆☆☆

''حنان! میں تم سے بات کر رہی ہوں بیٹے!''

''سن رہا ہوں ماما.....'' وہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''کہاں سن رہے ہو..... کتنی دیر سے دیکھ رہی ہوں کسی گہری سوچ میں گم ہو.....''

''بس وہ آفس کا ایک ایشو تھا اس پر غور کر رہا تھا۔'' گہری سانس لیتے ہوئے اس نے بات بنائی تھی ورنہ اتنی دیر سے بیٹھا وہ صرف زارا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ بہت بدل گئی تھی..... ایسی تبدیلی جو عموماً کسی بڑے واقعے یا بڑے حادثے کے بعد ہی عمل میں آتی ہے..... وہ بڑا واقعہ یا حادثہ کیا تھا؟ وہ اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا لیکن سوچنے لگتا تھا۔ بہت مرتبہ دل چاہتا تھا کہ اس سے اس بارے میں بات کرے لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ وہ اس سے کترانے بھی تو کتنا لگی

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس 100 روپے ادا کر کے اپنا پرچا بک کروا لیں۔

یا

ادارے کو 1500 روپے بھیج کر سالانہ خریدار اور 750 روپے ادا کر کے 6 ماہ کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

تھی۔ کئی، کئی بار وہ پھپھو کی طرف چکر لگاتا تھا لیکن بہت کم اس سے ملاقات ہو پاتی تھی۔ وہ جو پہلے ہی رہی اندر احساسِ جرم کا شکار تھا اس کے اس اجتناب نے اس کے احساس کو کچھ اور بڑھا دیا تھا۔

''کوئی زیادہ پریشانی کی بات تو نہیں ہے ناں.....'' وہ سامنے سے اٹھ کر اس کے برابر آ بیٹھیں۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے میری پیاری ماما! آپ بتائیں کیا کہہ رہی تھیں؟'' اس نے ہلکے، پھ... لہجے میں کہتے ہوئے انہیں کندھے سے لگایا تھا۔

''میں کہہ رہی تھی کسی دن مائرہ کی ... کو ڈنر پر انوائٹ کرلیں۔''

''ابھی کچھ دن نہیں ماما..... بہت بزی ہوں.....''

''نیکسٹ ویک.....''

''میں بتاؤں گا آپ کو..... ایک ڈیڈ... ن آرہا ہے باہر سے اس سے ذرا فری ہولوں.....''

''چلو ٹھیک ہے کھانا لگواؤں تمہارے ... آج ..... تمہارے پاپا اور حدید تو آج لیٹ آ... گے۔''

''نہیں ابھی کوئی خاص بھوک نہیں ... آلیں پاپا... اور حدید بھائی... پھر اکٹھے ہی کھاتے ...''

''چلو تب تک تم ریسٹ کرلو.....'' انہ... نے اٹھتے ہوئے کہا تھا اور وہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے کی ... بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

''تھینک گاڈ کہ تم مجھے جاگتی مل گئیں کنزا... ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ اب بھی پھپھو کہیں گی ... سو رہی ہے حنان..... ویسے بائے دا وے ایک بات تو بتاؤ..... کیا اشیر بھائی نے تمہارے سونے پر پابندی لگا... تھی جو یہاں آکر تم ہر وقت سوتی پائی جاتی ہو..... ...نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے سیب کی ایک ق... منہ میں ڈالی تھی۔

''نہیں ہر وقت تو نہیں سوتی.....'' اس ... ہتگی سے کہا تھا۔ حنان نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈ... اور پھر ہٹالی۔ ریڈ اور بلیک کلر کی گرمشال خوب اچھی طرح سر اور چہرے کے گرد لپیٹے وہ خاصی متفکر تو لگ رہی تھی لیکن ایک عجیب سا نور بھی تھا جو اس کے چہرے کا ہالہ کیے ہوئے تھا۔

''تو گویا مجھے کہلوا دیتی تھیں کہ سو رہی ہو'' حنان نے سرسری سے انداز میں کہتے ہوئے سیب کی دوسری قاش منہ میں ڈالی اور پلیٹ اس کی جانب بڑھائی۔

زارا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ اسے بھلا کیسے پتا چلا تھا کہ وہ ایسا کرتی تھی۔

حنان نے اس کی حیرانی سے کھلی آنکھوں کو دیکھا اور مسکراہٹ بے اختیار اس کے لبوں پر پھیلتی چلی گئی۔ کیسی پاگل لڑکی تھی کچھ بھی کچھ بھی تو چھپانا نہیں آتا تھا..... اس نے سوچا تھا..... پھر اس کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے خود بھی سنجیدہ ہوگیا تھا۔

''زارا کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟'' بغور اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

''ناراض..... وہ کیوں؟''

''یہ تو مجھے علم نہیں..... لیکن یہ جانتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور..... ورنہ دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہے ہماری..... اور تم آج اتنے دن بعد مل رہی ہو..... نہ وہ پہلے کی سی شیئرنگ..... نہ وہ دوستی..... کل اجیہ کہہ رہی تھی..... حنان، زارا کو کمپنی دینا..... اسے میری کمی مت محسوس ہونے دینا، اب میں اسے کیا بتاتا کہ زارا تو میرے سائے سے بھی بچنے لگی ہے۔'' وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

زارا چند لمحے جیسے کچھ سوچتی رہی، پھر گہری سانس لیتے ہوئے گویا ہوئی۔

''حنان! ہم مسلمان تو ہیں لیکن..... اسلام ہمیں کن کاموں کو کرنے کا حکم دیتا ہے اور کن کاموں سے روکتا ہے۔ یہ ہم نہیں جانتے..... میں آج کل ان چیزوں کو جاننے کی اور..... جو جان رہی ہوں ان پر عمل کرنے کی کوشش کررہی ہوں..... اسلام میں لڑکے اور لڑکی کی دوستی کا تصور نہیں ہے..... اس لیے میں نے بھی تم سے دوستی ختم کردی ہے۔ میں نے اپنے آپ سے اور اپنے اللہ جی سے یہ پرامس کیا ہے کہ ہر وہ کام چھوڑ دوں گی جو میرے اللہ کو ناپسند ہو..... اور ہر وہ کام کرنے کی کوشش کروں گی جو میرے اللہ کو پسند ہو..... اس لیے پلیز تم بھی آئندہ یہ مت کہنا کہ میں تمہاری دوست ہوں، ہم آپس میں کزن ہیں۔ یہ وہ رشتہ ہے جو اللہ جی نے بنایا ہے ہمارے درمیان اور اس رشتے کو ہم نے اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہی لے کر چلنا ہے..... اور اللہ ہمیں دو لڑکیوں کی طرح جب چاہے، جہاں چاہے بیٹھ کر

گپ شپ کرنے کی اجازت دیتا ہے نہ ہر جگہ گھومنے پھرنے کی۔" زارا کو پہلے یہ سب کہنا مشکل لگا تھا لیکن جب کہنے لگی تھی تو پھر کہتی چلی گئی تھی۔

حنان نے بے حد حیرانی سے بہت چونک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ اس زارا سے بے حد مختلف لگ رہی تھی جسے وہ جانتا تھا اس نے بات تو شروع کی تھی یہ جاننے کے لیے کہ آخر اس کے اور اشیر احمد کے درمیان کیا چل رہا تھا۔ اور کیا اس کے لیے وہ اسے بھی قصوروار سمجھتی تھی۔

لیکن وہ تو کچھ اور ہی بتا رہی تھی..... کوئی اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔ ہاں کہانی ہی تو تھی..... دل بدلنے کی..... راہ بدلنے کی..... اور یونہی تو نہ دل بدلتا ہے نہ راہ بدلی جاتی ہے..... اس کی ہمیشہ کوئی بہت بڑی اور بہت خاص وجہ ہوتی ہے۔

"کیا یہ اتنا آسان ہے....." چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

"آسان تو کچھ بھی نہیں ہوتا..... ہاں اللہ آسان بنا دیتے ہیں..... اور نہ بھی بنائیں تو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے بھی تو ہم بہت ساری مشکلات اٹھاتے ہیں..... اللہ کے لیے کچھ مشکلات اٹھالیں گے تو نہ جانے کتنا اجر لکھوالیں گے۔"

"ہاں، یہ تو ہے....." بے اختیار حنان کے لبوں سے نکلا تھا۔

"اللہ کے اتنے قریب کب سے ہوگئی ہو کزن.....؟" وہ متاثر سا پوچھ رہا تھا۔

"جب اللہ نے کرلیا..... کیا نہیں ہونا چاہیے۔"

"بالکل ہونا چاہیے..... بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ خدا پر ایمان لانا خدا کو پانے کا اقرار کرنا ہے اور جب کوئی شخص حقیقی معنوں میں خدا کو پالیتا ہے تو خدا اس کے لیے وہ حقیقت بن جاتا ہے جس پر وہ سب سے زیادہ یقین کرتا ہے۔ خدا اس کے لیے وہ طاقت بن جاتا ہے جس سے وہ سب سے زیادہ ڈرتا ہے زندگی کا ہر معاملہ اس کے لیے خدا کا معاملہ بن جاتا ہے۔" اچانک اس کی نگاہ وال کلاک کی جانب گئی تھی۔

"موجودہ دور میں انسان کے لیے کچھ بھی سیکھنا اس قدر آسان ہوگیا ہے حنان..... میں آج کل آن لائن قرآن پاک پڑھ رہی ہوں..... ترجمے اور تفسیر کے ساتھ..... میں لیپ ٹاپ یہاں رکھ لیتی ہوں..... ماما فارغ ہوں تو وہ بھی آجاتی ہیں..... پاپا گھر پر ہوں تو وہ بھی....." لیپ ٹاپ کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے بڑے رسان سے بتایا تھا۔

"تم بھی قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھنا شروع کرو..... بے شک روز کی دو تین آیات ہی پڑھو..... دیکھو ناں.....! آخرت والے دن ہم اللہ تعالیٰ سے کیا کہیں گے کہ ہم نے ڈھیروں اور کتابیں تو پڑھیں بس آپ کی کتاب ہی نہیں پڑھی۔" وہ بول رہی تھی اور حنان عقیدت سے اسے دیکھ رہا تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ اس سے اجازت لیتی کیونکہ اب اس کا سارا دھیان لیپ ٹاپ کی جانب تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوکے کزن..... تم کلاس لو..... اور ہمارے لیے بھی دعا کرنا۔"

"خدا حافظ....." دھیمی سے مسکراہٹ سے کہتے ہوئے وہ نوٹ بک اور پین لے کر لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھ گئی..... تو حنان عقیدت سے اسے دیکھتا ہوا سمیہ سے ملنے کچن کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکانے میں، اللہ سے مانگنے میں کتنا سکون ملتا ہے ناں ماما..... کاش مجھے پہلے پتا چل جاتا....." وہ ان کا ہاتھ تھامے کھوئے، کھوئے سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

اور سمیہ پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی۔ اس کے چہرے پر آئی بالوں کی لٹ کو پیچھے ہٹانے لگی تھیں۔ وہ ابھی ابھی وضو کر کے آئی تھی۔ اس کا دھلا ہوا شفاف چہرہ عجیب سا نور لیے ہوئے تھا۔

"آپ کو یاد ہے دادی جان کہا کرتی تھیں۔" اللہ تعالیٰ کی طرف ایک قدم بڑھاؤ تو اللہ اپنے بندے کی طرف دس قدم بڑھاتا ہے۔" وہ بالکل ٹھیک کہتی تھیں ماما..... بالکل ایسا ہی ہے۔ میں اس کو experience کر رہی ہوں۔" مدھم سے لہجے میں کہتے ہوئے وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی تھی۔

سمیہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے کیا کہیں..... اس لیے خاموشی پر ہی اکتفا کیا تھا۔

''لیکن انسان کیوں اس کے بالکل اگنیسٹ کرتا ہے ماما..... اس کی طرف جتنا بڑھتے جاؤ وہ پیچھے ہٹتا جاتا ہے..... پیچھے ہی پیچھے..... دور ہی دور.....''

کھوئے، کھوئے سے لہجے میں کہتے ہوئے وہ ایک دم بے حد اداس نظر آنے لگی تھی۔

سمیہ کے دل کو جیسے کسی نے آکٹوپس میں جکڑا تھا۔ انہوں نے بے اختیار اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا تھا۔

''جو انسان ایسا کرے وہ بڑا بدقسمت ہوتا ہے میری جان اسے اس کی بدقسمتی کے ساتھ جہاں تک جائے جانے دینا چاہیے۔''

''جو دل میں بستے ہوں وہ دل سے دور جائیں یا زندگی سے بہت تکلیف ہوتی ہے ماما..... اس لیے دعا کرنی چاہیے دل میں بسنے والے کبھی دل سے نہ اتریں.....''

اس نے جس لہجے میں کہا تھا اس نے ان کا دل تڑپا کر رکھ دیا تھا۔

انہوں نے بے اختیار اسے ساتھ لپٹا لیا تھا اور دھیرے، دھیرے اس کی پشت سہلانے لگی تھیں۔

☆☆☆

''اثیر! شافعہ خالہ کو جانتے ہو ناں تم.....''

''جی اکثر ذکر کرتی ہیں آپ..... جو عامنہ بھی ہیں ناں!''

''ہاں، وہ کہا کرتی تھیں ذہنی اور روحانی بیماریاں بھی جسمانی بیماریوں کی طرح ہوتی ہیں..... انہیں بھی جسمانی بیماریوں کی طرح ہی علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔'' دھیمے سے لہجے میں کہتی وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی تھیں اور بغور انہیں دیکھا تھا۔

اثیر احمد سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ کوئی خاص بات کرنے لگی تھیں۔ یہ ان کا تمہیدی لہجہ بتا رہا تھا۔

''شزا والے واقعے کو تم فوراً نہیں لیکن وقت کے ساتھ، ساتھ کوشش کر کے فراموش کر سکتے تھے..... لیکن تم نے اسے دل سے لگا لیا..... روگ اور بیماری بنا لیا..... اب یہ بیماری اتنی بڑھ گئی ہے کہ اسے ایک معالج کی ضرورت ہے۔'' انہوں نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا تھا۔ پیشانی پر شکنوں کا جال سا ابھرا ہوا تھا۔

''امی جان..... آپ۔'' انہوں نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن عابدہ بیگم نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

''پہلے تم اپنی اس بیماری کی وجہ سے ماں، باپ اور بہن، بھائی کو دکھ دیتے تھے۔ پھر بیوی کو تختۂ مشق بنا لیا۔ اب بھی اگر تم نے اس کا علاج نہ کروایا، اس سے پیچھا نہ چھڑایا تو اس کا شکار تمہاری اولاد ہوگی اور مجھے امید ہے کہ ایسا تم کبھی نہیں چاہو گے..... تم پڑھے لکھے ہو..... سمجھدار ہو یوں رات، رات بھر سگریٹ پھونکنے کے بجائے مسائل کا حل نکالو.....'' وہ مسلسل انہیں دیکھے جا رہی تھیں۔

''لاہور جاؤ اور پہلی فرصت میں جیسے بھی ممکن ہو زارا کو منا کر گھر لے آؤ..... اس حالت میں ٹینشن اس کے لیے اور بچے کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ اس لیے جتنی جلدی ممکن ہو اس کا دل اپنی جانب سے صاف کرو اور ساتھ ہی اپنے لیے کسی اچھے سائیکالوجسٹ سے ٹائم لو..... اس وقت یہ دونوں کام تمہارے لیے ہر چیز سے زیادہ اہم ہونے چاہئیں۔'' بے حد سنجیدگی سے انہیں دیکھتے ہوئے انہوں نے بات ختم کی تھی اور کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

سوچوں کے گرداب میں چکراتے وہ کئی لمحے الجھے، الجھے سے انداز میں آرام چیئر پر آگے پیچھے جھولتے رہے پھر اٹھ کر دریچے میں آ کھڑے ہوئے تھے۔

باہر رم جھم بارش برس رہی تھی اور ان کے اندر.....؟ کیا واقعی وہ بیمار تھے، انہیں علاج کی ضرورت تھی؟

ہاں! شاید ایسا ہی تھا۔

تسلیم کرنا مشکل تھا لیکن انہوں نے کر لیا تھا۔ اب نہ وہ خود کوئی تکلیف اٹھانا چاہتے تھے۔ نہ زارا کو دینا چاہتے تھے اور اپنے بچوں کو تو ہرگز بھی نہیں.....

☆☆☆

''ماما.....! اثیر سے نہیں بھی تو امی جان سے تو تعزیت کرنی چاہیے مجھے..... بابا جان کی وفات کے بعد کس قدر اکیلا محسوس کر رہی ہوں گی ناں وہ خود کو.....''

سمیہ نے بے اختیار اپنا سر تھاما تھا۔ کتنی بڑی غلطی ہوئی تھی ان سے کہ انہوں نے اسے بتا دیا تھا کہ اثیر کے ایک بار طلاق دینے سے ان کے رشتے پر کچھ ایسا اثر نہیں پڑا تھا۔ لیکن انہوں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ طلاق سے زیادہ برا تو انہوں نے یہ کیا تھا کہ اتنی رات گئے اسے گیٹ کے باہر بے ہوش چھوڑ کر خود اندر چلے گئے تھے۔ یہ سوچ

بنا کہ یوں باہر پڑے اس کے ساتھ کیا بیت سکتی تھی۔

''اثیر میں ذرا سی بھی تو انسانیت ہوتی تو ایسا کبھی نہ کرتے..... لیکن انسانیت ہوتی تب ناں....'' انہوں نے تنفر سے کہا تھا۔

''ماما.....! بے ہوش تو میں ان کے اندر جانے کے بعد ہوئی تھی۔ وہ آہستہ سے منمنائی تھی اور سمیہ کا دل چاہا تھا وہ اپنا سر پیٹ لیں۔

''تو اس نے پچکارتے ہوئے تو باہر نہیں نکالا ہوگا ناں..... میری نظر میں تو وہ وحشی ہے وحشی..... ذرا بھی خیال ہوتا ناں اسے تمہارا تو وہ یہ جاننے کے بعد کہ اس کے وحشی پن کی وجہ سے تم رات دن موت و حیات کی کشمکش میں پڑی رہی ہو..... وہ بھی ایسی حالت میں..... تو وہ بھاگا آتا..... لیکن وہ تو..... انسان ہی نہیں..... اور خبردار جو تم نے اب نام لیا اس سے یا اس کی ماں سے بات کرنے کا.....'' غصے میں وہ زارا کے جذبات کو بھی بھول گئی تھیں۔

غلطی ان کی بھی نہیں تھی..... صبح سے یہ تیسری مرتبہ وہ یہ بات کر رہی تھی۔

اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا دیکھ کر انہیں فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔

''زارا.....! میری جان..... لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ انہیں فوراً ان کے ظلم کا احساس نہ دلایا جائے تو خود کو خدا سمجھنے لگتے ہیں..... اگر تم یوں آرام سے عابدہ بیگم کو یا اثیر کو فون کر لو گی تو انہیں تو یہی لگے گا ناں کہ کچھ ہوا ہی نہیں..... وہ پھر دوبارہ کسی بھی وقت ایسا کر سکتا ہے.....'' وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی تھیں۔

''اگر دو مرتبہ اور اس نے یونہی طلاق کے الفاظ منہ سے نکالے تو تم لوگوں کا رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا..... اس لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ اسے احساس دلایا جائے کہ اس نے تمہارے ساتھ بے حد برا کیا ہے اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اسے موقع دو اپنے بی ہیوئیر پر غور کرنے کا..... اس کی تلافی کرنے کا..... دل رابطہ کرنے کے لیے اکسائے تو اسے یاد دلاؤ کہ اس نے تمہارے ساتھ کیا، کیا ہے؟''

اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لیے وہ نرمی کے ساتھ دھیرے، دھیرے اسے سمجھا رہی تھیں..... جب انہوں نے اپنی بات ختم کی تو اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا تھا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔

اب تک اس آخری لمحے کا خوف اس کے دل و دماغ کو اس قدر جکڑے ہوئے تھا کہ اتنے دنوں سے جب بھی وہ لمحات اسے یاد آتے تھے اسے بس اللہ سے اپنی دوری یاد آتی تھی اور پھر ایک پکار پر اللہ کی مدد یاد آتی تھی اور وہ فوراً اللہ کا شکر ادا کرنے میں محو ہو جاتی تھی۔ لیکن اس لمحے اسے اثیر احمد کا ایک، ایک لفظ یاد آ رہا تھا اور..... بری طرح رُلا رہا تھا۔ کیسے وہ اسے گھسیٹتے ہوئے گیٹ کے باہر لے گئے تھے..... اور کس حقارت سے اسے جھٹکے سے باہر پھینکا تھا..... اور وہ الفاظ.....

''پکڑو فون اور بلاؤ اپنے اس عاشق کو..... ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا وہ..... فوراً بھاگا آئے گا۔''

اسے لگا جیسے کسی نے اس کے کانوں میں سیسہ لا انڈیلا تھا۔ اس نے بے اختیار کانوں پر ہاتھ رکھے تھے، وہ اسے اتنا برا سمجھتے تھے۔ اس سے اتنی نفرت کرتے تھے۔

وہ کچھ اور شدت سے روئی تھی اور بہت دیر تک روتی رہی تھی۔

☆☆☆

''خیریت تو ہے ناں بیگم..... چہرہ کیوں اس قدر اترا ہوا ہے؟'' علی رضا نے متفکر نگاہوں سے بیوی کو دیکھا تھا۔

''بس زارا کے بارے میں سوچ، سوچ کر پریشان ہوں۔'' انہوں نے ساری باتیں کہہ سنائی تھیں۔

''اگر وہ ایسا سوچ رہی ہے تو یہ تو ایک خوش آئند بات ہے۔ لڑکیوں میں کمپرومائز کرنے کی عادت ہو تو وہ ہر طرح کے حالات میں ایڈجسٹ کر لیتی ہیں۔''

''آپ نے میری بات غور سے سنی ہی نہیں..... میں کب اسے یہ کہہ رہی ہوں کہ وہ کمپرومائز نہ کرے۔'' سمیہ کو ان کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔

''تو پھر.....؟'' انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے سمیہ کو دیکھا تھا۔

''میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ اثیر کو احساس ہو کہ اس نے کس قدر گری ہوئی حرکت کی ہے، آپ خود سوچیں علی..... یہ سب کسی پڑھے لکھے شخص کے شایانِ شان ہے..... میاں، بیوی میں لڑائی جھگڑا ہو جاتا ہے..... ایک

دوسرے پر غصہ بھی نکالا جاتا ہے لیکن یوں نہیں.....''
ٹشو سے کہتے ہوئے سمیہ نے ان کے کپڑے الماری میں ہینگ کیے تھے۔
''اچھا چلیں آپ چھوڑیں ساری باتیں..... واش روم سے فارغ ہو کر نکلیں..... میں دودھ لا رہی ہوں.....''
اچھی بیویوں کی طرح سمیہ نے بحث سمیٹی تھی اور کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

☆☆☆

''کیا کر رہی ہے ہماری بیٹی؟'' انہوں نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے شفقت سے پوچھا تھا۔
''کشف المحجوب'' پڑھ رہی ہوں پاپا..... دادی جان بہت شوق سے پڑھا کرتی تھیں مگر خاصی مشکل کتاب ہے۔''
''ہاں یہ تو ہے.....''
''اب دیکھیں ذرا میں یہ پڑھ رہی تھی۔
''حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ فرمائے کہ مجھے دیکھو تو میں آنکھ سے نہیں دیکھوں گا کیونکہ محبتِ الٰہی میں آنکھ غیر اور بیگانہ ہے، غیر کی غیریت مجھے دیدار سے روکتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں، میں آنکھ کے واسطے کے بغیر اسے دیکھتا رہا ہوں..... پس میں آخرت میں اس واسطے کو کیا کروں گا؟'' ــــ کیسے لوگ تھے پاپا یہ..... کیا اس دور میں بھی ایسے لوگ ہوں گے؟''
''بالکل ہوں گے..... ہمارے ارد گرد، ہمارے درمیان..... بس ہم انہیں پہچان نہیں پاتے..... یا شاید پہچاننا نہیں چاہتے..... لیکن یہ دنیا ایسے ہی لوگوں کے دم سے اب تک قائم ہے۔''
''میرا بڑا دل چاہتا ہے..... پاپا کہ میں ایسے لوگوں سے ملوں.....'' وہ کھوئے، کھوئے لہجے میں کہہ رہی تھی جب سمیہ آوازیں دیتی اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔
''حد کرتے ہیں آپ بھی علی، زارا کو بلانے کے بجائے خود بھی اندر ہی اندر آ کر بیٹھ گئے ہیں۔''
''سوری بیگم..... چلو زارا بیٹی! تمہاری ماما نے بارش کا مزہ دوبالا کر دیا ہے، پکوڑے، سموسے اور پتا نہیں کیا کچھ بنا ڈالا ہے۔ اور تمہارے بغیر ہاتھ نہیں لگانے دے رہیں یہ مجھ غریب کو.....''
''زارا ہاتھ چیک کرنا ذرا بیچارے غریبوں کے.....'' سمیہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور زارا بھی مسکرا دی تھی۔

☆☆☆

''جھوٹ مت بولو..... ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا ہے تم لوگوں کو وہاں سے نکلے..... بولو کہاں گئی تھیں تم اس کے ساتھ.....'' جھاگ اڑاتے منہ کے ساتھ کہتے ہوئے انہوں نے اس کے رخسار پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ ایک لمحے کے لیے زمین و آسمان اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔
''کہیں بھی نہیں اشیر..... قسم سے سیدھی ماما کی طرف سے آ رہی ہوں.....'' اس نے آنسوؤں سے رندھی آواز میں کہا تھا۔
''شٹ اپ.....'' انہوں نے اتنی زور سے اس کے بال کھینچے تھے کہ اس کی چیخ نکل گئی تھی۔
''ماما.....'' وہ ننھا سا وجود سسکتا ہوا اس کے ساتھ آ لپٹا تھا۔
''دفع ہو جاؤ وہیں پر جہاں سے آئی ہو اور اس گندگی کو بھی ساتھ لے جاؤ..... جیسی ماں ویسی بیٹی.....'' تنفر سے کہتے ہوئے انہوں نے اسے دھکا دیا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو گرنے سے بچایا تھا..... لیکن جس کی وجہ سے بچایا تھا وہ جھٹکا لگنے سے نیچے جا پڑی تھی۔
اور تبھی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ وہ کمرے میں اکیلی تھی، چہرہ اور جسم پسینے سے بری طرح بھیگا ہوا تھا۔
''یہ کیسا خواب تھا؟'' اس نے بے اختیار اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا تھا اور بہت دیر یونہی ہاتھ رکھے خالی، خالی نگاہوں سے چھت کی طرف دیکھتی رہی تھی۔
''یہ خواب تھا یا کوئی اشارہ.....'' نچلا لب دانتوں تلے دبائے اس نے انگلیوں سے اپنی کنپٹیوں کو سہلایا تھا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی لیکن آنسو خود بخود آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔
''دفع ہو جاؤ وہیں پر جہاں سے آئی ہو..... اور اس گندگی کو بھی ساتھ لے جاؤ..... جیسی ماں ویسی بیٹی.....''
کیوں.....؟ آخر کیوں اس شخص کو اس پر بھروسا نہیں تھا، اعتبار نہیں تھا۔ ایک دم اسے اس قدر رونا آیا تھا کہ خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔ پھر جانے کتنی دیر وہ

دھاڑیں مار، مار کر روتی رہی تھی۔

دل یوں تھا کہ جیسے پگھل کر بہہ جانا چاہتا تھا۔ رو، رو کر تھک چکی تھی لیکن آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ رکتے تھے پھر کوئی بات یاد آتی تھی اور آنسوؤں کو رواں کر جاتی تھی۔

کیا قصور تھا آخر اس کا.....! کیا جرم تھا جو اس نے کیا تھا! صرف یہ کہ اس شخص کو چاہا تھا..... اس سے محبت کی تھی!

مگر کیوں کی تھی اس نے اس سے محبت.....؟ اسے ایک عجیب سے ملال نے گھیرا تھا۔ محبت پر اختیار نہیں تھا..... لیکن اظہار پر تو ہو سکتا تھا ہاں..... اس اظہار نے ہی اسے بے اعتبار کیا تھا! اسے اس شخص کی نگاہوں میں گرا دیا تھا..... بے وقعت اور بے عزت کر دیا تھا.... اور... بدکردار بنا دیا تھا۔

''اللہ جی..... میرے..... اللہ جی.....'' روتے، روتے اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔

کیسا اذیت ناک تھا اس شخص کی نگاہ میں یوں... کریکٹر لیس ہونا جسے اس نے دل کے سب سے بلند مقام پر بٹھایا تھا۔ اسے لگا تھا اس کا دل پھٹ جائے گا..... لیکن کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ نہ اس کا دل پھٹا تھا نہ آسمان ٹوٹا تھا۔ رو، رو کر جب وہ تھک گئی تو آنسو بھی بالآخر تھم گئے تھے۔

[illegible] پانی کے چھینٹے [illegible] آئی تھی تو وہ [illegible] ہا تھا۔ وال کلاک کی جانب نگاہ اٹھی تو قرآن پاک کی آن لائن کلاس میں چند منٹ رہتے تھے۔ موبائل اٹھاتے ہوئے اس نے فیس بک کھولی... اور پھر اس کی نگاہوں کے سامنے جو الفاظ آئے تھے انہوں نے اس کی نگاہوں کو جکڑ لیا تھا۔

''ایک ماں کے لیے اپنے بچے کو رنجیدہ، ٹوٹا ہوا، بکھرا ہوا، شکستہ حال دیکھنا دنیا کا سب سے مشکل ترین کام ہے..... پھر اللہ جو اپنے بندے سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے وہ اپنے بندے کو ایسی کیفیت میں دیکھ کر کیسے نہیں تڑپ کر اسے سمیٹ لینے کے لیے آگے بڑھے گا۔ تو جب دنیا تمہیں توڑ دے تو دل مت چھوڑو، حوصلہ مت ہارو، یقین رکھو کہ تمہارا رب تمہیں جوڑنے کے لیے تمہارے بالکل قریب ہے اور اسے ٹوٹے دلوں سے..... بے حد پیار ہے۔''

اس کا دل اپنے پیارے اللہ جی کی محبت سے لبریز تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے..... مگر یہ آنسو دکھ سے نہیں آئے تھے، رنج و غم سے نہیں آئے تھے..... یہ آنسو خوشی کے تھے..... تشکر کے تھے..... اسے لگا تھا اللہ اسے حوصلہ دے رہا ہے..... اس کی ہمت بندھا رہا ہے..... اسے اپنے پیار کا یقین دلا رہا ہے اور اس وقت اس سے زیادہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا رب ٹوٹے دلوں سے کتنا پیار کرنے والا تھا۔

اس نے پوسٹ کے ساتھ، ساتھ پیج بھی لائک کیا تھا اور شال اچھی طرح لپیٹ کر لیتے ہوئے بے حد ذوق و شوق سے قرآن کلاس لینے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''اجیہ..... ڈونٹ وری یار..... کیوں اس قدر ٹینشن لے رہی ہو تم..... اٹس آل رائٹ..... بس ذرا سی سر پر چوٹ آئی ہے..... دو چار دن میں ٹھیک ہو جائے گی.....'' اجیہ کے مسلسل بہتے آنسوؤں کو دیکھ کر سمیر نے اپنی تکلیف چھپا کر مسکراتے ہوئے اجیہ کو دلاسا دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اجیہ کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے تھے۔

''اجیہ..... تم چپ کرو گی یا نہیں.....'' اب کے سمیر نے جھنجلا کر کہا تھا۔

''نہیں.....'' اس نے جس انداز میں کہا تھا سمیر تکلیف کے باوجود مسکرا دیا تھا۔

''ویسے سچ میں روتے ہوئے تم اتنی حسین لگ رہی ہو ناں کہ میں سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ میں ہر چند روز بعد یہ کارنامہ انجام دیا کروں.....''

''سمیر کے بچے تم.....'' وہ بے اختیار کشن اٹھاتی اس کی جانب بڑھی تھی پھر فوراً کشن پھینک دیا تھا اور پیٹوں میں جکڑا اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

''کیوں کرتے ہو اتنی ریش ڈرائیونگ..... جانتے ہو اگر تمہیں کچھ ہو ناں تو میں بھی ختم ہو جا.....'' جملہ اس سے پورا نہیں کیا جا سکا تھا آنسوؤں کا گولا سا حلق میں پھنسا تھا۔ بس کوئی پل تھا کہ وہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگتی کہ گیٹ کی مسلسل بجتی بیل نے اسے سنبھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''آئی تھنک کہ حسیب ہوگا.....'' سمیر نے کہا تھا۔

اس نے ٹشو باکس سے دو تین ٹشوز کھینچے تھے اور آنسو صاف کرتی باہر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

''اشیر آیا ہے.....'' شاور لے کر خود کو خاصا فریش محسوس کرتی وہ بالوں میں برش کر رہی تھی..... دروازہ کھلا تھا اور سمیہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے جیسے دھماکا کیا تھا۔ وہ کئی لمحے خاموشی سے اُن کا چہرہ دیکھتی رہی۔ پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''واپس بھیج دیں.....''

''کیا.....؟'' سمیہ کو جیسے اپنی سماعت پر شبہ ہوا۔

''ہاں ماما..... کہہ دیں میں ان سے نہیں ملنا چاہتی..... نہ آج..... نہ کل..... کبھی بھی نہیں.....'' اس کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ سمیہ حیران و پریشان سی اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

''زارا..... اس طرح.....''

''آپ کے لیے مشکل ہے تو میں خود کہہ دیتی ہوں۔''

''زارا بات تو سنو.....'' انہوں نے روکنا چاہا تھا لیکن وہ تیزی سے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔

''کیا کرنے آئے ہیں آپ یہاں..... اور کیوں؟'' دروازے کے درمیان کھڑی وہ تند لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''زارا..... میں.....'' اُن کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کہیں.....

''کون زارا..... کیا رشتہ ہے آپ کا زارا سے؟ چلے جائیں آپ یہاں سے..... اور دوبارہ کبھی مت آیئے گا..... مار دیا ہے آپ نے زارا کو سمجھے آپ.....'' وہ جس طرح تیزی سے آئی تھی ویسے ہی تیزی سے پلٹ گئی تھی اور وہ بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے تھے۔

سمیہ نے آکر بڑے سبھاؤ کے ساتھ معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ زارا کی طبیعت کی خرابی کا بتاتے ہوئے چائے کے لیے اصرار کیا تھا لیکن وہ معذرت کرتے ہوئے اٹھ گئے تھے۔

اگر سائیکالوجسٹ سے ان کا ٹریٹ منٹ نہ چل رہا ہوتا اور امی جان ہر روز زارا کی تعریفوں کے پل نہ باندھ رہی ہوتیں تو شاید وہ اس وقت بھی ایک بار پھر زارا کو ہی قصور وار ٹھہرانے لگتے لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ اب وہ اسے حق بجانب سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے خود اپنے آپ کو اس کی نظروں میں گرا دیا..... اپنا مقام کھویا تھا، اب اس کا لہجہ بدل گیا تھا تو انہیں برداشت کرنا تھا۔

☆☆☆

دوسرا اور پھر تیسرا دن بھی گزر گیا تھا۔

وہ نہیں آئے تھے، اسے انتظار نہیں تھا پھر دل جانے کیوں اس قدر بے کل تھا۔

بے چین روح کے مانند اندر باہر چکراتی وہ اس وقت لاؤنج کے دروازے پر کھڑی تھی جب حنان وہاں پر سے گزرا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے وہ رکا ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔

زارا کا دل جو پہلے ہی بے حد اداس تھا کچھ اور اداس ہوا تھا۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ اس کے پیچھے جائے..... اس سے پوچھے کہ وہ اس سے ملے بغیر کیوں جا رہا تھا۔ پہلے کی طرح اس سے جھگڑے کہ وہ اسے اگنور کر رہا ہے۔ اس نے دل کو جھڑکا اور بوجھل دل کے ساتھ وہیں کھڑی ملوئی، کھوئی نگاہوں سے گیٹ کو دیکھتی رہی..... اور ابھی جانے کب تک یونہی کھڑی رہتی کہ اندر سے سمیہ اسے پکارتی لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر چلی آئیں۔

''زارا کہاں گم ہو میری جان..... کتنی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور یہ ہلکا سا سوئیٹر پہنا ہوا ہے تم نے..... پہلے ہی فلو ہو رہا ہے۔''

''نہیں ماما اتنی بھی سردی نہیں ہے۔'' دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے ہوا سے ہلتے بوگن ویلیا کے پھولوں کو دیکھا تھا۔ یہ پھول یوں ہوا کے ساتھ جھومتے اسے کتنے خوب صورت لگتے تھے لیکن آج نہیں لگ رہے تھے۔

''چلو جلدی سے اندر آؤ..... دیکھو میں نے اپنی بیٹی کے لیے کیا بنایا ہے.....''

''کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا ماما.....''

''اوں ہوں..... تم دیکھو تو سہی..... خود ہی دل چاہے گا۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ تھاما اور وہ کسی روبوٹ کے مانند ان کے ساتھ چل پڑی تھی۔

ٹیبل پر اس کا پسندیدہ گاجر کا حلوا رکھا تھا، جسے دیکھتے ہی وہ خوش ہو کر پُرجوش نعرہ لگایا کرتی تھی۔

''واؤ..... گاجر کا حلوا.....'' آج چاہتے ہوئے بھی ایک لفظ نہ کہہ سکی..... کہا ہی نہیں گیا..... جانے کیوں دل اس قدر گداز ہو رہا تھا۔

سمیہ نے محبت سے اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے اپنے ہاتھ سے چمچ بھر کر اس کے منہ کی جانب کیا تھا۔

بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے منہ کھول دیا تھا اور پھر چمچ ان کے ہاتھ سے تھام لیا تھا۔

''ساجدہ سالن کے نیچے آنچ ہلکی کردو ذرا..... بلکہ ٹھہرو میں خود آرہی ہوں۔'' وہ تیز قدموں سے کچن میں گئی تھیں اور چند منٹ بعد پلٹ آئی تھیں۔

''مصروف نظر آرہی ہیں..... کوئی آرہا ہے کیا.....'' کچن سے اٹھتی اشتہا انگیز خوشبوؤں اور ان کی مصروفیت سے اس نے جیسے اندازہ لگایا تھا۔

''ہاں..... تمہارے انکل اور ماموں..... تمہارے پاپا کا خیال ہے کہ اکٹھے ہوں گے ذرا ہلا گلا ہوگا تو تمہارا بھی دل بہلے گا۔ تمہارے لیے کچھ شاپنگ کی ہے میں نے..... چیک کرلو کیا پہننا ہے.....''

''اس کی کیا ضرورت تھی ماما..... ابھی دو تین پہلے ہی تو اتنا کچھ لے کر آئی تھیں آپ.....''

یہ حقیقت تھی کہ اسے اس وقت کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں تھی..... نہ ہی اس وقت کسی سے ملنے کو اس کا دل چاہ رہا تھا..... لیکن اب کیا ہوسکتا تھا..... ماما، پاپا سب کو انوائٹ کرچکے تھے۔ اب سب سے ملنا بھی تھا اور ہنسنا بولنا بھی تھا..... حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کمرے میں جائے اور دروازہ بند کرلے۔

تنہائی ہو، وہ ہو اور اس کا رب..... باقی سب کو وہ بھلا دے..... دکھ دینے والے ہر خیال کو دل کو بوجھل کردینے والے ہر احساس کو..... بس یاد ہو تو اس کا رب ہو..... بات ہو تو اس کے رب کی ہو..... اس سے کہے..... اسی کی سنے..... اس کے سامنے آنسو بہائے اور اسی کے دلاسے سے ہلکی پھلکی ہوجائے۔ لیکن پھر اس نے خود کو سمجھایا تھا کہ یوں سب سے کٹ کر رہنے کو تو اللہ نے بھی پسند نہیں فرمایا۔ لیکن خود کو بہت سمجھانے کے باوجود بھی اس کا دل سب سے مل کر بھی اور بوجھل ہوگیا تھا۔

وہ خوشی جو ہمیشہ ہوا کرتی تھی مفقود تھی۔

ماما، پاپا کی تاکید پر اس نے اشیر احمد کے بارے میں کہا تھا کہ انہیں اچانک شہر سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ لیکن اسے صاف لگ رہا تھا جیسے وہ سب جانتے تھے کہ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ حالانکہ انہوں نے تو کچھ ایسا کہا تھا نہ ظاہر ہی کیا تھا، بس یہ اس کے اپنے اندر کا احساس تھا۔

اندر جہاں اس وقت عجیب متضاد سی کیفیات تھیں۔ اس ساری گہما گہمی میں بھی اندر جیسے گہری خاموشی تھی۔ عجیب سی تنہائی تھی۔

ہنستے ہنستے اچانک ہی آنکھ بھر آئی تھی تو نمی چھپانا مشکل ہوجاتی تھی۔ کہاں تو اصرار کرکے سب کو روکا کرتی تھی۔ کہاں آج انتظار تھا..... کہ کب سب جائیں گے..... اور پھر باری، باری جب سب چلے گئے تو اس نے جیسے سکون کی سانس لی تھی..... لیکن یہ صرف چند لمحوں کے لیے تھا اس کے بعد پھر وہی بے چینی تھی۔

ماما کو شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آئی تو جسم تو تھکن سے چور تھا ہی دل اور ذہن بھی تھک چکے تھے۔ چینج کرکے بستر پر آئی تو خیال تھا کہ فوراً نیند آجائے گی لیکن نیند کا دور، دور تک کوئی نام ونشان نہیں تھا..... کچھ دیر بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ دل کی بے چینی اور اضطراب کو دور کرنے کا جو کلیہ اسے چند دن پہلے ملا تھا وہ بے حد آسان تھا اور ہمیشہ کارآمد ثابت ہوتا تھا۔

اور وہ کلیہ تھا اللہ کے سامنے حاضری..... نماز کے ساتھ قرآن کے ساتھ ذکر، درود شریف اور دعا کے ساتھ..... اب بھی جب نوافل اور دعا کے بعد وہ سونے کے لیے واپس بستر پر آئی تو دل پُرسکون تھا۔

اشیر احمد نے پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی۔ اجیہ نے اسے تین دن سے کال نہیں کی تھی۔ حنان نے صرف دعوت میں شریک نہ ہونے کے لیے گاڑی کے خراب ہونے کا بہانہ بنایا تھا۔ یہ سب خیال اور ان پر رہ، رہ کر ہوتا ملال جاتا رہا تھا۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کیسی معمولی باتوں پر پریشان ہوتی رہی تھی جبکہ جن باتوں پر پریشان ہونا چاہیے تھا ان کو پھر بھولی ہوئی تھی۔

اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھی کتاب ''آیئے اللہ کو راضی کریں'' اٹھائی تھی۔

''اگر کبھی آپ کو کسی سے بھی اپنے خلوص، وفا اور محبت کا صلہ نہ ملے..... سب دوستیاں، سب سنگتیں کہیں کھو جائیں..... دل سے جڑے تعلق ہوں یا خون کے رشتے..... محبت کے دعوے سب کریں مگر کسی مشکل لمحے میں ساتھ کھڑے نظر نہیں آئیں..... وہی لوگ آپ کو بری طرح توڑ دیں..... جن کو آپ سب سے زیادہ چاہیں، جن

پر آپ اپنی جان تک لٹائیں..... تو دل چھوٹا مت کریں، پریشان، مایوس مت ہوں..... خود کو تنہا بے یارو مددگار اور لاچار مت سمجھیں..... ! کوئی ہے جو آپ کے پاس ہے..... آپ کے بہت قریب..... شہ رگ سے بھی زیادہ قریب.....

وہ دیکھ رہا ہے آپ کی آنکھوں کو پتھر ہوتے..... لہو کو آپ کی رگوں میں منجمد ہوتے..... آسمان کو آپ کے سر سے ہٹتے..... زمین کو آپ کے پاؤں تلے سے سرکتے..... روح کو جسم سے کھنچتے..... وہ ایسا علیم وخبیر ہے کہ آپ کی کیفیت کو آپ سے بھی بہتر جانتا ہے۔ اس کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے اسے پکاریں۔

اسے صرف آپ کی ایک پکار ہی کا انتظار ہے..... دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلی ہوئی صرف ایک پکار کا..... ہوسکتا ہے یہی ایک پکار سننے کے لیے آپ کو تنہا کیا گیا ہو..... ہوسکتا ہے اپنے ساتھ جوڑنے کے لیے آپ کو یوں توڑا گیا ہے..... آپ کے پکارتے ہی وہ آپ کو اپنے دامن محبت میں چھپالے، آپ پر اپنی رحمتوں کی بارش برسادے..... آپ کو ہر غم، ہر دکھ سے بے نیاز کرکے اپنا بنالے۔'' زارا کو لگا جیسے یہ الفاظ کسی نے اسی کے لیے لکھے تھے اور اس کے پیارے اللہ نے اس کے سامنے لا رکھے تھے۔ اسے بے اختیار اپنے رب پر بے حد پیار آیا جو اس پر اس قدر مہربان تھا کہ اس کی ساری نادانیوں کو نظر انداز کرتا خود اسے اپنی جانب بلا رہا تھا۔

☆☆☆

''صاحب جی..... گیارہ بج گئے ہیں..... اٹھ جائیں..... دوائی کھالیں..... دوپہر کی وی اپنی زیادہ دیر نال لی تھی آپ نے.....'' حامد نے اشیر احمد کو کندھے سے ہلاتے ہوئے عاجز آئے لہجے میں کہا تھا۔

انہوں نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھولی تھیں پھر بند کرلی تھیں۔

دو دن سے انہیں شدید بخار تھا..... حامد سخت پریشان تھا..... اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے..... زارا کا نمبر اس کے پاس نہیں تھا۔ بڑی بی بی اتنی دور تھیں کہ انہیں بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ پھر ان کو بتانے سے وہ ناراض بھی بہت ہوتے تھے۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے کہ اچانک ان کے دوست عالمگیر خان کا فون آگیا تھا۔ حامد نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے ساری صورت حال اسے بتائی تھی۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں آپہنچا تھا اور انہیں زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا۔ چیک اپ کروا کے اور میڈیسن دلا کر حامد کو ہدایات دے کر وہ تو چلا گیا۔ لیکن میڈیسن لینے میں انہوں نے حامد کو وہ زچ کیا کہ وہ رونے والا ہوگیا۔

دو بجے کی خوراک انہوں نے پانچ بجے لی تھی اور اب شام کی خوراک لیے بغیر ہی سو گئے تھے اور اس کے بار، بار اٹھانے کے باوجود اٹھنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

''کنی چنگی تھیں زارا باجی..... کتنا خیال رکھتی تھیں اناں دا پر صاحب جی..... انہاں نوں راس ای نئیں آئی اپنی محبت میرے پاس فون دی تو نئیں زارا باجی دا..... نئیں تو ہوسکتا اے صاحب کی بیماری دا سن کر صلح ہی ہوجاندی دونوں دی.....''

بے حد ہمدردی سے سوچتے ہوئے ایک بار پھر وہ اشیر احمد کو جگانے کے لیے آگے بڑھا تھا۔

☆☆☆

وہ ان کا اس کے گھر کا پانچواں چکر تھا..... سمیہ کے بڑی شائستگی سے ساتھ، بڑی عاجزی کے ساتھ معذرت کرنے پر وہ اس دفعہ واپسی کے لیے نہیں اٹھے تھے..... بلکہ ان سے اجازت لے کر زارا کے کمرے میں چلے آئے تھے۔

وہ دریچے میں کھڑی تھی قدموں کی چاپ سن کر واپس مڑی تو انہیں روبرو پایا..... چند لمحے تو لب بھینچے خاموش کھڑی رہی پھر باہر کی جانب بڑھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کو کندھوں سے تھام لیا۔

''ایسے کب تک چلے گا زارا..... کتنے دن ہوگئے ہیں روز آرہا ہوں میں..... مانتا ہوں غلطی ہوگئی ہے مجھ سے لیکن معذرت کررہا ہوں ناں.....''

زارا نے استہزائیہ انداز سے انہیں دیکھتے ہوئے ان کے ہاتھ کندھوں سے ہٹائے تھے۔

یہ وہ معذرت کررہے تھے..... کربھی رہے تھے تو اسے کیا..... اس نے سوچا تھا اور یہ ہی بات ان سے کہہ بھی دی تھی۔

''میاں، بیوی میں سو باتیں ہوجاتی ہیں زارا..... بس غصہ آگیا تھا..... دماغ خراب ہوگیا تھا میرا..... اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے مجھے.....''

ایا واقعی انہیں اپنی غلطی کا احساس تھا؟ لگ تو نہیں رہا تھا وہ بے اختیار دلگرفتہ ہوئی اور اپنی دلگرفتی پر غصہ بھی آیا۔

''چلو اب غصہ تھوک دو پلیز.....'' اس کی خاموشی نے ان کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ اس کی دلی کیفیت سے بے خبر مطمئن سے لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے اس کا ہاتھ تھاما۔

اس نے ایک نظر ان کے مطمئن چہرے کو دیکھا اور ان کے اطمینان نے اسے بری طرح مایوس کیا..... ساتھ ہی اسے اپنا خواب یاد آیا..... اتنا کچھ کرنے کے باوجود اگر وہ نادم نہیں تھے..... تو آئندہ ان سے کوئی اچھی امید رکھنا نادانی تھی..... اور اپنی نادانیوں کی سزا وہ اپنی اولاد کو قطعاً نہیں دے سکتی تھی۔ فیصلہ کن انداز میں سوچتے ہوئے اس نے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

''غصہ وہاں ہوتا ہے، جہاں کوئی تعلق ہو اور آپ سے میرا کوئی تعلق نہیں.....'' اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے نکالتے ہوئے اس نے سرد سے لہجے میں کہا۔

''اللہ کا شکر ہے زارا..... ہمارا تعلق ویسے ہی برقرار ہے۔''

''تو اب ختم کر دیں اس تعلق کو کیونکہ مجھے کوئی تعلق نہیں رکھنا ہے آپ سے.....'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا اور اشیر احمد کا وجود جیسے منجمد ہو گیا تھا۔ جانے اس کے لفظوں سے..... اس کے لہجے سے یا اس کی آنکھوں کے اس تاثر سے جس پر انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

دروازے کے باہر کھڑی سمیہ کے قدم بھی جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے۔ وہ اپنی بات ختم کر کے کمرے سے نکل آئی تھی اور سمیہ کے پاس رکے بنا برابر سے گزرتی باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

پھر اشیر احمد کئی بار آئے اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ علی رضا نے سمجھایا..... سمیہ نے منایا لیکن وہ اپنی بات پر جمی رہی۔

''زارا میری جان اب یہ سب ختم کرو ناں..... ابھی تو پوری فیملی میں کسی کو اصل بات کی خبر نہیں..... سب کو میں نے یہی بتایا ہے تم توفیق احمد کی اچانک ڈیتھ کی خبر سن کر بے ہوش ہو گئی تھیں اور ابھی تمہاری ساس سانہوال سے واپس نہیں آئیں تو اس لیے تم یہاں ٹھہری ہوئی ہو۔ مگر اور کتنے دن میں یہ کہہ سکوں گی.....''

''ماما آپ مت کہیں یہ..... جو حقیقت ہے وہ سب کو بتا دیں آپ۔'' زارا نے سورۂ بقرہ کی تفسیر پڑھتے ہوئے سکون سے کہا تھا۔

''زارا.....''

''ماما پلیز.....'' ان کی تمہید سے وہ سمجھ گئی تھی کہ اب وہ کیا کہنے والی تھیں۔

''ماما آئی نو کہ یہ سب فیس کرنا آپ کے اور پاپا کے لیے مشکل ہے مگر مجھ سے زیادہ مشکل تو نہیں..... ہم سب کو اسے فیس کرنا ہے ماما..... کیونکہ یہ طے ہے کہ مجھے اشیر احمد کے ساتھ نہیں رہنا۔'' سر پر اسٹال لپیٹے ٹھہرے، ٹھہرے لہجے میں کہتی وہ انہیں بڑی سوبر سی اور بہت بڑی سی لگ رہی تھی۔

وہ چند لمحے خاموشی سے انہیں دیکھتی رہیں پھر دوپٹا سر پر اوڑھتے ہوئے اس کے برابر آ بیٹھی تھیں۔

☆☆☆

آج اشیر احمد کی ڈاکٹر خرم کے ساتھ آخری میٹنگ تھی۔ فارغ ہو کر نکلے تو گاڑی کا رخ اس کے گھر کی طرف موڑ دیا اور فیصلہ کر لیا کہ جو بھی ہو آج وہ زارا سے مل کر رہیں گے۔ لیکن اس وقت ان کی مایوسی کی انتہا نہ رہی جب چوکیدار نے بتایا کہ سب لوگ پھولوں کی نمائش دیکھنے گئے ہیں۔ بددلی سے ڈرائیونگ کر کے گھر پہنچے تو حامد کو آرام کرنے کا کہہ کر خود اپنے کمرے میں چلے آئے۔

اس کے بغیر کتنا سونا اور ویران تھا کمرا..... بالکل ان کے دل کی طرح..... وہ آہستہ، آہستہ چلتے سائڈ ٹیبل پر لگی اس کی تصویر کے پاس آئے اور فریم اٹھا لیا۔

دلہن کے روپ میں وہ بے حد خوب صورت اور مسرور لگ رہی تھی۔ وہ تو ان سے بے حد محبت کرتی تھی پھر اب اس قدر سنگدل کیسے ہو گئی تھی۔ تصویر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے بوجھل دل سے سوچا تھا۔

تبھی ان کے موبائل کی بیپ بجی تھی۔ انہوں نے کوٹ کی جیب سے موبائل نکالا۔ امی جان کی کال دیکھ کر چند لمحے گومگو میں کھڑے رہے۔

''اب امی پھر زارا کا پوچھیں گی۔ کیا کروں اب..... کیسے مناؤں اسے..... امی جان بھی تو ٹھیک نہیں ہیں ورنہ انہیں ہی لے جاتا.....'' انہوں نے سوچا

تھا۔ بیل بند ہوگئی تھی موبائل انہوں نے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور تصویر لے کر بیڈ پر آبیٹھے تھے۔

ایک، ایک کر کے ایسے کتنے ہی لمحے، کتنے ہی منظر یاد آنے لگے تھے۔ عجیب بات تھی کہ وہ قریب تھی تو جیسے نظر ہی نہیں آتی تھی اور اب نہیں تھی تو جیسے ہر طرف وہ ہی وہ تھی۔ تصویر پر نگاہ جمائے خیالوں ہی خیالوں میں وہ اس کے ساتھ جانے کہاں، کہاں گھومتے رہے تھے مگر حقیقت کی دنیا میں آئے تو وہی سونا کمرا تھا اور وہ تھے بوجھل دل کے ساتھ انہوں نے تصویر رکھ دی تھی۔

جو آنکھوں اوٹ ہے چہرہ اسی کو دیکھ کر جینا
یہ سوچا تھا کہ آساں ہے مگر آساں نہیں ہوتا

زیرِ لب کہتے ہوئے انہوں نے موبائل اٹھایا تھا اور یہی شعر اسے واٹس ایپ کر دیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بہت سارے دوسرے میسجز کی طرح یہ بھی unread ہی رہے گا۔

''وہ تو اتنے نرم اور پیارے دل کی مالک تھی پھر جانے اتنی سخت دل کیسے ہوگئی....''

''کیسے کا کیا مطلب ہے اثیر صاحب.....؟ سارا کیا دھرا خود تمہارا ہی ہے۔'' ان کے اندر سے کسی نے انہیں بتایا تھا اور وہ ٹھنڈی سانس بھرتے الماری سے کپڑے نکالنے لگے تھے۔

اگلے دن طبیعت کی خرابی کے باوجود امی جان شہیر کے ساتھ آگئی تھیں۔

''سچ بتاؤ اثیر.....تم اس شزا کی وجہ سے تو زارا کو لانے میں تامل نہیں کر رہے۔'' شہیر کے جاتے ہی وہ اس کے پاس آبیٹھی تھیں۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپ امی جان.....'' وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں انہیں دیکھ رہے تھے۔

بات تھی بھی نہ سمجھ میں آنے والی.....شزا کا بھلا یہاں کیا ذکر.....

''دو ماہ ہونے کو ہیں تم زارا کو نہیں لائے.....یہ تو میں نہیں مانتی کہ تم نے دل سے کوشش کی ہو اور وہ نہ آئی ہو۔'' ان کے پُریقین لہجے پر وہ چند انہیں دیکھتے رہے تھے پھر گہری سانس لیتے ہوئے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''وہ نہیں آئی امی جان.....لیکن قصور میرا ہی ہے.....میں نے کچھ نازیبا باتیں کہہ دی تھیں غصے میں اس سے.....جو میں نے آپ کو نہیں بتائیں.....اور بتا بھی نہیں سکتا.....لیکن یہ آپ کو بتا رہا ہوں کہ میں نے کوشش کی ہے اور دل سے کی ہے لیکن وہ اب میری بات تک سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ بس اب آپ ہی کچھ کریں پلیز.....

اور ہاں یہ شزا کا خیال کہاں سے آگیا آپ کو.....''

''شزا کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی ہے ناں.....''

''کب اور آپ کو کیسے پتا چلا.....؟''

''شہیر نے خبر پڑھی تھی چند دن پہلے اخبار میں بتا رہا تھا اس کے شوہر نے کسی اداکارہ سے شادی کر لی ہے۔''

''اوہ.....پھر تو زارا کو بھی یہ خبر معلوم ہو چکی ہوگی۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''تو کیا تم نے زارا کو بتایا ہے شزا کے بارے میں.....''

''جی.....!'' ان سے نگاہیں چراتے انہوں نے مرا، مرا سا جی کہا تھا اور امی جان افسوس بھرے انداز میں سر ہلا کر رہ گئی تھیں۔

''تم سے مجھے ایسی نادانی کی توقع نہیں تھی اثیر.....اللہ نے تم پر کس قدر مہربانی کی تھی.....کیسی اچھی ساتھی دی تھی تمہیں.....لیکن سچی بات ہے کہ تم نے اس لڑکی کی قدر ہی نہیں کی تھی.....آخر ضرورت کیا تھی تمہیں اس سے شزا کا ذکر کرنے.....''

''امی جان آپ غلط سمجھ رہی ہیں..... میں نے یونہی بائی دا وے شزا کا ذکر کیا تھا۔'' سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ انہوں نے کہا تھا۔

وہ ماں کو بتا نہ سکے کہ انہیں تو اب شزا کے نام سے بھی نفرت ہوگئی تھی۔ عالمگیر خان کی پارٹی میں کیسے اس نے انہیں اپنے شوہر کی ہی نہیں خود ان کی اپنی نگاہوں میں بھی دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا تھا کہ ایک لمحے کو تو ان کا دل چاہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔

''واسع یہ اثیر احمد ہیں..... غائبانہ تعارف تو ہے ناں' آپ بڑا دھواں دھار قسم کا عشق کرتے تھے یہ مابدولت سے.....اتنے سالوں بعد اب جا کر شادی کی ہے۔'' انہیں اس کا تمسخرانہ لہجہ اور انداز یاد آیا تھا اور وہ لب بھینچ کر رہ گئے تھے۔

''ذرا مجھے نمبر تو ملا دو زارا کا.....'' انہوں نے چونک کر امی جان کو دیکھا اور گہری سانس لیتے ہوئے خود کو نارمل کیا۔

''ابھی میں نے فون کیا تھا نمبر بند ہے اس کا.....

میرا خیال ہے کل آپ فون کیے بغیر ملنے چلی جائیں..... یہ نہ ہو کہ آپ فون کریں اور وہ پھر اِدھر اُدھر چلی جائے....'' انہوں نے تجمل سے انداز میں کہا تھا۔ اور انہیں مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے عابدہ بیگم نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

''زارا پہلے تم خود انہیں فون کرنے کے لیے بے تاب تھیں اور اب وہ تم سے ملنے آئی ہیں تو تم ان سے ملنا نہیں چاہ رہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا الجھا کر رکھ دیا تم نے مجھے.....''

''ماما..... الجھا میں نہیں رہی آپ کو..... آپ خود ہی الجھ رہی ہیں، میں نے تو آپ کو بتا دیا ہے کہ مجھے اثیر احمد کے ساتھ نہیں رہنا..... تو پھر میں ان سے ان کی والدہ سے یا بہن، بھائیوں سے کیوں ملاقات کروں.....''

''تو تم گھر نہیں آرہیں.....؟''

''ماما..... پلیز ٹرائے ٹو انڈر اسٹینڈ.....''

''وہ صرف تم سے ملنے کی خاطر اتنی دیر سے رکی ہوئی ہیں۔''

کوئی بات نہیں ماما..... وہ اپنی مرضی سے رکی ہیں ناں میں نے یا آپ نے تو رکنے کے لیے نہیں کہا ان سے۔''

''پھر بھی زارا.....'' سمیہ نے ایک کوشش اور کرنا چاہی تھی۔ لیکن اس نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

''پلیز ماما.....'' اس نے تھکے، تھکے لیکن حتمی لہجے میں کہا تھا اور انہوں نے خدا حافظ کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

وہ شدت سے امی جان کی واپسی کے منتظر تھے..... وہ آئیں تو اُن کے چہرے پر گہری سنجیدگی دیکھ کر وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ فوراً کچھ پوچھنا اچھا نہ لگا تو خاموشی سے ان کے سامنے آبیٹھے۔

''زارا گھر پر نہیں تھی یا کہلوا دیا کہ گھر پر نہیں ہے۔''

''میرا نہیں خیال کہ گھر پر ہو.....'' چونک کر اثیر احمد کو دیکھتے ہوئے انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

''چلو کوئی بات نہیں..... کل تو نہیں پر سوں جاؤں گی دوبارہ۔'' انہوں نے کہا تھا اور وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

☆☆☆

انگلیوں میں دبے سگریٹ نے ان کی انگلیوں کو جلایا تو انہوں نے چونک کر سگریٹ کا ٹکڑا نیچے پھینکتے ہوئے نیا سگریٹ نکالنے کے لیے پیکٹ اٹھایا..... پھر گہری سانس لیتے ہوئے واپس رکھ دیا۔ پیکٹ خالی ہو چکا تھا۔ دکھتی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا تھا اور ٹانگیں میز کے نیچے رکھ لی تھیں۔

کتنی ہی دیر وہ بنا کسی جنبش کے یونہی نیم دراز سی حالت میں بیٹھے رہے تھے..... پھر آنکھیں کھولی تھیں اور گہرے نیلے آسمان پر جگمگاتے چاند کو اور پھر دور تک چمکتے تاروں کو دیکھا تھا..... بظاہر سب کچھ ویسا ہی تھا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ سب کچھ بدل گیا تھا۔

زارا گھر پر تھی یا نہیں..... یہ انہیں علم نہیں تھا لیکن یہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ امی جان سے بھی ملنا نہیں چاہتی تھی۔ انہوں نے اس کے ساتھ بہت برا کیا تھا وہ مانتے تھے..... لیکن وہ بھی تو اب ان کے ساتھ اچھا نہیں کر رہی تھی۔ امی جان سے تو اسے ملنا چاہیے تھا۔

انہوں نے کچھ ملال، کچھ شکوہ آمیز انداز میں سوچا تھا اور دکھتے سر کو دونوں ہاتھوں سے دبایا تھا۔ اس کے دل کی سرزمین پر تو ہر وقت محبت کی بہار رہتی تھی۔ پھر وہ اس قدر بے مروت اور بے حس کیوں ہو گئی تھی۔

کہا محبت کی وہ بہار..... ان کے مقدر کی خزاں کی نذر ہو گئی تھی۔ ان کا دل یک دم بے حد بوجھل ہوا..... ہاں..... شاید ایسا ہی تھا۔ بے حد اداس ہوتے دل کے ساتھ انہوں نے سوچا تھا اور اپنے تھکے اور نڈھال وجود کو بمشکل سنبھالتے اٹھے تھے اور بے ربط قدموں کو گھسیٹتے اندر کی جانب بڑھے تھے۔

☆☆☆

''زارا وہ دھواں دھار قسم کی محبت ختم ہو گئی جو تمہیں اثیر احمد سے تھی۔'' سمیہ نے قدرے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا تھا۔

اثیر احمد کے بار، بار نا کام ہو کر جانے اور اگلے دن پھر چلے آنے اور..... کل عابدہ بیگم سے ملاقات کے بعد سمیہ بیگم دل سے چاہتی تھیں کہ زارا اپنے گھر چلی جائے مگر وہ تھی کہ اپنی بات سے ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔ ہر بات کے جواب میں اس کی ایک ہی ناں تھی۔

''محبت تو شاید ختم نہیں ہوئی ماما..... لیکن کبھی، کبھی

اتنی اہم بھی نہیں رہتی کہ ہم سب کچھ اس پر قربان کردیں....." اس نے اس انداز میں کہا تھا کہ چند لمحوں کے لیے وہ اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔ پھر انہوں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھاما اور اپنے دونوں ہاتھوں میں دبالیا تھا۔

"زارا! تم اب ماں بننے والی ہو..... ماں کو اللہ تعالیٰ نے بڑا رتبہ دیا ہے..... جنت رکھی ہے اس کے قدموں کے نیچے..... اس لیے کہ ماں اپنے بچے کے لیے اپنا آپ بھی قربان کردیتی ہے۔ تم جانتی ہو ناں بچے کو ماں اور باپ دونوں کی یکساں محبت اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے..... اثیر احمد سے غلطی ہوئی ہے لیکن اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔"

"ماما.....! میں وہ سب کچھ بھول جانا چاہتی ہوں لیکن آپ لوگ مجھے بھولنے نہیں دے رہے..... آخر کیوں.....؟" وہ ایک دم روہانسی ہوئی تھی۔

"ہمیں غلط مت سمجھو زارا..... ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں میری جان جو کہتے ہیں تمہاری بھلائی کے لیے کہتے ہیں۔"

"ماما.....! مجھے اثیر کے ساتھ نہیں رہنا بس..... میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ یہ ہی ہم دونوں کے لیے بہتر ہے اور مجھے اس معاملے میں آپ کی سپورٹ چاہیے....." اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے....." سمیہ نے گہری سانس لیتے ہوئے چند لمحے چپ چاپ اسے دیکھا پھر آہستگی سے سر ہلا دیا۔

فی الحال انہوں نے کچھ اور کہنا بہتر نہیں سمجھا تھا اور اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"کیا ماما کو میں وہ سب بتاؤں تو بھی ماما مجھے اثیر احمد کے ساتھ جانے کے لیے کہیں گی..... ابھی تو وہ کتنے آرام سے کہہ دیتی ہیں..... اثیر احمد نے صرف تمہیں ایک طلاق دی ہے زارا..... ایک طلاق سے تعلق نہیں ٹوٹتا..... ایک طلاق سے میاں، بیوی کا تعلق بے شک نہیں ٹوٹتا لیکن جو وار انہوں نے میرے کردار پر کیے ہیں..... جو گھاؤ انہوں نے میری روح پر لگائے ہیں..... جس طرح انہوں نے میرے دل کو کرچی، کرچی کیا ہے جیسے انہوں نے گھسیٹ کر مجھے اپنے گھر سے نکالا ہے..... یہ وہ جان لیں تو....." اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر کیا آیا تھا..... اس کے لب کانپنے لگے تھے..... ضبط کی تمام کوشش کے باوجود آنسو پلکوں کا بند توڑتے رخسار پر بہنے لگے تھے۔

وہ سب..... وہ یاد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن یادوں پر پہرے بٹھانا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ سب وہ دوبارہ نہیں سننا چاہتی تھی..... یہ اس کے اختیار میں تھا..... اس لیے وہ اب کبھی بھی اثیر احمد کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی۔

محبت اس کے لیے اہم تھی لیکن عزت سے زیادہ اہم نہیں تھی..... اور اب تو جانے محبت تھی بھی یا نہیں..... اور اگر تھی بھی تو وہ اسے..... بس دل کے کسی گوشے میں دبا دینا چاہتی تھی..... دفنا دینا چاہتی تھی۔

☆☆☆

"اجیہ.....! میں اس معاملے میں زارا سے بات نہیں کرسکتا..... پھپھو سے میری بات ہوئی ہے وہ بتا رہی ہیں کہ زارا، اثیر احمد سے خلع لینا چاہتی ہے..... میں جانتا ہوں وہ صرف غصے میں ایسا کر رہی ہے..... ورنہ وہ آج بھی اثیر احمد سے ویسی ہی محبت کرتی ہے..... اگر ممکن ہو تو تم صرف چند دن کے لیے پاکستان آجاؤ اور اسے کسی طرح سمجھاؤ....." ساری صورت حال اجیہ کو بتانے کے بعد حنان نے اس سے ریکوئسٹ کی تھی۔

"حنان ! آئی ڈونٹ بلیو کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ اور مجھے دیکھو..... میں کیسی دوست ہوں کہ مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ وہ کن کرائسز سے گزر رہی ہے۔" اجیہ کی آواز بھرائی اور پھر بے اختیار وہ رونے لگی۔

"دیکھو اسی لیے میں تمہیں بتا نہیں رہا تھا کہ تم وہاں اکیلی ہو..... پریشان ہوجاؤ گی۔"

"تم نے غلط کیا حنان..... تمہیں مجھے پہلے ہی بتانا چاہیے تھا..... اوکے پھر..... بات کرتی ہوں۔ خدا حافظ....."

"خدا حافظ....." حنان نے آہستگی سے کہا تھا۔

موبائل رکھ کر اس نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں بند کرلی تھیں لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے کئی بار اثیر احمد کو آتے جاتے دیکھا تھا۔ اس لیے مطمئن تھا کہ دونوں کے درمیان معاملات ٹھیک ہوگئے تھے..... پھپھو نے بھی ایسا ہی ظاہر کیا تھا۔ لیکن کل اس نے اثیر احمد کو پھپھو کے گھر جاتے اور کچھ ہی دیر میں واپس نکلتے ہوئے دیکھا تو چونکے بنا نہ رہ سکا۔ پھر اثیر احمد کے چہرے کے تاثرات اور اس کے پاس رکے بنا، اس سے ملے بنا

گاڑی اس کے برابر سے نکالتے ہوئے چلے جانا۔

وہ فوراً پھپھو کی طرف چلا آیا..... اور ان سے ساری صورتِ حال کے بارے میں جان کر حیران و پریشان ہو کر رہ گیا۔

اسے کسی بھی طرح زارا کو اس اقدام سے روکنا تھا اس لیے اس نے ساری صورتِ حال اجیہ کو بتاتے ہوئے اسے بلایا تھا۔ وہ اس معاملے میں کھل کر زارا سے بات کر سکتی تھی، اسے سمجھا سکتی تھی، منا سکتی تھی۔

☆☆☆

رات کے آخری پہر جا کر اشیر احمد کی آنکھ لگی تھی اور تب بھی بار، بار آنکھ کھلتی رہی تھی۔

الارم بجا تو سر بے حد بھاری تھا اور آنکھیں بوجھل..... الارم بند کر کے انہوں نے پھر سونے کی کوشش کی تھی لیکن کافی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد نیند مہربان نہ ہوئی تو تنگ آ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ غسل سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو امی جان کی قدرے ناگواری لیے آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔

''اشیر احمد باہر آؤ ذرا.....''

''جی امی جان.....'' وہ عجلت میں ٹاول بیڈ پر پھینکتے ہوئے باہر نکلے۔

''تمہارا فون ہے۔''

''کس کا ہے؟''

''سنو گے تو پتا چل جائے گا۔''

انہوں نے حیرانی سے ماں کے چہرے پر پھیلی ناگواری کو دیکھا تھا۔ ریسیور اٹھا لیا تھا۔

ہیلو کے جواب میں دوسری جانب سے جو آواز ابھری تھی اس نے ان کے چہرے کی حیرانی کو ناگواری اور کرختگی میں بدل دیا تھا۔

''اشیر احمد! میں شرمسار بات کر رہی ہوں.....'' ان کی خاموشی پر اس نے دوبارہ کہا تھا۔

''پلیز اشیر..... فون بند مت کرنا..... میں پہلی اور آخری بار تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''مگر مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی.....'' انہوں نے اس کی کاٹی تھی۔

''پلیز اشیر میں تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔''

''معافی تلافی وہاں ہوتی ہے محترمہ جہاں کوئی تعلق ہو اور میرا تم سے کوئی تعلق نہیں.....'' سختی سے کہتے ہوئے انہوں نے فون بند کر دیا تھا اور پھر بار، بار بیل بجنے پر بھی نہیں اٹھایا تھا۔

☆☆☆

''ماما! جب میں نے کل اشیر احمد کو صاف بتا دیا تھا کہ ان کا یوں روز، روز چلے آنا مجھے ڈسٹرب کرتا ہے اس لیے اگر وہ مجھے ذہنی تکلیف اور پریشانی سے بچانا چاہتے ہیں تو دوبارہ مت آئیں پھر اب آج دوبارہ یہ کیوں آ رہی ہیں۔'' سمیہ نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ تھکے، تھکے سے لہجے میں کہتی وہ جیسے شدید اعصابی دباؤ میں تھی۔

''زارا ریلیکس میری جان..... میں انہیں بتا دیتی ہوں کہ آج تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''ماما.....! آپ میری بات کیوں نہیں..... انڈر اسٹینڈ نہیں کر رہیں..... صرف آج نہیں..... میں چاہتی ہوں وہ کبھی بھی نہ آئیں.....''

''او کے..... کول ڈاؤن..... کرتے ہیں کچھ..... بس آج تم ان سے مل لو.....'' انہوں نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے پیار سے کہا تھا۔

''ماما..... آپ تو میری ماں ہیں..... آپ کو تو مجھے انڈر اسٹینڈ کرنا چاہیے۔'' اس کا لہجہ یک دم اس قدر شکستہ ہوا تھا کہ سمیہ تڑپ اٹھی تھیں۔

''میں سمجھتی ہوں میری جان..... بس میرا خیال تھا کہ تم غصے میں ہو ایسا نہ ہو کہ غصہ اترنے پر تمہیں پچھتاوا ہو اس لیے سمجھا رہی تھی۔ تم فکر نہ کرو جو تم چاہو گی وہی ہو گا۔'' انہوں نے بے اختیار اسے گلے لگاتے ہوئے تسلی دی تھی۔

☆☆☆

''السلام علیکم احسن بھائی! حنان بتا رہا تھا کہ اجیہ کی ٹانگ میں فریکچر ہو گیا ہے۔'' سمیہ نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی پریشانی سے پوچھا تھا۔

''ہاں اللہ نے زندگی بچالی یہ بھی ایک معجزہ ہے ورنہ جیسے سیڑھیوں سے گری ہے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔'' انہوں نے اخبار میز پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔ ساتھ ہی پکارے۔

''مسز، باہر آؤ بھئی.....''

''سمیہ..... تھینک گاڈ..... بڑے موقع پر آئی ہو تم لو بات کرو ذرا..... ٹانگ فریکچر کروا کر بیٹھی ہے اور مجھ سے جھگڑ رہی ہے کہ زارا دن رات بے ہوش رہی ہے اور

آپ نے مجھے بتایا نہیں۔''

''یہ بات کروا پنی چچی سے۔''

''السلام علیکم پھپھو.....'' حنان کی دیکھا دیکھی اس نے بچپن میں سمیہ کو پھپھو کہنا شروع کیا تھا۔ اور اب تک یہی کہتی تھی۔

''کیسی ہو پھپھو کی جان..... میں نے تو جونہی حنان سے سنا فوراً سمیر کو فون کیا..... فون نہیں ملا تو اِدھر بھاگی آئی ہوں، کیسی ہو کیا ہوا ہے؟''

''پھپھو میں ٹھیک ہوں..... آپ مجھے بتائیں کہ زارا کے ساتھ کیا کچھ ہو گیا اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں..... کیوں؟'' وہ روہانسی ہو کر پوچھ رہی تھی۔

''ریلیکس اجیہ..... میں سب بتاتی ہوں میری جان..... بلکہ سنو..... سگنل کا پرابلم ہے شاید..... تمہاری آواز بھی مجھے کٹ، کٹ کر آ رہی ہے، میں گھر جا کر تمہیں فون کرتی ہوں۔'' سمیہ نے جلدی سے کہتے ہوئے کال ڈس کنیکٹ کر دی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ پاس بیٹھے وسیم احسن بھی پوری باتیں سنیں۔

''سخت ناراض تھی مجھ سے کہ زارا اتنی بیمار رہی ہے، میں نے بتایا کیوں نہیں..... کل جونہی حنان سے پتا چلا اسی وقت سمیر کو آفس سے بلا کر شور مچا دیا کہ مجھے پاکستان بھجواؤ..... جیسے پاکستان، لاہور سے شیخوپورہ تک کا سفر ہے۔ کل کی سیٹ بک کروا کر اب ہوا کے گھوڑے پر سوار تیاری کر رہی تھی..... بھاگ کر سیڑھیاں اترتے ہوئے پاؤں مڑ گیا۔ سمیر بتا رہا تھا کہ جیسے الٹ کر نیچے آئی میرے تو حواس ہی ساتھ چھوڑ گئے۔ کوئی نیکی ہی کام آ گئی کہ سوائے ٹانگ کے کہیں اور خراش تک نہیں آئی۔''

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے بھابی..... میں تو سنتے ہی اس قدر پریشان ہوئی کہ پتا نہیں یہ ہمارے بچوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے..... پہلے زارا اور اب اجیہ..... سمیر کو فون کیا تو اٹینڈ نہیں ہوا..... میں نے فوراً ادھر کا رخ کیا۔''

''بیٹھو ناں..... کھڑی کیوں ہو.....''

''بس بھابی چلتی ہوں، زارا کی ساس آ رہی ہیں..... بس پہنچنے والی ہوں گی۔''

''کچھ دیر تو بیٹھتیں.....''

''شام کو آؤں گی..... خدا حافظ.....'' کہتے ہوئے انہوں نے تیزی سے باہر کی جانب قدم بڑھائے تھے۔

☆☆☆

''اور اللہ اپنے قرب کے لیے چن لیتا ہے جس کو چاہے۔'' اس کی نگاہیں سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر 13 کے ترجمے پر تھیں اور اس کا دل ایک الوہی سی کیفیت میں دھڑک رہا تھا۔ کیسا خوش قسمت ہو گا وہ انسان جسے اللہ خود اپنے قرب کے لیے چن لے۔ خود اپنی طرف بلائے، خود اپنی جانب لے کر آئے..... کیسا ہو گا وہ انسان جو ایسے لطف و کرم کا مستحق ٹھہرتا ہو گا..... خالقِ کائنات نے خود اپنے لیے مخصوص کرتا ہو گا۔'' اس نے عجیب سی حسرت سے سوچا تھا۔

کیا وہ ایسی خوش قسمت ہو سکتی تھی..... ایک دم اس کے دل میں خیال ابھرا تھا اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔

اگر وہ اپنی زندگی کے شب و روز پر نگاہ ڈالتی تو کچھ بھی ایسا نہیں تھا اس کے پاس کہ وہ ایسے خوش نصیبوں میں شمار ہو سکتی..... لیکن اللہ کے کرم و فضل کے بارے میں سوچتی تو کچھ بھی ناممکن نہیں تھا۔

''یا اللہ..... مجھ گناہ گار کو چن لے..... اپنی قربت کے لیے..... اپنی اطاعت و فرمانبرداری کے لیے..... یا اللہ دنیا کا ہر غم، ہر فکر اور ہر دکھ میرے دل سے نکال دے..... بس ہر دم ایک ہی فکر لگا دے کہ کیسے تو مجھ سے راضی ہو گا۔'' بے حد جذب سے کہتے ہوئے آنسو اس کی آنکھوں سے تواتر سے بہہ رہے تھے۔ اسے پتا بھی نہیں چلا تھا اور کھلے دروازے سے عابدہ بیگم اور سمیہ کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ سمیہ تو اسے یوں دیکھ کر واپس چلی گئیں جبکہ عابدہ بیگم دبے پاؤں چلتی اس کے پیچھے آرام کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔

کافی دیر کے بعد جب وہ جائے نماز اٹھاتے ہوئے کھڑی ہوئی تو ان پر نگاہ پڑتے ہی چند لمحے ساکت کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

عابدہ بیگم ایک دم اٹھیں اور اسے گلے لگا لیا۔ اور پھر جانے کیا ہوا..... دل کو سمجھانے کی..... آنسوؤں پر ضبط کے پہرے بٹھانے کی ہر کوشش، ہر سعی رائگاں چلی گئی۔ وہ روئی تو پھر روتی چلی گئی۔ عابدہ بیگم اسے ساتھ لگائے پیار سے، شفقت سے تھپکتی رہیں۔ پھر اپنے دوپٹے

کے پلو سے نرمی اور محبت سے اس کے آنسو خشک کیے.....

''غلطی ہوگئی ہے اس سے..... پریشان ہے بہت اسے معاف کردو۔'' ان کا یہ جملہ کہنے کی دیر تھی کہ آنسو جو کسی طرح تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ یک دم رک گئے تھے اور اسے اپنے یوں رونے پر بے حد غصہ آیا..... آخر کیوں ان کے سامنے یوں اپنی کمزوری کا اعلان کیا تھا اس نے.....

''میری بیٹی تو بہت محبت کرنے والی، بہت برداشت کرنے والی ہے ناں.....'' اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے انہوں نے بے حد نرمی اور پیار سے کہا تھا۔

''آپ کے دل میں جتنی بھی محبت ہو لیکن جب یہ علم ہو جائے کہ دوسرے کے دل میں آپ کے لیے نہ محبت ہے نہ عزت تو پھر راہ بدل لینی چاہیے۔'' اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔

''آپ بیٹھیں، میں ذرا... منہ دھولوں۔'' یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی، تیزی سے واش روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔

واپس آئی تو عابدہ بیگم بیڈ پر کھلا تصویروں والا البم گود میں رکھے تم آنکھوں سے دادی جان کی تصویر کو دیکھ رہی تھیں۔

''زارا بیٹی، یہ کس کی تصویر ہے؟'' اس کے قریب آتے ہی انہوں نے پوچھا تھا۔

''یہ میری دادی جان ہیں۔''

''شافعہ خالہ..... جن کا میں اکثر تم سے ذکر کرتی رہوں..... جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا وہ تمہاری دادی جان ہیں..... بھئی میں کہتی تھی کہ جو باتیں تم اپنی دادی جان کی مجھے بتاتی ہو وہ مجھے اس قدر مانوس کیوں محسوس ہوتی ہیں۔'' وہ نم آنکھوں اور خوشی بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

زارا نے کوئی جواب دیے بغیر ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر بستر پر بکھرے البم اکٹھے کرنے لگی۔

''میں جانتی ہوں تم اثیر سے بہت ناراض ہو، اس نے کیا بھی بہت برا ہے..... لیکن شافعہ خالہ پتا ہے کیا کہا کرتی تھیں..... ''اگر ہم انسان خود درگزر نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ سے درگزر کی امید بھی چھوڑ دینی چاہیے۔''

زارا نے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔ ان کی بات نے اس کے اندر ایک ہلچل مچا دی تھی۔

پھر وہ کافی دیر ٹھہرے، ٹھہرے لہجے میں اسے سمجھاتی رہیں لیکن اس کا ذہن اسی بات میں اٹکا رہا تھا۔ ''اگر ہم انسان خود درگزر نہیں کرتے تو اللہ سے بھی درگزر کی امید چھوڑ دینی چاہیے۔''

☆☆☆

''بڑی دیر لگا دی ہے امی جان نے.....'' انتظار کتنا جانگسل ہوتا ہے یہ اثیر احمد کو آج پتا چلا تھا نہ کسی کام میں دل لگ رہا تھا نہ کسی تفریح میں..... کئی چینل سرچ کرنے کے بعد بیزاری اور بے کلی کے ساتھ ریموٹ ٹیبل پر رکھتے ہوئے ایک بار پھر لاؤنج کے دروازے کے ہینڈل پر رکھا تھا جب حامد کی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تھی اور ایک لمحے کے لیے ان کا وجود منجمد کر گئی تھی۔

''فیروزاں جے اس دن تجھے گملا توڑن دا خیال نہ آندا تے صاحب جی تے باجی جی نوں تینوں طلاقاں دے دیتیاں سین۔'' (فروزاں اگر اس دن تجھے گملا توڑنے کا خیال نہ آتا تو صاحب جی نے تو باجی کو تین طلاقیں دے دینی تھیں)

''بس مجھے بھی اللہ کی طرف ہی خیال آ گیا کہ گملا اٹھا کر زور سے پھینکوں..... بس طلاق کا سنتے ہی میرے ذہن میں چاچی جی کے بین بھرنے لگے..... ہائے منحوس، تینوں طلاقیں دے دیں، گھر اجاڑ لیا اپنا..... مجھے بس یہی سمجھ میں آیا کہ کچھ بھی کروں اور صاحب جی کو اپنا گھر اجاڑنے سے روک لوں.....''

فیروزاں کے اس آخری جملے نے اثیر احمد کو اس کا ممنون کر دیا تھا۔ کتنا بڑا احسان کیا تھا اس نے ان پر یہ وہی جانتے تھے۔ وہ ایسا نہ کرتی تو وہ اب خالی دل اور خالی ہاتھ ہوتے۔ انہیں بے اختیار وہ لمحے یاد آئے تھے۔

''میں اثیر احمد ولد توفیق احمد..... تمہیں طلاق دیتا ہوں۔'' انہوں نے کتنے فخر و غرور سے کہا تھا۔

''میں تمہیں.....'' پورچ سے کچھ گرنے کی زوردار آواز آئی تھی اور الفاظ ان کے منہ میں ہی رہ گئے تھے۔ ایک جھٹکے سے اسے چھوڑتے وہ تیزی سے باہر نکلے تھے۔

ابھی کل ہی تو ساتھ والے گھر میں چوری ہوئی تھی۔ ستون کے ساتھ پڑا گملا ٹکڑوں میں بکھرا ہوا تھا انہوں نے جلدی سے گیٹ سے نکل کر ادھر ادھر دیکھا تھا پھر حامد کو آواز دی تھی۔ حامد کے بجائے فیروزاں پھولے سانسوں

کے ساتھ ان کے پاس آئی تھی۔

''حامد سو رہا ہے صاحب جی..... اسے بہت تیز بخار ہے اسی لیے بی بی جی نے مجھے بلایا تھا۔''

''یہ گملا کیسے ٹوٹا ہے۔''

''پتا نہیں صاحب جی.....''

''میں آواز سن کر باہر نکلا ہوں..... تم لوگوں کو آواز نہیں آئی.....؟''

''آئی تھی صاحب جی..... بس میں دیکھنے کے لیے آرہی تھی۔'' غصے میں اسے گھورتے ہوئے ایک بار پھر انہوں نے گیٹ پر جا کر اِدھر اُدھر دیکھا تھا پھر واپس پلٹ آئے تھے۔

فیروزاں وہیں کھڑی تھی۔

''کیوں کھڑی ہو.....؟''

''جی وہ.....''

''جاؤ اپنے کوارٹر میں.....'' ترش لہجے میں کہتے وہ اندر کی جانب بڑھے تھے اور اندر کی جانب بڑھتے ہوئے اچانک انہیں کل شام کو سنا ہوا مولانا صاحب کا بیان یاد آیا تھا۔ جس میں انہوں نے بتایا تھا کہ ایک ہی وقت میں تین بار طلاق دینا شدید گناہ ہے۔

''میں اس ذلیل عورت کی خاطر خود کو گناہ گار کیوں کروں۔ ابھی بس اسے دفعان کرتا ہوں، باقی دو طلاقیں بعد میں اس کے منہ پر ماروں گا۔'' اندر جاتے ہوئے انہوں نے تنفر سے سوچا تھا۔ اور یہ سوچ اس لیے آئی تھی کہ وہ فیروزاں کا پھینکا ہوا گملا ٹوٹنے کی آواز سن کر وہ منحوس جملہ ادھورا چھوڑ کر باہر نکل آئے۔

بے حد ممنون ہوتے ہوئے انہوں نے اس چھوٹی سی لڑکی کو دیکھا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کا گھر ٹوٹنے سے بچ گیا تھا۔

اسے شاباش دینے کے خیال سے انہوں نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی زور و شور سے بجنے لگی تھی۔ واپس پلٹتے ہوئے انہوں نے ریسیور اٹھایا لیکن دوسری طرف سے آواز سن کر ان کا دل چاہا ریسیور کو واپس کریڈل پر پٹخ دیں۔ اور شاید وہ ایسا کر بھی گزرتے لیکن جانے کس خیال نے انہیں روک دیا تھا۔

''خدا کے لیے اثیر..... پلیز ایک بار میری بات سن لو..... میں تم سے کچھ نہیں چاہتی سوائے معافی کے..... میں بہت تکلیف میں ہوں اثیر..... بہت اذیت میں ہوں..... تم مجھے معاف کر دو گے تو شاید اذیت کچھ کم ہو جائے۔'' وہ انتہائی ملتجی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''مجھے لگتا ہے اثیر یہ صرف تمہارا دل دکھانے کی سزا ہے جو یہ ساری ذلت میرا مقدر بنی ہے۔''

''وہ اونچا نام جس پر مجھے بڑا غرور تھا اب ایک اداکارہ کے نام کے ساتھ جگمگا رہا ہے، وہ گھر جس کی چمک دمک کی وجہ سے میں نے تمہیں ٹھکرا دیا تھا میرے پاس ہے، ہاں اس اداکارہ کے ساتھ لندن جاتے ہوئے واسع خان اس گھر کو خیرات کے مانند میری جھولی میں ڈال گیا ہے۔''

وہ یہ سب انہیں کیوں بتا رہی ہے انہوں نے.... بے حسی سے سوچا تھا۔

''دونوں بیٹے بورڈنگ میں ہیں، میں اکیلی سارا دن اس عالیشان مگر سنسان اور ویران گھر میں پاگلوں کی طرح اِدھر سے اُدھر چکراتی پھرتی ہوں اور غرور و نخوت سے کہے گئے میرے وہ جملے ہر وقت میرا پیچھا کرتے ہیں، یہ سب تمہارا دل دکھانے کی سزا ہے اثیر..... میں تم سے بہت زیادہ شرمندہ ہوں خود کو معافی کے قابل نہیں سمجھتی لیکن.....'' وہ ایک لمحے کے لیے سانس لینے کے لیے رکی تھی۔

''اثیر تم سن رہے ہو ناں.....'' ان کی خاموشی پر چونک کر اس نے بے تابی سے پکارا تھا۔

''ہاں.....'' گہری سانس لیتے ہوئے انہوں نے آہستگی سے کہا تھا..... انہوں نے سوچا تھا وہ اسے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ لیکن کیا یہ وہ سزا تھی جسے انہوں نے کبھی معاف نہ کرنے کا عہد کیا ہوا تھا۔ یہ تو جیسے زمانے کی ستائی، کوئی تنہا، شکست خوردہ عورت تھی جس کے لہجے میں ٹوٹے کانچ کی سی چبھن تھی۔

اور ایسے میں جب وہ بھی کسی سے معافی کے طلبگار تھے تو شاید اسے معاف کر دینے سے انہیں بھی معافی مل جاتی۔

''اثیر..... پلیز.....''

''ہاں میں نے تمہیں معاف کیا..... لیکن ایک گزارش ہے.....'' وہ ذرا سا رکے تھے۔

''ہاں.....'' شرا کا رواں، رواں ہمہ تن گوش تھا۔

''اب دوبارہ فون مت کرنا.....'' انہوں نے کہا تھا اور کال ڈس کنیکٹ کر دی تھی۔

دو آنسو شرا کی پلکوں سے ٹوٹ کر گرے تھے اور

کارپٹ میں جذب ہوگئے تھے۔

☆☆☆

''مومن وہ ہے جس کے سامنے جب بھی دو راہیں آئیں، ایک اس کی اپنی پسندیدہ اور دوسری اس کے رب کی پسندیدہ..... ایک پر اس کا دل چلنا چاہے اور دوسری کی جانب اس کا رب بلائے تو وہ ہمیشہ اپنے رب کی پکار پر لبیک کہے..... اپنی چاہت کو اپنے رب کی چاہت پر قربان کردے۔'' دادی جان اپنے اسی اثر انگیز لہجے میں رہی تھیں جو اسے ہمیشہ متاثر کرتا تھا۔

''یہ کتنا مشکل ہے ناں دادی جان'' وہ نیند میں بڑبڑا رہی تھی اور سوتے ہوئے بھی شدید بے چین تھی۔

''تمہارے سامنے پہلے بھی دو راہیں آئی تھیں..... اس وقت جب تم نے پہلی بار اشیر احمد کو اپنے روبرو دیکھا تھا۔'' زارا نے بے حد چونک کر انہیں دیکھا تھا۔ وہ کیسے یہ سب جانتی تھیں۔

''تمہارے پاس اختیار تھا کہ تم اپنے دل کے کہنے پر چل کر اس کی جانب بڑھتیں یا اپنے رب کے کہے پر پلٹتیں..... تم نے دل کا کہا مانا..... اس کی جانب بڑھیں، خود سے شادی کا پیغام دیا۔ اپنے رب کی نگاہ میں تو خود کو گرایا ہی لیکن اشیر احمد کی نگاہ میں بھی خود کو دو کوڑی کا کرلیا۔ رب کی طرف رجوع کرتیں، اس کی محبت اپنے رب سے طلب کرتیں تو ہوسکتا ہے اس کی نگاہ تم پر اٹھتی تو واپس نہ پلٹتی وہ تمہارا اسیر ہوجاتا۔''

دادی جان کی باتیں اسے شدید ندامت میں مبتلا کررہی تھیں۔ پچھتاوے سے دوچار کررہی تھیں۔

''پہلے بھی اللہ نے تم پر خاص مہربانی کی تھی کہ اس شخص کو اتنی جلدی تمہارے لیے محرم بنادیا، ورنہ تم جتنا تم اس کے پیچھے خود کو خوار کرتیں اتنا ہی خود کو رب کی نظر میں گناہ گار کرتیں۔ اب بھی اللہ تم پر بے حد مہربان ہے کہ تمہیں احساس دلایا جارہا ہے کہ تم غلط کررہی ہو..... اللہ کو جائز اور حلال چیزوں میں جو چیز شدید ناپسند ہے وہ میاں، بیوی میں جدائی ہے یعنی طلاق ہے۔ ایک بار تم نے وہ راہ چنی جس پر تمہارے دل نے چلنا چاہا اب ایسا مت کرو..... اب اس راہ پر مت جاؤ..... اب اس راہ پر چلو جو اللہ چاہ رہا ہے..... میری بچی..... اللہ سے محبت کا دعویٰ کرنے والے دل کی پوری آمادگی کے ساتھ اللہ کی رضا پر سرخم کردیا کرتے ہیں۔''

''میری پیاری دادی جان.....'' اس نے ان کا ہاتھ تھامنا چاہا تھا مگر وہ ایک دم غائب ہوگئی تھیں۔ وہ گویا گرنے والی تھی کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی، کمرے میں اچھی خاصی خنکی ہونے کے باوجود اس کا وجود پسینے سے بھیگ رہا تھا۔

''دادی جان.....'' اس نے آہستگی سے پکار کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

وہ جانتی تھی کہ وہ خواب دیکھ رہی تھی لیکن..... دادی جان کی خوشبو..... ''یقیناً یہ میرا الوژن تھا.....'' چہرے پر آئے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا تھا۔

اس کا اور دادی جان کا ساتھ بہت کم رہا تھا مگر اس مختصر ساتھ میں انہوں نے ہمیشہ اس کی رہنمائی کی تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ اس دنیا سے جانے کے بعد بھی وہ ایسا ہی کررہی تھیں۔

شام کے پونے پانچ ہوئے تھے شاور لینے اور نماز پڑھنے کے بعد گھر سے نکلتی تو تقریباً آدھا گھنٹا اسے راستے میں لگتا۔

اس نے موبائل اٹھایا اور اشیر احمد کا نمبر ملایا تھا۔

اس وقت وہ کچھ نہیں سوچ رہی تھی سوائے اس کے کہ اب اسے وہ کرنا تھا جو اس کا رب چاہتا تھا۔ اس کا خالق، اس کا مالک، اس کا پیارا اللہ جو ہمیشہ اس پر مہربان رہا تھا۔ اس کی خطاؤں، اس کے گناہوں کو معاف کرتا رہا تھا۔

پہلی ہی بیل پر کال ریسیو ہوگئی تھی۔

''زارا.....'' اشیر احمد کی بے چین سرگوشی میں..... بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔

''آپ گھر پر ہی ہیں..... میں ایک گھنٹے تک آرہی ہوں۔'' کہتے ہوئے اس نے کال ڈسکنیکٹ کردی تھی۔

نماز کے بعد مسجد میں رکھا تو آنکھوں سے آنسو اور لبوں سے یہ لفظ جیسے بے اختیار نکلنے لگے ''یا اللہ مجھے..... اب دل کی نہیں تیری مان کر زندگی گزارنی ہے صرف تیری مان کر میرے اللہ..... صرف تیری مان کر۔'' جانے کتنی دیر اور اسی بے قرارانہ انداز میں وہ یہی جملہ دُہراتی رہی کہ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ دوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف کرتے ہوئے اس نے کچھ الجھن آمیز

انداز میں دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ تبھی دروازہ کھلا تھا اور اثیر احمد سرخ گلابوں کا مہکتا ہوا گلدستہ لیے اندر داخل ہوئے تھے۔

اس نے قدرے حیرانی سے انہیں دیکھا تھا۔ انہیں تو پھولوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ سلام کرتے ہوئے بے حد دلکش مسکراہٹ لبوں پر لیے اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔

''اپنی پیاری بیوی کے لیے جس نے مجھے پھولوں کے ساتھ، ساتھ کانٹوں سے بھی پیار سکھادیا۔'' محبت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے پھول اس کی جانب بڑھائے تھے۔

وہ چند لمحے انہیں دیکھتی رہی پھر گلدستہ تھام لیا تھا۔

''میں شاید اب پہلے کی طرح آپ سے محبت نہ کرسکوں۔'' دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے پھولوں پر ملائمت سے ہاتھ پھیرا تھا۔

''کوئی بات نہیں..... میں سمجھوں گا یہ میری سزا ہے.....اور دل کو تسلی دوں گا کہ سزا ایک مقررہ وقت تک ہی ہوتی ہے۔''

''اور اگر یہ ہمیشہ کے لیے ہو تو.....'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

''تو میں نے گزشتہ دنوں میں یہ جان لیا ہے کہ حقیقی محبت لین دین نہیں، صرف دین ہی دین ہے۔''

زارا نے بوکے میں سے ایک سفید کلی کو نکال کر دوبارہ سیٹ کررہی تھی بے حد چونک کر بے یقینی سے انہیں دیکھا تھا۔ ان آنکھوں میں وہ سب کچھ تھا جو دیکھنے کے لیے وہ ترستی رہی تھی۔ محبت، شوق، مان، بھروسا.....اس کی دھڑکنوں نے لے بدلی تھی اور اسے بے حد حیران کردیا تھا۔

''تو کیا دل میں بسنے والے کبھی دل سے نہیں اترتے؟'' لیکن یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ اس نے بے یقینی سے سوچا تھا۔ ساتھ ہی اسے یاد آیا تھا کہ چند دن قبل ہی تو اس نے ماما سے کہا تھا۔

''جو دل میں بستے ہوں وہ دل سے دور جائیں یا زندگی سے بڑی تکلیف ہوتی ہے ماما..... اس لیے دعا کرنی چاہیے دل میں بسنے والے دل سے نہ اتریں کبھی.....'' اسے اپنا کہا جملہ یاد آیا تھا اور وہ بری طرح چونکی تھی یک دم اس کی تمام تر حسیات بیدار ہوگئی تھیں۔ ایک الوہی سا احساس تھا جو رگ و پے میں دوڑتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

بے اختیار اس کے لبوں پر علامہ اقبال کا یہ شعر آیا تھا۔ کل جب وہ یہ شعر پڑھ رہی تھی تو بڑی دیر سوچتی رہی تھی کہ آخر کیسا ہوتا ہوگا وہ'' ایک سجدہ.....'' اور اب.....! اس لمحے.....وہ اس ایک سجدے کے بارے میں جان گئی تھی۔

وہ جان گئی تھی کہ وہ ایک سجدہ بندے کا اپنے رب کے حضور اس کی بندگی کا ایسا اقرار اور اظہارِ عبدیت ہے جس میں وہ اپنے سر کو ہی اپنے رب کے حضور سجدے میں نہیں رکھتا..... بلکہ دل و جان کو بھی رکھ دیتا ہے۔ اپنی من چاہی ہر راہ کو چھوڑ کر اپنے رب کی راہ کی چاہ کو اپنانے کا عہد کرلیتا ہے۔

اس کی زبان.....اس کے دل و جان.....اس کا رواں، رواں بس اپنے رب کی رضا کا طلبگار رہتا ہے وہ اپنا سب کچھ فنا کرسکتا ہے لیکن اپنے رب کو خفا نہیں کرسکتا۔ بندے کا اپنے رب کی رضا میں یوں راضی ہوجانا ایک ایسا عمل ہے جو رب کو بے حد بھاتا ہے۔

اسے اپنے بندے پر اس قدر پیار آتا ہے کہ پھر وہ معجزے دکھاتا ہے۔ کُن فرماتا ہے اور.....ٹوٹے دل... جڑنے لگتے ہیں.....

کھوئے ہوئے مل جاتے ہیں.....
ہارے ہوئے جیتنے لگتے ہیں.....
بیمار شفایاب ہوجاتے ہیں.....

زارا کی کوئی ادا بھائی تھی یا اس کی کوئی دعا یوں عرش سے ٹکرائی تھی کہ اس سے بھی وہ ایک سجدہ کروالیا گیا تھا۔

اور پھر.....

اس کی زندگی کے ہر منظر کو اس کے حسبِ آرزو کرنے کے لیے کن فرمادیا گیا تھا۔

دل کو خدا کی یاد کا مسکن بنا کے دیکھ
ملتا ہے کیا نماز میں سجدے میں جا کے دیکھ

(ختم شد)

عورت فائدہ

ایک عام تاثر یہی ہے کہ عورت ایک کمزور اور کم تر ہستی ہے . . . مگر یہی کمزور اور کم تر ہستی صنف مخالف پر کس، کس طرح اثر انداز ہوتی اور وقت پڑنے پر چٹان جیسی مضبوطی بھی دکھاتی ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے شروع ہونے والے اس نئے سلسلے عورت کہانی میں ہماری معروف قلم کار فرحین اظفر نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔

جداگانہ موضوعات لیے کہانیوں کا نیا سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین کی نذر

یہ میری زندگی کا وہ لمحہ تھا جب مجھے لگا میں نے سب ہار دیا، اپنا سب کچھ..... پھر خیال آیا، آج تک میں جس سب کو اپنا سمجھتی رہی وہ میرا اپنا تھا بھی یا نہیں.....

☆☆☆

جس دن سے سسرال میں قدم رکھا، اپنی ذات سے ہر ایک کو ہر ممکن فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔ خود اکثر نقصان اٹھایا لیکن یہ سوچ کے چپ کر گئی کہ بول کے احسان جتانے کا کیا فائدہ۔ جس کو تیبھی ہوئی نہیں

دکھتی اس کو کھڑے ہو کے بھی کیا دکھائی دے گی۔

شوہر کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ رہا۔ ان کا جھکاؤ اپنی امی کی زندگی میں امی کی طرف اور ان کے بعد بہن کی طرف زیادہ تھا۔ بہت نہیں معمولی سا..... لیکن یہ معمولی سا جھکاؤ بھی اس کو نند کے سامنے جیسے رکوع میں ہی رکھتا۔ کبھی، کبھی اس کا پورا توازن ہی بگڑ جاتا لیکن وہ صرف ایک چپ سو سکھ کے مقولے پر عمل پیرا اس وقت کے انتظار میں تھی جب یہ معمولی سا فرق ختم ہونا اور زبیر بیوی اور بہن میں توازن رکھنا سیکھ جاتے۔

یہی معمولی سا عدم توازن تھا جس کی وجہ سے کبھی، کبھی اس کو لہو کے گھونٹ پینے پڑتے اور زبیر وقت گزرنے کے بعد یوں ہو جاتے گویا ابھی، ابھی پیدا ہوئے ہیں۔

☆☆☆

شادی کے بعد اولین دنوں میں جب ہر عورت بننے سنورنے کی شوقین ہوتی ہے۔ وہ بھی اپنے جہیز کے نت نئے شوخ رنگ جوڑے پہن کے اترائی، اترائی پھرتی۔ کچھ دن تو ساس نے یہ سب دیکھا۔ پھر بلا وجہ ہی بپھر گئیں۔

''اب کتنے دن تک چلے گا یہ دلہنا پا؟'' بڑا ہی کوئی عجیب سا سوال تھا کہ وہ ٹکر ٹکر ان کا منہ دیکھتی رہی کوئی جواب نہ بن پڑا۔

''جی کیا مطلب امی؟''

ان کو امی کہتے سے اس کے دل میں اِک نامعلوم سی اداسی کروٹ لیتی تھی جانے کیوں..... شاید اپنی امی کی یاد آجاتی تھی۔ جنہوں نے اس سے کبھی اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ وہ تو ہر روز، نئے روٹیوں کی دھوپ چھاؤں مخصوص رشتوں کے سائے تلے کھڑی ہو کے دیکھ رہی تھی۔

وہی نند تھی کبھی سگی بہنوں سے بڑھ کے تو کبھی اجنبی..... وہی ساس تھیں، کبھی ماں جیسی مہربان کبھی بالکل انجان بیگانی.....

زندگی کی بُنت میں نیا ڈیزائن ڈال لیا گیا تھا اور گانٹھ در گانٹھ وہ الجھتی چلی جا رہی تھی۔ ایک کو کھولتی ذرا سا ہاتھ کے رکتی تو دوسرا بل دہائی دینے کو تیار ہوتا۔

وہ روہانسی ہو کے زبیر کو دیکھتی تو وہ کبھی حد درجے خود مختار تو کبھی بے بس نظر آتے۔

''بس تم کچھ مت کہا کرو۔ امی کو زیادہ زبان چلانے والی لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔''

''لڑکیاں یا صرف بہویں۔'' اس نے ہمیشہ لب سی کے صرف سوچنے پر ہی اکتفا کیا..... کہنے کی جرأت تھی نہ فائدہ.....

☆☆☆

زندگی یونہی گزر رہی تھی کہ قدم کبھی زمین میں گڑے ہوئے معلوم ہوتے تو کبھی، ریت میں دھنسے ہوئے اور کبھی تو بالکل ہوا میں معلق..... اس نے کچھ اور سیکھا یا نہیں ایک زبردست قسم کا صبر کرنا ضرور سیکھ لیا تھا جو یقیناً معمولی باتوں پر کیا جاتا تھا اور سیدھا خوش باش زندگی سے دھڑکتے دل پر پانی کے قطرے کی طرح جا کے گرتا تھا لیکن پانی بھی اگر کہیں مسلسل ٹپکتا رہے تو سوراخ کر دیتا ہے۔

ایسا ہی ایک سوراخ اس کے دل میں بن رہا تھا لیکن اس قدر آہستگی اور نامحسوس طریقے سے کہ خود اس کو بھی خبر نہ ہو سکی۔

پہلے بیٹے کی پیدائش پر اسے بصد اصرار میکے بھیجا گیا.. کیونکہ اس کی اپنی نند کے ہاں زچگی متوقع تھی اور اسے بھی اپنے میکے ہی آنا تھا۔

ساس صاحبہ نے اس موقع پر بہت اصول پسند بنتے ہوئے اخراجات کا اسی فیصد اس کے میکے کے حصے میں ڈالا اور خود بہت چاؤ سے اپنی بیٹی کے ارمانوں کا بوجھ بیٹے پر ڈالا۔ وہ اتنے دن زبیر سے دور رہنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی لیکن یہ اُن کے گھر کی روایت تھی اور اسے اپنی من مرضی کے بجائے روایات پر چلنا تھا۔

اس کی نند منیرہ کے سسرال والے اسے بھیجنے کے لیے دل سے راضی نہیں تھے کیونکہ یہ منیرہ کے گھر دوسری خوشی تھی لیکن امی نے اتنا شور ڈالا کہ انہوں نے بادلِ ناخواستہ اسے بھیج ہی دیا۔

عجب بات تھی۔ بہو جانا نہیں چاہتی تھی اسے بھیج کے دم لیا۔ بیٹی کو آنا نہیں تھا اسے بلا کے ہی دم لیا۔

زبیر خود پہلے پہل کے بیٹے کے لیے ہر وقت ترستے تھے۔ ان کو بھی روز سسرال آنے کی اجازت نہیں تھی۔ بالآخر جب وہ سوا مہینے کے بعد واپس آئی تو تنہائی میں زبیر سے مل کے سسک اٹھی۔

''مجھے وہاں آپ کی اتنی یاد آتی تھی کہ حد نہیں۔''

''اگر اتنی یاد آتی تھی تو آجاتیں۔ ارے بھئی تمہیں روکا کس نے تھا۔'' بظاہر تو انہوں نے لاڈ سے کہا تھا لیکن اس کی سسکیاں تھم گئیں۔ وہ دل ہی دل میں بولی۔

''جس طرح آپ کی امی نے زبردستی مجھے بھیجا تھا۔ اسی طرح واپس آنے پر وہ مصیبت نہ مچا دیتیں۔ کچھ بعید نہیں کہ وہ میرے امی ابو کو کنجوسی کا طعنہ ہی دے مارتیں تو میں کیا کر لیتی۔''

زبیر سب سمجھتے تھے لیکن وہی انجانا، اجنبی پن جو ان کے انداز میں اچانک جھلک آتا تھا، اسے کوئی بھی شکوہ کرنے سے روک دیتا تھا۔

وہ ایک گہری سانس لے کے چپ کر گئی۔

اس نے محبت بانٹنے اور فائدہ پہنچانے کا ہنر سیکھا تھا اور اسی کو سب کچھ سمجھ کر یہ سوچتی تھی کہ پھولنا وہ خود فائدہ پہنچا رہی ہے لہٰذا اسے نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

لیکن زمانے کی اک ریت ہے۔ ایک روایت ہے۔

ضروری نہیں کہ اگر آپ شیر کو نہیں کھاتے تو شیر بھی آپ کو نہیں کھائے گا..... اس کی بھی یہی بھول تھی کہ میں فائدہ دیتی ہوں تو فائدہ ملے گا۔ میں چپ رہی ہوں تو دوسرے بھی لحاظ کریں گے۔ ایسا کر کے اس نے اپنے آپ کو اتنا سمیٹ لیا جیسے کسی خول میں بند موتی۔

بچے جیئے جیسے بڑے ہوتے گئے حق بات کی جگہ پر اس کا چپ رہ جانا ان کو حیرت اور الجھن میں مبتلا کرنے لگا۔

شوہروں کو فرمانبردار بیویاں پسند ہوتی ہیں لیکن ساتھ میں خوش مزاج بھی ہوں تب..... اس کی خاموشی فطری نہیں اختیاری تھی۔ اس لیے دوسروں کے شکووں کے ساتھ ساتھ اندر کی گھٹن بھی بڑھتی گئی۔

گھر میں جب بھی اس کی نند رہنے آتی امی کی اکثر یہی کوشش ہوتی کہ وہ ان ہی دنوں میں اپنے میکے چلی جائے۔ میکے جانے سے پہلے اجازت مانگنے کا فرسودہ رواج بھی اسی لیے جلا پا رہا تھا کہ اس کو اجازت بڑے ناپ تول کے دی جاتی۔ اس کے دل کو یہ بات بڑی بری طرح چبھتی تھی کہ وہ آخر ایسا کیوں کرتی ہیں۔ کیا وہ نہیں چاہتیں کہ اس کے اور اس کی نند منیرہ کے درمیان کی بھی قسم کے روابط پنپ سکیں۔

عام طور پر سسرالوں میں بہو کے میکے جانے پر پابندی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے یہاں الگ ہی حساب تھا۔

وہ جتنا بھی سوچ لیتی اپنی ساس کے اس ذہن تک کبھی نہ پہنچ پاتی، جو اس نے ایک دن بلا ارادہ جان لیا۔

''بھاوجوں کو بہت برا لگتا ہے۔ بیاہی بیٹیاں جب میکے آ کے کھانا پینا کرتی ہیں۔ بلاوجہ کا بیر پال لیتی ہیں نندوں سے۔ اپنے میاں پر بوجھ بنتی ہیں اور کان بھر بھر کے فساد کھڑا کرتی ہیں وہ الگ.....''

اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس کی ساس امی اس کے بارے میں اس طرح بھی سوچ سکتی ہیں۔ اس نے تو اپنے کسی عمل سے آج تک ایسا کوئی تاثر نہیں دیا تھا کہ خدانخواستہ وہ اپنی نند سے جلتی ہے یا اس کو بوجھ سمجھتی ہے۔

''ہوں بھئی خود بھی تو جاتی ہے وہ اپنے میکے جو مرضی عیش کرتی پھرے۔ ہم نے کبھی منع کیا ہے۔ ہم نے کبھی پوچھا آج تک.....'' فون پر ان کی آواز جذبات کے مارے بلند ہو گئی۔

''پوچھا تو میں نے بھی کبھی نہیں.....''

''گھر کا خرچا بھی اسی طرح کنٹرول میں رہتا ہے دو جنے بڑھ گئے تو دو کم ہو جائیں۔ کوئی اضافی خرچہ بھی نہیں ہوتا۔'' اسے کبھی پتا نہ چلتا کہ اس کی ساس حساب کتاب کی اتنی ماہر ہیں، اگر وہ اپنے کانوں سے یہ سب نہ سن لیتی۔

نہ کوئی سوال کرنے کی جرأت تھی، نہ جواب دینے کی حسرت.....

جب تک بچے اسکول جانے کے قابل نہ ہو گئے۔ وہ سب کچھ جان لینے کے باوجود اسی خاموشی اور پابندی سے میکے جاتی رہی۔

☆☆☆

سگے بہن بھائیوں کی اولادوں کو کوئی کب تک دور رکھ سکتا ہے۔ بچے بڑے ہوئے تو نانو اور دادو کے گھر میں جمع ہو کر کھیلنے میں جو مزہ آیا تو بس مزے ہی لگ گئے۔

روایتی ساسوں کی طرح امی کی جانبداری ایسے وقتوں میں عروج پر ہوتی۔

ایسے وقتوں میں اس کا دل مسوستا رہتا۔ بچوں میں لڑائی جھگڑے نوک جھوک ہو جاتی۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ زیادتی ہوتے دیکھتی لیکن زبان سے ایک لفظ نہ بولتی۔ اس کے دل میں اس قدر قریبی اور اتنے اپنے رشتوں کی بیگانگی کی دیوار اتنی گہری ہو چکی تھی کہ اسے لگتا اس کی آواز اگر نکلی بھی تو گنبدِ بے در سے ٹکراتی گونج کے سوا اور کچھ نہ ہوگی۔

اس نے بہت اوائل دنوں میں ہی اس حقیقت کو جانچ لیا تھا کہ وہ جس زمین پر پاؤں جمانے کی کوششوں میں مصروف ہیں وہ صرف ایک سراب ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں.....

کسی بھی وقت یہ زمین دلدل کا روپ بھی دھار سکتی ہے۔

اس کی اس سوچ کو تقویت دینے میں زبیر کا بہت ہاتھ تھا۔ جو اول تو کبھی اس کی کسی بات کی تائید اپنے دل و دماغ سے کرتا ہی نہیں تھا کہ اس کی سوچ پر ماں کا بے انتہا اثر تھا۔

اور اگر کبھی قسمت سے اسے تنہائی میں کوئی تائیدیا تعریفی جملہ ملا بھی تو اپنی ماں کے سامنے وہ اپنی ہی کہی ہوئی بات سے مکر گیا۔ وہ منہ دیکھتی رہ گئی اور زبیر اور امی مزے سے اسے رد کر کے ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔

شروع میں ایک دو بار کوشش کے بعد اس نے زبیر سے اپنی پسند، اپنی سوچ کے بارے میں بات کرنا تقریباً چھوڑ دیا۔

وہ ایک بے یقینی کی سی کیفیت میں رہتی تھی۔ امی اپنے اکلوتے بیٹے کے بجائے اکلوتی بیٹی پر زیادہ واری صدقے جاتیں۔ زبیر کو معلوم نہیں محسوس ہوتا تھا یا نہیں لیکن وہ بے طرح جل کے رہ جاتی لیکن لب کھولنے کا مطلب خود کو بھرے پُرے گھر میں تنہا کرنا تھا۔

گزرتے وقت کے ساتھ، ساتھ وہ.... انتہائی خاموش ہوتی چلی گئی۔ بظاہر ہنستی بولتی سب کے درمیان چلتی پھرتی لیکن جو شوخی اور چونچالی ایک پُر اعتماد عورت کا خاصہ ہوتی ہے وہ اس میں ناپید تھی۔

بچے بڑے ہوئے تو ان میں بھی شعور بیدار ہونے لگا۔ اس کے اپنے دونوں بچے اپنی ماں کی خاموش طبعی سے سمجھوتا کر چکے تھے لیکن دل ہی دل میں اس سے شکوہ کناں رہتے۔

وہ ساس اور نند کو خوش اور راضی رکھنے کے لیے ان کی خاطر، خوشامد کرتی، دن رات کام کی چکی میں پسنے کے بعد اس کے پاس اپنی اولاد کے لیے لاڈ پیار کا وقت ہی نہیں بچتا۔

وہی عورت جو نند کی آمد کے ساتھ ہی پھرکی کی طرح یہاں وہاں چکراتی پھرتی۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کب اور کس وقت اس کے اُلجھے رویّے نے اس کے اپنے بچوں کو اس سے دور کر کے فلزا (نند کی بیٹی) کو اس کے قریب کر دیا۔

اسے اپنی یہ معصوم چپ چاپ سی مامی اس قدر بھانے لگیں کہ وہ کبھی، کبھی اپنی سگی ماں کو بھی مامی کی مثالیں دینے لگی تھی۔

شمع کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ ہی قصوروار گردانی گئی۔ تب ایک دن امی اور منیرہ کی باتوں دلبرداشتہ ہو کے اس نے فلزا سے کہا۔

''میں تمہیں اتنی اچھی کیوں لگتی ہوں فلزا..... میرے اندر کچھ بھی تو خاص نہیں..... اتنی تعریفیں نہ کیا کرو میری.....''

وہ اتنی چھوٹی بھی نہیں تھی.... لاڈ میں اس سے

لپٹ گئی۔

''اللہ مامی..... آپ کو کیا پتا آپ کتنی اچھی ہیں کوئی مجھ سے پوچھے..... ارے آج کل تو آپ جیسے لوگ ہوتے ہی نہیں ہیں۔ کسی سے کوئی جھگڑا، نہ کوئی اعتراض، نہ بات نہ چیت، بس چپ چاپ سب کی خدمت اور اپنے کام سے کام..... پتا ہے۔ آپ اس زمین پر میری سب سے فیورٹ لیڈی ہیں۔ کاش آپ ہی میری مما ہوتیں۔'' اس نے لاڈ میں اپنی بات تو کہہ دی لیکن وہ بات زندگی بھر کے لیے شمع کے دل پر لکھی گئی۔

اس کی اپنی بیٹی نے کبھی ایسی خواہش کا اظہار نہ کیا تھا۔ بچپن سے لڑکپن میں جانے کے بعد اس سے ایسی بے ساختگی کبھی نہیں دکھائی تھی..... وہ انتہائی خوشی کے موقع پر بھی سمٹی سمٹی رہتی۔

شمع دل ہی دل میں جب کبھی فلزا اور اپنی بیٹی ہنیہ کا موازنہ کرتی تو ایک بے نام سی اداسی اس کے اندر سرائیت کر جاتی۔ اسے لگتا اس کی بیٹی بھی اسی کی طرح احساسِ کمتری اور عدم اعتماد کا شکار ہو رہی ہے..... حالانکہ ایسا تھا نہیں۔ صرف اپنی اور اپنی بیٹی سے جذباتی دوری نے اسے اس خیال میں مبتلا کر دیا تھا۔

ہنیہ ایک بہادر، اور پُر اعتماد بچی تھی۔ کلاس کے لائق بچوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ وہ طبیعتاً اپنی ماں پر گئی تھی۔ اسے زور زور سے ہنسنا کھلکھلانا پسند نہیں تھا۔ لیکن وہ شوخ رنگ پہنتی تھی۔ اسکول اور اسکول کے بعد کالج کے فنکشنز اور دوستوں کی گیدرنگز اٹینڈ کرتی تھی لیکن دھیمے، نپے تلے انداز میں۔ گھر میں اس کی شخصیت ماں کی طرح دھیمی تو تھی لیکن خاموش اور تنہائی پسند نہیں۔

دادی اسے کوئی خاص منہ نہیں لگاتی تھیں۔ فلزا کو وہ بورنگ لگتی۔ باپ کا رعب بہت تھا۔ بڑے بھائی کی دلچسپیاں الگ تھیں۔ لے دے کے ایک شمع ہی بچتی تھی جو گھر داری میں اتنی مصروف ہو گئی تھی کہ اب اپنے مسئلے مسائل کے لیے اسے پریشان کرنا ہنیہ کو خود ہی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ ماں سے دور ضرور تھی لیکن اسے ہر بیٹی کی طرح اپنی ماں سے اتنی ہی محبت تھی جتنی اپنی باپ سے.....

یہ الگ بات کہ وہ اس کا اظہار کرنے میں جھجکتی تھی۔ گھر سے باہر اس کی الگ دنیا تھی۔ جہاں رنگ تھے۔ دوستیاں تھیں پیار تھا اور اس کی اپنی ماں اس سے بے خبر تھی۔

☆☆☆

ایک دن بے حد چپکے سے امی نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

دن رات کے معمول میں اداسی تیرنے لگی۔ امی بے شک بوڑھی ہو چکی تھیں لیکن یہ نہیں لگتا تھا کہ وہ اتنی اچانک چلی جائیں گی۔

اس نے سوائے زبیر اور منیرہ کے کسی کو خاص غمزدہ نہیں دیکھا۔

نواسے نواسیاں، پوتے پوتیاں چند گھنٹے رسمی سا سوگ..... منا کر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

تیسرے دن تک لگتا ہی نہ تھا کہ گھر میں کوئی فوتگی ہوئی ہے۔ شمع کے اپنے دل پر کسی الم کا بوجھ آ گرا تھا بھی تو وہ مہمانداریوں..... اور تدفین کے کھانے اور سوئم کے کھڑاگ میں کہیں دب گیا۔

زندگی معمول پر آ تو گئی لیکن ایک مستقل کمی کے احساس کے ساتھ..... ان ہی دنوں جب وہ اس کمی کے دھیمے پن کو محسوس کر کر کے حیران تھی۔ ایک دن ہنیہ نے دھماکا کر دیا۔

وہ اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس نے شریکِ حیات کا انتخاب کر کے ماں، باپ دونوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔

زبیر تو چپ سے ہو گئے۔ خیر کوئی باپ بیٹی کے منہ سے پسند کی شادی کا سن کے بھنگڑے تو نہیں ڈال سکتا۔ لیکن شمع کے دل کا غم و غصہ کچھ الگ ہی تھا۔ اسی لیے اس نے رشتے کے ساتھ شادی کی تاریخ کا عندیہ دے دیا۔ حالانکہ لڑکا اور اس کے گھر والے دو سال کا ٹائم لینا چاہتے تھے۔ لیکن شمع کے دل میں غصہ تھا یا کوئی انجانا خوف کہ وہ پھر رکی ہی نہیں۔ جس نے بھی اس سے بات کرنے کی کوشش کی اس نے سختی سے انکار کر کے منع کر دیا۔ سب گھر والے، منیرہ اور فلزا سمیت سب اس

ضد پہ حیران اور پریشان ہو کر رہ گئے۔ اس نے تو کبھی اس طرح اپنے لیے ضد نہیں کی کجا کہ اولاد کے لیے۔

''آپ میرے بجائے بچوں سے بات کریں۔ ہبیہ نہ صرف فوراً رخصت ہوگی... بلکہ میں اس کے ساتھ ہی فلزا اور نوفل کی بات بھی طے کردوں گی۔''

زبیر کو ایکا ایکی سانپ سونگھ گیا۔

''اتنی جلدی!''

''جلدی ہی بہتر ہے۔ اس سے پہلے کہ پھر وہ بھی.....'' اس نے لب بھینچ لیے۔

''کوئی گل کھلا کے بیٹھ جائے۔''

''خدانخواستہ.....'' زبیر ناگواری سے بڑبڑائے۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ عجیب پتھر سی ہو رہی تھی۔ جیسے کسی بات نے اسے اندر سے توڑ کے رکھ دیا ہو اور اب وہ مضبوط بننے کی ناممکن کوشش کر رہی ہو۔

''نوفل سے تو پوچھ لو۔''

''پوچھ لوں گی پہلے ذرا ہبیہ کو نمٹا دوں۔ مجھے پتا ہے نوفل مان جائے گا۔''

''اور اگر منیرہ نہ مانی تو.....؟''

''وہ بھی مان جائے گی۔ اسے فلزا منا لے گی۔''

''کیا مطلب؟'' وہ۔ چونکے

شمع گڑبڑا سی گئی۔

''وہ ہمیشہ سے یہاں آنا چاہتی ہے۔ اب بھی اکثر کہتی رہتی ہے۔ اس کا اور کیا مطلب ہوتا ہے۔ اب اپنے منہ سے تو نہیں کہے گی ناں۔''

جانے کیوں اس کے منہ سے نکل گئی وہ تحریر الفاظ کی صورت جو برسوں سے دل پر لکھی تھی یہ اس کی بے خبری تھی یا معصومیت کہ وہ بھتیجی کو سگی بیٹی سے زیادہ سمجھنے کا دعویٰ کر بیٹھی۔

ہبیہ نے بہت کہا کہ وہ ابھی پڑھنا چاہتی ہے۔ اس کا ہونے والا شوہر سیٹلڈ نہیں ہے لیکن اس نے ایک نہ سنی۔

اصل میں زندگی بھر زبیر سے وہ اپنائیت نہ ملنے کے سبب، جس کو وہ اپنا حق سمجھتی تھی۔ اس کے دل میں ایک غبار سا بھر گیا تھا۔ یہی غبار ہبیہ کی بات کے بعد اس کے دل میں شکوے کی صورت بنا اور اس کی فوراً شادی کی شکل میں باہر آیا۔ رخصتی تک وہ خود ہبیہ سے ناراض تھی لیکن بیٹی نے بھی اسے منانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس بات نے اس کا غم اور غصہ اور بڑھا دیا۔

اس کے اندر برسوں سے دبی اپنا استحقاق استعمال کرنے کی خواہش ایک دم منہ زور سی ہوگئی۔

شادی کے فوراً بعد ہی وہ نوفل کا رشتہ فلزا کے لیے لے کے پہنچ گئی۔ منیرہ حیران پریشان رہ گئیں۔ انہوں نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔

''تم کو سوچنے کا وقت لینے کی کیا ضرورت ہے منیرہ۔ تمہارے سامنے کا بچہ ہے نوفل، کیا اس کی بھی چھان بین کراؤ گی۔'' اس کے لب مسکرا رہے تھے۔ لیکن لہجہ کافی چبھتا ہوا سا تھا۔

''نہیں، نہیں ایسی بات نہیں ہے لیکن فلزا کے ابو اور خود فلزا سے تو پوچھوں گی ناں۔''

''فلزا کی تم فکر مت کرو اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' وہ جس قدر تیزی سے بولی اتنی ہی تیزی سے منیرہ کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔

''اسے اعتراض ہو یا نہ ہو یہ میرا فرض بھی ہے اور اس کا حق بھی.....''

منیرہ نے بہت مشکل سے خود کو کوئی سخت بات کہنے سے روکا تھا لیکن اس کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ اسے شمع کی بات بری لگی ہے۔ خود زبیر بھی بہت بے آرام سے دکھائی دیتے تھے۔

شمع جتنی مطمئن تھی وہ اتنے ہی بے چین اور نوفل چپ، چپ..... خفا خفا.....

ہبیہ شادی کے بعد روایتی طریقے سے میکے آتی تو شمع کے اندر کوئی گرم جوشی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ کھانے پر اہتمام تو کرتی، ٹیبل بھی سجاتی، خاطر بھی کرتی لیکن یوں جیسے یہ روز کا معمول ہو۔

زبیر اگر آفس میں ہوتے تو شمع ہبیہ اور اپنے داماد سے دو چار باتیں کر کے اٹھ کے اپنے کام میں لگ جاتی۔ جو بظاہر ہبیہ کے لیے ہی کیا گیا اہتمام ہوتا۔ ہبیہ

تھکن

مجبوری و منافقت
کے کچے دھاگے سے بندھے
رشتے نبھاتے، نبھاتے
دل میرا تھک سا گیا ہے
تعلق کے بوجھ اٹھاتے، اٹھاتے
بدن میرا چُور ہو گیا ہے
چاہت کا بھرم رکھتے رکھتے
روح میری بوجھل ہو گئی ہے
غرض کے دلکش ریپر
میں لپٹی محبت بھی
دل و جاں گھائل کر گئی ہے
زندگی جیسے مجھ میں
خودکشی کر گئی ہے

شاعرہ: سعدیہ ہما شیخ۔ سرگودھا

اور اس کا شوہر یا تو نوفل سے باتیں کرتے یا اگر نوفل بھی نہ ہوتا تو اکیلے بیٹھے رہتے۔

ایک دو بار بہنیہ اٹھ کے اس کے پاس کچن میں آئی تو اس کا میاں اکیلا ٹی وی دیکھتا رہا۔

شمع، بہنیہ کی باتوں پر ہوں ہاں کرتی رہی۔ ان دونوں ماں بیٹی کے درمیان، جھجک کی ان دیکھی دراڑ تھی۔ جو بہنیہ کی شادی کے بعد بڑھ کے خلیج کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس کے اندر ہمت نہیں تھی کہ وہ بڑھ کے ماں کے گلے میں جھول جاتی۔ بانہیں پھیلا کے اسے سمیٹ لیتی یا لاڈ سے اس سے معافی مانگ لیتی۔

رفتہ، رفتہ اس نے آنا چھوڑ دیا۔ شمع کو احساس تو تھا لیکن اس نے اس کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ زبیر نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی۔ اسے سب کا احساس تھا سوائے خود کے..... کہ وہ خود اپنے خول میں سمٹ کر سب کو خود سے دور کرتی جا رہی تھی۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ دوسرے اسے بے حس سمجھتے تھے اور ایسا سمجھنے میں حق بجانب بھی تھے۔ اور دوسری طرف وہ خود تھی کہ دوسروں کے جذبات سے بے بہرہ صرف روز کے معمول کی پُرسکون جھیل میں روانی سے تیرتی جا رہی تھی کہ اِک روز اس جھیل میں بڑی زور کا کنکر آن گرا۔

''میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔''

اس کا وجود پتھر ہو گیا۔

یہ اس کی زندگی کا وہ لمحہ تھا جب اسے لگا اس نے سب ہار دیا، اپنا سب کچھ..... پھر خیال آیا، آج تک وہ جس سب کو اپنا سمجھتی رہی وہ اس کا اپنا تھا بھی یا نہیں.....

''کیوں؟'' کا سوال حلق میں گھس کے شہ رگ پکڑنے لگا۔

''کوئی بھی سوال مت کرنا کیونکہ ہر سوال کا جواب تمہارے اپنے رویّے میں پوشیدہ ہے۔ میں کسی ایسی عورت کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا تھا جو میرے جذبات کو سمجھے میرے دکھ درد کی ساتھی ہو نا کہ کسی گھڑی کی طرح معمول پر چلنے والی مشین.....''

اس نے پلکیں جھپک، جھپک کے خود کو یقین دلایا کہ وہ زندہ جیتا جاگتا انسان ہے بھی یا نہیں۔

''باہر فلزا آئی بیٹھی ہے وہ تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔''

اس نے اسی طرح ساکت نگاہوں سے اپنے شریکِ حیات کو کمرے سے باہر جاتے دیکھا۔

ان کے باہر نکلتے ہی فلزا آندھی کی طرح اندر داخل ہوئی۔

''آپ سے کس نے کہا تھا کہ میں نوفل سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ آپ نے کس بری طرح مجھے میرے امی، پاپا کی نظروں میں چور بنا دیا۔ میرے کس عمل سے آپ کو لگا کہ میں..... میں..... آپ نے کیوں نہیں سوچا کہ آپ کی بات جس انداز میں میری کردار کشی کرے گی اس کا میری زندگی پر کیا اثر پڑے گا۔''

اس کی سانس پھول رہی تھی۔ گردن کی رگیں کھنچ رہی تھیں..... لیکن اس کے الفاظ.....

شمع کو لگا زبیر کی بات نے اسے طمانچہ کھینچ مارا ہے لیکن فلزا نے تو اس پر پہاڑ ہی توڑ ڈالا تھا۔

ابھی وہ ایک صدمے سے نکلی نہیں تھی کہ یہ دوسرا دکھ.....

ایک الزام کا دفاع تو دور ڈھنگ سے سن بھی نہیں پائی تھی کہ یہ دوسری تہمت.....

فلزا کا شور سن کر ہی نوفل بوکھلایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

''بتاؤ نوفل..... بتاؤ ان کو۔ کیا میں نے کبھی تم سے کہا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ کیا کبھی.....''

وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔

شمع کا وجود مفلوج ہوگیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے دائرے سے ناچنے لگے۔ صرف سماعتیں زندہ تھیں۔

فلزا اپنی بات کہہ کر جا چکی تھی۔ اسے وہاں رک کے کرنا بھی کیا تھا۔ جو تباہی پھیرنے وہ آئی تھی وہ پھیر کے جا چکی تھی۔

اب کمرے میں صرف شمع اور نوفل تھے۔

شمع اب جامد سی ہو کے نوفل کو دیکھ رہی تھی۔

اس کا دل چاہا نوفل آگے بڑھے، اسے سہارا دے۔ کوئی حرفِ تسلی، کوئی ڈھارس کا بول.....

''وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہہ رہی تھی امی..... اسے اپنے گھر میں اتنی آزادی ملی ہوئی ہے کہ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ آپ سے پہلے منیرہ پھپھو کو بتاتی۔ وہ..... وہ..... منیرہ پھپھو بہت براڈ مائنڈڈ ہیں۔ وہ آپ جیسی نہیں ہیں۔''

اس کے اور اس کے بیٹے کے درمیان وہ سالوں کی جھجک آ گئی۔ جسے اس نے خود ہی اپنی عقل و فہم سے پرورش کر کے آج اس حد تک پہنچایا تھا۔

شوہر، بیٹا اور بھتیجی..... یہ اس کے سب سے قریبی لوگ تھے۔ لیکن درحقیقت کتنے دور تھے۔ آج وہ دریا کے بیچ و بیچ کھڑی سہارے کے لیے کنارے کی طرف دیکھتی تو کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سوائے چند ایک جملوں کے.....

''میں ایک ایسی عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا جو.....''

''آپ نے مجھے چور بنا دیا.....''

''منیرہ پھپھو بہت براڈ مائنڈڈ ہیں۔ وہ آپ جیسی نہیں.....''

وہ آپ جیسی نہیں۔

آپ جیسی نہیں.....

آپ جیسی.....

تم جیسی.....

کمرے کے سکوت میں اسے ڈوبا چھوڑ کر نوفل جا چکا تھا۔ وہ ہمیشہ سے خود کو اکیلا سمجھتی تھی پھر یہ کیسا خوف تھا جو عفریت کی طرح اسے جکڑنے لگا۔

شور تیز ہو رہا تھا۔

الزام در الزام.....

تکرار.....

اس نے گھبرا کے کانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ لیکن آوازیں اس کی مامتیں چھیل رہی تھیں۔ اس کا دل ڈوب رہی تھیں۔ بالآخر وہ بری طرح چیخ اٹھی۔

''میں بے حس نہیں ہوں..... ں..... تم لوگ احسان فراموش ہو..... میں بری نہیں ہوں..... تم لوگ گندے ہو..... اور..... تم سب ایک ہو..... میں ایسی نہیں ہوں..... ں۔''

اس نے ہوش کھونے سے پہلے کسی کو کمرے میں گھستے دیکھا۔ لیکن کون..... وہ پہچان نہیں سکی.....

☆☆☆

جس وقت اس کو ہوش آیا کتنے ہی لمحے پلکیں جھپک کے سامنا منظر صاف کرنے اور یہ یاد کرنے میں لگے کہ وہ ہے کہاں.....

دھیرے دھیرے آس پاس کا منظر واضح ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی خود پر ہوا سارا ظلم بھی یادداشت میں تازہ ہوتا چلا گیا۔

یک دم کمزوری کی جو کیفیت پورے وجود میں درد کی صورت ابھر رہی تھی، ایک ناقابلِ بیان تکلیف میں ڈھل کے دل کو چیرنے لگی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی پھر کمزوری کے باعث ناکام ہو کر لیٹے لیٹے ہی دھیرے دھیرے سسکنے لگی۔

دائیں بازو میں تکلیف کے مدھم سے احساس کو دباتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ دیکھا تو اندازہ ہوا کہ شاید ڈاکٹر انجکشن لگا کے گیا ہے۔

''کاش کہ یہ انجکشن زہر کا ہوتا تو آج میں ہوش میں آنے کے بجائے ہمیشہ کی نیند سو جاتی۔'' مایوس کن سوچ نے اس کے درد کو اور بڑھاوا دیا۔

اپنا اکیلا پن، تنہائی اور زبیر کی بات نے مل کے اس کے دل و دماغ میں اودھم مچا دیا۔

قریب تھا کہ وہ پھوٹ، پھوٹ کے رو پڑتی لیکن اسی وقت دروازہ کھول کے کوئی اندر آیا۔

اس نے عجیب سے احساسات میں گھر کے دیکھا۔ آنے والی اس کی بیٹی بہیہ تھی۔

''امی.....!'' اس نے نزدیک آ کے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

''کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟''

جواب کے بجائے اس کے آنسو جھر جھر گرنے لگے۔

''پلیز مت روئیں..... اسٹریس آپ کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے آپ ہوش میں آ گئیں۔''

''کاش میں کبھی ہوش میں نہ آتی۔ ہوش میں آنے کا فائدہ بھی کیا ہے اب۔'' اس کی بھرائی ہوئی آواز سن کر بہیہ ایک دم جز بز سی ہو گئی۔

''ابھی آپ آرام کریں۔ یہ فائدہ نقصان کی باتیں بعد میں کر لیے گا۔''

وہ پورا دن اور دوسرے دن بھی بہیہ اس کے پاس رہی، زبیر کا کچھ پتا نہ تھا۔ وہ سارا وقت یا تو چپکے، چپکے سسکتی رہی یا پھر بہیہ کو اپنی خدمت سے منع ہی کرتی رہی۔

''رہنے دو تم... یہ چونچلے بس۔'' اس وقت بھی اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ بہیہ اس کے پاؤں دبانے آئی تھی۔

''اب کیا فائدہ جب کرنے کے دن تھے تب تو کیا نہیں.....'' دکھے دل سے بولتے اس کا گلا بھرا گیا۔

''میں آپ کی طرح ہر بات میں اپنا فائدہ تو نہیں دیکھتی لیکن پھر بھی آپ کی خدمت سے میرا اللہ خوش ہو گا تو میرا فائدہ ہی فائدہ ہے۔'' اس نے عام سے لہجے میں کندھے اچکا کے جو بات کی اسے سن کے شمع دھک سی رہ گئی۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ بہیہ نے اسے کچھ بھی بولنے سے ہاتھ اٹھا کے روک دیا۔

''میری بات سنیں امی..... فائدہ، فائدہ..... کیا ہوتا ہے یہ فائدہ۔ اور کس طرح کا فائدہ چاہتی ہیں آپ..... اور کون سا نقصان ہو گیا آپ کا..... کیا کسی نے آپ کو اپنی ماں، بہن، بیٹی یا اس گھر کا فرد ماننے سے انکار کر دیا۔ کسی نے آپ کی ذات کی نفی کی..... نہیں نا..... ماشاء اللہ سے آپ گھر میں وقت کے ساتھ، ساتھ وہی اہمیت اختیار کر گئی ہیں جو کسی بھی عورت کو اپنے گھر میں شوہر کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ پھر اور کون سا فائدہ چاہیے تھا آپ کو.....'' وہ ذرا دیر کو تھمی۔

''ٹھیک ہے آپ نے اپنے فرائض بہت اچھی طرح ادا کیے۔ لیکن کیا آپ اس سے کسی قسم کا کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ کل سے آپ شکوے کر رہی ہیں کہ آپ نے گھر بنانے میں اپنی ہڈیاں گھسا دیں۔ کیا آپ نے اس ساری محنت سے کوئی فائدہ حاصل کرنے کا سوچا تھا۔ اگر سوچا تھا تو کیا کوئی تخت، تاج کوئی روپیہ پیسہ..... نہیں ناں..... آپ کو امپورٹنس نہیں چاہیے تھی امی..... آپ کو جذباتی سہارا چاہیے تھا جو آپ کو نہیں ملا۔

''اصل میں یہی وہ فائدہ ہے جو آپ کو نہیں مل سکا۔ ایک مکمل خاندان رکھتے ہوئے بھی آپ ناآسودہ رہی ہیں۔ خود بے غرض ہوتے ہوئے آپ کو سب رشتے خود غرض ملے۔ یہی سوچتی ہیں ناں آپ..... لیکن اصل میں ایسا نہیں ہے۔ کوئی خود غرض ہے مطلب پرست..... سوائے خود آپ کے.....''

شمع کھلے منہ کے ساتھ صدمے کی سی کیفیت میں اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''جی آپ..... آپ نے سب رشتے، ناتے نبھائے، ذمے داریاں پوری کیں اس سوچ کے ساتھ کہ سب لوگ آپ کو بدلے میں کچھ نہ کچھ دیں گے۔ یقیناً وہ محبت اور احساس کے علاوہ دوسری کوئی شے نہ تھی۔

لیکن کیا آپ نے سوچا کہ خود آپ نے محبت، اظہار اور احساس میں سے اپنے گھر والوں کو کیا دیا۔

کچھ بھی تو نہیں.....

جیسے آپ نے سب کی جسمانی ضرورتیں پوری کیں اسی طرح سب نے اپنے، اپنے لحاظ سے آپ کی ضرورت پوری کر کے آپ کا بدلہ چکا دیا دیٹس آل.....

اگر آپ نے اپنے شوہر اور بچوں کو آپ نے محبت بھرے جذبات دیے ہوتے تو آج آپ اس طرح اکیلی نہ ہوتیں۔''

''کیا بک، بک کیے جا رہی ہو۔ اکیلی بھی میں ہوں قصوروار بھی میں..... یا اللہ۔'' شمع تو صدمے سے مرنے والی ہو گئی تھی۔

''اپنے اوپر ترس کھانے کے بجائے اپنا محاسبہ کریں امی..... جب بچوں کو گلے لگانے اور چومنے کی عمر ہوتی ہے۔ آپ منیرہ پھپھو اور فلزا کی خاطروں میں لگی رہیں۔ کبھی آپ نے نوفل اور میری ایموشنل اٹیچمنٹ کے بارے میں سوچا..... آپ نے سب کی خدمت کی لیکن آپ نے کسی کو بھی جذباتی طور پر خود کے قریب نہیں آنے دیا کیوں..... صرف آپ نہیں۔ ہم سب پیاسے ہیں امی..... سالوں کی پیاس جمع ہے سب کے اندر..... جیسی گھٹن آپ محسوس کرتی ہیں ویسے ہی ہم سب بھی آپ کی طرف سے محسوس کرتے ہیں۔ کبھی دوسروں کی جگہ بھی خود کو رکھ کے سوچیں.....''

''تم یہ سب باتیں نہیں سمجھ سکتیں..... تمہیں وہ ماحول نہیں ملا۔ شادی کے شروع دنوں میں ہی جس اجنبیت سے مجھے رکھا گیا۔ تم اس اذیت کو نہیں سمجھ سکتیں۔ تم نے تو اپنی من مرضی کر لی ناں۔'' شمع اب اپنا غم بھول کر تنفر سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جبکہ ہبہ کی آنکھوں میں افسوس بھرا ہوا تھا۔

''آپ..... آپ اتنی نادان کیوں ہیں امی..... کیا آپ کو لگتا ہے پسند کی شادی کر کے میرے لیے سب آسان ہو گیا۔ میرے لیے تو اور بھی مشکل ہے سب کو فیس کرنا۔ ایک تو پسند کی شادی اور پھر آپ کا اتنی جلدی کرنے پر اصرار..... مجھے بھی سب سسرال والوں کی نظروں میں مشکوک بنا گیا ہے۔ کبھی اپنی ذات سے باہر نکل کے دیکھیں، آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ شاید آپ کچھ دیکھ سکیں۔''

وہ بول، بول کے تھک چکی تھی۔ شمع سر جھکا کے سوچ میں ڈوب گئی۔

''یہ مت سوچیں کہ آپ کو کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ جو فائدہ آپ نے دوسروں کو پہنچایا، وہ تو آپ کو بھی مل گیا ناں لیکن جو چیز آپ نے کسی کو دی ہی نہیں..... اس کا دوسروں سے کیا سوال..... رشتوں کا احساس اور جذبات کا اظہار..... یہ وہ قیمتی چیزیں ہیں جو آج آپ کے پاس نہیں۔ یہی آپ کا نقصان ہے اور یہی وہ فائدہ ہے جو آپ کو نہیں مل سکا۔'' کہنے کو لاتعداد الفاظ تھے۔ بلکہ شاید اتنے کہ زندگی گزر جاتی اور اس کی بات ختم نہ ہوتی۔

وہ پرائی ہو چکی تھی لیکن اب بھی ماں کے ایک گرمجوش بوسے کی منتظر تھی کہ کب ماں اس کے لیے بانہیں کھول کے اسے خود میں یوں سموئے گی کہ اس کی زندگی بھر کی تشنگی، خالی پن اور تنہائی کا احساس مٹ جائے گا۔

ابھی وہ وقت آیا نہیں تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ وقت اب زیادہ دور نہیں تھا۔

''نوفل بھائی اور فلزا کے بارے میں مت سوچیں۔ ابھی اس کا ٹائم نہیں آیا۔ اپنے اور ابو کے بارے میں سوچیں۔ جنہوں نے آپ کو دھمکی تو دے دی ہے عمل کرنے کی ان کی ہمت نہیں.....'' شمع نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

''اپنے آپ کو ''فائدے'' کی تکرار سے نکال کے، صرف محبت سے رشتوں کو ڈیل کریں۔ دیر نہیں ہوئی ہے۔''

شمع کو ہکا بکا چھوڑ کے وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی، اس یقین کے ساتھ کہ جس فائدے کا سبق اس نے ایک بیٹی ہو کر ماں کو سکھایا ہے۔ ماں کو ضرور سمجھ آ گیا ہوگا کہ اسی میں ان کا فائدہ تھا۔

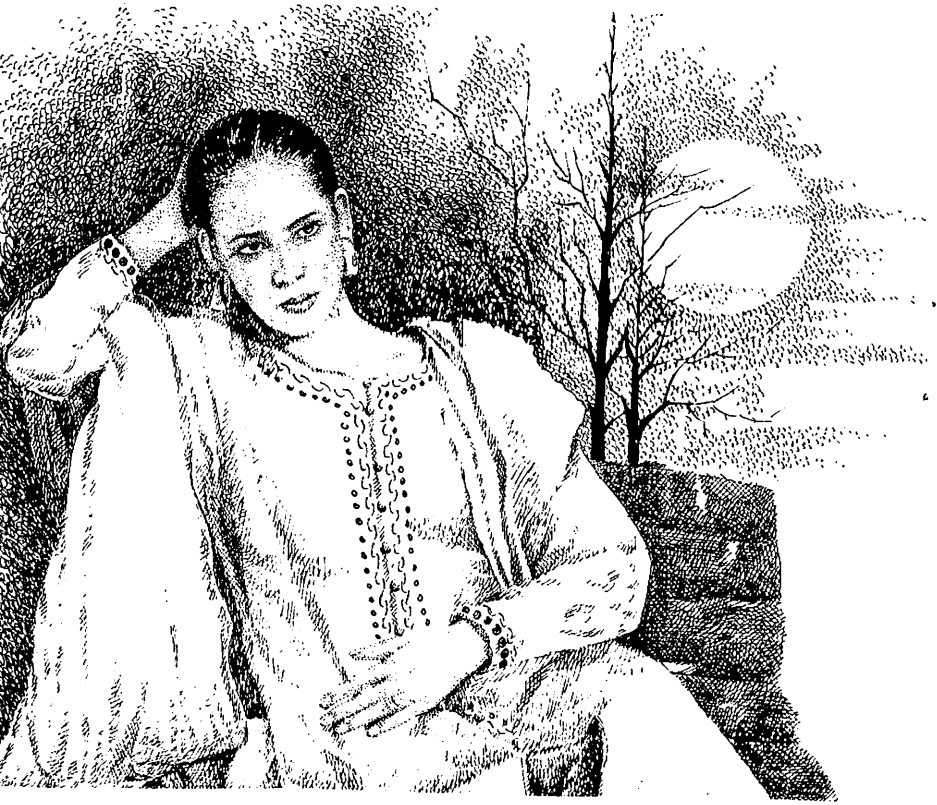

نگینہ

ہما بیگ

بڑے ہو کر ڈاکٹر بننے کا شوق ہر بچے کے دل میں ہوتا ہے، کچھ کو انتقاماً اور کچھ کو خالصتاً دکھی انسانیت کی خدمت کا جذبہ میڈیکل کی طرف لے جاتا ہے۔

میں چونکہ بچپن ہی سے صحت مند رہی ہوں، اور اللہ کے فضل سے کسی اپنے کو بھی صحت کے مسائل سے دوچار ہوتے نہیں دیکھا اس لیے میرے دل میں تو کم از کم انتقام کا جذبہ بالکل نہیں تھا، البتہ دکھی انسانیت کی خدمت کا جذبہ مجھے ڈاکٹر بنانے میں کارفرما

تھا اور اس میں بھی میں نے جسمانی علاج کے بجائے نفسیات کا شعبہ اختیار کیا۔ جسمانی امراض کا علاج آسان ہے جبکہ نفسیاتی مریض اپنے آپ کو بیمار نہیں سمجھتے نہ ہی اپنے مسائل کا کسی سے ذکر کرتے ہیں، اندر ہی اندر وہ مسائل جڑ پکڑ کر مضبوط اور شدید نوعیت اختیار کر لیتے ہیں اور پھر ان کا علاج وقت کے ساتھ، ساتھ مشکل ترین ہو جاتا ہے۔

نفسیاتی مریضوں کے ڈاکٹر بھی مشکل ترین مرحلے سے گزرتے ہیں، ان کو وہ کچھ سننا اور پھر سہنا پڑتا ہے جس سے مریض گزرتا ہے۔ ڈاکٹر بھی اس تکلیف دہ سفر میں اپنے مریض کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ٹوٹی اور بکھری ہوئی کڑیوں کو ملا کر اصلی کہانی کی کھوج لگانا یقیناً ایک مشکل کام ہوتا ہے اور مجھے زندگی میں چیلنج کا سامنا کرنا ہمیشہ اچھا لگا کرتا تھا۔ کئی دفعہ مجھے کامیابی اور کئی دفعہ ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اس دفعہ میرا تبادلہ حیدر آباد کے نفسیاتی اسپتال (پاگل خانے) میں ہوا، کافی عرصے سے وہاں کوئی سائیکاٹرسٹ نہیں تھی۔ اس دفعہ میرے سامنے کافی بڑا چیلنج تھا۔ خیر پہلے دن اسٹاف سے ملاقات کی وہاں کے مسائل اور وسائل پر گفتگو ہوئی۔ سب ہی میری پوسٹنگ سے ناخوش لگ رہے تھے کہ اب دلجمعی سے کام کرنا پڑے گا۔ میٹنگ برخاست کرتے ہوئے میں نے اسٹاف کو تنبیہ کی۔

''کل صبح 8 بجے مجھے سب لوگ اپنی، اپنی ڈیوٹی پر حاضر نظر آنے چاہئیں اور فائلز بھی مکمل ہوں۔ پہلے ہم وارڈز کا معائنہ کریں گے پھر آئندہ کا لائحہ عمل طے ہوگا، کام میں غفلت یا بے پروائی ناقابلِ معافی جرم ہے، امید ہے آپ سب میرے ساتھ تعاون کریں گے۔''

اسپتال کے قریب ہی دو کمروں پر مشتمل میری رہائش کا بندوبست تھا پھر سے پیک سامان کو نکالنا اور سیٹ کرنا۔

''اب ویک اینڈ پر ہی سیٹنگ کروں گی، لائف میں ٹینشن نہیں لینے کا۔'' اپنے آپ کو سمجھا کر میں نے گھر فون ملا لیا اور ان لوگوں کو اپنی خیریت سے مطلع کیا۔ امی سب سے زیادہ میری طرف سے پریشان رہتی تھیں۔

''ان کا علاج کر کر کے تم بھی ان جیسی نہ ہو جاؤ اور بھی ڈاکٹرز ہوتے ہیں مگر تم ہر مریض کے مرض کو سر پر سوار کر لیتی ہو۔'' امی کی باتوں پر میں مسکرا دیتی۔

اگلی صبح سارا اسٹاف ڈیوٹی پر موجود تھا۔ صفائی بھی ہو چکی تھی۔ کافی تسلی بخش صورتِ حال تھی۔

''میڈم راؤنڈ پر چلیں؟'' سینئر اسٹاف نرس نے کہا۔

''بالکل چلیں، ان کا ریکارڈ ساتھ لے چلو۔'' میں نے اوورآل پہنتے ہوئے کہا۔

پہلے وارڈ میں کچھ خواتین مختلف مشغلوں میں مصروف نظر آئیں۔ نرس نے ایک مریض خاتون سے جس کی عمر 45 سال تھی میرا تعارف کرایا۔

''رضیہ یہ ہماری نئی ڈاکٹرنی ہیں، انہیں سلام کرو۔''

وہ خاتون زور، زور سے اپنے دونوں ہاتھ گھما رہی تھیں اور منہ سے زوں، زوں کی آواز نکال رہی تھیں۔

''آپا بیٹھ جاؤ، راستے میں ڈراپ کر دوں گی، راستے میں بازار آئے گا وہاں کی بریانی بھی کھاتے چلیں گے۔''

میں نے رضیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''آپ جلدی میں لگ رہی ہیں، مجھے تھوڑا کام ہے بعد میں خود گھر چلی جاؤں گی، آپ جایئے۔''

اس نے خیالی اگنیشن میں چابی گھمائی اور لمبی سی زوں کی جیسے واقعی میں گاڑی کی اسپیڈ بڑھائی ہو۔

دوسری طرف ایک لڑکی منہ سے ٹک، ٹک کی آواز نکالتی اور انگلیوں میں دبی کوئی خیالی چیز سامنے پھینکتی۔

''چھکا! پھر چھکا آ گیا میں جیت گئی۔'' اور زور، زور سے تالیاں بجاتی۔ اس نے میرا کوٹ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

''دیکھو، دیکھو یہ بے ایمانی کر رہا ہے۔'' اس نے اپنے سامنے اشارہ کیا اس کے خیالی ساتھی کو میں

نے سرزنش کی۔

''بری بات اچھے بے ایمان نہیں کرتے بچے۔''

یہ وارڈ بے ضرر مریضوں کا تھا۔ ساتھ، ساتھ میں ان کا ریکارڈ پڑھتی جارہی تھی۔ ان کے امراض قابلِ علاج تھے مگر گھر والوں نے ان سے جان چھڑا کر اسپتال میں داخل کردیا تھا۔ گھر میں رہ کر شاید وہ جلدی ٹھیک ہوجاتیں۔

''سسٹر کل سے ان کے کمرے میں تلاوتِ کلام پاک کا بندوبست کیجیے، دوسرے ان کو نماز کی طرف راغب کرنے کی کوشش کریں۔ کئی بیماریوں کی شفا سورۂ رحمٰن میں ہے۔'' میری بات سن کر سسٹر نے کہا۔

''مگر میڈم ہم ان کو دوپٹا نہیں دے سکتے کہ یہ سر ڈھانک لیں۔''

''سر ڈھکے بغیر بھی عبادت ہوسکتی ہے، ان کے لیے معافی ہے، انہیں ٹوپی بھی پہنائی جاسکتی ہے۔ شروع تو کیجیے آہستہ، آہستہ آسانیاں پیدا ہوجائیں گی۔''

''چلیں اب دوسرے وارڈ میں چلتے ہیں میم۔'' اسٹاف نے کہا۔

''ہاں اب ذرا مشکل مریضوں سے بھی ملاقات کرلی جائے، آہستہ، آہستہ ان سے قریب ہونا ہوگا تاکہ علاج میں آسانی ہو۔ اندر کا حال آسانی سے کہاں معلوم ہوتا ہے۔'' میں نے کہتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی اور خود کو ذہنی طور پر تیار کرلیا ان خطرناک ذہنی مریضوں سے ملنے کے لیے۔ ہر ایک کا ریکارڈ دیکھتی ہوئی میں آگے بڑھتی گئی۔ کچھ خاموش بیٹھی چھت کو دیکھ رہی تھیں، کچھ کے قہقہے کانوں کے پردے پھاڑ رہے تھے۔ کچھ بالکل نارمل لگ رہی تھیں، ایک نے سلاخوں کے پیچھے سے ہاتھ نکال کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''کب سے تمہارا انتظار کررہی ہوں آج آئی ہو! میری یاد نہیں آتی تم کو؟ یہاں اتنی بوریت ہوتی ہے، تم آجاؤ تو مل کر باتیں کریں گے۔''

میں نے مسکرا کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''شرمندہ ہوں تم سے بس مصروفیت بہت تھی۔ اب ان شاء اللہ روز آؤں گی اور ہم پکنک پر بھی چلیں گے۔''

سب سے آخری کمرے کا منظر میری توقعات کے برخلاف تھا، وہاں محفل سجی ہوئی تھی۔ ایک خاتون مسندِ خاص پر تشریف فرما تھیں، اور کچھ خواتین ان کے قدموں میں بیٹھی واہ، واہ کررہی تھیں خاتون نے ہماری آمد پر ایک ادائے دلبری سے ہماری طرف دیکھا اور اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اور اسٹاف نے اندر قدم رکھا تو انہوں نے مجھے اپنی طرف بلایا۔

''کہو فریادی کیسے آنا ہوا؟ ہم تمہارے لیے کیا کرسکتے ہیں؟'' میرا ہاتھ پکڑ کر انہوں نے اپنے پاس بٹھالیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے نرس کی طرف دیکھا۔

''نگینہ بی بی یہ بڑی میڈم ہیں، اب یہ ہمارے ساتھ ہی ہوں گی، آج آپ سے ملاقات کے لیے آئی ہیں۔''

نگینہ نے خشمگیں نگاہوں سے نرس کو گھورا۔

''حدِ ادب ملحوظ رہے، آپ کو کسی نے ادب سے بات کرنی نہیں سکھائی؟ آج ہمارا موڈ اچھا ہے اس لیے معاف کیے دیتے ہیں، آئندہ خیال رہے۔'' اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئیں۔

''تو آپ بڑی میڈم ہیں ہمیں اردو پڑھائیں گی؟ ہمیں تو پڑھانے کا شوق ہے، خیر آپ سے بھی کچھ سیکھ لیں گے۔ پہلے آپ ہمارے سوالوں کا جواب دیجیے۔''

''جی، جی شہزادی صاحبہ پوچھیے، میں پوری کوشش کروں گی کہ آپ کو مطمئن کرنے کی۔'' میں نے ادب سے جواب دیا۔

''اچھا تو یہ بتایئے شوق کی جمع کیا ہوتی ہے۔'' مجھے سوچتا دیکھ کر نگینہ نے قہقہہ لگایا۔ ''اشواق'' دوسرا سوال ''قسم'' کی جمع کیا ہوتی ہے؟'' ایک بار پھر میرا دماغ لاجواب ہوگیا۔

''حد ہے آپ ہمیں پڑھائیں گی۔ ''اقسام'' ہوتی ہے بھئی قسم کی جمع اور مرد کی جمع مردود ہوتا ہے یا پھر آپ امرود بھی کہہ سکتی ہیں، ارے کنیزوں ہم کو بہت دن سے امرود کی چاٹ نہیں ملی۔ مابدولت کو فوراً امرود پیش کیے جائیں۔'' اب نگینہ سب کچھ بھول کر امرود کی

گردان کرنے لگی تھی۔

نرس نے مجھے اشارہ کیا اور ہم وہاں سے باہر آگئے۔ ہمارے پیچھے سے واہ، واہ کی آوازیں آرہی تھیں۔

''یہ کیا ہے بھئی؟ تفصیل تو خیر فائل سے پڑھ لوں گی، آپ مجھے مختصراً بتادیں۔'' ایسا ماحول اور ایسی مریضہ پہلی دفعہ مشاہدے میں آئی تھی۔

''میڈم آرام سے بیٹھ کر بتاتی ہوں، ایک کپ چائے کے ساتھ، سر میں درد ہونے لگتا ہے ان کی کہانیاں کہہ سن کر۔''

''سسٹر ہمارا کام ہی یہی ہے، اگر آپ کو یہ کام پسند نہیں تھا تو کسی دوسرے شعبے میں جانا چاہیے تھا۔'' مجھے غصے میں دیکھ کر وہ شرمندہ ہوگئی۔

''سوری، آئندہ ایسا نہیں کہوں گی، ہم بھی انسان ہیں کبھی، کبھی لگتا ہے ہمارا دماغ بھی کام کرنا چھوڑ رہا ہے۔ نگینہ کی کنڈیشن جب بہتر ہوتی ہے تو وہ ایسی ہی محفلیں سجاتی ہے اس کی ضد ہوتی ہے سب لوگ بیٹھ کر اس کی تعظیم کریں، اس کی ہاں میں ہاں ملائیں، اسٹاف کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ اور جب تنہائی کا دورہ پڑتا ہے تو اپنے قریب بھی کسی کو آنے نہیں دیتی، بس فرش پر کچھ لکھتی رہتی ہے، کبھی دیوار پر..... دواؤں سے اس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر کبھی، کبھی جب وہ آپے سے باہر ہوجاتی ہے تو الیکٹرک شاک بھی دینا پڑجاتے ہیں۔'' نرس نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

میں نے سوچا فائل گھر لے جاکر مطالعہ کروں پھر سوچا کل ایک بار پھر اس سے مل لوں، ویک اینڈ پر تسلی سے اس کا کیس پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کروں گی۔

''اچھا یہ بتائیے گھر پر کام کے لیے کوئی ذمے دار عورت مل جائے گی، جو صفائی بھی کرے اور کھانا بھی پکالے، گھر والے میرے پاس آنا چاہ رہے ہیں۔''

''کوئی مسئلہ نہیں، آج شام کو ہی آپ کے گھر لے کر آتی ہوں، میری رشتے دار ہے۔'' نرس نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

رات کو جب میں سونے کے لیے لیٹی تو کسی لڑکی نے غزلیں گانی شروع کردیں کبھی وہ فلمی گانے شروع کردیتی۔ آواز سُریلی تھی مگر میں سونا چاہتی تھی تکیہ کانوں پر رکھ لیا۔

''پتا نہیں کس محلے میں گھر لے لیا، پڑوسیوں کو ذرا تمیز نہیں رات بھر وقفے، وقفے سے یہ سلسلہ جاری رہا۔ صبح جلدی، جلدی چائے پی کر اسپتال کی طرف روانہ ہوئی، یہ گھر مجھے اس لیے پسند آیا تھا کیونکہ یہ بالکل اسپتال کے ساتھ تھا اور مجھے پیدل آنے جانے میں آسانی تھی۔

گیٹ پر چوکیدار نے سلام کیا، جواب دے کر میں نے اس کے گھر والوں کی خیریت پوچھی۔

''آپ کی دعا اور مولا سائیں کی مہربانی ہے میڈم جی.....! آپ کو تو کوئی پریشانی نہیں ہمارے شہر میں۔''

''نہیں عبدالعلیم بہت اچھی جگہ ہے مگر یہ رات بھر کون گانے گاتا رہا؟ کیا روز کا یہی معمول ہے؟ اگر ہے تو گھر بدلنا ہوگا، تمہاری تو رات کی ڈیوٹی ہے، کہاں سے آواز آتی ہے؟''

''میڈم جی یہ پڑوسیوں کی حرکت نہیں ہے، ہماری آخری بیرک کی مریضہ کو گانے کا شوق ہے اور آپ کے گھر کے ساتھ اس بیرک کی دیوار ہے اس لیے آپ کو آواز آتی رہی۔''

''اچھا! چلو میں اندر معلوم کرتی ہوں، یہ کون سی گلوکارہ ہمارے اسپتال میں قیام پزیر ہیں۔''

آفس میں آتے ہی روز مرہ کے کام شروع ہوگئے پھر راؤنڈ کی باری آئی، آج مریضوں کے لیے تلاوت کا انتظام تھا۔ کچھ تو ہل، ہل کر سن رہی تھیں اور کچھ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی دنیا میں ہی مگن تھی۔ ایک لڑکی نے میرے سامنے آکر لجاجت سے کہا۔

''آپ میرے ساتھ چھپن چھپائی کھیلیں گی۔''

میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''کیوں نہیں، بہت مزہ آتا ہے، بس میں تھوڑا کام کرلوں، جب تک تم اپنی وہ والی سہیلی کے ساتھ

کھیلو۔'' ایک اسی کی عمر کی لڑکی چپ، چپ بیٹھی ہمیں دیکھ رہی تھی۔

''بھئی میں نے دن میں تلاوت کا کہا تھا یہ رات بھر تم موسیقی کس خوشی میں کرواتی رہیں؟'' باہر آ کر میں نے نرس سے کہا۔

''میڈم ہم خود تنگ ہیں، نگینہ پر نیند کی گولی کا بھی اثر نہیں ہوتا جب اس کی حالت ذرا بہتر ہوتی ہے تو ہم انجکشن کے بجائے اسے نیند کی گولی دے دیتے ہیں مگر سب بے سود ثابت ہوا۔ پتا نہیں کون، کون سی غزلیں جو ہم نے کبھی نہیں سنی، چپ کرانے کی کوشش کریں تو وہ اور تیز آواز میں شروع ہو جاتی ہے۔''

''انٹرسٹنگ کیس ہے، چلو آج اس کا موڈ دیکھتے ہیں۔'' ہم باقی مریضوں کا حال پوچھتے ہوئے نگینہ کے کمرے کے سامنے پہنچے تو کل والا ہی منظر تھا، وہ کچھ اوٹ پٹانگ بولتی جا رہی تھی اور زمین پر بیٹھی عورتیں واہ، واہ کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس نے آداب کیا اور بولی ''تخلیہ.....'' عورتیں جلدی سے اِدھر اُدھر ہو گئیں۔

''استانی جی اب آپ کب سے ہمیں پڑھانا شروع کر رہی ہیں؟ آپ کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔''

''بس نگینہ جلدی پڑھائی شروع کر دیں گے، تم کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا میں منگوا دوں گی۔''

''آپ مجھے نگین کہہ سکتی ہیں، میری سہیلیاں اور استانیاں اسی نام سے پکارتی تھیں مجھے..... آپ میرے لیے کاپی اور پین منگوا دیں اس کے بغیر کیسے پڑھائی ہوگی اور ہاں ایک ترازو بھی چاہیے یہ سب کہتے ہیں میرے شعر بے وزن ہوتے ہیں، ترازو میں تول کر ٹھیک کر لوں گی۔''

میں نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی اور وعدہ کیا جلد ہی اس کی ضرورت کی چیزیں اسے مل جائیں گی، نرس بھی مسکراتی ہوئی میرے ساتھ آفس کی طرف چل پڑی۔

اپنے آفس پہنچ کر میں نے نگینہ کی فائل نکلوائی۔

عمر 52 سال..... تعلیم بی اے پاس، ایک بیٹی جو امریکا میں بسلسلۂ تعلیم مقیم تھی، اس کے علاوہ کئی نفسیات کے ڈاکٹرز کی رپورٹس تھیں جن کے پاس وہ وقتاً فوقتاً جاتی رہی تھی۔ رابطے کے لیے اس کے شوہر وارث گیلانی کا موبائل نمبر لکھا تھا، میں نے اس کا نمبر ملایا کئی دفعہ کی کوشش کے بعد انہوں نے فون اٹھا لیا۔

''جی فرمایئے؟'' رعونت بھری آواز میں پوچھا۔

''میں مینٹل اسپتال سے بات کر رہی ہوں آپ کی بیگم کے متعلق بات کرنی تھی، ان کی میڈیکل فائل میں مکمل معلومات درج نہیں ہیں، آپ ہی مزید حالات پر روشنی ڈال سکتے ہیں تاکہ ان کا علاج درست بنیادوں پر کیا جا سکے۔'' میرا جملہ ختم ہوتے ہی ان کی غصے میں سانس لینے کی آواز اسپیکر پر ابھری۔

''خاتون میں نے نگینہ کے علاج کے تمام اخراجات ایڈوانس میں جمع کرا دیے ہیں..... پھر بے وقت فون کرنے کی وجہ؟''

''گیلانی صاحب میں آپ سے رقم کا مطالبہ نہیں کر رہی، آپ کی بیگم کی ہسٹری معلوم کرنا چاہ رہی ہوں، آپ دونوں کے تعلقات، ان کی بیماری کی وجوہات، وہ جسمانی طور پر بیمار ہوتیں تو ایکسرے اور دوسرے ٹیسٹ سے ہم بیماری کی نوعیت معلوم کر کے علاج کر لیتے مگر یہ نفسیاتی بیماری ہے جو روح میں پلتی ہے، دماغ میں پیدا ہوتی ہے۔'' میں نے اپنا غصہ قابو میں رکھا۔

''محترمہ اتنی لمبی تقریر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں بزنس کرتا ہوں، اتنا فارغ وقت میرے پاس نہیں جو ایک پاگل عورت کے لیے برباد کروں۔''

''اس نے اپنی زندگی کے 30 سال آپ کے اور آپ کے گھر کے لیے وقف کر دیے۔ کیا شادی کے وقت وہ پاگل تھی؟ اگر تھی تو آپ نے شادی کیوں کی؟ 30 سال بہت بڑا وقت ہوتا ہے، عمر قید بھی 14 سال کی ہوتی ہے اس نے تو اس سے زیادہ وقت آپ کے ساتھ گزار لیا۔'' میں سانس لینے کو رکی۔

''اس نے نہیں میں نے اس کے ساتھ وقت گزارہ ہے، وہ ایک انا پرست، ضدی عورت ہے، جو

صرف اپنے بارے میں سوچتی ہے، اس نے کبھی میرے گھر کے ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنے آپ کو پرفیکٹ سمجھتی ہے اور چاہتی ہے دنیا اس کے اشاروں پر چلے، شطرنج کی بساط بچھا رکھی تھی اس نے اور دونوں طرف سے خود کھیل کر خوش ہوتی تھی۔ خود مہرے آگے بڑھاتی تھی اور خود ان کو مات دے کر خوش ہوتی تھی۔ ڈاکٹرنی صاحبہ آپ کا جو دل چاہے کریں..... مجھے اب اس معاملے سے معاف ہی رکھیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔

''عجیب بدمزاج انسان ہے یقیناً اپنی بیوی کو اس حال تک پہنچانے میں اسی کا ہاتھ ہے، میں بھی ہار نے والی نہیں، مسئلے کی تہ تک پہنچ کر رہوں گی۔'' میری خود کلامی سن کر جونیئر ڈاکٹر نے پوچھا۔

''کیا ہوا میڈم.....؟ وہ تعاون کے لیے تیار نہیں ہیں تو اب ان کی بیٹی سے رابطہ کرتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ اس کا پتا فائل میں نہیں ہے اور نگینہ سے ملنے بھی کوئی نہیں آتا۔''

''اس کے لیے کاغذ اور قلم کا بندوبست کرو، وہ خود ہی بتا دے گی، پتا ہے ناں نفسیاتی مریضوں کا علاج، کاغذ اور قلم ہے، چاہے وہ کچھ لکھیں، لکیریں کھینچیں، کارٹون بنائیں، وہ اپنا لکھا کتھارس اسی طرح کرتے ہیں، بس ہمیں نظر رکھنی ہوگی جس وقت اس کی کنڈیشن بہتر ہو، دوسرے وہ قلم سے اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچا سکے۔''

اس رات بہت اچھی نیند آئی تھی پورے چاند کی روشنی کچھ انسانوں کو اپنے سحر میں جکڑ کر شانت کر دیتی ہے جبکہ کچھ چکور کی طرح اپنا سر ٹکرا، ٹکرا کر لہولہان ہو جاتے ہیں۔

''گڈ مارننگ میڈم۔''

''گڈ مارننگ.....'' سب کی خیریت پوچھ کر میں آفس میں روٹین کے کام نپٹانے لگی۔

''میڈم کافی یا چائے۔''

''گرما گرم کافی مل جائے تو کیا بات ہے۔ پھر نگینہ کی طرف چلتے ہیں، اسے کاغذ اور قلم دیں گے پھر دیکھیں گے وہ respond کرنے میں کتنا ٹائم لیتی ہے۔'' میں نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا۔

''کل رات جب اس کو کھانے دینے کے لیے دروازہ کھولا تو اس نے دھکا دے کر کھانا گرا دیا اور ماسی کو کافی مارا پھر باہر کی طرف بھاگی۔ چونکہ کافی عرصے سے وہ پُرسکون تھی اسی لیے اسٹاف بھی اس کی طرف بے فکر ہو گئے تھے۔ بڑی مشکل سے اسے باندھا اور سکون کے انجیکشن لگائے گئے، اب ہوش میں آئے گی تو پتا چلے گا کہ کیا کنڈیشن ہے۔''

''یہ تو اچھی خبر نہیں سنائی آپ نے..... چلیں اسے دیکھیں چل کر، ہوش میں آ کر کیا کرتی ہے، اس کا مطلب ہے رات کی دوائیں بھی اس نے نہیں کھائیں جبھی اتنی Violent ہو گئی۔''

زنجیروں سے بندھی وہ چھت کو گھورے جا رہی تھی، آہٹ پر اس نے ہماری طرف دیکھا آج اس کی آنکھیں خون کی طرح لال ہو رہی تھیں، ان سے نفرت اور غصے کے شعلے نکل رہے تھے۔

''کہا تھا ناں تم سے میری کسی بات کو رد نہیں کرنا مجھے ناشتے کی عادت نہیں ہے، کہہ دیا تو بس کہہ دیا۔ آنکھیں نیچی کرو، ورنہ نکال کر ہاتھ میں رکھ دوں گی، کوئی مقابلے پر آئے..... ہونہہ میرے جیسا کوئی نہیں، منہ پر تیزاب ڈال دوں گی سمجھیں۔''

نرس نے بدقت اس کے بازو میں انجیکشن لگا دیا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ پُرسکون ہو گئی اور ہم سر جھکائے وارڈ سے باہر آ گئے۔ نگینہ کو واپس پُرسکون حالت میں آنے میں ایک ہفتہ لگا، اس دوران اسے الیکٹرک شاکس بھی دینے پڑتے۔ جب وہ اپنے کمرے میں واپس آئی تو نقاہت سے بیٹھ نہیں پا رہی تھی، میں نے پاس جا کر اسے پکارا۔

''نگینہ کیسی ہو؟ مجھے پہچانتی ہو ناں.....''

''جی آپ نئی ڈاکٹرنی ہیں ناں.....! اور میری استانی بھی مجھے پڑھانے کا وعدہ کیا ہے آپ نے، یاد

ہے ناں؟'' اس نے نقاہت بھری آواز میں پوچھا، بڑی، بڑی سیاہ آنکھوں میں امید کی کرن چمکی۔

''کیوں نہیں، تم جلدی سے ٹھیک ہوجاؤ پھر پڑھائی شروع گڈ گرل.....''

''میڈم کھانے کا وقت ہوگیا ہے، اب چلیے۔'' میری اسٹنٹ کی آواز مجھے واپس حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔

''تم کو پتا ہے ناں یہ صرف میری ہیں میری..... آئندہ بیچ میں مت بولنا۔'' یک بیک نگینہ غصے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ٹھیک ہے نگینہ، میں تمہاری ہوں اور تم میری، ان سے غلطی ہوگئی ہے، اب ہم چلتے ہیں کل ملاقات ہوگی۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنی اسٹنٹ کو اشارہ کیا اور پھر ہم آفس میں بیٹھ کر نگینہ کے رویے کو ڈسکس کرتے رہے۔

اگلے دن میں اس کے لیے ایک رجسٹر اور پین لے کر گئی۔ وہ خوشی سے کھل اٹھی، بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگی۔

''مجھے پتا تھا آپ اپنا وعدہ ضرور پورا کریں گی، اب مجھے پڑھنا ہے تاکہ لوگ مجھے میٹرک فیل نہ کہیں.....''

''ایسا کرو نگینہ پہلے تم اس میں وہ لکھو جو تمہیں آتا ہے یا تم خط لکھو اس کے نام جو تمہیں بہت عزیز ہے۔ وہ پڑھ کر میں دیکھوں گی کہ تم کو کیا پڑھانا ہے، ٹھیک ہے ناں.....'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے وہ رجسٹر کا پہلا صفحہ پھاڑ کر اس کے پُرزے، پُرزے کرکے ہوا میں اڑا رہی تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟ ایسے میں تمہیں کیسے پڑھاؤں گی، اس طرح کوئی کچرا پھیلاتے ہیں۔'' میں نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔

''سوری، سوری اب نہیں کروں گی پلیز مجھے معاف کردیں۔ ورنہ میں رو پڑوں گی۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''اچھا اب میں چلتی ہوں اور روز آکر تمہارا کام چیک کروں گی۔'' اس دن کے بعد کئی دوسری مریضائیں اسپتال میں داخل ہوئیں۔ کچھ پرانی فائلز کو

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
علمی دانشمانہ برتنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ
سرگزشت

اگست 2020ء کی جھلکیاں

سائل انعام
زویا اعجاز کے قلم کا شہکار، تاریخ کے ظالم ترین انسان کی داستان

خصوصی
ببرک کارمل جمالی کی تحریر، بلوچستان کی ایک بہادر دوشیزہ کا قصہ

خاص
انور فرہاد سنا رہے ہیں کراچی کی فلمی صنعت کا احوال

ندیم اقبال کا زورِ قلم، ایک الگ انداز کا سفرنامہ

کنیز زہرا کی تلاش، آنکھ نم کردینے والی سچ بیانی

بھی بہت سے دلچسپ سچے واقعات، سچی داستانیں، سچے قصے

ہر صاحبِ علم کے لیے تحفہ، سرگزشت کا ہر شمارہ خاص شمارہ

مکمل کروانا پڑ گیا۔ ٹھیک ایک ہفتے کے بعد تین دن کی چھٹی آ گئی تو گھر والوں نے اصرار کر کے گھر بلوالیا۔ وہ خود تو نہیں آسکے تھے..... اس طرح کوئی پندرہ دن گزر گئے نگینہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ مگر میں مستقل اس کا حال احوال پوچھتی رہی۔ یہی خبر ملی کہ وہ کافی نارمل ہے، محفلیں بھی سجا رہی ہے۔ گلوکاری بھی ہو رہی ہے مگر زیادہ تر وہ لکھتی رہتی ہے۔ یہ میرے لیے خوش آئند بات تھی۔

''کہاں تھیں آپ؟ کتنے سال گزر گئے آپ کا انتظار کرتے، کرتے، آپ نے کبھی کسی کا انتظار کیا ہوتا تو پتا چلتا' انتظار تو بس ایک اذیت ہے، چاہے وہ بستر پر لیٹ کر نیند کا ہو، دروازے پر بیٹھ کر محبوب کا ہو، کالی سیاہ راتوں میں چاند کا ہو یا زندگی کی بازی ہار کر موت کا ہو۔'' آج وہ خلافِ معمول بہت سنجیدہ لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خلاؤں میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ بے چینی سے اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

''معاف کردو ناں پیاری سہیلی، اب تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ اب تو ہنس دو اور اپنا رجسٹر دکھاؤ، میں بھی تو دیکھوں کیا لکھا ہے اتنے دن میں۔'' اس نے اجنبی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور رجسٹر میرے حوالے کر دیا اور نئے رجسٹر کی فرمائش کر دی۔

بیرک سے نکلتے ہی میرے ساتھ سینئر نرس نے تشویشناک انداز میں کہا۔

''آج کی رات نگینہ کو پھر دورہ پڑے گا۔ اس کی آنکھوں میں ویسی ہی وحشت تھی جیسے دورے سے پہلے ہوتی ہے، آج بھی پورا چاند ہے، اس کے برتاؤ میں سکوت ویسا ہی ہے جیسے طوفان آنے سے پہلے ہوتا ہے۔''

میں نے اس سے بحث مناسب نہیں سمجھی کیونکہ وہ کافی عرصے سے اس اسپتال میں کام کر رہی تھی۔ آفس کے کام نپٹا کر میں نے نگینہ کا رجسٹر اٹھایا اور گھر کی طرف چل دی۔ بے اختیار نظر آسمان کی طرف گئی تو واقعی چاند اپنی منزلیں طے کرتا ہوا اپنے شباب پر تھا۔

گھر پہنچ کر اپنے لیے سینڈوچ اور کافی تیار کر کے میں نے رجسٹر کھول لیا۔ کہیں کارٹون بنے ہوئے تھے، کہیں فلمی گیت کسی صفحے پر کیڑے مکوڑے، درمیان میں کہیں، کہیں کچھ بے ربط سی تحریر بھی لکھی ہوئی تھی جو ایک نظر میں میری سمجھ میں نہیں آئی میں نے جلدی سے کاغذ اور قلم نکالا اور اس کے لکھے ہوئے جملوں کو ایک ساتھ لکھنے کی کوشش کی۔ وہ کسی سے مخاطب تھی۔ تین چار دفعہ کی کوشش کے بعد میں اس خط کو یکجا کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

''میرے محبوب، پتا ہے مجھے پاگل خانے سے اور پاگل ہونے سے بہت ڈر لگتا ہے، پاگلوں سے ڈر بالکل نہیں لگتا، وہ بھی تو ہمارے جیسے انسان ہوتے ہیں، تمہیں معلوم ہے وہ کیوں پاگل ہوجاتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ عام انسانوں سے زیادہ ذہین اور زیادہ حساس ہوتے ہیں، شاید اسی لیے وہ پاگل ہوجاتے ہیں..... کیونکہ ان کی قوتِ برداشت اور لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے، عام لوگ تو اپنے دکھوں اور اپنی پریشانیوں کو دماغ پر سوار نہیں کرتے۔ مگر یہ دنیا سے نرالے لوگ ہر بات کو اپنے دل پر لے لیتے ہیں اور دل ہی دل میں کڑھتے رہتے ہیں..... مگر آخر کب تک کبھی تو صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا ہی ہے، ہر ایک کا اظہار کا طریقہ مختلف ہوتا ہے، کبھی تو یہ حالات سے گھبرا کر جان دے دیتے ہیں۔ اور بعض برداشت کی حدوں کو پھلانگ کر جنونی ہوجاتے ہیں..... میرے ساتھ بھی شاید یہی ہوا۔ ورنہ میری یادداشت تو ایسی تھی کہ مجال ہے کوئی بات بھول جاؤں، ہر ایک کی سالگرہ یاد رکھنا، ان کو مبارک باد دینا، ہر فلم دیکھنا، ہر گانا یاد رکھنا، اب تو کچھ یاد نہیں رہتا، چہرے نہ نام نہ ہی منظر..... ارے ہاں وہ منظر صاحب کیسے ہیں؟ ان کی شکل یاد نہیں آرہی۔ صرف اب یہ یاد ہے محبت میں جدائی کا سبق پہلا بھی اور آخری بھی..... دل میں بہت سارے شکوک اور وہم ہوں اور منزلوں کا بھی پتا نہ ہو تو آدمی کس کی چاہ میں سفر کی صعوبتیں اٹھائے بھلا'' میں پڑھتی رہی۔

''تمہیں یاد ہے ناں.....! میں شادی سے پہلے کتنا ہنستی تھی، امی کہتی تھیں دیکھو زیادہ ہنسنے سے چہرے کی رونق ختم ہوجاتی ہے، یہ بات اس وقت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ مسکرانے کے بھی قرض ہوتے ہیں۔ شاید شادی سے پہلے مجھے ساری خوبیاں ایڈوانس میں مل گئی تھیں اس لیے ابھی تک آنسوؤں سے ان کے قرض اتار رہی ہوں۔'' یہ تحریر آگے پیچھے بے ربط سی تھی جسے میں جوڑ رہی تھی۔

''امی جان نے مجھے بیٹی کم اور دوست زیادہ بنا کر رکھا، اپنی زندگی کا ہر تجربہ گھول کر پلا دیا۔ وہ بہت مطمئن تھیں..... مگر وہ یہ بھول گئیں کچھ تجربے صرف وقت سے ہی حاصل ہوتے ہیں اور جو تجربوں سے نہیں سیکھتے ان کو وقت ہی سکھاتا ہے، شاید کچھ غلط لکھ دیا، میں نے خیر ہوا ابھی پھر کچھ یونہی..... زندگی نے اتنے موڑ کاٹے، اتنی مشکلات آئیں جیسے ریسنگ کارزوں، زوں کر کے اسپیڈ بریکر سے اچھلتی کودتی بھاگتی ہے، ان تجربات نے تو مجھ 25 سال کی عمر میں 50 سال کا کر دیا۔ قصور تمہارا نہیں ہے۔ اب میں سوچتی ہوں غلطی سراسر میرے والدین کی ہے، بچوں کو اتنی محبت دینی ہی نہیں چاہیے کہ وہ اس کے عادی ہو جائیں، محبت کو اپنا حق سمجھ لیں، ابو نے اپنے کلیجے کا ٹکڑا تمہارے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''میری ایک بات بھی نہ بھولنا، غلط راستے کو سو طرح کے سنگار لگے ہوتے ہیں، اپنی طرف مائل کرتے ہیں، رجھاتے ہیں مگر یہ دلکش نظارے اس راستے کے دروازے تک ہی ہوتے ہیں، اس کے آگے تو یہ راستہ اترائی کا ہوتا ہے۔'' مگر تم نے ان کی بات پر توجہ نہیں دی۔

''میرے محبوب میری ہر خوشی ہر سانس تمہارے لیے تھی تمہارے لیے ہے، تمہارے لیے رہے گی مگر میں بھی تم سے کچھ چاہتی تھی۔ محبت کا جواب محبت سے دیتے مگر تم نے کبھی اظہار ہی نہیں کیا۔ منہ سے نہ کہتے کم از کم اپنے انداز سے تو ظاہر کر دیتے۔ میرا اپنے والدین سے، سہیلیوں، رشتے داروں سے ملنا تم کو پسند نہیں تھا، فلمیں، ٹی وی دیکھنے پر بھی پابندی تھی۔ میرا لکھنا پڑھنا تمہیں ناگوار گزرتا تھا سو چھوڑ دیا، میری جدائی کے غم نے ہی میرے والدین کو زندہ درگور کر دیا۔ وہ سمجھتے رہے ان کی بیٹی بدل گئی ہے، ان کو کیا پتا! کیوں ان کو بتا کر پریشان کرتی۔

''ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی..... شاید موسم یا سیاست پر بات ہو رہی تھی مگر ہماری بات ہوتی کب تھی، تم حکم دیتے تھے اور میں عمل کرتی تھی۔ پھر یہ تو ہونا ہی تھا، کہیں تو میرے اندر کا غصہ نکلنا تھا ناں..... کبھی، کبھی مجھے اپنا جسم اور روح دونوں الگ، الگ محسوس ہوتے ہیں۔ میں اپنے جسم کو چھو کر دیکھتی ہوں تو یقین آتا ہے کہ ابھی کم از کم روح نے جسم کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ پتا ہے جب میرا جسم زنجیروں سے بندھا ہوتا ہے تو میری روح آزاد ہوتی ہے اور مجھے تڑپتا ہوا دیکھتی ہے اور قہقہے لگاتی ہے کبھی درمیان سے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آجاتی ہے تو احساس ہوتا ہے، ہاں میں نے بھی ایک زندگی جی لی سادہ سی، خاموش بے کیف زندگی۔

''ہوسکتا ہے تم نے بھی کبھی مجھ سے محبت کی ہو، در اصل محبت کے بھی تو الگ، الگ انداز اور پیمانے ہوتے ہیں، میرے نزدیک محبت قربانیاں مانگتی ہے۔ یعنی جس سے محبت ہو اس کی ہر خواہش کا احترام کیا جائے جبھی تو سر جھکا کر تمہاری ہر بات مانتی گئی، میں ڈرتی تھی کہیں تم روٹھ گئے اور مجھے چھوڑ دیا تو میں کیسے جی پاؤں گی جبکہ تمہاری محبت کا مطلب حاکم بن کر رہنا یا پھر بیوی کو پیر کی جوتی بنا کر رکھنا تھا۔

''ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟ مگر تم کو کیا ضرورت ہے میری بات سننے کی، تم نے تو کبھی یہ جاننے کی بھی کوشش نہیں کی کہ مجھے کیا پسند ہے کیا ناپسند..... مجھے محبت میں بٹوارہ سخت ناپسند ہے، نفرت ہے مجھے، تمہیں بے باک لڑکیاں پسند ہیں ناں؟ جو سب کے سامنے اپنے حسن کی نمائش کرتی ہیں، داد سمیٹتی ہیں، بیویاں بھی کبھی جوان اور خوب صورت ہوتی ہیں مگر جب شوہر

کے مکان کو گھر بنانے میں، اس کے بچے پیدا کرنے اور پالنے، میں اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہیں تو شوہر جوان، شوخ و چنچل لڑکیوں کے پیچھے اپنی اسی جیون ساتھی کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔

''میرے ناز انداز اٹھانے والا پہلے بھی کوئی نہیں تھا اب بھی میں تنہا ہوں، ایک خاموشی بھری تکان ہے جو اندر ہی اندر مجھے دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے، کاش تم نے مجھے کبھی اپنی محبوبہ سمجھا ہوتا، جیسے میں نے تم کو اپنا محبوب بنا کر من مندر میں بسا کر پوجا کی، ہاں میں نے تم سے عشق کیا یہ جانتے بوجھتے بھی کہ تم کلی، کلی منڈلانے والے بھنورے ہو۔

''میں نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کوئی اور عورت تمہاری زندگی میں آئے گی اور میری برسوں کی بسی بسائی گرہستی کو اپنے قدموں تلے روندتی چلی جائے گی، میں تو اس غلط فہمی کا شکار رہی کہ اور عورتوں کی طرح یہ بھی کچھ دن تمہارا دل بہلا کر دل سے اتر جائے گی مگر وہ تو میرے گھر پر ہی قبضہ کر بیٹھی اور تمہارا انتظار اور آنسو ہی میرا نصیب ٹھہرے۔

''محبت کے بھی نرالے اصول ہیں، مرد نے ٹھکرا دیا تو دو آنسو بہا کر چپ ہوگئی۔ پھر میری ذہنی رو بھٹک رہی ہے، دل کرتا ہے ساری دنیا کو آگ لگا دوں..... اس سے پہلے کہ میرے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں مفقود ہو جائیں ایک بات سن لو، تمہیں تو عورت ذات کا بہت تجربہ ہے لیکن ایک راز کی بات بتاؤں تم کو اب پھر کبھی کسی عورت کو corner مت کرنا، بہت حوصلہ بہت برداشت دی ہے خدا نے عورت کو..... مگر جب ہر دروازہ بند ہو جائے اور کوئی راستہ نہ ملے تو وہی معصوم، بے ضرر سی عورت شیرنی بن جاتی ہے، جس کو تم بلی سمجھتے ہو جو تمہارے پچکارنے پر دم ہلاتی تمہارے پیر چاٹتی ہے، وہی بلی تمہاری بے توجہی اور بے حسی کے پتھروں سے نڈھال ہو کر کبھی تو موت کو گلے لگا لیتی ہے، کبھی پاگل ہو جاتی ہے اور کبھی انتقاماً وہی کرتی ہے جو تم نے اس کے ساتھ کیا۔ غلط اور صحیح کی پہچان مٹ جاتی ہے اور میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔

''تم نے اگر مجھے میرا حق دیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی، میں ٹکڑے، ٹکڑے ہوگئی ہوں، آؤ مجھے جوڑ دو پلیز مگر ٹھہرو ذرا سا رک جاؤ مجھے ان سلاخوں کے پیچھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ، مجھے بہت ڈر لگتا ہے، اب کوئی شکایت نہیں کروں گی۔''

صبح صادق کی روشنی نے احساس دلایا کہ اب رات تو ڈھل چکی ہے اور نئی امیدوں کی روشنی لیے سورج ہمارا منتظر ہے..... لیکن کسی کے نصیب کے اندھیرے کبھی نہیں جاتے، آہ وہی پرانی گھسی پٹی کہانی، کسی نئے موڑ کی منتظر..... جیسے نگینہ اس تاریک کمرے میں اپنی زندگی کے دن کسی روشنی کی منتظر کسی محبت کرنے والے لمحے کے رونما ہونے کے انتظار میں بیٹھی ہے۔

''السلام علیکم میڈم! رات کو تو آپ آرام سے سوگئی ہوں گی؟'' سینئر نرس نے پوچھا۔ خود اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

''کیوں، کیا ہوا؟ میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''رات کو پھر نگینہ کو دورہ پڑا۔ ہم پہلے سے تیار تھے، اسی لیے وہ خود کو یا کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکی۔ رات سے ہی اس کو زنجیروں میں باندھ دیا ہے، آپ کا انتظار تھا کیونکہ اب الیکٹرک شاک کے علاوہ کوئی چارہ نہیں..... آپ آکر دیکھ لیں..... دن کی ڈیوٹی والے اسٹاف بھی آچکے ہیں، شاکس کے بعد اس کو بھی کچھ سکون مل جائے گا اور ہم بھی آرام کرلیں گے۔'' پھر میرا بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رہا۔

''ہاں محبت کرنے والوں کا یہی علاج ہوتا ہے، عمر بھر دکھوں کے شاکس اور جب ان کو پرانے ڈبوں اور بوتلوں کی طرح باہر پھینک دیا جاتا ہے تو ہوش سے بیگانہ کرنے کے لیے بجلی کے جھٹکے۔'' یہ صرف اس نفسیاتی..... اسپتال میں داخل ایک نگینہ کی کہانی نہیں بلکہ ایسے کتنے نگینے اپنے جیسوں کی ناقدری سہتے، سہتے کہاں، کہاں رُل رہے ہیں..... کون جانے۔

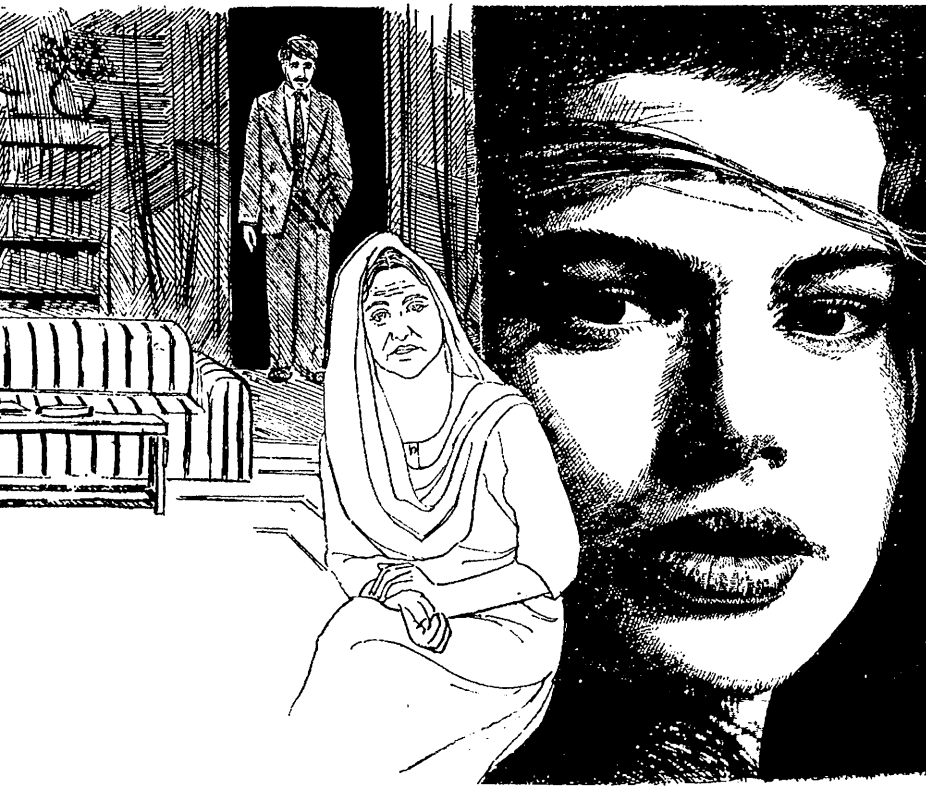

بڑے کام کی چھوٹی بات

افشین نعیم

''حلیم بے انتہا مزیدار بنا ہے بھابی۔'' کھانے سے اچھی طرح انصاف کرتی ثمن نے یہ جملہ کوئی تیسری بار دُہرایا تھا۔ رعنا نے مسکراتے ہوئے تعریف وصول کی اور حلیم کا ڈونگا مزید اپنی مہمان نند کی طرف کھسکایا۔

''سب، میرا کمال ہے۔'' توصیف نے نوالہ حلق سے اتارتے ہوئے فرضی کالر کھڑے کرتے ہوئے کہا۔

''جی بالکل، آپ ہی کا کمال ہے سارا کیونکہ اتنی سگھڑ بیوی آپ ہی تو بیاہ کر لائے ہیں۔'' ثمن نے فوراً سر ہلا کر تائید کی۔

''ماما! پانی۔'' پانچ سالہ شاروق نے اپنے برابر والی ڈائننگ چیئر (کرسی) پر بیٹھی ماں کی قمیص کا دامن

کھینچتے ہوئے کہا۔

''اچھا بیٹا.....'' ثمن نے پانی گلاس میں ڈال کر گلاس شارق کی طرف بڑھایا۔

''جی نہیں بیوی تو میری پیاری اماں بیاہ کر لائی ہیں۔'' توصیف نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر آپ کا کمال کہاں سے آ گیا، حلیم کے مزیدار ہونے میں۔'' ثمن نے مسکراتے ہوئے بھائی کو مخاطب کیا۔

''حلیم مکس کا وہ پیکٹ میں خرید کر لایا تھا جس کی مدد سے یہ حلیم بنایا گیا ہے۔'' توصیف نے بھرے ہوئے منہ کے ساتھ راز آشکار کیا۔

''تو پھر تو آپ سے زیادہ اس کمپنی کا کمال ہوا ناں جو یہ مسالا جات تیار کر کے پیک کرتی ہے۔'' ثمن نے مسکراتے ہوئے جوابی گولہ باری کی۔ رعنا بولی تو کچھ نہیں پر اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ دونوں بہن، بھائی کی گفتگو سے خوب حظ اٹھا رہی ہے۔

''امی؟ آپ بھی تو کچھ بولیں ناں.....'' ثمن نے ماں کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے انہیں متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

ثمن کی بات پر بے اختیار ہی رعنا کی نظر ساس کی طرف اٹھی جو چہرے پر پتھریلے تاثرات سجائے انتہائی سنجیدگی سے کھانا کھانے میں مگن تھیں۔

''بھئی، ہم سے تو نہیں ہوتیں یہ خواہ مخواہ کی ناز برداریاں اور جھوٹی تعریفیں۔ آج کے دور میں حلیم بنانا کون سا کمال ہے۔ ڈبا لائے، گھنٹے بھر میں حلیم تیار..... یہ تو ہم تھے جو پوری، پوری رات حلیم گھوٹتے تھے اور اس پر بھی ساس کی سو، سو باتیں سنتے تھے۔'' وحیدہ بیگم کے طنز میں ڈوبے نوکیلے جملوں نے ایک دم ہی ماحول پر سناٹا طاری کیا۔

رعنا کرسی کھسکا کر ایک جھٹکے سے اٹھی اور بغیر کسی کی طرف دیکھے تیز، تیز قدموں سے چلتی اپنے کمرے میں غائب ہوگئی۔ ثمن تو ماں کو چھیڑ کر پچھتائی اس بولنے سے تو اُن کی خاموشی ہی بہتر تھی۔

''لو جی، اب ایسا بھی کیا کہہ دیا ہم نے جو بہو رانی سارے ادب آداب بالائے طاق رکھ کر اپنے حجرے میں تشریف لے گئی ہیں۔'' کٹیلے سے انداز میں کہتی وحیدہ بیگم دوبارہ سے کھانے میں مصروف ہو چکی تھیں۔ ثمن کی تو بھوک ہی اُڑ گئی تھی۔

''تو..... مس ثمن عدیم صاحبہ! چونکہ آپ کی تعریف مطلب وہ تعریف جو آپ نے ہماری بیگم کی، کی اس نے ہماری والدہ ماجدہ کا موڈ خراب کیا اور ان کے جوابی حملوں نے ہماری بیگم کا موڈ خراب کیا سو اس جرم کی پاداش میں آپ کو وہ خوش رنگ اور خوش ذائقہ زردہ پُلاؤ سے خود لے کر آنا پڑے گا جو انہوں نے بغیر کسی ڈبے کی مدد کے تیار کیا ہے۔ اور اس بات کی تو آپ خود بھی گواہ ہیں.....'' توصیف نے ذرا سا توقف کیا۔

دونوں خواتین کے کان اسی کی طرف لگے ہوئے تھے۔

''کہ کم از کم زردہ بنانے پر ہماری والدہ نے کبھی اپنی ساس کی باتیں نہیں سنیں کیونکہ نہ ان کو زردہ بنانا آتا تھا نہ کبھی بنایا۔'' ہلکے پھلکے انداز میں بات ختم کرتے آخر میں اس نے مسکرا کر بہن کو دیکھا۔

اب کے کھانا چھوڑ کر جانے کی باری وحیدہ بیگم کی تھی۔ وہ تن فن کرتی وہاں سے جا چکی تھیں۔ جاتے، جاتے اکلوتے لختِ جگر کو جورو کا غلام کا خطاب دے گئی تھیں۔

ثمن نے بیچارگی سے بھائی کو دیکھا اور کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ شارق نے ماں کو کھڑے ہوتے دیکھا تو خود بھی کرسی سے چھلانگ لگا کر کھڑا ہو گیا۔

''اب تم کہاں چلیں؟'' توصیف نے بہن کو کھڑے ہوتے دیکھا تو بوکھلاتے ہوئے بولا۔

''زردہ لانے۔'' مسکرا کر کہتے اس نے بھائی کے سر پر پیار سے چپت لگائی۔ زردہ واقعی بہت مزیدار تھا، ثمن، توصیف اور شارق نے خوب مزے لے، لے کر کھایا۔

''ویسے ایک بات تو ماننے والی ہے۔'' ثمن جھوٹی پلیٹیں سمیٹتے ہوئے بولی۔

توصیف نے سوالیہ نظروں سے بہن کو دیکھا۔

''رعنا کے ہاتھ میں ذائقہ بہت ہے جو چیز بناتی ہے کمال کی خوش رنگ اور خوش ذائقہ ہوتی ہے۔'' ثمن نے چور نظروں سے ماں کی طرف دیکھتے آواز نیچی رکھتے ہوئے کھلے دل سے بھاوج کی تعریف کی۔ جس کے جواب میں توصیف کا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا۔

''اگر جو میں بھی یہ کہنے کی جسارت کرلوں ناں اماں حضور کے سامنے تو ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اماں جان گھر سے نکال دیں مجھے۔'' توصیف ہنستے ہوئے بولا۔

''وہ بھی مع اہل وعیال۔'' ثمن نے بھی ہنستے ہوئے ٹکڑا لگایا۔ برتن سمیٹ کر کچن میں رکھنے اور ڈائننگ ٹیبل صاف کرنے کے بعد ثمن، توصیف کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

''اٹھو، جا کر رعنا کو منا کر لاؤ، میں امی کو لے کر آتی ہوں۔ پھر چائے بناؤں گی سب مل کر پئیں گے۔''

''ہرگز نہیں.....'' توصیف دائیں بائیں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اگر آج قسمت سے ہم دونوں بہن بھائی کو تنہائی میں ایک دوسرے سے دکھ سکھ کہنے کا موقع مل ہی گیا ہے تو ہم اسے بالکل بھی ضائع نہیں [illegible] ہیں گے۔ [illegible] رہنے دو، دونوں خواتین کو کمروں میں تم اپنے [illegible] بنا [illegible] تب تک میں اپنے شہزادے کو کہانی سناتا ہوں۔'' دونوں بازو کھول کر شارق کو گود میں بھرتے توصیف کہتا ہوا ڈائننگ روم کے دوسرے کنارے پر موجود صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔

''اوکے.....'' ثمن سر ہلاتے ہوئے کچن کی سمت بڑھی۔

چائے بننے کے دوران اس نے جلدی، جلدی برتن بھی دھو ڈالے۔ چائے سے بھرے کپ ٹرے میں رکھے جب وہ واپس آئی تو شارق، توصیف کی گود میں سر رکھے سو رہا تھا جبکہ توصیف خود بھی بیٹھے، بیٹھے اونگھ رہا تھا۔

''چائے آگئی، بھائی صاحب۔'' ثمن ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔ توصیف سیدھا ہو بیٹھا۔

ثمن نے شارق کو کاؤچ پر لٹا کر اس کے اوپر چادر ڈال دی۔ وہ تھوڑی دیر کسمسانے کے بعد کروٹ لے کر سو گیا۔ وہ بھائی کے سامنے دھرے سنگل صوفے پر پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔

''جی! تو بھائی صاحب شروع ہو جائیں۔ کون سے دکھ سکھ کرنے ہیں آپ کو۔'' ثمن چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔

''ہوں.....'' توصیف نے کچھ سوچ کر ہنکارا بھرا۔ ''سوچ رہا ہوں، کہاں سے شروع کروں.....''

''ایسا کرو، اپنی پیدائش سے شروع کرو۔'' ثمن نے اس کی مشکل آسان کی۔

''اچھا.....تو تم چاہتی ہو کہ میں بھی ناراض ہو کر کسی کمرے میں بند ہو جاؤں تاکہ تمہیں میری باتیں نہ سننی پڑیں۔'' توصیف نے بہن کو گھور کر دیکھا۔

''مجھے معلوم ہے، تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' اس نے مسکرا کر بھائی کو دیکھا۔

''کیونکہ تم جانتی ہو کہ میں تم سے ناراض نہیں ہو سکتا۔''

''نہیں.....'' ثمن نے گردن نفی میں ہلائی۔

''کیونکہ میں جانتی ہوں کہ گھر میں مزید کوئی کمرا نہیں ہے جہاں تم جا کر پڑاؤ ڈالو۔'' اس بات پر دونوں بہن، بھائی ہنسنے لگے۔ پھر توصیف نے سنجیدہ ہو کر بات شروع کی۔

''یار، کتنا اچھا دور تھا ناں جب میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ گھر میں صرف میں اور امی ہوتے تھے۔''

''تمہیں رعنا سے مسئلہ ہے۔'' ثمن نے چونک کر بھائی کی شکل دیکھی۔

''مجھے نہیں، امی کو رعنا سے مسئلہ ہے۔'' وہ چائے کی خالی پیالی ٹرے میں رکھتے ہوئے بولا۔

''تم یونہی معمولی سی بات کو سر پر سوار کر رہے ہو۔ شام تک دیکھنا دونوں ساس بہو بالکل نارمل ہو جائیں گی۔ اور ایسی چھوٹی موٹی باتیں تو ہر گھر میں چلتی ہیں۔ اس میں پریشانی والی کون سی بات

ہے۔'' ثمن نے ناسمجھی سے بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بات اصل میں یہ ہے محترمہ کہ آپ کی شادی کو ہو چکے ہیں چھ سال اور ان چھ برسوں میں آپ چھ مرتبہ بھی میکے رہنے کے لیے نہیں آئیں۔ بھاگتی دوڑتی آتی ہیں، ساتھ میں یہ باجا لگا ہوا ہوتا ہے۔'' اس نے آنکھ سے کاؤچ پر سوئے شارق کی طرف اشارہ کیا۔

''جو وقفے، وقفے سے بجتا رہتا ہے۔ اسی بھاگ دوڑ میں آپ کے میاں صاحب آپ کو واپس لینے آجاتے ہیں اور آپ کھانا کھا کر اپنا سامان سمیٹ کر یہ جا وہ جا..... آپ کو اپنے میکے میں پیدا ہونے والے مسائل کا ادراک ہی نہیں ہو پاتا۔''

''تو بھائی صاحب! آپ کی شادی کو تو ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا۔ آپ آخر ایسے کون سے مسائل کا شکار ہو گئے ہیں جنہوں نے آپ کی راتوں کی نیندیں اڑا دی ہیں۔'' ثمن نے توجہ سے بھائی کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

جواباً توصیف نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''ثمن! تم اس بات کی گواہ ہو ناں کہ میں کس شدت سے آصفہ پھپھو کی نرما سے شادی کا خواہش مند تھا۔'' سوالیہ نظریں بہن کے چہرے پر جماتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''ہاں..... مگر اس وقت آصفہ پھپھو اور نرما کا یہاں کیا ذکر؟'' ثمن نے حیرت سے بھائی کو دیکھا۔

''امی کے تعلقات دادی سے کبھی اچھے نہیں رہے جس کی وجہ سے اُن کی پھپھو سے بھی کبھی نہیں بنی۔ نرما کو بیاہ کر لانے کا مطلب تھا کہ یہ چخ، چخ مستقل زندگی کا حصہ بن جائے گی۔''

ثمن بغیر ٹوکے اسے بولنے کا موقع دیتی رہی۔

''امی نرما کو بہو بنانے کے لیے تیار نہیں تھیں سو میں نے زور زبردستی سے اپنی بات منوانے کے بجائے امی کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ پھپھو نے نرما کو اپنی سسرال میں بیاہ دیا اور میں نے اپنی شادی کے معاملات کلی طور پر امی کے سپرد کر دیے۔ رعنا مکمل طور پر امی کی پسند تھی۔ میں نے ماں کی رضا جان کر پوری خوشدلی کے ساتھ اسے اپنی زندگی میں شامل کیا۔''

''بالکل ٹھیک .....'' ثمن نے سر ہلا کر اس کی بات کی تائید کی۔

''رعنا ایک بہترین بیوی اور بہو ہے۔'' توصیف اپنی بات پر زور دے کر بولا۔

''نہ صرف بہترین بیوی اور بہو بلکہ ایک بہت اچھی بھابی بھی ہے۔ میرے آنے پر جس طرح وہ خوشی کا اظہار کرتی ہے مجھے فون کر کے بلاتی ہے، اچھے طریقے سے مہمان نوازی کرتی ہے۔ میں تو دل سے اس کی قدر دان ہوں۔'' ثمن نے دل سے بھاوج کی تعریف کی کہ وہ واقعی اس سے بہت خوش تھی۔

''شادی کے پہلے دو ماہ تو خیریت سے گزرے۔ میں، امی اور رعنا تینوں ہی اپنی، اپنی جگہ بہت خوش تھے۔ اس کے بعد امی کے رویے میں عجیب و غریب سی تبدیلی آنا شروع ہوئی۔'' توصیف رنجیدگی سے بولا۔

''میں رعنا کے ہاتھ کی پکی کسی چیز کی تعریف کرتا تو امی فوراً ہی کوئی ایسا جملہ بول دیتیں جو مجھے ناگوار گزرتا ہی تھا پر رعنا کا موڈ زیادہ خراب کر دیتا تھا۔ شروع، شروع میں ہم دونوں ہی نے نظر انداز کیا لیکن بات یہاں رکی نہیں، بڑھتی گئی۔ ہم نے کہیں جانا ہوتا تو امی کا موڈ خراب ہو جاتا..... خاص طور پر رعنا کے میکے، امی کو ساتھ چلنے کا کہتے تو وہ بھی ان کو منظور نہیں تھا۔ اب حالات یہ ہیں کہ گھر میں داخل ہوتا ہوں تو امی رعنا کی شکایات کا ایک انبار لیے بیٹھی ہوتی ہیں، ان کی خواہش ہوتی ہے کہ میں فوراً سے بیوی کو بلا کر اس سے باز پرس کروں۔ شروع، شروع میں رعنا، امی کے اس رویے پر کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ پر اب وہ اپنی ناگواری چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ پھر کہنا شروع ہوا۔ ''ہفتے کے پانچ دن ساس بہو ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کر رہی ہوتیں اس سب کے لیے تو میں اپنی محبت سے دستبردار نہیں ہوا تھا ناں..... ! یہ جو فرمانبرداری کا لیبل

میں نے اپنے ماتھے پر سجایا تھا۔ اس لیے تو نہیں تھا کہ سارے دن کی محنت مشقت کے بعد جب میں گھر آؤں تو ایک مستقل تناؤ اور بیزاری کی کیفیت میرا راستہ تک رہی ہو۔'' بولتے، بولتے وہ ہانپ سا گیا۔

ثمن، بھائی کی باتیں سن کر پریشان ہوگئی۔ وہ خود بھرے پُرے سسرال میں رہتی تھی کبھی دو ہفتے اور کبھی ایک ماہ بعد میکے کا چکر لگتا تھا۔ وہ بھی ایسے کہ صبح عدیم آفس جاتے ہوئے اسے چھوڑ جاتے اور واپسی میں پک کرنے آتے تو دونوں میاں بیوی ڈنر کرکے واپس ہوتے۔

شارق نے جب سے اسکول جانا شروع کیا تھا تب سے تو رہنے کے لیے آنا اور بھی مشکل ہوگیا تھا۔ آخری مرتبہ وہ دس ماہ پہلے بھائی کی شادی میں ہی آئی تھی میکے رکنے کے لیے۔

توصیف کی شادی کے بعد سے تو وہ خاصی خوش اور مطمئن تھی کہ اس کی ماں کی تنہائی بانٹنے والی آگئی ہے پھر رعنا تھی بھی بہت خوش مزاج اور خوش اخلاق لڑکی۔ سوا سے کبھی محسوس ہی نہیں ہوا کہ یہاں کسی قسم کی کوئی ٹینشن چل رہی ہے۔

''دیکھو ثمن! میں اگر ایک فرمانبردار بیٹا ہوں تو اس کے ساتھ، ساتھ ایک ذمّے دار شوہر بھی ہوں..... میں اگر یہ برداشت نہیں کروں گا کہ میری بیوی میری ماں سے بدتمیزی کرے تو اپنی ماں کو بھی بیوی کے ساتھ زیادتی کی اجازت نہیں دوں گا۔''

''سنگل پیرنٹ اکثر عدم تحفظ کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے امی بھی تمہاری شادی کے بعد خود کو غیر محفوظ محسوس کررہی ہوں، ان کو یہ لگتا ہو کہ بیوی آجانے کے بعد بیٹا ہاتھوں سے نکل جائے گا سو وہ ایسے بی ہیو کررہی ہوں۔'' ثمن نے رسان سے بھائی کو سمجھایا۔

''تو پھر انہیں میری شادی نہیں کرنی چاہیے تھی.....''

توصیف کے دوٹوک انداز پر ثمن خاموش ہوگئی۔

''بہرحال، میں نے اس مسئلے کا حل سوچ لیا ہے۔''

''تم رعنا کو لے کر الگ ہوجاؤ گے؟'' بھائی کی بات پر ثمن نے چونک کر سر اٹھایا۔ کچھ سہمے ہوئے سے

برکھارت میں
سجے ستمبر 2020ء کے
شمارے کی جاودانیاں

اولین صفحات

برائی کا وجود ناقابلِ برداشت تھا اس کا خاتمہ ضروری تھا۔ قاتل کے پیچھے قاتل تھا۔ جرم اور طاقت کی سنسنی خیز داستان..... **امجد رئیس** کے قلم کا شاہکار

انا گیر

سنہری ریت کے سرابوں میں بھٹکتے خوابوں کے سوداگر کی دل فگار داستان..... **امجد جاوید**
کے زور آور قلم کا امتحان.....

الاؤ

مسیحاؤں کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل.....
زندہ انسانوں کے لیے دہکتے الاؤ کی صورت موت تیار کی جارہی تھی **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی**
کے قلم سے نیا سنسنی خیز سلسلہ

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

ایک نوجوان لڑکی کا لرزا خیز قتل..... جرم، سنسنی، دہشت اور پُراسراریت سے بھرپور کہانی.....

دوسرا رنگ

ہر جگہ طاقت کا قانون ہے..... اور انصاف، قانون کے سامنے بے بس ہے..... سرورق کی تیکھی کہانی

چٹنی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں...
شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

انداز میں اس نے بھائی سے پوچھا۔

''نہیں، امی کو چھوڑنے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتا ہوا بولا۔

پھر جو حل توصیف نے بتایا، اس نے تو ثمن کے پاؤں کے نیچے سے زمین ہی سرکا دی تھی۔

مسئلے کا کوئی ٹھوس اور پائدار حل اب اسی کو سوچنا تھا۔

☆☆☆

شارق کے سالانہ امتحان چونکہ حال ہی میں ختم ہوئے تھے سو نتیجہ آنے اور نئی کلاسیں شروع ہونے تک اس کے اسکول کی طرف سے کم سے کم ثمن کو بے فکری تھی۔ تیسری بیل پر عدیم نے کال ریسیو کر لی۔

''فرمایئے بیگم صاحبہ، چند گھنٹوں کی دوری بھی آپ سے برداشت نہیں ہو رہی، آفس سے نکل کر سیدھا آپ کے پاس ہی تو آنا ہے پھر یہ بے قراری چہ معنی.....'' شوخ سے لہجے میں کہتے اس نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

''بڑی خوش فہمی ہے جناب کو.....'' ثمن کی شوخ سی کھنکھناتی آواز عدیم کا موڈ خاصا خوشگوار کر گئی۔

''چلیں، خوش فہمی ہی سہی..... کہیے کیسے یاد کیا اس وقت.....'' عدیم نے پوری طرح متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ایک اجازت درکار تھی.....'' ثمن نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا۔

''کیسی اجازت.....؟'' عدیم کے کان کھڑے ہوئے۔

''وہ اصل میں۔ امی، توصیف، رعنا سب لوگ رکنے کے لیے اصرار کر رہے ہیں تو آپ سے پوچھے بنا ہامی بھرنا اچھا محسوس نہیں ہوا اس لیے کال کر لی۔'' ثمن مدعا بیان کر کے اب جواب کی منتظر تھی۔

''کتنے دن رکنا چاہ رہی ہیں آپ.....؟'' کچھ توقف کے بعد عدیم کی آواز سنائی دی۔

''یہی کوئی تین چار دن.....'' مدھم سے لہجے میں ثمن بولی۔ جانتی تھی کہ عدیم ایک رات بھی اس کے اور شارق کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پر کیا کرتی میکے کا مسئلہ سلجھانے کے لیے اس کا ٹھہرنا ناگزیر تھا۔

''بہت ہی ظالم ہو.....'' عدیم ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔ ''یہ نہیں سوچتیں، میں کیا کروں گا تم دونوں کے بغیر اتنے دن۔''

''آپ..... شادی سے پہلے کے دور کو یاد کیجیے گا۔'' ثمن ہنسی۔

''ٹھیک ہے جناب، رہ لیجیے آپ جتنے دن رہنا چاہیں، جب آنا ہو تو فون کر دیجیے گا۔ غلام حاضر ہو جائے گا۔'' عدیم نے کچھ ایسے درد بھرے لہجے میں کہا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ثمن کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''اچھا سنیں..... رات کے کھانے پر آ رہے ہیں ناں.....'' ثمن نے جلدی سے استفسار کیا مبادا وہ فون رکھ ہی دے۔

''ہرگز نہیں..... اکیلے واپس آنے کو دل نہیں کرے گا اور کہیں آپ کا پروگرام کینسل ہی نہ ہو جائے رکنے کا۔ لہٰذا اب اسی دن آؤں گا جب آپ نے واپس آنا ہوگا۔'' عدیم نے نہ آنے کی وجہ بیان کی پھر الوداعی کلمات کے بعد اس نے فون رکھ دیا۔

☆☆☆

اس کے بعد کے تین دن ثمن نے امی اور رعنا کے معمولات پر کڑی نگاہ رکھی۔ بظاہر شارق کے ساتھ مصروف رعنا کے ساتھ چھوٹے، چھوٹے کام کرواتے۔ امی کے ساتھ گپ شپ کرتے، توصیف کے ساتھ نوک جھوک کرتے وہ باریک بینی سے ایک، ایک چیز کا جائزہ لیتی رہی اور آخر کار وہ مسئلے کو اس کی جڑ سمیت پکڑنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

''کتنا، اچھا لگا ناں..... کتنا دل بہل گیا میرا تم دونوں کے آجانے سے۔'' وحیدہ بیگم شارق کو گود میں لیے بیٹی کو دیکھتے ہوئے اداسی سے بولیں کہ آج رات اس نے واپس چلے جانا تھا۔

''عدیم سے کہو ناں کہ مہینے، دو مہینے بعد دو چار دن کے لیے تمہیں رہنے بھیج دیا کرے۔'' انہوں نے پیار سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہت مشکل ہے امی..... ملنے آنے دیتے ہیں

یہی بڑی بات ہے۔'' ثمن ماں کا ہاتھ دباتے نرمی سے بولی۔'' اب بھی شارق کے اسکول سے چھٹیاں ہیں تو میں ٹھہر گئی ورنہ کہاں ممکن تھا۔''

''چلو، اللہ پاک تمہیں اپنے گھر میں آباد رکھے۔'' انہوں نے دل سے بیٹی کو دعا دی۔

''امی، آپ توصیف کی شادی کے بعد بہت بدل گئی ہیں، ہائپر پریشر اور شوگر جیسی بیماریاں بھی جان کو لگا لی ہیں۔'' ثمن نے بڑے سبھاؤ سے بات شروع کی۔

''تم سے توصیف نے کچھ کہا۔'' وہ ایک دم الرٹ ہو کر بولیں۔

''نہیں امی.....'' ثمن نے جلدی سے نفی میں گردن ہلائی۔

''تو پھر رعنا نے شکایت کی ہے کوئی.....؟'' انہوں نے لاؤنج کے پار بنے کچن کی جانب نگاہ کرتے ہوئے پوچھا جہاں رعنا ڈنر کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

''کسی نے کچھ نہیں کہا امی..... میں نے جو خود سے محسوس کیا ہے وہ بتا رہی ہوں۔ اب دیکھیے ناں توصیف کی شادی، میری شادی کے پانچ برس بعد ہوئی ہے، ان پانچ برسوں میں آپ نے کس بہترین طریقے سے گھر کا انتظام سنبھال رکھا تھا۔ ایک صفائی والی ماسی کے علاوہ تمام کام آپ اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں بلکہ میرے آنے پر بھی آپ کئی طرح کے کھانے میرے نہ، نہ کرنے کے باوجود خود اکیلی تیار کرتی تھیں۔''

''ہاں تو اور کیا..... تم سسرال کے ہزار جھمیلوں سے جان چھڑا کر تھوڑی سی دیر کو تو آتی تھیں، تو اب کیا تم سے کام کروانے لگتی.....'' وحیدہ بیگم اس وقت کو یاد کر کے تھوڑا سا مسکرائیں۔

''تو پھر اب کیا ہوا ہے امی.....؟'' ثمن نے سوالیہ نظریں ماں کے چہرے پر گاڑیں۔

''کیا ہوا ہے؟'' وہ ایک دم گھبرا کر بولیں۔'' کیا کوئی کمی محسوس ہوئی ہے تمہیں اپنی خاطر داری میں.....''

''نہیں، خیر خاطر داری اور مہمان نوازی تو پہلے سے زیادہ ہی ہو رہی ہے۔'' وہ اپنی بات پر زور دے کر بولی۔

''تو پھر.....؟'' وحیدہ بیگم نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

''آپ نے کام کاج سے کیوں ہاتھ کھینچ لیا ہے؟'' آخر دل کڑا کر کے ثمن نے وہ بات کر ہی دی جسے کرنے کے لیے وہ اتنی دیر سے تمہید باندھ رہی تھی۔

''کیا مطلب ہے اس بات کا.....؟'' وہ خاصا برا مان کر بولیں۔

''بہو کے آنے کے بعد بھی کام اگر مجھے ہی کرنا ہے تو پھر مجھے کیا فائدہ ہوا بیٹے کی شادی کا اور ویسے بھی ساری زندگی بہت کر لیا کام..... اب آرام کی عمر ہے میری اور تم اچھی بیٹی ہو جسے ماں کا آرام چبھ رہا ہے۔'' انہوں نے خفا ہو کر منہ دوسری طرف کر لیا۔

''امی پلیز..... میری اچھی امی..... پہلے میری پوری بات تو سن لیں۔'' اس نے ماں کا ہاتھ ہولے سے دباتے ہوئے کہا۔

''بولو.....'' ہنوز خفا، خفا سے لہجے میں انہوں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آرام کرنے کی عمر نہیں ہوتی امی..... آرام کرنے کا وقت ہوتا ہے، دن کے چند گھنٹے یا پھر رات کا وقت، اپنی عمر کا ایک حصہ آرام کے نام کر دینا یا فراغت کے لیے مختص کر دینا یہ تو خود اپنے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔''

''لو، بی بی..... یہ خوب کہی تم نے..... ساٹھ برس کی عمر میں تو حکومت بھی ریٹائر کر دیتی ہے بندے کو کہ بھلے لوگ بہت محنت کر لی تم نے اب گھر بیٹھ کر آرام سے پنشن کھاؤ۔''

''تو اگر یہ رواج ہمارے ملک میں رائج ہے بھی تو بالکل غلط ہے، ساٹھ برس کی عمر، کوئی اتنی بھی زیادہ عمر نہیں ہوتی کہ انسان کو ہر کام سے فارغ ہی سمجھ لیا جائے۔'' وہ ہولے، ہولے اپنا مافی الضمیر ماں کے سامنے بیان کر رہی تھی۔

''بھئی ثمن! سچی بات ہے مجھے تمہاری باتیں سمجھ نہیں آ رہی ہیں..... تم جو بھی کہنا چاہتی ہو۔ آسان الفاظ میں بتاؤ۔'' وہ کچھ جھنجلاتے ہوئے بولیں۔

''میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ ساٹھ برس کی عمر میں ریٹائرمنٹ کا تصور ہمارے ہاں مغرب سے آیا ہے۔ ورنہ ہمارے مذہب میں تو زندگی کی آخری سانس تک کام کرنے کی مثالیں موجود ہیں۔ ہمارے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰؐ کی مثال لے لیجیے۔ انہوںؐ .... نے تریسٹھ برس کی عمر پائی.....اور اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک وہ اس کام کو سرانجام دینے کے لیے سرگرم عمل رہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے ذمے لگایا تھا۔'' اب امی غور سے سن رہی تھیں۔

''بالکل اسی طرح ہمارے صحابہ کرامؓ، خلفائے راشدینؓ، امہات المومنینؓ سب اپنی، اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک اپنے معمولات زندگی سرانجام دیتے رہے۔ ہمارے انبیاء کرام علیہ السلام کی مثال لے لیجیے۔ حضرت نوحؑ نے قریباً ساڑھے نو سو برس کی عمر پائی۔ کیا ہم نے کبھی سنا کہ زندگی کے کسی مقام یا عمر کے کسی حصے میں انہوں نے کہا ہو کہ اب سے میرے آرام کا وقت یا عمر شروع ہوگئی ہے۔ نہیں ناں.....'' اس نے ماں کی آنکھوں میں جھانکا جو گم صم اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

''بھیا! ساری زندگی انسان محنت کرتا ہے اولاد کی خاطر مشقت جھیلتا ہے اسی لیے ناں تاکہ بڑھاپا آرام وسکون سے گزارے۔'' اب کے وہ بولیں تو آواز خاصی پست تھی۔

''اور یہی سوچ اور نظریہ ہمارے معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ آپ خود سوچیے ساٹھ برس تک چاق وچوبند رہنے والا انسان جونہی فراغت کے نرغے میں آتا ہے یا آپ کے الفاظ میں ہم یوں کہہ لیتے ہیں آرام کی عمر کو پہنچتا ہے تو سال دو سال کے اندر ایسی، ایسی بیماریاں خود سے چمٹا لیتا ہے جو ساری زندگی کبھی اس کے قریب بھی نہیں پھٹکی ہوتیں۔'' وہ ماں کو زندگی کا وہ پہلو دکھا رہی تھی جو اب تک اُن کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

''تم یہ سب اس لیے کہہ رہی ہو... کیونکہ تم جوان ہو، صحت منداور تندرست ہو۔ میری عمر میں جب تم وہ سب کچھ نہیں کر پاؤ گی جو آج کر لیتی ہو تو تمہارے نظریات از خود تبدیل ہو جائیں گے۔'' وحیدہ بیگم تھکے، تھکے سے لہجے میں گویا ہوئیں۔

''آپ کی عمر میں اگر میں وہ سب کچھ نہ بھی کر پائی جو آج کر لیتی ہوں تو وہ سب کچھ ضرور کروں گی جس کی میری صحت اجازت دے گی اور جس کی ہمت میں اپنے اندر پاؤں گی۔'' ایک عزم سے کہتے ہوئے اس نے بحث سمیٹ لی۔ وحیدہ بیگم بغیر ایک لفظ بولے، محض پُرسوچ نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

ثمن کی نند کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے۔ وہ سسرال میں ایسی مصروف ہوئی کہ دو ماہ تو میکے چکر لگانے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ بس فون پر ہی سرسری سا حال احوال جاننے کا وقت بھی وہ بمشکل نکال پاتی۔ آخر اللہ، اللہ کر کے فرصت ملی تو ندیم کی از حد مصروفیات کے سبب توصیف کو بلا بھیجا۔

''جی جناب! تو کیا کھائیں گی آپ؟'' گاڑی کو گھر کی طرف موڑتے توصیف نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھی بہن کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''بھئی وہی کھاؤں گی جو تمہاری بیگم نے بنایا ہوگا۔'' ثمن نے حیران ہو کر بھائی کو جواب دیا۔

''ماموں! میں آئس کریم کھاؤں گا۔'' شارق پیچھے سے توصیف کے گلے میں بازو حمائل کرتے ہوئے بولا۔

''او کے.....تو پہلے ہم کھانا کھائیں گے اس کے بعد آئس کریم۔'' توصیفؔ نے خوشگوار لہجے میں کہتے گاڑی کا رخ ایک مہنگے ریسٹورنٹ کی جانب موڑا۔

''یہ کس خوشی میں بھئی.....؟'' ثمن نے آنکھیں نکالیں۔

''میرے گھر کا ماحول خوشگوار بنانے کے لیے اس کو ایک چھوٹا سا ٹوکن سمجھ لو شکریے کا۔'' توصیف نے گاڑی پارک کر کے ثمن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم نے امی پر جانے کیا اسم پڑھ کر پھونکا کہ

تمہارے جانے کے بعد وہ اچھی خاصی متحرک ہوگئیں۔ مزاج بھی روز بروز بہتر ہوتا گیا۔ اور اب تو راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔'' دونوں بہن، بھائی بات کرتے نسبتاً ایک کارنر پر دھری ٹیبل پر آکر بیٹھ گئے۔ شارق، توصیف کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''بھئی، مجھے تو تمہارے فیصلے نے پریشان کردیا تھا کہ میں ٹی وی لاؤنج کے درمیان میں پارٹیشن کرکے گھر کے دو پورشن کردوں گا۔ آدھا وقت امی کے پاس گزاروں گا... آدھا بیگم کے۔'' ثمن مینیو کارڈ پر نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔

توصیف ہنسنے لگا۔

''یقیناً میں ایسا ہی کرتا اگر تم امی کو سمجھا بجھا کر نہ جاتیں شکر ہے امی کو تمہاری یہ بات سمجھ آگئی کہ وہ انجانے میں رعنا کے ساتھ بہت زیادتی کررہی ہیں اور انہوں نے بھی تمہاری بات مان کر رعنا کے ساتھ اپنا رویہ خاصا بہتر کرلیا ہے۔''

ویٹر کے آنے پر انہوں نے آرڈر نوٹ کروایا اور پھر ثمن گویا ہوئی۔

''لیکن میں نے تو امی کو رعنا کے متعلق کچھ نہیں کہا نہ ہی انہیں یہ احساس دلایا کہ وہ بہو کے ساتھ زیادتی کی مرتکب ہورہی ہیں۔''

توصیف نے حیرت سے بہن کی شکل دیکھی.....

''تو پھر امی کے رویے میں درآنے والی یہ مثبت تبدیلیاں.....'' اس کے جملہ مکمل کرنے سے قبل ہی ثمن نے اس کی بات کاٹی۔

''اصل میں، میں نے مسئلے کی جڑ پکڑ لی تھی۔''

''کیا مطلب.....؟'' توصیف نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

''مطلب یہ کہ میں نے تین چار دن امی اور رعنا کی روٹین کا بغور جائزہ لیا تو مجھے پتا چلا کہ امی کو ناشتے سے لے کر دوپہر اور رات کے کھانے تک ہر چیز بستر پر مہیا ہے۔ وہ صبح سویرے نماز، قرآن کے بعد سیرت کی کتابوں کا مطالعہ کرتی ہیں اس کے بعد ٹی وی پر دو، دو گھنٹے اپنے پسندیدہ اسلامی ٹاک شوز دیکھتی ہیں۔ درمیان میں نمازوں کے اوقات میں نماز اور تفسیر قرآن اور اللہ، اللہ خیر صلہ دن تمام ہوا۔ عملاً گھر کے کسی کام میں وہ حصہ نہیں لے رہیں یہاں تک کہ صبح کی چائے کے لیے بھی وہ رعنا کی منتظر ہوتی ہیں۔'' وہ سانس لینے کو چند لمحے رکی تو توصیف گویا ہوا۔

''حالانکہ یہی امی تھیں جو پچھلے سال تک میرا، اپنا بلکہ گھر کا سارا کام بھی کتنی پھرتی سے سرانجام دیتی تھیں۔'' توصیف سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''بالکل یہی بات.....'' ثمن نے چٹکی بجائی۔

''یہی بات میں نے امی کو یاد دلائی بلکہ سمجھائی کہ اگر ہمیں حضور پاک کی سنت پر عمل پیرا ہونا ہے تو خالی تفسیر کے مطالعے سے کام نہیں چلے گا بلکہ جب تک دم ہے اپنے ہاتھوں پیروں کو چلتا رکھنا ہوگا۔ اصل میں مسئلہ ہی تب شروع ہوتا ہے جب انسان فارغ بیٹھتا ہے اسے جب خود سے کچھ کرنا نہیں پڑتا تو دوسرے کے کام میں کیڑے بھی زیادہ ہی نظر آتے ہیں۔ مصروف بندے کے پاس دوسرے کے کام میں کیڑے نکالنے کا وقت نہیں ہوتا۔''

''اور شکر ہے یہ بات ہماری والدہ کو سمجھ آگئی۔ انہوں نے کچن کا کنٹرول باضابطہ طور پر اپنے ہاتھ میں واپس لے لیا ہے۔'' توصیف نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''شکر.....الحمد للہ.....'' ثمن نے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرتے ہوئے کہا۔

''ویسے ایک بات ہے۔'' توصیف میز پر آگے کو جھکتے ہوئے بولا۔ ''اگر یہ تمام باتیں رعنا، اماں حضور کو سمجھانے کی کوشش کرتی ناں تو.....'' جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے ثمن کی شکل دیکھی۔

''تو.....پھر.....؟''

''خانہ جنگی.....'' ثمن نے بھی آہستہ سے جواب دیا اس کے بعد دونوں بہن، بھائیوں کا ایک مشترکہ قہقہہ ریسٹورنٹ کی فضا میں گونجا تھا۔

❁❁❁

مکمل ناول

پریوں کا دیس

مدیحہ شاہد

دوسرا حصہ

صبح اُن کی آنکھ دیر سے کھلی۔ وہ فریش ہو کر باہر آئیں تو لاؤنج میں نانی کے ساتھ ارما کی امی اور شبو خالہ بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ارما فوراً گھر والوں کے تحفے لاؤنج میں لے آئی۔

''السلام علیکم.....!'' اُس نے اندر آ کر خوش دلی سے سلام کیا پھر سینٹر ٹیبل پر سب چیزیں رکھنے لگی۔

''وعلیکم السلام..... شکر ہے کہ تم دونوں خیریت سے پہنچ گئیں، ورنہ میں تو پریشان ہی ہو گئی تھی۔'' نانی

نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے خوشگوار انداز میں کہا۔ ان کا تعلق بنگال سے تھا، برسوں پہلے وہ ڈھاکا سے بیاہ کر کراچی آئی تھیں مگر بعد میں نانا، نانی کراچی سے لاہور شفٹ ہوگئے تھے۔ وہ اب بھی ساڑی ہی پہنتی تھیں۔ ارما نے اپنے بچپن میں بنگلہ دیش سے جڑی بے شمار کہانیاں سن رکھی تھیں۔ ڈھاکا اور چٹاگانگ کے باغات، وہاں کے پھلوں کا ذائقہ، پٹ سن کے سنہرے کھیت، کاٹن کی ساڑیاں، ربڑ کی جوتیاں، دریاؤں کی مچھلیاں، پانی کے راستے جہاں نہروں اور جھیلوں میں کشتیاں چلتی تھیں۔ ارما ان کہانیوں کو سنتے ہوئے بڑی ہوئی تھی۔

نانی اب بھی نیلے رنگ کی کاٹن کی ساڑی پہنے ہوئے تھیں اور سفید بالوں کا جوڑا بنایا ہوا تھا۔

''امی کیسی ہیں آپ، آپ نے تو یوں اچانک آکر مجھے سرپرائز دے دیا۔'' ارما اپنی ماں سے گلے ملتے ہوئے بولی پھر اس نے ساتھ کھڑی عائلہ کا تعارف کروایا۔

''یہ میری فرینڈ عائلہ ہے، آسٹریلیا سے آئی ہے، اس کے ساتھ ہی میں ناردرن ایریا زگئی تھی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ارما کی امی کا چہرہ سنجیدہ تھا، ان کے انداز میں کسی قسم کی گرم جوشی نہیں تھی۔ انہوں نے ابرو اچکا کر عائلہ کی طرف ایک نظر دیکھا۔

''تمہارے ابا نے رات کو بتایا تھا، کہہ رہے تھے کہ انہیں تم نے اور تمہاری سہیلی نے سلام تک نہیں کیا۔'' انہوں نے خشک انداز میں شکوہ کیا۔

عائلہ شرمندہ ہوگئی۔ ارما نے وضاحت دینے کی کوشش کی۔

''ابا نے ہمیں سلام دعا کرنے کا موقع ہی کہاں دیا۔ گیٹ کھولنے سے پہلے ہی بولنا شروع ہوگئے، عائلہ تو انہیں دیکھ کر اتنا ڈر گئی کہ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔'' ارما سنجیدگی سے بولی۔

''اب وہ ایسے بھی خوفناک نہیں ہیں، تمہارے بھلے کے لیے ہی کہہ رہے تھے۔ تمہارے انتظار میں وہ ساری رات جاگتے رہے، سوئے ہی نہیں کہ ارما آئے گی تو گیٹ کون کھولے گا۔'' ارما کی امی نے خفا آواز اور ناراض انداز میں کہا۔ انہیں یوں لگا... کہ ارما نے اپنے ابا کا مذاق اڑایا ہے۔ ارما کو اس کہانی پر ذرا یقین نہ آیا۔

''ہم لوگ بہت تھکے ہوئے تھے، لمبے سفر سے آئے تھے اور راستے میں بارش اور طوفان کی وجہ سے بدترین لینڈ سلائڈنگ میں پھنس گئے تھے۔ بڑی مشکل سے گھر پہنچے، بجائے ہمارا حال چال پوچھنے کے ابا تو ہمیں ڈانٹنے ڈپٹنے اور باتیں سنانے لگے۔'' ارما نے گہری سانس لے کر سنجیدہ انداز میں کہا۔ عائلہ ساکت، صامت اور حیرت زدہ انداز میں کھڑی اس مباحثے کو سن رہی تھی۔

''تو صحیح ہی تو کہہ رہے تھے وہ..... اماں نے تمہیں بہت آزادی دے رکھی ہے مگر تمہیں سمجھانا بھی تو ہمارا فرض ہے، حالات دیکھے ہیں آج کل کے؟ جوان جہان لڑکیاں اکیلی پہاڑوں پر گھومنے پھرنے چلی گئیں۔ یہ سارے انگریزوں کے شوق ہیں..... یہ ٹریولنگ، ٹورز، دنیا کو دریافت کرنے کا تجسس، کوہ پیمائی کا جنون، ہائیکنگ کے نام پر پہاڑوں پر چڑھنا اور جنگلوں میں خوار ہونا..... مگر مشرقی لڑکیوں کو یہ سب زیب نہیں دیتا، یہ سارا قصور اس سوشل میڈیا کا ہے جو نوجوان نسل کو خراب کر رہا ہے اور انہیں اپنے ماحول سے باغی بنا رہا ہے۔'' انہوں نے سخت انداز اور درشت آواز میں کہا۔ یہ نصیحت کرنے کا وہ انداز تھا جس سے ہر سننے والے کو بے اختیار نفرت ہو جاتی ہے۔

ارما نے افسوس سے انہیں دیکھا۔

''یہ تو آپ نے بہت عجیب بات کہی ہے امی..... کیا مشرقی لڑکیوں کو ٹریولنگ، گھومنے پھرنے اور ایڈونچر کرنے کا شوق نہیں ہو سکتا؟ کیا انہیں ٹریکنگ اور ہائیکنگ میں دلچسپی نہیں ہو سکتی؟ کیا وہ پہاڑوں سے محبت نہیں کر سکتیں؟ کیا یہ شوق صرف انگریزوں کو ہی جچتے ہیں؟ کیا ہمارے ہاں لڑکیوں کے دل میں ایسے

ارمان نہیں ہو سکتے؟ لڑکے نشہ کریں گے، سگریٹ پئیں گے، موٹر سائیکل پر ریس لگائیں گے، انہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا، لڑکیاں ایک جھیل دیکھنے پہاڑوں پر چلی جائیں گی تو غضب ہو جائے گا۔'' وہ طنزیہ ہنسی۔

''امی روایتوں کے کشکول میں قربانیوں کا تقاضا کرنا اب ہمیں بند کر دینا چاہیے، آپ لوگ مشرقی لڑکیوں سے کیا چاہتے ہیں کہ وہ سارا دن کچن میں کھانے پکاتی رہیں..... برتن مانجھتی رہیں اور ایک کمرے میں بیٹھ کر اپنی جوانی کے قیمتی سال برباد کر دیں پھر بھی انہیں کسی تمغے سے نوازا نہیں جاتا۔ مشرقی لڑکی کے بارے میں ہم لوگ اپنے اس تصور کو بدلنا ہی نہیں چاہتے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ یہاں لوگ دوسروں کو آزادی سے جینے کیوں نہیں دیتے۔ جب لڑکیاں چاند پر جا سکتی ہیں تو جھیل سیف الملوک تک کیوں نہیں جا سکتیں۔'' ارمانے سنجیدگی اور قدرے خفگی سے کہا۔

عائلہ حق دق اس کی شکل دیکھتی رہی، ارما کی امی اس کی باتیں سن کر بھڑک اٹھیں۔

''اماں، دیکھ رہی ہیں آپ؟ یہ سب آپ ہی کی ڈھیل کا نتیجہ ہے، یہ خیالات، یہ باتیں توبہ، توبہ کمال بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے کہ اگر ہم نے بروقت ارما کی شادی نہ کی تو یہ لڑکی ہمارے لیے بڑے مسائل کھڑے کرے گی تعلیم مکمل کر لی، نوکری کا شوق بھی پورا کر لیا، اب گھر بسانے کی تیاری کرو، ہم تمہاری شادی کی فکر میں ہلکان ہو رہے ہیں، تمہارے لیے رشتے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں مگر تمہیں تو کسی کی پروا ہی نہیں ہے۔ اماں.....! آپ نے کس انداز میں اس کی تربیت کی ہے کہ یہ تو کسی کی بات کو اہمیت ہی نہیں دیتی۔ اسے سمجھانے بیٹھو تو اس کے پاس ہر سوال کا جواب تیار ہوتا ہے۔'' انہوں نے غصے کے عالم میں کبھی اسے کبھی اماں کو مخاطب کر کے کہا۔

عائلہ کو اس ماحول میں اپنا آپ احمق لگ رہا تھا۔ وہ ہونقوں کی طرح سب کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ ماحول اس حد تک خوفناک ہو گیا کہ نانی کو دخل اندازی کرنی پڑی۔

''اچھا چھوڑو اس بحث کو..... مہمان بچی بھی پریشان ہو رہی ہے، یہ موقع ان باتوں کا نہیں ہے۔ اس موضوع پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ ارما تم یہ چیزیں دکھاؤ، دیکھیں تو سہی کہ پہاڑی علاقوں سے کیا کچھ لے کر آئی ہو۔'' انہوں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ان کی آواز کے رعب کو سب لوگ اچھی طرح سمجھتے تھے۔

ان کی بات پر ارما گہری سانس لے کر چیزیں کھولنے لگی۔ عائلہ اس کے ساتھ چپک کر بیٹھ گئی۔

ارما نے دھاگے اور شیشوں کے کام والی سبز رنگ کی چادر نانی کی طرف بڑھائی۔

''نانی! یہ دیکھیں..... میں آپ کے لیے کیا لائی ہوں، کڑھائی والی شال..... اور یہ جیولری رکھنے کے لیے لکڑی کا جیولری بکس بھی ہے، اخروٹ کی لکڑی کا بنا ہوا ہے۔'' وہ انہیں چیزیں دکھانے لگی۔

''ارے واہ..... یہ تو بہت خوب صورت ہے، بنگال میں مہوگنی درخت کی لکڑی سے بنے ایسے ہی ڈبے ملتے تھے، ہماری اماں اس ڈبے میں نکے جمع کر کے رکھتی تھیں۔'' وہ لکڑی کا منقش ڈبا کھول کر دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔ ارما نے ایک لفافہ شبو خالہ کی طرف بڑھایا۔

''شبو خالہ! آپ نے بادام لے کر آنے کے لیے کہا تھا، یہ چترال کے بادام ہیں، اپنے ذائقے اور بہترین کوالٹی کی وجہ سے مشہور ہیں۔'' اس نے باداموں کا لفافہ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''چلو اچھی بات ہے کہ تمہیں یاد رہا۔'' انہوں نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

عائلہ حیران ہوئی کہ یہ شکر یہ ادا کرنے کا کون سا طریقہ تھا مگر ارما کے لیے شاید ان کا یہ انداز نیا نہیں تھا، اس نے ایک شاپر میں سے ایک چھوٹا سا لفافہ نکالا۔

''نانی! ناران میں ہم قیمتی پتھروں کی اک دکان پر بھی گئے تھے، میں آپ کے لیے یہ اسٹونز بھی لے کر

آئی ہوں، بالکل اصلی ہیں، آپ ان کی رنگز اور ٹاپس بھی بنواسکتی ہیں۔'' اس نے چھوٹے سے لفافے میں سے سبز، نیلے اور سنہرے رنگ کے قیمتی چمکتے ہوئے پتھر نکال کر نانی کو دیے۔ نانی مسکرائیں۔

''یہ تو بہت خوب صورت ہیں..... میں آج ہی جیولر کو فون کروں گی۔ وہ آکر دیکھ لے۔'' وہ بوڑھی ہتھیلیوں پر پتھروں کو رکھتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔ شبو خالہ کی نظر روشنی میں چمکتے پتھروں پر ٹھہر گئی۔

''اماں آپ کے پاس تو پہلے ہی اتنے زیورات ہیں، لاکر اور سیف بھرے پڑے ہیں، میں تو کہتی ہوں کہ وہ سارے زیور آپ اپنی مرضی اور خوشی سے سب اولادوں میں تقسیم کردیں، آخر کب تک وہ لاکر میں بند پڑے رہیں گے۔ آم کے باغات تو سویرا کے حصے میں آئے تھے، ہمارے حصے میں چند زیور ہی سہی۔'' شبو خالہ نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ایک لمحے کے لیے ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ ارما کی ماں نے بے اختیار پہلو بدلا۔

عائلہ نے حیرت سے سوچا کہ یہاں تو بہت سی باتیں الجھی ہوئی ہیں، نانی کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔

''ناشتا نہیں کیا تم لوگوں نے ابھی تک، جاؤ جا کر ناشتا کرلو..... میں نے سائرہ سے کہا تھا کہ ڈائننگ ٹیبل پر تم دونوں کے لیے ناشتا لگادے۔'' نانی نے ارما کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''جی نانی!'' ارما، عائلہ کا بازو تھامے وہاں سے اٹھ گئی۔ پھر وہ دونوں ڈائننگ روم میں آگئیں..... سائرہ میز پر ناشتا لگا رہی تھی۔

''چلو ناشتا کرتے ہیں، مجھے تو کیوائی آبشار کا ناشتا یاد آرہا ہے۔'' وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔ کڑوی کسیلی باتیں سننے کے باوجود بھی اس کے چہرے پر اِک بھرم رکھتی ہوئی مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔ جبکہ عائلہ بجھے ہوئے انداز میں ناشتا کرنے لگی۔ ارما نے عائلہ کے لیے چائے بنائی پھر اس نے غور سے عائلہ کے چہرے کو دیکھا۔

''عائلہ! ان لوگوں کی باتوں کی وجہ سے پریشان نہ ہونا، انہیں تو ہر چیز میں اعتراض کرنے کی عادت ہے، اتنے سال گزر گئے مگر ان کے گلے شکوے ختم نہ ہوئے۔ کچھ دنوں بعد جب یہ لوگ واپس چلے جائیں گے تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' اس نے عائلہ کی چائے میں چینی ملاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

''شاید تمہارے والدین اور تمہاری خالہ کو میرا یہاں آنا برا لگا ہے۔'' عائلہ نے پھیکے سے انداز میں کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے عائلہ، ویسے بھی یہ گھر میری نانی کا ہے، انہی کے نام ہے اور تم ابھی میری نانی کو نہیں جانتی ہو، وہ سب کچھ ٹھیک کردیں گی، وہ ان خاندانی سیاستوں کو خوب سمجھتی ہیں، میرے نانا نے یہ گھر اور جائداد کا بیشتر حصہ نانی کے نام کردیا تھا۔ امی اور خالہ کی شادی اتنے دولت مند گھرانوں میں نہیں ہوئی اسی لیے سب کی نظریں نانی کی دولت اور جائداد پر لگی ہوئی ہیں ہر کسی کو یہی شکوہ ہے کہ فلاں کو اتنا کچھ مل گیا اور ہمیں کچھ نہیں ملا۔ تم اپ سیٹ نہ ہو، یہاں تو یہ روز کا معمول ہے۔'' اس نے عائلہ کی دلجوئی کرنے کی کوشش کی۔

''تمہارے نانا کافی امیر آدمی تھے؟'' عائلہ نے بے ساختہ کہا۔ دولت اور رشتوں کی کہانیاں ہمیشہ الجھی ہوئی ہوتی ہیں۔

''ہاں ان کا کنسٹرکشن کا بزنس تھا، وہ گھر اور پلازہ وغیرہ بناتے تھے، ان کی کافی جائداد تھی جو رفتہ رفتہ بک گئی۔ ماموں اپنے حصے کی جائداد بیچ کر دبئی چلے گئے اور وہیں سیٹل ہوگئے۔ امی اور خالہ نے بھی بہت پہلے اپنی پراپرٹی بیچ دی۔ اب ایک پلازہ میں نانی کی چند دکانیں ہیں جن کا کرایہ ہر ماہ آجاتا ہے اس پر بھی لوگوں کی نظریں لگی رہتی ہیں۔'' ارما نے سنجیدگی سے اسے بتایا۔

''میں تو ان لوگوں کی باتیں سن کر حیران ہی رہ گئی۔ تم نے کبھی اپنی فیملی کے بارے میں تفصیل سے بتایا ہی نہیں تھا۔ میں نے تو ہمیشہ اس گھر میں تمہیں اور نانی کو ہی دیکھا تھا۔ باقی لوگوں کے بارے میں صرف

سنا ہوا تھا۔'' عائلہ نے کہا۔

''تم پریشان نہ ہو، یہ لوگ یہاں مہمان ہیں، جلد ہی اپنے گھر واپس چلے جائیں گے۔ خیر تم بتاؤ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟'' اس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

عائلہ کو اس ماحول سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے چند لمحے کچھ سوچا پھر سر جھکائے کانٹے سے آملیٹ کاٹتے ہوئے کہنے لگی۔

''میری خالہ جو بہاول پور میں رہتی ہیں، میں نے ان کی طرف بھی جانا ہے۔ ممی نے انہیں سڈنی سے ہی فون کر دیا تھا کہ ان کے گھر آؤں گی۔''

ارما ناشتا کرتے ہوئے ٹھہر گئی۔

''بہاول پور..... نوابوں کا شہر میں بھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔ مجھے بھی بہاول پور دیکھنے کا بہت شوق ہے۔'' ارما نے بے ساختہ کہا۔ عائلہ اس کی خواہش کے پس منظر کو سمجھ چکی تھی۔

''ہاں چلو، میری خالہ تو بہت خوش ہوں گی، وہ تو مہمانوں کا انتظار کرتی رہتی ہیں، میں آج ہی انہیں فون کرتی ہوں مگر تمہارے والدین کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔'' عائلہ نے کہا مگر ارما نے اپنے ذہن میں پروگرام ترتیب دے دیا تھا۔

''میں نانی کو بتا دوں گی، وہ انہیں ہینڈل کر لیں گی مگر ہمیں کوئی نیا بہانہ بنانا پڑے گا۔'' وہ چائے کی پیالی میں چمچ چلاتے ہوئے کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''بہانہ؟'' عائلہ حیران ہوئی۔

''ہاں..... کہہ دیں گے کہ تمہارے کزن کی شادی ہے۔ سو ہمیں بہاول پور جانا ہے۔'' اس نے بہانہ بھی فوراً بنا لیا۔

''ہاں ٹھیک ہے..... یہ بہانہ مناسب بھی ہے۔ میں خالہ کو آج ہی فون کرتی ہوں۔'' اس نے ہامی بھر لی۔

''تو میں کل صبح کی ٹکٹ بک کروا لوں گی۔'' ارما نے اطمینان سے کہا۔

عائلہ حیران رہ گئی۔

''کل صبح.....؟ اتنی جلدی؟'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ہاں.....'' ارما نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

عائلہ کچھ بول نہ سکی۔ اسے احساس ہوا کہ ارما اس ماحول سے دور جانا چاہتی ہے اور وہ عائلہ کو بھی ان لوگوں کی موجودگی میں یہاں نہیں رکھنا چاہتی۔ عائلہ کو یہ صورتِ حال بہت عجیب لگ رہی تھی۔ وہ ارما کی زندگی کے صرف ایک رخ سے واقف تھی۔ اس کی زندگی کے اس دوسرے رخ کے بارے میں تو اسے کبھی اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ یہی جانتی تھی کہ ارما کے والدین ملتان میں رہتے ہیں۔ اور ارما بچپن سے ہی اپنی نانی کے ساتھ رہتی تھی۔

اس کے نانا کی وفات کے بعد اس کی نانی ملتان سے اسے اپنے ساتھ لاہور لے آئی تھیں اور یہیں اسکول میں اس کا ایڈمیشن کروا دیا تھا اور پھر وہ نانی کے پاس ہی پلی بڑھی۔ خود ارما نے بھی کبھی اپنے والدین کے بارے میں زیادہ نہیں بتایا تھا۔ ارما کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا جو اکثر اسے فون کرتا رہتا مگر اب عائلہ کو لگتا تھا کہ ارما کی زندگی میں اس کے والدین اور اس کے خاندان سے جڑے ایسے بہت سے راز تھے جن کے بارے میں عائلہ نہیں جانتی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ارما کے بدمزاج والدین کے اس رویے کے پیچھے کوئی اور ہی کہانی ہے۔ اسے تو وہ ارما کے والدین لگتے ہی نہیں تھے مگر وہ ارما سے اتنے سوالات کر کے اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ارما خود بھی اپ سیٹ ہے مگر صرف اپنی سہیلی کی دلجوئی کی خاطر مسکرا رہی تھی اور اس نے بہاول پور جانے کا پروگرام بھی اسی لیے بنایا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ دونوں کمرے میں آ گئیں۔

''سائرہ! یہ کپڑے دھلوا دو..... جب سوکھ جائیں تو استری کر کے لے آنا۔'' ارما نے ناران کے سفر والے کپڑے سوٹ کیس سے نکال کر پاس کھڑی ملازمہ کو دیے۔

''اچھا باجی.....'' وہ کپڑے سمیٹ کر چلی

گئی۔ عائلہ خاموش بیٹھی تھی۔ ارما نے اسے یوں چپ چاپ بیٹھے دیکھا تو نرمی سے کہا۔

''تم کیوں اس طرح خاموش بیٹھی ہو؟ ٹی وی ہی دیکھ لو۔'' اس نے بظاہر نارمل سے انداز میں کہا۔

''سوچ رہی ہوں کہ کاش ہم ناران، کاغان سے اتنی جلدی واپس نہ آتے۔'' عائلہ نے پھیکے پڑتے چہرے کے ساتھ کہا۔

''ہاں..... کاش ہم کوئی لمبا ٹرپ پلان کر لیتے، وہاں سے آگے ہنزہ چلے جاتے مگر وہاں موسم خراب ہو رہا تھا۔ راستے بند ہو جانے کا خطرہ تھا۔ میں اس سفر کی بہت سی یادیں ساتھ لائی ہوں، سرسبز پہاڑ، کسی ستارے کی طرح چمکتی ہوئی جھیل سیف الملوک، روانی سے بہتا دریائے کنہار، ناران کا بارونق بازار، مہمان نواز اور خدمت گزار لالہ نارانی، ہر طرف بھاگتے دوڑتے اختر بھائی، ہمدرد ڈرائیور حکم خان، وادیِ کاغان کا وہ گھر جہاں آتش دان میں لکڑیاں سلگتی تھیں، سرخ بالوں والی شفیق سی بی بی جان، موتیوں کے مکرامے بنانے والی سادہ لڑکی زرمینہ اور وہ پُراسرار اجنبی جس کا نام سالار تھا، ہے ناں۔''

اِک یاد اسے بہت دور لے گئی..... دور پہاڑوں پر ملنے والے ایک اجنبی کے پاس۔

''کاش ہم اس کا فون نمبر ہی لے لیتے۔ ویسے بندہ شاندار تھا۔'' عائلہ نے کہا۔

ارما کے ذہن میں اس کا عکس ابھرا۔

''اور وہ تو جیسے ہمیں اپنا فون نمبر دے ہی دیتا۔ اس کی شخصیت میں کوئی اسرار تھا۔ وہ بھیڑ میں گم ہو جاتا، بڑی توجہ سے لوگوں کو نظر انداز کرتا، اجنبیت میں بھی شناسائی کا رنگ ہوتا..... اس کی آنکھیں جیسے کسی جادوگر کی آنکھیں تھیں۔'' ارما کھوئے، کھوئے انداز میں بولی۔

اس اجنبی کے نام کا گلاب اس کی یادوں میں تازہ تھا۔

''پتا نہیں وہ کون تھا؟'' عائلہ کو بھی سالار کے بارے میں تجسس تھا۔ ارما سرسبز وادی کی یادوں میں کھو گئی۔

''کاش میں دوبارہ وادیِ کاغان کے جنگل میں بنے اس گھر میں کبھی جا سکوں، وہ میرا ڈریم ہاؤس تھا، جس کے دروازے پر پھول سجے تھے اور بارش میں بھیگتے خوبانی کے درخت کی شاخوں میں ڈری سہمی چڑیوں نے پناہ لے رکھی تھی۔''

اس سفر کی یاد اس کے دل میں نقش ہو گئی تھی۔ اس کے ارتکاز کو موبائل کی بیل نے توڑا۔ ملتان سے اس کے بھائی ازمیر کا فون آ رہا تھا۔ اس نے فوراً فون ریسیو کیا۔

''ہیلو سسٹر! پہاڑوں سے واپسی مبارک ہو، کیسا گزرا سفر؟ امید ہے کہ گھر واپس آ کر طبیعت باغ و بہار ہو گئی ہو گی۔'' وہ چہکتی ہوئی آواز میں بولا۔

''ہاں بہت زیادہ..... تم اندازہ تو کر ہی سکتے ہو، تمہیں بھی اب فون کرنے کا خیال آیا ہے؟'' وہ ناراض ہوئی۔

''تین چار دن سے فون ملانے کی کوشش کر رہا ہوں مگر سگنل ہی نہیں ملتے تھے۔ کافی اہم خبریں ہیں میرے پاس مگر ایسے ہی مفت میں تو ساری معلومات نہیں دے جاتا ہوں..... ہاں اگر نیا آئی فون تحفے میں مل جائے تو اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔'' ازمیر نے کہا۔

''خبیث ہو تم! کیا، نیا آئی فون تمہیں اپنی بہن سے زیادہ عزیز ہے؟'' ارما نے اسے لتاڑا۔

''بہن کی اپنی جگہ ہے اور آئی فون کی اپنی اہمیت ہے، بہن کو بھی بھائی کا احساس کرنا چاہیے۔ ایسی بھی بہنیں ہوتی ہیں جو بِنا کہے ہی چھوٹے بھائیوں کی فرمائشیں پوری کر دیا کرتی ہیں۔'' وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔

''مل جائے گا تمہیں آئی فون، فکر نہ کرو..... تم پہلے مجھے اہم معلومات سے آگاہ کرو۔'' ازمیر نے اس کی بات مانتے ہوئے کہا۔

''ابا نے آپ کے لیے ایک عدد رشتہ تلاش کیا ہے، وہ لوگ لاہور میں رہتے ہیں، لڑکا جانوروں کا ڈاکٹر ہے، گائے بھینسوں کا علاج کرتا ہے، سنا ہے کہ

لوگ دور، دور سے اپنے جانوروں کا علاج کروانے اس کے پاس آتے ہیں، وہ فیس بھی خوب بٹورتا ہے۔'' ازمیر نے انکشاف کیا۔

''جانوروں کا ڈاکٹر.....؟'' ارما کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ہاں..... جانوروں کا ڈاکٹر ہونا کوئی معیوب بات تو نہیں ہے، یہ بھی ایک پروفیشن ہے، ڈاکٹر تو ان کے نام کے ساتھ بھی لگتا ہے، یہ بھی کافی پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں اور کافی پیسہ بھی کما لیتے ہیں۔'' ازمیر نے اظہارِ خیال کیا۔

''تم مجھے جانوروں کے ڈاکٹر کے فائدے نہ بتاؤ، میں نے جانوروں کے ڈاکٹر پر کوئی نوٹ نہیں لکھنا'' اس نے غصے کے عالم میں اسے ٹوکا۔ ازمیر نے اپنی بات جاری رکھی۔

''خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق..... دی ہوئی ہے اور اب وہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

اس نے بالآخر ایک اہم راز فاش کیا..... ارما ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی۔ آخر اس کے لیے کس قسم کے رشتے ڈھونڈے جا رہے تھے۔

''اوہ اچھا.....! تو ڈاکٹر صاحب دوسری شادی کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں، پہلی بیوی کہاں گئی؟'' اس نے اپنا غصہ دباتے ہوئے پوچھا۔

''چلی گئی ہوگی اپنے میکے..... ابا کو ڈاکٹر صاحب سے بڑی ہمدردی ہے، وہ ان کا گھر بسانا چاہتے ہیں..... ڈاکٹر صاحب بے حد دولت مند آدمی ہیں، ان کا گائے بھینسوں کا ایک ڈیری فارم بھی ہے، جس کا نام الجیوان فارم ہاؤس ہے اور آپ کو تو معلوم ہے کہ امی، ابا کی کمزوری دولت ہے، وہ آپ کے لیے یہ رشتہ اس لیے لے کر آئے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں آپ کی عمر اب کافی زیادہ ہو چکی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پچیس سال کی عمر میں تو لڑکی تین بچوں کی ماں بن جاتی ہے اور ان کے خاندان کی سب لڑکیاں بیس، بائیس سال کی عمر میں بیاہ کر سسرال چلی جاتی ہیں اور جن لڑکیوں کی عمر زیادہ ہو جائے تو پھر انہیں ڈاکٹر صاحب جیسے رشتے ہی ملتے ہیں۔'' ازمیر نے کہا۔ ارما کے دل میں اِک آتش فشاں ابلنے لگا۔

''انکشاف کا سلسلہ جاری رکھو۔'' اس کی باتیں سنتے ہوئے ارما کی آنکھوں سے شرارے پھوٹنے لگے۔ ابھی اسے اس ساری بات کی اصلیت کا پتا لگانا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب پکی عمر کے بندے ہیں پچاس سال کے تو ہوں گے مگر عمر سے کیا ہوتا ہے، انسان کا دل جوان ہونا چاہیے جو کہ ڈاکٹر صاحب کا ہے اسی لیے تو وہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ پہلی بیوی کب آئی، کب گئی، وہ تو یہ بھول ہی چکے ہیں۔ انہیں تو بس دوسری بیوی کا انتظار ہے۔'' اس نے مزید معلومات فراہم کیں۔ ارما کے اندر جوار بھاٹا سا اٹھا۔

''تو پھر اس رشتے کے لیے امی ابا اتنا اصرار کیوں کر رہے ہیں؟ کیا صرف اس منحوس ڈاکٹر کی ہمدردی اس کی وجہ ہے؟ میں نہیں مان سکتی کہ وہ کسی اجنبی سے ہمدردی بھی کر سکتے ہیں۔ وہ اس بڈھے ڈاکٹر میں کیوں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں کہ اچانک ملتان سے لاہور آ گئے۔'' اس نے ناگواری سے پوچھا۔

''ابا نے ڈاکٹر صاحب کو آپ کی تصویر دکھائی تھی۔ بس ڈاکٹر صاحب تو تصویر دیکھتے ہی ہاں کر بیٹھے۔ وہ بے حد دولت مند آدمی ہیں، یوں سمجھیں موٹی آسامی ہیں، باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے اس رشتے کے بدلے رقم اور پراپرٹی دینے کا وعدہ کیا ہے، امی، ابا کے ساتھ ڈیل کی ہے۔ یہ شادی نہیں دراصل سودے بازی ہے، اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ مجھے فوراً آئی فون بھجوا دیں، میں اس رشتے کو ختم کروانے کے مشن پر کام کرتا ہوں، پلان میں نے بنایا ہوا ہے۔'' ازمیر نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

ارما نے بہت سے آنسو دل میں ہی اتار لیے۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔ پہلے بھی اس طرح کے دو تین واقعات ہو چکے تھے۔ ہر بار اس کا دل اسی طرح

ٹوٹا تھا۔

''ٹھیک ہے میں ابھی جا کر تمہیں پیسے ٹرانسفر کرتی ہوں..... تم وہیں سے آئی فون خرید لینا..... بس کسی طرح اس ڈاکٹر سے میرا پیچھا چھڑاؤ۔'' یہ ساری بات سننے کے بعد ارما نے کہا۔ اس نے کوشش کی کہ اس کی آواز میں لرزش نہ آئے۔ ابھی اسے بہت سے محاذوں پر لڑنا تھا۔

''ارے یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے..... میں نے تو جب سے یہ بات سنی ہے اس وقت سے پلان بنا رہا ہوں..... آپ فکر نہ کریں..... بس میرا تھوڑا بہت خیال رکھ لیا کریں، اس مہنگائی کے دور میں امی، ابا جیسے کنجوس والدین کے ساتھ گزارہ کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ آپ کی تو موجیں ہیں، بڑی دولت ہے نانی کے پاس..... کیا کریں گی وہ اتنے روپے، پیسے کا۔ ان سے کہیں سب لوگوں میں یہ دولت بانٹ کر ثواب کمائیں۔''

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ازمیر کو اس بات پر ڈانٹ دیتی مگر اب اسے ضبط سے کام لینا پڑا۔

عائلہ حیرت سے یہ گفتگو سن رہی تھی۔

''ٹھیک ہے..... نانی تک تمہارا پیغام پہنچا دوں گی۔ اب خوش..... تم یہ رشتہ ختم کروانے والے منصوبے پر کام کرو اور جلد ہی مجھے خوشخبری سنانا..... سمجھے!''

ارما نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ عائلہ شاک کے عالم میں بیٹھی تھی۔

''ارما!..... کیا یہ تمہارے اصل والدین ہیں؟'' وہ خود کو یہ سوال کرنے سے روک نہ سکی..... ایک لمحے کے لیے ارما چونکی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ پھر اس نے نظریں چرا لیں۔ وہ بے حد اپ سیٹ تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ عائلہ کو کس، کس بات کی وضاحت کرے۔

''ہاں مگر میں بچپن میں ہی اپنی نانی کے پاس آ گئی تھی۔ اس لیے میں اپنے والدین کے ساتھ مانوس نہیں ہو پائی۔ ویسے بھی وہ بیٹیوں کو پسند نہیں کرتے انہیں تو صرف ازمیر سے ہی پیار ہے۔'' اس نے افسوس سے کہا۔ اسے خود بھی یہ لولا لنگڑا بہانہ بوگس لگا تھا۔

''مجھے حیرت ہے کہ آج کل کے دور میں بھی لوگ ایسی سوچ رکھتے ہیں مگر شکر ہے کہ تمہارا بھائی اچھا ہے۔'' عائلہ کو یہ سب کچھ سن کر افسوس ہو رہا تھا۔

''چیزیں بھیجتے رہو اور اس کی فرمائشیں پوری کرتے رہو تو وہ بھی اچھا ہے۔'' ارما کے منہ سے..... بے ساختہ نکلا۔

''چلو..... دو چار چیزوں سے کیا ہوتا ہے..... وہ تمہارا احساس تو رکھتا ہے ناں، تمہاری مدد تو کر رہا ہے۔'' عائلہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

''عائلہ! تم لیپ ٹاپ پر کوئی ڈراما دیکھ لو۔ میں نانی سے کچھ بات کر کے آتی ہوں۔'' ارما اٹھ کر دروازے کے پاس آئی..... اور سنجیدہ انداز میں بولی۔

ازمیر کے انکشافات نے اس کے دل میں اک آتش فشاں روشن کر دیا تھا۔ عائلہ کو اس کا چہرہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ بہت اپ سیٹ تھی مگر دل پاور سے کام لے رہی تھی اور اس کی آنکھوں کے کناروں پر نمی چمک رہی تھی۔

وہ [illegible] سے باہر نکل گئی۔ عائلہ کو اس ساری صورتِ حال پر افسوس ہو رہا تھا۔ ارما نم آنکھوں کے ساتھ نانی کے کمرے میں آئی۔ اس کے چہرے پر آتش فشاں کا عکس نظر آ رہا تھا، نانی پاندان کھولے صوفے پر بیٹھی تھیں۔ اور پان بنانے میں مصروف تھیں۔ وہ آہستگی سے چلتے ہوئے نانی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''سویرا اور کمال تمہارے لیے اک رشتہ لے کر آئے ہیں، آج وہ لوگ لڑکے والوں کی طرف جا رہے ہیں اور کل لڑکے والوں نے ہمارے ہاں دعوت پر آنا ہے، میں تو کہوں گی کہ اگر رشتہ اچھا ہے تو ہمیں ہاں کر دینی چاہیے۔ کمال اس فیملی کو برسوں سے جانتا ہے۔ لڑکا پڑھا لکھا ہے اور.....''

''اور جانوروں کا ڈاکٹر ہے۔'' ارما نے نم پڑتی آنکھوں اور سرد سے انداز میں نانی کی بات کاٹ دی۔ اس نے عجیب سے لہجے میں اُن کا جملہ مکمل کیا۔ نانی ایک لمحے کے لیے چونکیں۔

''تو جانوروں کا ڈاکٹر ہونے میں کوئی برائی تو نہیں ہے۔'' انہوں نے غور سے اس کے رنجیدہ چہرے کو دیکھا۔

''جی..... بالکل مگر وہ ڈاکٹر صاحب اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے چکے ہیں، ان کی عمر بھی زیادہ ہے، پچاس کے قریب تو ہوں گے۔'' اس نے دل میں غصہ دباتے ہوئے انکشاف کیا۔ نانی حیرت زدہ رہ گئیں۔ ان کے ہاتھ سے سونف اور چھالیا گر گئی۔

''کیا؟ کہیں تم مذاق تو نہیں کر رہی ہو ارما! سویرا اور کمال نے تو مجھے ایسی کوئی بات نہیں بتائی ہے بلکہ وہ تو لڑکے اور اس کے خاندان کی بے حد تعریفیں کر رہے تھے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' انہیں یہ سن کر صدمہ ہوا تھا۔

''نانی! مجھے تو یہ بات پہلے ہی کھٹک رہی تھی کہ امی اور ابا اس رشتے کے لیے اتنا اصرار کیوں کر رہے ہیں، خاص اس رشتے کے لیے ملتان سے لاہور آئے، آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ انہیں کسی سے ہمدردی نہیں ہے، انہیں صرف دولت سے پیار ہے، انہیں جہاں بھی دولت حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نظر آئے گا۔ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے، انہوں نے اس بڈھے ڈاکٹر کے ساتھ اس رشتے کے بدلے میری قیمت طے کی ہے، وہ اس سے روپیہ، پیسہ، زمین، جائداد، بٹورنے کا پلان بنائے بیٹھے ہیں۔'' وہ پلکیں جھپک جھپک کر اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ غم اور غصے سے اس کا برا حال تھا، نانی کا صدمہ بڑھا۔ ان کے ماتھے پر تفکر کی لکیریں گہری ہو گئیں۔

''تمہیں یہ سب از میر نے بتایا ہے؟'' انہیں اندازہ ہو گیا کہ یہ ساری معلومات وہی ارما کو دے سکتا ہے۔

''جی ہاں، ایک آئی فون کے بدلے اس نے یہ سارے راز فاش کیے ہیں مگر اس کا نام کہیں نہیں آنا چاہیے ورنہ اس کی خیر نہیں ہے۔'' اس نے بہت سے آنسو اپنے دل میں اتارتے ہوئے نم آواز کے ساتھ اعتراف کیا۔

''مجھے سویرا اور کمال سے اتنی گھٹیا سازش کی توقع نہیں تھی۔ آخر کیا سوچ کر انہوں نے تمہارے لیے ایسے رشتے کو پسند کیا ہے، مجھے جھوٹی باتیں بتاتے رہے، میں تو خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ جلد از جلد کسی اچھی جگہ تمہاری شادی ہو جائے ورنہ لوگ تو طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں کہ میں اپنے بڑھاپے اور تنہائی کی وجہ سے تمہاری شادی کرنا ہی نہیں چاہتی ہوں۔'' ان کی آواز میں دکھ اور کرب تھا۔

''نانی! بس آپ ان لوگوں کو یہاں سے بھیج دیں، یہاں آ کر ان لوگوں نے جس طرح کا رویہ اختیار کیا ہے اس کی وجہ سے میں بہت اپ سیٹ ہو گئی ہوں۔ میں عائلہ کے سامنے اتنی شرمندہ ہوئی ہوں کہ بتا نہیں سکتی، وہ تو مجھ سے حیران پریشان ہو کر بار بار یہی پوچھ رہی ہے کہ کیا یہ میرے اصلی والدین ہیں، آپ بتائیں میں اسے کیا جواب دوں، سچائی کسی کو بتا نہیں سکتی، اپنی بیسٹ فرینڈ کو بھی نہیں.....'' آخری جملے پر اس کی آواز اداس اور مدھم ہو گئی، چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔

''میں سویرا اور کمال کو اس طرح اپنی من مانی کرنے کی اجازت نہیں دوں گی... میں ضعیف ضرور ہو گئی ہوں مگر اتنی کمزور نہیں ہوں کہ تمہارا دفاع نہ کر سکوں، میری تو خواہش تھی کہ شبو، شیراز کے لیے تمہارا رشتہ مانگ لیتی..... مگر وہ اپنی ضد کی وجہ سے نہیں مانی۔'' چند لمحوں بعد انہوں نے آہ بھر کر کہا۔ ان کی آواز میں ملال تھا۔

''چھوڑیں نانی، شبو خالہ جیسی ڈکٹیٹر خاتون کے ساتھ رہنا بھی تو آسان نہیں ہے اور شیراز موٹا تو مجھے ذرا بھی پسند نہیں تھا۔ اچھا ہی ہوا جو شبو خالہ نے میرا رشتہ نہیں مانگا۔'' اس کی آواز میں ناگواری تھی، وہ پرانے قصے کہانیوں کو کریدنا نہیں چاہتی تھی۔

نانی نے آدھا ادھورا پان، پاندان میں رکھ دیا اور اپنا سر تھام لیا۔

''سمجھ نہیں آتی کہ کیا کروں.....! سویرا اور کمال کی فطرت سے واقف ہونے کے باوجود میں نے ان

پر بھروسا کرلیا۔ اس رشتے سے انکار کی کوئی نہ کوئی وجہ تو تلاش کرنی ہی پڑے گی، تم نے ازمیر کا نام لینے سے بھی منع کیا ہے، وہ دونوں تو مجھ سے پوچھیں گے کہ مجھے اس بدبخت ڈاکٹر کے بارے میں اتنا سب کچھ کیسے پتا چل گیا۔'' نانی نے پریشانی اور فکرمندی سے کہا۔

''ازمیر اس معاملے کو خود کو ہینڈل کرلے گا اور ڈاکٹر کے گھر والے خود ہی انکار کردیں گے، آپ تو ازمیر کی صلاحیتوں سے واقف ہیں، اس نے بے شمار جاسوسی فلمیں اور سیریز دیکھی ہوئی ہیں، وہ کوئی نہ کوئی پلان بنا ہی لے گا۔ اور جو کارنامہ اس نے سرانجام دینا ہے اس کے آگے تو ایک چھوٹا سا آئی فون کچھ بھی نہیں ہے۔'' ارما نے کہا۔

''نانی نے صوفے پر پڑے پرس میں سے اپنا اے ٹی ایم کارڈ نکال کر ارما کو دیا۔

''اپنے لیے بھی کچھ رقم نکلوالو اور ازمیر کو بھی اس کے آئی فون کے لیے رقم بھجوادو۔'' انہوں نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

اس نے کارڈ تھام لیا پھر گہری سانس لے کر اُن کی طرف دیکھا۔

''نانی! میں ان لوگوں کی موجودگی میں یہاں نہیں رہنا چاہتی ہوں، میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں، ورنہ میں پاگل ہوجاؤں گی، بیمار پڑ جاؤں گی اور یہ لوگ جس ایجنڈے پر یہاں آئے ہیں مجھے لگتا ہے کہ یہاں ان کا قیام طویل ہوجائے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں یہاں مزید رہی تو میرا ان لوگوں کے ساتھ بہت بڑا جھگڑا ہوجائے گا، میں لوگوں کے سامنے اپنا بھرم رکھ کر تھک چکی ہوں۔''

وہ دوسروں کے سامنے رونے والی لڑکی نہیں تھی مگر اب وہ رو رہی تھی اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ نانی کو دکھ اور افسوس ہوا، انہوں نے اسے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا، اپنی اولاد کے لیے وہ ایک سخت گیر ماں تھیں مگر اس کے لیے وہ بے حد شفیق نانی تھیں۔

''ارما! مت روؤ بیٹا، تم تو بڑی بہادر لڑکی ہو، چلو اپنے آنسو صاف کرو، مجھے بتاؤ کہ تم کہاں جانا چاہتی ہو؟ ابھی تو تم ناران، کاغان سے واپس آئی ہو۔'' انہوں نے اسے چمکارتے ہوئے کہا۔ اس کے آنسو دیکھ کر اُن کا دل پگھل گیا تھا۔ ارما نے ہتھیلیوں کی پشت سے اپنے آنسو صاف کیے۔

''عائلہ کی خالہ بہاول پور میں رہتی ہیں، ان کے بیٹے کی شادی ہے تو عائلہ وہاں جارہی ہے، میں بھی اس کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔''

اس نے سر جھکاتے ہوئے بتایا۔

نانی سوچ میں پڑ گئیں۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید وہ اسے جانے سے منع کردیتیں۔ انہیں غصہ تھا کہ سویرا اور کمال نے ان سے کیوں جھوٹ بولا اور ارما کے لیے ایسا رشتہ کیوں لے کر آئے جو انسان کسی دشمن کی بیٹی کے لیے بھی نہ لے کر جائے۔

''ٹھیک ہے، عائلہ کے ساتھ چلی جاؤ..... کب جانا ہے؟'' وہ گہری سانس لے کر بولیں۔ ارما بے ساختہ خوش ہوگئی۔

''کل..... ہم صبح چھ بجے کی بس سے چلے جائیں گے۔'' اس نے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

نانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ابھی سے اس بات کا اعلان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بس صبح سویرے نکل جانا، سویرا اور کمال سے تو میں خود نپٹ لوں گی۔'' انہوں نے سوچتے ہوئے کہا۔

اس بڑھاپے میں بھی ان کا رعب و دبدبہ کمال تھا۔

''تھینک یو نانی.....'' وہ اٹھ کر بے اختیار نانی کے گلے لگ گئی پھر اس نے ان کے نرم گال پر پیار کیا۔

نانی ذہنی تناؤ کے باوجود مسکرادیں۔ انہیں ارما کی شادی کی بے حد فکر تھی، بہت لوگوں سے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کا کہا ہوا تھا مگر ابھی تک کہیں بات نہیں بنی تھی۔ انہیں سویرا، کمال، شہو اور اس کی فیملی سے کسی اچھائی کی امید نہیں تھی۔ یہ سوچ انہیں پریشان کرتی رہتی کہ اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہوگیا تو ارما کا کیا ہوگا،

وہ جانتی تھیں کہ ارما کے لیے کسی کے دل میں محبت نہیں ہے، وہ بہت پریشان اور فکرمند ہوگئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ارما کی شادی ہونا اتنا آسان کام نہیں ہے، لوگ طرح طرح کے سوال پوچھتے تھے، انہیں بہت سی وضاحتیں دینا پڑتیں۔ بھرم رکھنے کے لیے بہت سے جھوٹ بولنے پڑتے، وہ کب سے اس کے لیے کوئی اچھا رشتہ تلاش کرنے کی کوشش کررہی تھیں، انہوں نے لوگوں کو لالچ بھی دیے، اُن کے سامنے جھوٹی، سچی کہانیاں بھی گھڑیں..... جس کی وجہ سے لوگ اور بھی مشکوک ہوجاتے اور راہِ فرار اختیار کرتے۔ سارے خاندان والے جانتے تھے کہ ارما کی شادی ایک بے حد اہم مسئلہ ہے۔

کمرے میں آکر ارما نے عائلہ کو خوشخبری سنائی کہ نانی نے اسے بہاول پور جانے کی اجازت دے دی ہے پھر اس نے موبائل پر ہی آن لائن بس کے ٹکٹ بک کروالیے۔

''صبح چھ بجے کی بس ہے، ہم پانچ بجے ہی گھر سے نکل جائیں گے، تم پیکنگ کرلو۔'' وہ موبائل پر ٹائپ کرتے ہوئے بولی۔ اتنے شارٹ نوٹس پر اتنے سارے کام کرنا ارما کا ہی خاصہ تھا۔

''ٹھیک ہے، کچھ دن خالہ کے پاس ہی رہیں گے۔'' عائلہ اٹھ کر بیگ میں کپڑے رکھنے لگی۔ وہ یہ نہ کہہ سکی کہ جب تک تمہارے والدین یہاں ہیں ہم یہاں واپس نہیں آئیں گے مگر ارما اس کی بات سمجھ چکی تھی۔ وہ خود بھی تو یہی چاہتی تھی۔

''میں تو بہاول پور جانے کے لیے بہت ایکسائٹڈ ہوں، وہاں ہم بازار بھی جائیں گے، سنا ہے کہ وہاں بہت خوب صورت جیولری ملتی ہے اور وہاں چُنری اور کڑھائی والے سوٹ بھی بہت مشہور ہیں، وہاں پر نوابوں کے محل بھی ہیں، مجھے تو نور محل دیکھنے کا بے حد شوق ہے، کہتے ہیں کہ یہ نور محل کسی نواب نے اپنی بیگم کے لیے بنوایا تھا، بھئی کیا بات ہے۔'' ارما مسکراتے ہوئے بولی۔ عائلہ کو بھی اس کی بات پر مسکرانا پڑا۔

''ہاں، میں اپنے کزن سے کہوں گی تو وہ ہمیں وہاں لے جائے گا۔'' اس کا دل بھی بہل گیا۔

''وہی کزن! ہم جس کی شادی پر جارہے ہیں۔'' ارما نے شوخی سے کہا۔

عائلہ بے ساختہ ہنسی۔

''ہاں..... وہی..... عالیان ہے اس کا نام.....'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا پتا کہ عالیان صاحب تمہارا ہی انتظار کررہے ہوں۔'' ارما نے شوخی سے کہا۔

''ہوسکتا ہے۔'' عائلہ مسکرائی۔

''چلو جاکر دیکھ لیں گے..... اک نیا ایڈونچر..... بہاول پور..... نور محل اور عالیان.....''

☆☆☆

ایک لمبے سفر کے بعد عائلہ اور ارما بہاول پور پہنچیں..... بس اسٹاپ پر عائلہ کا کزن عالیان ان دونوں کو لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ وہ عالیان کے ہمراہ عائلہ کی خالہ کے گھر پہنچیں تو عائلہ کی خالہ نے ان کا پُرتپاک اور شاندار استقبال کیا۔ ان کا گھر پرانی طرز کا بنا ہوا تھا۔ سادہ مگر صاف ستھرا تھا، خالہ کی محبت اور خلوص کی چاشنی نے ان کی ساری تھکن اتار دی۔ انہوں نے کھانے پر بے حد اہتمام کیا ہوا تھا اور اس اہتمام میں تکلف نہیں محبت شامل تھی۔ چکن بریانی، رائتہ، سلاد، کباب، کوفتے غرض دسترخوان انواع واقسام کے کھانوں سے سجا ہوا تھا۔ کھانے کے دوران خالہ محبت سے ایک، ایک ڈش خود پیش کررہی تھیں۔

''تمہاری ممی سے میری بات ہوئی تھی۔ جب اس نے بتایا کہ تم پاکستان آرہی ہو تو سچ پوچھو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہا، کب سے میں تمہاری آمد کا انتظار کررہی ہوں۔'' انہوں نے عائلہ کی پلیٹ میں بریانی ڈالتے ہوئے مسکراتے ہوئے محبت بھرے انداز میں کہا۔

''خالہ میں ارما کے ساتھ ناران، کاغان گئی ہوئی تھی۔ ہم جھیل سیف الملوک پر بھی گئے تھے، مجھے بچپن سے ہی وہاں جانے کا شوق تھا مگر کبھی موقع ہی نہیں ملا

تھا۔ اب پاکستان آئی تو میں نے اور ارمانے وہاں جانے کا پلان بنالیا۔ پھر ہم وہاں چلے گئے..... وہ ایک یادگار سفر تھا۔'' عائلہ نے مسکراتے ہوئے انہیں بتایا۔

''چلو اچھا کیا تم دونوں نے کہ خوب انجوائے کرلیا۔'' خالہ مسکرا کر بولیں۔

''اب ہم لوگ نورمحل دیکھنا چاہتے ہیں، سنا ہے کہ وہ محل بے انتہا خوب صورت ہے اور لوگ دور، دور سے اسے دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔'' عائلہ نے مسکراتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''ہاں ضرور دیکھنا، عالیان تم لوگوں کو وہاں لے جائے گا۔ نورمحل کی کشش مسافروں کو بہاول پور میں روک لیتی ہے، کسی زمانے میں یہ نوابوں کی ریاست ہوا کرتی تھی اور نواب یہاں حکومت کیا کرتے تھے۔'' خالہ نے مسکرا کر کہا۔

عالیان کھانا کھاتے ہوئے چونکا۔

''نورمحل اب پاکستان آرمی کی تحویل میں ہے مگر سویلین بھی ٹکٹ خرید کر اسے دیکھنے جاسکتے ہیں۔ کل اتوار ہے، میں تم لوگوں کو وہاں لے جاسکتا ہوں، اس کے علاوہ میں پورا ہفتہ بزی ہوں گا، اس لیے کل دن کے وقت تیار رہنا۔'' اس نے بریانی پر رائتہ ڈالتے ہوئے قدرے سپاٹ سے انداز میں کہا۔ اس نے خالہ کی طرح ان لوگوں کی آمد پر بے پناہ گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

''کل دن کے وقت تو دھوپ اور گرمی ہوگی۔ تم انہیں شام کو وہاں لے جانا۔'' خالہ نے اسے نرمی سے ٹوکا۔

اس نے کھانا کھاتے ہوئے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔ وہ دونوں بے ساختہ خوش ہوگئیں۔

''میں تو یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ پرانے زمانے کے محل کیسے ہوتے تھے، کیا وہ ویسا ہی محل ہے جیسا پریوں کی کہانی میں ہوتا ہے۔'' ارمانے ایکسائٹڈ انداز میں کہا۔

''میری یہ دوست بچپن سے ہی کہانیوں کی کتابیں پڑھتی آئی ہے، یوں سمجھیں کہ یہ کہانیاں پڑھتے، پڑھتے بڑی ہوئی ہے اور اس طرح کی جگہیں اسے بہت اٹریکٹ کرتی ہیں۔'' عائلہ بے ساختہ مسکرائی۔

اس نے ارما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ خالہ اس بات پر محظوظ ہوئیں۔

''نورمحل پریوں کی کہانیاں والے محل سے بھی زیادہ خوب صورت ہے، جب بہاول پور ریاست پر نوابوں کی حکومت تھی تو انہوں نے یہاں بہت سے محل تعمیر کروائے تھے جو آج قومی اثاثہ اور تاریخی ورثہ ہیں، کسی زمانے میں یہ ایک خوش حال ریاست ہوا کرتی تھی اور نوابوں کے پاس دولت کے انبار ہوا کرتے تھے۔ ان کی شان و شوکت کے قصے تو آج بھی مشہور ہیں اور اس خطے سے بے شمار کہانیاں جڑی ہوئی ہیں۔'' خالہ نے انہیں بتایا۔ تبھی عائلہ کو اک خیال آیا۔

''خالہ! کل تو ہم نورمحل دیکھنے کے لیے جائیں گے پھر عالیان تو سارا ہفتہ مصروف ہوگا تو ہم بھلا کس کے ساتھ گھومیں پھریں گے؟'' عالیان گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے ٹھٹکا۔

''تو تمہارا کیا مطلب ہے کہ میں تم لوگوں کا گائڈ بننے کے لیے اپنے اسکول سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لوں۔'' وہ عائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے ابرو اچکا کر بولا۔

''کیا تم اسکول میں پڑھاتے ہو؟'' عائلہ یک دم حیران ہوکر اسے دیکھنے لگی۔

عالیان اپنے کزنز کے ساتھ کبھی بھی اتنا فرینک نہیں رہا تھا۔ اتنے سالوں میں اس کی کبھی عائلہ سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی وہ سوشل میڈیا پر چیٹنگ کرنے کا شوقین تھا۔

عالیان نے چونک کر اس کی حیران آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی والدہ کے بھرم رکھنے والی عادت کی وجہ سے ان کے رشتے دار کبھی ان کے حالات سے باخبر نہیں ہوئے تھے۔

''ہاں.....'' اس نے مختصراً جواب دیا پھر کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''کون سا سبجیکٹ پڑھاتے ہو تم؟'' عائلہ نے بے ساختہ پوچھا۔

''فزکس۔'' اس نے بتایا۔

''تو تم کالج میں لیکچرار شپ کے لیے اپلائی کیوں نہیں کرتے؟'' عائلہ نے فوری مشورہ دیا۔

''کئی مہینے کالجز کے چکر لگا تا رہا ہوں پھر میں نے سوچا کہ بے روزگار ہونے سے بہتر ہے کہ جہاں نوکری مل رہی ہے وہیں پر جاب کرلوں۔'' اس نے صاف گوئی سے جواب دیا پھر پانی کا گلاس منہ سے لگالیا۔

''حق حلال کے چار پیسے کما لینا ہی بڑی بات ہے..... جس کے پاس حلال کی کمائی کا روزگار ہو، وہی خوش قسمت ہوتا ہے بیٹا۔'' خالہ نے سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کسبِ حلال کے فلسفے کی اس گہرائی کو بہت کم لوگ سمجھ پاتے تھے۔'' ارما خاموشی سے کھانا کھاتے ہوئے اس گفتگو کو سن رہی تھی۔

''تم ایم فل کیوں نہیں کر لیتے؟'' عائلہ نے ایک اور مشورہ دیا مگر پھر خود ہی پچھتائی۔

''کیا ساری عمر پڑھتا ہی رہوں گا؟ مجھے تو اس لاجک کی سمجھ نہیں آتی کہ ایم ایس سی کی ڈگری پر لوگ اعتبار کیوں نہیں کرتے جو ہر جگہ ایم فل کی شرط لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ بے شمار تعلیمی ادارے کھلتے جارہے ہیں لوگوں نے بھی پرائیویٹ کالجز اور یونیورسٹیوں کو کاروبار بنا لیا ہے مگر نوکری کے لیے جدھر جاؤ وہاں درخواستوں کا انبار لگا ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ تو معاشرتی المیہ بنتا جارہا ہے۔'' وہ ماتھے پر بل ڈالے سنجیدگی سے بولا۔

خالہ نے گہری سانس لی۔ عالیان کو تو اس طرح کی باتیں کرنے کی عادت تھی۔ انہوں نے دانستہ بات بدل دی ورنہ تو عالیان ٹاک شو میں بیٹھے لوگوں کی طرح اس موضوع پر بلا تکان اور نان اسٹاپ گفتگو کرسکتا تھا۔

''بچیاں لمبے سفر سے آئی ہیں۔ اس طرح کی سنجیدہ باتیں سن کر پریشان ہو جائیں گی کوئی اور بات کرو۔'' انہوں نے نرمی سے کہا۔

عائلہ بھی اس موضوع کو چھیڑ کر..... شرمندہ ہوگئی تھی۔

ارما تو خود یہاں مہمان تھی۔ اس گفتگو میں حصہ لینا اس نے مناسب نہیں سمجھا پھر کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔

کھانے کے بعد خالہ انہیں ان کے کمرے میں لے آئیں۔ وہ سادہ، صاف ستھرا مگر کشادہ کمرا تھا۔ کمرے میں آکر ارما نے سب سے پہلے نانی کو فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دی۔

عائلہ نے بھی آسٹریلیا فون کر کے اپنے والدین سے بات کی پھر ممی کی بات خالہ سے بھی کروائی۔ ممی خوش اور مطمئن تھیں کہ وہ خالہ سے ملنے بہاول پور آئی ہے۔

اب ان دونوں کو کل کا انتظار تھا کیونکہ کل انہوں نے نور محل دیکھنے جانا تھا۔

☆☆☆

کھجور کے باغات میں گھرا ہوا کشمیری چائے کے رنگ جیسی گلابی دیواروں اور سنگ مرمر جیسے سفید گنبدوں والا نور محل خوب صورتِ فن تعمیر کی اعلیٰ مثال اور شان و شوکت کا مظہر تھا۔ محل کے سرسبز باغ میں کھجور کے بے شمار درخت تھے جو پھلوں کا بوجھ اٹھائے کھڑے تھے۔ محل کے باہر سرخ رنگ کی بگھی بھی کھڑی تھی اور ایک کینٹین بھی تھی جہاں سیاحوں کے لیے کھانے پینے کا سامان موجود تھا۔

ارما، عائلہ اور عالیان کھجور کے باغ سے گزرتے ہوئے محل کی طرف چلتے جارہے تھے۔

''یہ محل کسی زمانے میں ایک نواب نے اپنی بیگم کے لیے بنوایا تھا۔'' عالیان نے محل کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔

''نواب اپنی بیگمات سے کتنی محبت کرتے تھے کہ بیگم کی محبت میں عالیشان محل تعمیر کروا دیا۔ واہ بھئی واہ..... محبت ہو تو ایسی ہو۔'' عائلہ مرحوم نواب کی محبت کے جذبے سے متاثر ہو کر بولی۔

''نوابوں کا رومانس بھی فیری ٹیلز جیسا ہوتا تھا۔'' ارما نے بے حد شاندار محل کی طرف دیکھتے ہوئے ستائشی انداز میں کہا۔

عالیان نے ہولے سے سر جھٹکا۔

''ان کی کوئی ایک بیگم تھوڑی.... ہوتی تھی۔ انہیں تو جو بھی خاتون پسند آتی تھی وہ اس سے شادی کر لیتے تھے مگر ہر بیگم کے لیے وہ محل نہیں بنواتے تھے۔ یہ عنایت تو صرف خاص بیگم کے لیے ہی ہوتی تھی۔'' عالیان نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''بڑی عالیشان اور شاندار زندگیاں گزار کر گئے ہیں نواب وغیرہ۔'' عائلہ نے موبائل سے محل کے اونچے میناروں کی تصویر اتارتے ہوئے کہا۔

''زندگی جیسی بھی گزرے، انسان کی آخرت اچھی ہونی چاہیے۔'' عالیان نے اپنے استاد ہونے کا ثبوت دیا۔

''ہاں جی، اصل فلسفہ ہی یہی ہے استاد صاحب۔'' عائلہ نے اسے چھیڑا۔

وہ ہولے سے مسکرا دیا۔

''نور محل کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ محل ایک نواب نے اپنی بیگم کے لیے تعمیر کروایا تھا مگر اس کی بیگم نے اس محل میں صرف ایک رات ہی گزاری۔ وہ اس محل کی خوب صورتی سے متاثر تو ہوئی تھی مگر جب اس نے محل کی کھڑکی سے باہر کا نظارہ دیکھا تو اس کی نگاہ سامنے نظر آتے قبرستان پر پڑی پھر وہ اگلے ہی دن اس محل سے چلی گئی اور نور محل بہت عرصے تک خالی پڑا رہا۔'' عالیان نے مزید معلومات فراہم کیں۔

وہ لوگ اب سیڑھیاں چڑھ کر محل کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ محل کا انٹیریئر بھی خوب صورت تھا۔ نقش و نگار والے فرش پر ستارے کی شکل کے پھول بنے ہوئے تھے۔ چھت پر فانوس روشن تھے اور چھت مختلف رنگوں کے نقش و نگار سے آراستہ تھی۔ دیواروں پر مختلف دور کے نوابوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔

لکڑی کی میزیں، کرسیاں اور صوفے، سنہری اور میرون امتزاج کے پردے، قیمتی اور انٹیک چیزیں، خوب صورت فریموں میں قید تصویریں، فرنیچر ایسا مضبوط اور دیدہ زیب تھا کہ آج بھی صحیح سلامت موجود تھا۔ اوپر کی منزل پر راہداریاں بھی نظر آ رہی تھیں یقیناً اس کی مین ٹین کا بھی خیال رکھا جا رہا تھا۔

یہ ایک وسیع و عریض ہال تھا جہاں شاید دربار لگا کرتا تھا، ہال کے آخری سرے پر ذرا اونچائی پر نواب کی کرسی بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ تینوں ہال میں چلتے ہوئے کونے میں رکھے پیانو کے پاس آ کر رک گئے۔

''تو نواب پیانو بھی بجایا کرتے تھے، واہ جی۔'' ارما نے ستائشی انداز میں پیانو کی سطح کو دھیرے سے چھوتے ہوئے کہا۔

''نواب انگلستان بھی جایا کرتے تھے۔ وہیں سے پڑھ لکھ کر آتے تھے تو ظاہر ہے کہ پیانو بھی بجاتے ہوں گے۔ اس محل کے انٹیریئر کا زیادہ تر سامان انگلینڈ اور اٹلی سے منگوایا گیا تھا۔ یہ پیانو بھی کہیں باہر سے ہی آیا تھا۔'' عالیان پیانو کے قریب کھڑے ہو کر جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔

''ارما! تمہیں یاد ہے جب تم مجھے انگلش کلاسک ناولز کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں جن میں ریاست کا شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو کر ادھر اُدھر گھومتا پھرتا تھا۔ اس کا بھی ایسا ہی عالیشان محل تھا..... جہاں اس کی ماں اور نانی ایسا ہی پیانو بجایا کرتی تھیں۔ ارما کی کہانیاں سنتے، سنتے میں بھی فیری لینڈ کی سیر پہ نکل جایا کرتی تھی۔ اس محل میں آ کر مجھے بچپن میں سنی تمام کہانیاں یاد آ گئیں۔'' عائلہ نے اِک جذب کے عالم میں کہا۔ ارما محو سے انداز میں اس پیانو کو دیکھے ہی تھی۔ وہ اسے بتا نہ سکی کہ وہ فیری لینڈ آج بھی اس کے اردگرد کہیں موجود تھا۔ دنیا کے تلخ حقائق سے فرار حاصل کرنے کے لیے وہ اب بھی کوئی کتاب کھولتی اور اپنے فیری لینڈ میں گم ہو جاتی۔

''حیرت ہے، بچپن میں لوگ اپنی دادی یا نانی سے کہانیاں سنتے ہیں اور تم نے یہ کہانیاں اپنی دوست سے سنیں۔'' وہ ارما پر اچٹتی نظر ڈال کر حیرت سے بولا۔

''بتایا تو تھا کہ ارما کو بچپن سے ہی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا، فارغ اوقات میں یہ ہمیشہ لائبریری میں

بیٹھی ملتی اور جو بھی کتاب پڑھتی اس کی کہانی مجھے ضرور سنایا کرتی، اسکول میں بریک کے وقت جب ساری کلاس کینٹین کے آگے جمع ہوتی تو ہم دونوں گراؤنڈ میں درخت کے نیچے بیٹھ کر لنچ کرتے ہوئے کہانیوں کو ڈسکس کیا کرتے تھے۔'' عائلہ نے مسکرا کر کہا۔

''عجیب بات ہے۔'' وہ کندھے اچکا کر بولا۔

ارمانے اشتیاق بھرے انداز میں دھیرے سے پیانو کو بجایا۔ ''کبھی مجھے بھی شوق تھا کہ ہمارے گھر بھی ایسا ہی پیانو ہوتا جسے میں بجایا کرتی۔'' اس نے دلچسپی سے پیانو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''پیانو کو باقاعدہ سیکھنا پڑتا ہے۔ صرف انگلیاں چلانے سے ہی بجایا نہیں جاتا۔'' عالیان نے پھر دخل اندازی کی۔

عائلہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

''ہر بات میں تمہارا کمنٹری کرنا ضروری ہے کیا؟'' اس نے اسے ٹوکا

وہ ذرا خفا ہوا۔

''یعنی تم لوگوں کو یہاں کی چیزوں کے بارے میں بتا رہا ہوں۔ ایک تو میں اپنا قیمتی وقت نکال کر تم لوگوں کا گائڈ بن کر آیا ہوں۔ اوپر سے مجھے کمنٹری کرنے کے طعنے بھی مل رہے ہیں۔ بہت خوب بھئی..... مہمان ہوں تو ایسے ہوں۔'' وہ تپ گیا۔

''اوہو سوری بھئی..... ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ تم تو ذرا، ذرا سی بات مائنڈ کر لیتے ہو۔'' عائلہ نے فوراً اسے منانے کی کوشش کی۔ وہ میزبان تھا، وہ اسے ناراض کرنے کا رسک بھی نہیں لے سکتی تھیں۔ ارمانے بھی بات بدلنے کی کوشش کی۔

''وہ دیکھو وہاں شاید دربار لگا کرتا تھا۔ اونچائی پر نواب کی کرسی بھی پڑی ہے۔'' ارمانے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، دربار تو یہاں لگا ہی رہتا ہوگا۔ آخر نواب پوری ریاست کا انتظام چلاتے تھے۔'' عائلہ نے دور سے نظر آتی سلور رنگ کی بادشاہوں والی کرسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''1947ء میں ریاست بہاول پور نے پاکستان کے ساتھ الحاق کیا تھا پھر 1956ء میں یہ ریاست آزاد ہوگئی تھی اور اس کا سارا کنٹرول حکومت پاکستان کے پاس چلا گیا۔ اس محل میں قائداعظم بھی اکثر آیا کرتے تھے اور وہ ریاست کے نواب، سر صادق کے دوست بھی تھے۔'' عالیان دربار کی طرف چلتے ہوئے بولا۔ عالیان کی معلومات قابل رشک تھیں۔

''اچھا! تو یہ ایک تاریخی جگہ بھی ہے۔'' عائلہ نے عالیان کی تقلید میں چلتے ہوئے بے ساختہ کہا۔

''ہاں، قیام پاکستان کی جدوجہد میں ریاست بہاول پور کے نوابوں کا بھی بڑا کنٹری بیوشن ہے۔ انہوں نے تحریک پاکستان میں بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔'' عالیان نے مزید معلومات سے آگاہ کیا۔

''عالیان! تمہارے پاس تو اس حوالے سے بڑی معلومات ہیں۔ تم کوئی کتاب کیوں نہیں لکھ لیتے!'' عائلہ خوشگوار انداز میں بولی۔

وہ اس کی بات پر دھیرے سے ہنسا۔

''میرے پاس یہ معلومات اس لیے ہیں کیونکہ میں اس شہر میں رہتا ہوں۔'' وہ دیوار کے ساتھ، ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

ارما اور عائلہ دیوار پر لگی نوابوں کی تصویریں دیکھنے لگیں جن پر ان کے نام اور ان کے متعلق کچھ معلومات تحریر تھیں۔ عائلہ بے اختیار ایک تصویر کے سامنے ٹھہر گئی۔

''نواب محمد بہاول خان عباسی''

عائلہ دیوار پر لگی نواب کی تصویر کے نیچے لکھے نام کو پڑھنے لگی۔

نارنجی رنگ کے شاہی لباس میں ملبوس نواب نے ایک ہاتھ میں تلوار تھام رکھی تھی، دوسرا ہاتھ اپنے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا اور وہ گہرے سبز رنگ کے صوفے پر بڑی شان سے براجمان تھا۔ اس نے گلے میں موتیوں کے ہار پہن رکھے تھے اور سر پر شاہی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ وہ

مناسب داڑھی مونچھوں والے خوبرو اور خوش شکل نوجوان کی تصویر تھی۔

''شاید یہی وہ نواب ہے جس کے نام پر اس ریاست کا نام بہاول پور رکھا گیا تھا۔'' عائلہ نے اس نواب کی تصویر کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔

''یہ دیکھو! نواب صادق کی تصویر ہے، قیامِ پاکستان کے وقت یہی بہاول پور کے نواب تھے اور انہوں نے بہاول پور کی ترقی کے لیے بہت کام کیے۔ صادق پبلک اسکول بھی انہوں نے بنوایا تھا۔'' عالیان ذرا فاصلے پر ایک اور تصویر کے پاس ٹھہر گیا تھا۔

اور تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔ اس تصویر کے نیچے تحریر تھا۔ نواب سر صادق محمد خان عباسی ..... یہ ایک بہت ہی .... بارعب نوجوان کی تصویر تھی جو سنہرے رنگ کی شیروانی زیب تن کیے ہاتھ میں تلوار تھامے بڑے رعب و دبدبے کے ساتھ بیٹھا تھا۔ انگلی میں سرخ یاقوت کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ سر پر ہلکے آسمانی رنگ کی پگڑی تھی جس کے وسط میں زمرد چمک رہا تھا اور کسی پرندے کا سفید پر بھی سجا ہوا تھا۔ سنہری شیروانی پر سنہرے رنگ کے بٹن بھی نمایاں نظر آرہے تھے۔

''یار یہ نواب تو بڑے ہینڈسم اور خوب صورت ہوتے تھے۔'' عائلہ کے عقب میں کھڑی ارما نے نوابوں کی تصاویر دیکھتے ہوئے ستائشی انداز میں کہا۔

''ظاہر ہے، اتنی دولت ہوتی تھی ان کے پاس، پوری ریاست کے مالک تھے۔ سونے، چاندی میں کھیلتے تھے، نوکر چاکر ان کے آگے پیچھے پھرتے رہتے اور خدمت گاروں کی فوج ہر دم تیار رہتی تھی۔ جاگیریں، زمینیں، باغات، روپے پیسے کی ریل پیل، نہ فکر نہ فاقہ، نہ نوکری کی ٹینشن، نہ روزگار کی فکر، نہ وہ دھوپ میں خوار ہوتے تھے ...خوب صورت تو ہونا ہی تھا انہوں نے۔'' یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ عالیان خاموش رہ پاتا۔ اب تو وہ دونوں اس کی اس انداز کی کمنٹری کی عادی ہو گئی تھیں۔ عالیان انہیں معلومات دینے کا فرض جو پورا کررہا تھا۔

''اس طرف میوزیم بھی ہے۔ چلو آؤ اس طرف چلتے ہیں۔''

عالیان بڑی دلجمعی سے انہیں معلومات بہم پہنچا رہا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں پر سنہری اور میرون پردہ لگا ہوا تھا اور وہاں سے لوگ گزر کر میوزیم میں جارہے تھے۔ عالیان ان کے آگے، آگے چلنے لگا۔ وہ دونوں اس کی تقلید میں چلتے ہوئے ہال کی دوسری طرف بنے حصے کی طرف چلی آئیں جہاں میوزیم تھا۔

''اس محل میں سب سے خوب صورت اور قیمتی چیز خانہ کعبہ کا یہ سیاہ غلاف ہے۔'' عالیان ایک جگہ احتراماً رک گیا۔

خانہ کعبہ کا سیاہ غلاف ایک بڑی سی شیشے کی الماری میں موجود تھا۔ سیاہ رنگ کی اپنی ہی ایک خوب صورتی ہوتی ہے۔ اور اب جبکہ اس کی نسبت اتنی مقدس جگہ سے تھی تو وہ دونوں شوق، احترام اور دلچسپی سے سب چیزیں دیکھ رہی تھیں۔ احمد پوری گیٹ اور بوہری گیٹ کے ماڈل بھی بنے ہوئے تھے۔

''1946ء میں ریاست کے نواب نے ہاتھ سے لکھا گیا قرآن پاک کا نسخہ بھی پیش کیا تھا۔ یہ ریاست بہاول پور کو پاکستان میں شامل کرنے کا خوب صورت اظہار بھی تھا۔'' وہ بتاتا جارہا تھا۔

وہاں تصویروں کی گیلری بھی تھی جہاں بہاول پور میں تعمیر شدہ مختلف محلات کی تصویریں آویزاں تھیں۔ جن میں دربار محل، گلزار محل، فرخ محل اور نشاط محل فنِ تعمیر کا اعلیٰ شاہکار تھے۔ نوابوں کی اہم شخصیات کے ساتھ تاریخی تصاویر بھی موجود تھیں۔ نوابوں کے کپڑے، استعمال کی دیگر اشیا، ہتھیار، بندوقیں، تلواریں، پرانے سکے، کرنسی اور دیگر چیزیں موجود تھیں۔ ایک بورڈ پر ریاست بہاول پور کا نقشہ بھی موجود تھا۔ شیشے کے ایک ڈبے میں رانی صاحبہ کے زیورات اور چنری کے رنگین ملبوسات بھی رکھے ہوئے تھے۔ عائلہ نے بے حد

بھاری جھمکوں کو حیرت اور تجسس سے دیکھا۔

''اُف..... اتنے بھاری جھمکے..... انہیں نواب کی بیگم بھلا کیسے پہنتی ہوں گی؟'' وہ چھوٹے، چھوٹے پیالوں کی شکل کے بے حد بھاری بھرکم جھمکے تھے۔

''اس زمانے میں یہی فیشن ہو گا ناں! fashion mania ہر زمانے اور ہر دور میں موجود رہا ہے۔'' ارمانے زیورات کو اشتیاق سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھئی، یہ نواب کی بیگم کے زیورات ہیں اگر وہ ہلکی پھلکی جیولری پہن لیتی تو لوگ سو، سو باتیں نہ کرتے۔'' عالیان پھر بولا۔

''ہاں بھئی، زیورات status symbol بھی تو ہوتے ہیں اور یہ دیکھو! یہ شاید نولکھا ہار ہے، سونے اور سفید موتیوں سے بنا ہوا۔'' عائلہ نے شیشے کے ڈبے میں موجود سونے اور موتیوں سے بنے لڑیوں والے خوب صورت ہار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ سب چیزیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ ایک عظیم الشان سلطنت ہو گی اور لوگوں کا لائف اسٹائل بھی زبردست ہوگا۔'' عائلہ نے اندازہ لگایا۔

''میوزیم بنانے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ نئے دور کے لوگ پرانے زمانے کے لوگوں کے رہن سہن، طرزِ معاشرت اور اطوار زندگی کو جان سکیں۔ پرانی چیزوں کو محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ یہ بھی تو قومی اور قیمتی اثاثے ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے کی چیزیں دیکھ کر ہم ہسٹری میں جھانک سکتے ہیں۔'' وہ جیز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ پھر کچھ دیر بعد، کچھ مزید چیزیں دیکھنے کے بعد وہ لوگ میوزیم والے حصے سے ہال کی طرف آ گئے۔ ''اس طرف نواب کا بلیئرڈ روم بھی ہے۔ نواب بلیئرڈ بھی کھیلا کرتے تھے۔ آؤ چل کر دیکھتے ہیں۔'' ذرا آگے آتے ہوئے عالیان نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ جاؤ دیکھ آؤ، میں یہیں ہوں۔'' ارما وہیں ٹھہر گئی۔

کورونا وائرس کے باعث پیدا ہونے والی صورت حال

☆دن تو ایسے گزر رہے ہیں جیسے انتظار کی سی کیفیت۔ جیسے ابھی کچھ رکنا ہے۔ ابھی کچھ ہوگا۔ اس طرح کی صورتِ حال ہے کورونا کے اس قدر کیسز سننے میں آ رہے ہیں۔ ہمارے اسکول کی میڈم جوان ہیں۔ ان کو کورونا کا اٹیک ہوا اور لنگر ختم ہو گئے۔ سامنے والوں کو بھی ہو گیا۔ برابر والوں کو بھی ہو گیا۔ میں اس قدر ذہنی تناؤ کا شکار ہوں بتا بھی نہیں سکتی۔ راتوں کو نیند نہیں آتی۔ عجیب سی بے چینی کا عالم ہے، ایک خوف ہے میں اپنے شوہر فرخ سے کہہ رہی تھی کہ ہم سب مرنے والے تو نہیں..... مجھے مرنے سے نہیں محبت کرنے والوں سے ڈر لگتا ہے۔ فرخ کو سوچتی ہوں یہ دل کے مریض ہیں، دل کے مریضوں کے لیے تو کورونا بہت خطرناک ہے۔ سب ایک جگہ عجیب سی صورتِ حال میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بیٹی انوشہ سولہ سال کی ہوگئی ہے وہ پڑھ رہی ہے، اپنا کیریئر بنا رہی ہے۔ اسے ہمیشہ پڑھتے پڑھاتے کچھ سیکھتے سکھاتے دیکھا۔ اب ایسا لگتا ہے کہ وہ انتظار کی کیفیت میں ہے۔ ہمارے اسکول میں بھی صرف دو دن بلا رہے ہیں کہ آن لائن کلاسز لے کر چلی جائیں۔ اسکول سے آ کر کپڑے بھی بدل لیتی ہوں سینیٹائزر اور ماسک بھی استعمال کر رہے ہیں لیکن کہہ نہیں سکتے کس جگہ سے جراثیم لگ جائیں۔ میں زبردستی سوتی ہوں، اپنے آپ کو بہلا کر نمازیں پڑھتی ہوں اور انتظار کی کیفیت میں رہتی ہوں کہ کب کورونا ختم ہوتا ہے۔ دس کام رکے ہوئے ہیں ملنا ملانا کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔

شازیہ فرخ..... دبئی

☆دن تو ظاہر سی بات ہے زیادہ تر اب گھر میں ہی گزر رہا ہے۔ اپنوں کے ساتھ، بچوں کے ساتھ، اپنی فیملی کے ساتھ۔ دوسرے یہ کہ وقت پر نماز پڑھ رہے ہیں، تبدیلی یہ آئی کہ عبادات میں زیادہ پنکچوئیل ہو گئے۔

عطیہ عاصم گھریلو خاتون۔ شارجہ

اس کی نظر لکڑی کی میز پر رکھے انٹیک ٹائم پیس پر پڑی جس کے قریب رکھا لیمپ روشن تھا اور میز پر فریم شدہ تصویریں بھی رکھی تھیں، وہ دھیرے سے چلتے ہوئے اس میز کے قریب آ گئی۔

عائلہ اور عالیان بلیرڈ روم دیکھنے چلے گئے۔

وہ میز کے قریب کھڑی سرمئی رنگ کے اس منفرد انٹیک ٹائم پیس کو دیکھنے لگی۔ وہ ایک عورت کا مجسمہ تھا اور وہ اپنے کندھے پر دامکن رکھے بیٹھی تھی۔ اس کے پیچھے پروں والا ایک ننھا منا سا بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی کوئی ساز تھا اور اس ساز کے نیچے گول گھڑی تھی۔ اس خوب صورت ٹائم پیس کے اوپر لیمپ روشن تھا جس کی روشنی میں یہ حسین شاہکار اور بھی دلفریب لگ رہا تھا۔

یک دم اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہوا ہے۔ اسے اپنی پشت پر قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی مگر وہ انٹیک ٹائم پیس کی خوب صورتی میں کھوئی رہی۔

''کیسی ہیں آپ؟'' اِک جانی پہچانی سحر انگیز مردانہ آواز سنائی دی جس کی بازگشت سارے محل میں گونجنے لگی۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت رہ گئی۔ یوں جیسے اس میں ایک قدم اٹھانے کی یا گردن موڑ کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ ہو۔ اس آواز کے سراب نے اس محل میں بھی اس کا تعاقب نہیں چھوڑا تھا۔ کیا پہاڑوں پر ملنے والا اجنبی شہزادہ اس محل میں بھی آ گیا تھا! بھلا یہ کیسے ممکن تھا؟

وہ اپنی جگہ حیران اور دم بخود کھڑی رہی۔ وہ دھیرے سے چلتے ہوئے اس کے سامنے آ گیا۔ وہ وہی تھا جسے وہ ناران کی سبز وادیوں میں ملی تھی۔ کبھی بادام خریدتے ہوئے، کبھی جھیل سیف الملوک کے کنارے، کبھی قیمتی پتھروں کی دکان پر زمرد خریدتے ہوئے، جس کی ایک نظر نے اس کے دل کے اس کونے کو چھوا تھا جہاں صدیوں سے اندھیرا تھا، وہ اس کی یاد کو ایک قیمتی راز کی طرح اپنے ساتھ لیے آ گئی تھی۔

نیلی جینز پر سفید شرٹ پہنے وہ بڑے اعتماد سے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی سنہری آنکھوں میں فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور وہ اس کی حیران آنکھوں میں دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہ پلک تک نہ جھپک سکی۔

شہزادہ محل میں داخل ہو گیا تھا اور حیرت زدہ کھڑی شہزادی کے عین سامنے موجود تھا۔ وہ جیسے کسی فیری لینڈ میں گم ہو گئی۔

عالیشان محل، کونے میں پڑا پیانو، چھت پر چمکتے فانوس، رنگین فرش، لہراتے پردے، اِک شہزادہ اور ایک شہزادی۔

''کیسا لگا آپ کو یہ محل؟'' وہ اس کی حیران، پریشان آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بھاری اور سحر انگیز آواز میں بولا۔

یہ آواز اسے خوابوں کی دنیا سے باہر لے آئی.....

سراب نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ وہ اس کے چہرے پر بکھری حیرت کے رنگوں کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ نارنجی لباس پر سرخ دوپٹا اوڑھے، لمبے بالوں کو کیچر میں باندھے وہ اسے اتنی خوب صورت لگی کہ وہ اس پر سے نظریں نہ ہٹا پایا۔ اس کی آنکھیں دیکھنے والا کوئی بھی شخص یہ اندازہ بہ آسانی لگا سکتا تھا کہ سنہری رنگت اور سیاہ چمک دار بالوں والی یہ لڑکی اس کے دل میں رہتی ہے۔ وہ اس کی گہری نظروں کے ارتکاز سے بوکھلا گئی۔

''آپ یہاں کیسے؟'' اس کے منہ سے .... بے ساختہ یہ جملہ نکلا۔ اب اسے کچھ تو کہنا ہی تھا۔ کب تک یوں ساکت و صامت کھڑی رہتی۔ اس نے دل میں سوچا کہ وہ بھی کیا سوچتا ہوگا کہ یہ لڑکی اسے دیکھ کر شاک کے عالم میں کیوں چلی گئی۔ وہ اس کے دل کی کیفیات سے باخبر جو نہیں تھا۔

''میں بھی آپ کی طرح نور محل دیکھنے آیا ہوں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گمبھیر آواز میں مسکرا کر بولا۔ وہ ایسی اپنائیت سے بات کر رہا تھا جیسے وہ دونوں برسوں پرانے شناسا ہوں۔ نہ جانے اجنبیت کی خلیج کب عبور ہو گئی۔ اسے پتا ہی نہ چلا۔

''یہ ایک عجیب اتفاق ہے۔'' وہ کانپتے لبوں سے مسکرائی۔

''کچھ اتفاقات واقعی بہت عجیب ہوتے ہیں کہ ان پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں نے آپ کو یہاں کھڑے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس محل میں کوئی شہزادی کھڑی ہے۔ دنیا کی فکروں سے ماورا اور اپنے دھیان میں گم۔'' وہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہا تھا۔

اتنی سی ملاقات میں بھی اس کا مشاہدہ غضب کا تھا۔ وہ اس سے خوف زدہ ہوگئی تھی اور اپنے اس خوف کو چھپانے کے لیے دوبارہ اس گھڑی کو دیکھنے لگی۔ اس نے دل میں سوچا کہ ایسا تو کہانیوں میں ہوتا ہے۔ کہانیوں کی وہ کتابیں جو اس کے کمرے کی الماری میں پڑی رہتی تھیں۔ ہر ناول کی اپنی اِک کہانی ہوتی، اپنے کردار ہوتے..... جنہیں پڑھتے ہوئے وہ اس کہانی کی کتاب میں گم ہو جایا کرتی۔

اتنے میں عالیان اور عائلہ ہال میں آگئے۔ ارما کے ساتھ سالار کو کھڑے دیکھ کر عائلہ کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ایک پل کے لیے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آیا۔

''اوہ..... یہ شخص یہاں کیسے؟'' وہ دور سے سالار کو دیکھتے ہوئے حیرت اور بے یقینی سے بولی۔

''کون ہے یہ؟'' عالیان نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے بے ساختہ چونک کر پوچھا۔ وہ بھی ارما کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ چکا تھا۔ عائلہ ایک لمحے کے لیے تذبذب میں پڑ گئی۔ بعض دفعہ کسی کا تعارف کروانا بے حد... مشکل ہوتا ہے۔

''یہ شخص ہمیں ناران میں ملا تھا۔ اب اسے یہاں بہاول پور میں دیکھ کر میں حیران رہ گئی ہوں۔'' اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''اچھا، اسٹرینج.....'' وہ اس اجنبی کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں، معلوم نہیں کہ یہ یہاں کیسے آگیا۔'' عائلہ اور عالیان ارما کے قریب آگئے۔

''ارے آپ یہاں! آپ سے تو ہماری ملاقات ناران کی وادیوں میں ہوئی تھی ناں۔'' عائلہ نے پاس آکر سالار سے کہا۔

سالار نے گردن موڑ کر عائلہ اور عالیان کو دیکھا پھر وہ خیر مقدمی انداز میں مسکرایا۔

''جی ہاں، دراصل میری ایک ٹریول کمپنی ہے اور میں ہر ہفتے ٹورلے کر کہیں نہ کہیں جاتا ہوں۔ اس بار ہم لوگ بہاول پور آئے ہیں۔'' اس نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کیا نام ہے آپ کی ٹریول کمپنی کا؟'' عائلہ کو ساری بات سمجھ آگئی۔

''مسافر کہانی ٹورز اینڈ ٹریولز۔'' اس نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ اعتماد سے جواب دیا۔

''ویری نائس..... پھر ہم بھی آپ کے ساتھ کوئی ٹرپ جوائن کریں گے، آپ کا اگلا ٹور کہاں کا ہے؟'' عائلہ نے پرجوش انداز میں کہا۔

''دراصل شمالی علاقہ جات میں موسم کی خرابی اور لینڈ سلائڈنگ کی وجہ سے ہمارے سارے ٹورز کینسل ہو گئے ہیں مگر آپ میرا کارڈ رکھ لیں، اس پر میرا فون نمبر بھی لکھا ہے، نیکسٹ ٹرپ کے بارے میں آپ کو اپ ڈیٹ کرتا رہوں گا۔ میرا نام سالار خان ہے۔'' وہ جینز کی جیب سے ایک کارڈ نکال کر عائلہ کی طرف بڑھاتے ہوئے شائستگی سے بولا۔

''ٹھیک ہے، ہم آپ کے ساتھ رابطے میں رہیں گے۔ میں عائلہ ہوں، یہ میری فرینڈ ارما ہے اور یہ میرے کزن عالیان ہیں۔ ہم دراصل ان ہی کے گھر آئے ہوئے ہیں۔'' اس نے وہ کارڈ تھامتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

عجیب بات تھی کہ ناران کی وادیوں میں وہ انہیں ایک مغرور شخص لگا تھا مگر اب اس محل میں وہ بہت با اخلاق اور شائستہ اطوار کا حامل انسان لگ رہا تھا۔

''خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر۔'' سالار کا چہرہ بتا رہا تھا کہ یہ جملہ رسمی نہیں تھا۔

عائلہ کی نظر اس کے ہاتھوں پر پڑی، اس کے ہاتھ میں وہ انگوٹھی نہیں تھی جو اس نے ناران بازار سے خریدی تھی۔

''آپ کی وہ رنگ ہمیں بہت پسند آئی تھی جس میں تین رنگوں والا قیمتی پتھر جڑا ہوا تھا۔'' عائلہ نے یک دم کہا۔ وہ چونکا۔

''وہ انگوٹھی کہیں کھو گئی۔ شاید راستے میں ہی کہیں گر گئی۔'' اس نے کچھ حیران ہوتے ہوئے جواب دیا۔

اس بات پر وہ دونوں چونکیں اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

''میں چلتا ہوں۔ میرا گروپ مجھے ڈھونڈ رہا ہو گا۔'' وہ یک دم بولا اس کی نظر عالیان پر پڑی جو بہت غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''او کے مسٹر سالار! نائس ٹو میٹ یو۔'' عائلہ نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ ارما کو بھی مسکرانا پڑا۔ وہ چند الوداعی جملے ادا کرنے کے بعد ارما پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ وہ وہیں کھڑی اسے محل کے صدر دروازے سے باہر جاتا دیکھتی رہی۔

''اچھا تو اس کی ٹریول کمپنی ہے۔ اسی لیے ہر جگہ گھومتا پھرتا ہے۔ ارما..... تم بھی تو اسے یہاں دیکھ کر حیران رہ گئی ہو گی۔'' عائلہ نے ہاتھ میں تھاما کارڈ پرس میں رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' وہ غائب دماغی کے عالم میں بولی۔

کہانی کی کتاب میں سے باہر آنے میں اسے تھوڑا وقت لگا۔

''کبھی، کبھی ایسے اتفاقات ہو جاتے ہیں۔'' عالیان دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔

وہ بے خیالی میں چلتے ہوئے عالیان اور عائلہ کی تقلید میں باہر آ گئی۔ محل کے دوسری طرف بنے لان میں گھڑ سواری ہو رہی تھی۔

''کسی نے گھوڑے پر بیٹھنا ہے؟ تم دونوں میں سے کسی کو رائڈنگ کا شوق ہے؟'' عالیان نے دور نظر آتے گھوڑے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' ارما نے مختصر جواب دیا۔

''کینٹین سے کچھ کھانا پینا ہے کیا؟'' عالیان نے پھر پوچھا۔

''نہیں، بس گھر چلو..... خالہ نے کھانا بنایا ہوا ہے۔ کینٹین سے کچھ کھالیں گے تو کھانا نہیں کھایا جائے گا۔'' عائلہ نے کہا۔

''او کے..... چلو۔'' وہ کھجور کے باغ سے گزرتے ہوئے پارکنگ کی طرف جا رہے تھے۔

ارما خاموش تھی اور اس اتفاق کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ یہ کیسے ہوا۔ پہاڑوں سے واپس آنے کے بعد اکثر اسے اس اجنبی کا خیال آتا تھا، کتنے دن تک وہ خوابوں میں بلند پہاڑ اور سبز وادیاں دیکھتی رہی تھی پھر اس نے سوچا کہ سفر سے واپس آنے کے بعد انسان اتنی جلدی اس سفر کے ٹرانس سے باہر نہیں آ پاتا۔

وادیوں کے اس سفر کو یاد کرتے ہوئے اس کا دل اس اجنبی کی یاد پر بھی دھڑکتا تھا مگر اسے امید نہیں تھی کہ وہ کبھی اس سے یوں سرِ راہ مل سکے گی۔ کہاں ناران، کاغان کی وادیاں، کہاں بہاول پور کا نور محل..... لوگ صحیح کہتے ہیں کہ دنیا گول ہے۔ یہاں لوگ ملتے ہیں بچھڑتے ہیں اور بچھڑ کر پھر مل جاتے ہیں۔

وہ تو اسے یاد کرتے ہوئے بھی ڈرتی تھی کہ ایک اجنبی کو بھلا کیا یاد کرنا..... مگر اس سراب کی پرچھائیاں ہر وقت اس کے اردگرد منڈلاتی رہتی۔ اسے اس کی وہ نگاہ یاد آتی جو آج بھی اس کے دل میں کسی جگنو کی طرح روشن تھی اور وہ بھی اسے بھولا نہیں تھا۔ اس لیے تو اس نے اسے فوراً پہچان لیا تھا۔ وہ اسے جس انداز سے دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں اس کے لیے وارفتگی کی جو روشنی تھی اس سے یہی لگا کہ صرف وہی اس کے بارے میں نہیں سوچتی تھی بلکہ وہ بھی اپنے ذہن سے اسے نکال نہیں پایا تھا۔

کوئی رابطہ تھا ان دونوں کے درمیان جسے وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔

نور محل کے خوب صورت عکس کو اپنے دل میں قید

کیسے جب وہ دونوں گھر آئیں تو سالار کے بارے میں ہی باتیں کررہی تھیں۔

''کیسا عجیب اتفاق تھا۔ میں نے تو جب اس لڑکے سالار کو تمہارے پاس کھڑے دیکھا تو حیران ہی رہ گئی۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو اسے حیرت کا جھٹکا ہی لگتا۔'' عائلہ نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، میں تو اسے محل میں دیکھ کر اتنی حیران رہ گئی کہ کیا بتاؤں، کتنی ہی دیر تک تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا، لگتا ہے کہ اسے بھی ہماری طرح سیاحت میں دلچسپی ہے اور شاید اسی لیے اس نے سیر و سیاحت کے پروفیشن کا انتخاب کیا ہے۔'' ارما الماری میں کپڑے رکھتے ہوئے بولی۔

''تو پھر ہم بھی اس کے ساتھ کسی ٹرپ پر چلتے ہیں۔'' عائلہ نے خیال ظاہر کیا۔

''ہاں، اسے فون کرکے پوچھ لیں گے۔ کہہ تو رہا تھا کہ اگلے ٹورز کے بارے میں اپ ڈیٹ کرتا رہے گا۔ پاکستان اتنا خوب صورت ملک ہے کہ اسے explore کرتے، کرتے مہینوں اور سالوں گزر جاتے ہیں۔'' ارما نے کہا یہ خواہش تو اس دل میں بھی تھی۔

''ویسے ہم نے اس سے کوئی ذاتی سوال نہیں پوچھا کہ وہ کہاں رہتا ہے؟ مزید کیا کرتا ہے؟ کتنے عرصے سے وہ اس پروفیشن میں ہے، ناران کی وادی کے بعد نور محل میں اچانک ہمیں دیکھ کر اسے کیسا لگا اور بھی بہت ساری باتیں تھیں جو ہم نے اس سے نہیں پوچھیں۔'' عائلہ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''ذرا دیر کی ملاقات میں اتنی ساری باتیں تو پوچھی نہیں جاسکتیں ناں۔'' ارما نے بے ساختہ کہا۔

سالار کے بارے میں تجسس تو اسے بھی تھا مگر وہ اچانک اسے سامنے دیکھ کر حواس باختہ ہوگئی تھی کہ چاہنے کے باوجود کوئی سوال نہ کرپائی۔

''ہاں، یہ بھی ہے اور دیکھو، اس کی وہ انگوٹھی بھی کہیں گم ہوگئی جو اس نے ناران بازار سے بنوائی تھی ہو بہو ویسی ہی انگوٹھی ہمیں کاغان میں بی بی جان کے گھر سے ملی تھی۔ عجیب بات ہے ناں۔'' عائلہ نے کہتے ہوئے پرس میں سے سالار کا دیا گیا کارڈ نکالا اور موبائل میں اس کا نمبر فیڈ کرنے لگی۔

''مگر وہ انگوٹھی تو کسی شندور خان کی تھی۔'' ارما نے بے ساختہ کہا۔ عائلہ کے چہرے پر سوچ کا عکس اترا۔

''پتا نہیں کیوں مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس چاندی کی انگوٹھی میں کوئی راز تھا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے مگر اب اس راز کے بارے میں کیسے پتا لگایا جائے؟'' وہ چونک کر بولی۔

''لیڈیز کھانے کے لیے آجائیں۔'' عائلہ دروازے کے پاس آکر بولا۔

''آرہے ہیں۔'' عائلہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے جواباً کہا۔ ان کی گفتگو ادھوری رہ گئی وہ دونوں لاؤنج میں چلی آئیں۔

خالہ نے کھانے پر بہت اہتمام کیا ہوا تھا۔ قیمہ بھرے کریلے، گرم چپاتیاں اور بادام کی کھیر۔ خالہ محبت اور خلوص سے ان دونوں کی پلیٹوں میں خود سالن ڈال رہی تھیں۔ ارما نے ان کی اپنائیت کو دیکھ کر دل میں سوچا کہ عائلہ خوش قسمت تھی جو اسے اتنی محبت کرنے والی خالہ ملی تھیں۔ ایک اس کی شبو خالہ تھیں، جن کی پیشانی پر ہمیشہ اسے دیکھ کر بل ہی پڑے رہتے، جنہوں نے دنیا دکھانے کو بھی کبھی محبت، پیار اور خلوص کا مظاہرہ نہیں کیا تھا جن کے چہرے پر ہمیشہ گلے شکوے ہی تحریر ہوتے۔ اسے عائلہ پر رشک آیا۔ اسے تو ویسے بھی دوسروں پر رشک کرنے کی عادت تھی۔ شاید یہ اس کے اندر کے complexes اور خوف تھے جو اسے دوسروں پر رشک کرنے پر مجبور کرتے۔

کھانے کے بعد وہ ٹیرس پر چلی آئی پھر اس نے ازمیر کو فون ملایا۔ ازمیر کو فون کرنا بھی آج کل اس کی روٹین کا اہم ترین کام تھا۔

''ہیلو ازمیر، بتاؤ کیا خبریں ہیں؟ وہاں کے کیا حالات ہیں؟ جانوروں کے ڈاکٹر والا رشتہ ختم کرنے کا مشن کہاں تک پہنچا؟'' ازمیر نے جیسے ہی فون اٹھایا

ارما نے فوراً پوچھا۔

''کام بہت مشکل ہے میری پیاری آپی جان، اتنی جلدی یہ نیا پارٹنر نہیں لگے گی۔ سچ پوچھیں تو اِک چھوٹا سا آئی فون اس کام کے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔'' ازمیر نے صاف گوئی سے کہا۔ اسے یہ سن کر مایوسی ہوئی۔

''مجھے نہیں پتا کسی طرح اس جانوروں کے ڈاکٹر سے میرا پیچھا چھڑاؤ، تم نے وعدہ کیا تھا، اب اس وعدے کو نبھانا تمہارا فرض ہے۔'' وہ ضدی انداز میں بولی۔ اس مایوسی نے اس کے غصے کو بڑھا دیا تھا۔

''اسی کام میں دن رات مصروف ہوں مگر وہ ڈاکٹر صاحب آپ کی تصویر دیکھ کر ایسے جنونی عشق میں گرفتار ہو گئے ہیں کہ کوئی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہو رہی اور وہ تو پیچھے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہے۔ خیر میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ کچھ نہ کچھ بندوبست تو کر ہی لوں گا۔'' وہ اس کے غصے سے گھبرا گیا پھر اس نے اسے تسلی دی۔

''اگر تم نے اس آدمی سے میرا پیچھا چھڑا دیا ناں تو میں تمہارے لیے بہت سارے گفٹس لے کر آؤں گی۔'' اس نے اسے لالچ دیتے ہوئے کہا مگر وہ خوش نہ ہوا۔

''کون سے گفٹس؟ چاکلیٹ، ٹافیاں وغیرہ؟ جو آپ مجھے پانچ چھ سال پہلے بھیجتی تھیں۔ نہ بابا نہ مجھے ایسے گفٹس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تو بس کیش گفٹ پسند ہے۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔ ارما کے پاس اس کی بات مان لینے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

''میں تمہیں ففٹی تھاؤزنڈ دوں گی مگر تمہیں میرا یہ کام جلد کرنا ہوگا۔'' وہ اس کی ساری کمزوریوں سے واقف تھی اور حالات کا تقاضا یہی تھا کہ وہ کسی ایسی ہی سخاوت کا مظاہرہ کرتی۔ وہ خوش ہو گیا۔

''سچ؟ ارے اب تو میں جلد ہی اس مشن کو مکمل کر لوں گا۔ اپنی کلاس فیلو رمشہ کو بھی اس مشن میں شامل کرتا ہوں، اسے اس قسم کے ایڈونچرز کا شوق اور تجربہ ہے اور پھر اس پر میرے احسانات بھی بہت ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ بھی مجھ پر کوئی احسان کرے۔ میں اسے اس ڈاکٹر کے پیچھے لگاتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب جیسے رنگین مزاج آدمی کو وہ بہ آسانی بیوقوف بنا لے گی۔''

''ہاں تو کرو اس سے بات..... دن گزرتے جا رہے ہیں اور تمہارا پلان ہی فائنل نہیں ہو پا رہا ہے۔ امی، ابا کے بارے میں بتاؤ، ان کی کیا خیر خبر ہے؟'' ارما بری طرح جھنجلا گئی۔

''امی، ابا ابھی تک لاہور میں ہی ہیں۔ نانی کے ساتھ ان کی کافی لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ وہ دونوں کافی ناراض ہیں کہ آپ آسٹریلیا والی سہیلی کے ساتھ سیر سپاٹے کرنے بہاول پور کیوں چلی گئی ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''نانی سے میری بات ہوئی تھی مگر انہوں نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی شاید وہ مجھے پریشان نہیں کرنا چاہتی ہوں گی۔ امی کا فون آ رہا تھا مگر میں نے ریسیو نہیں کیا۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ گھر کے حالات اچھے نہیں ہیں۔'' وہ فکرمند ہوئی۔ اور وہ الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ سنجیدگی سے بولی۔

''اچھی خبر جیسے ہی مجھ تک پہنچے گی تو فوراً ہی آپ کو فون کر دوں گا مگر میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔'' ازمیر کو بھی اس کی پریشانی کا احساس تھا۔ وہ ذرا سنجیدہ ہوا۔

''وہ کیا؟'' وہ چونکی۔

''وہ یہ کہ ہم کب تک ایسے اوٹ پٹانگ رشتوں کو اس طرح کے پلان بنا کر نبھاتے رہیں گے۔ آپ کسی اچھے انسان سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟'' ازمیر سنجیدگی سے بولا تو وہ تلخی سے مسکرائی۔

''تو تم ڈھونڈ دو ناں میرے لیے کوئی اچھا انسان! اپنی بہن کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے؟'' وہ خفا ہوئی۔

''کمال ہے، آپ اتنا گھومتی پھرتی ہیں، خود مختار ہیں مگر ابھی تک آپ اپنے لیے اچھا انسان بھی نہیں ڈھونڈ سکیں۔'' اس کے لہجے میں افسوس تھا۔

''یہ کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے۔'' ارما نے گہری سانس لے کر کہا۔ ایک لمحے میں بہت سی تلخ یادیں اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو گئیں۔

''آج کل تو لوگ سوشل میڈیا پر ملتے ہیں اور

شادی ارینج کرلیتے ہیں۔ رانگ نمبرز پر باتیں کرتے، کرتے محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور پھر اُن کی شادی بھی ہو جاتی ہے۔ آج کل تو ایسی، ایسی لو اسٹوریز دیکھنے کو مل رہی ہیں جن پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور ایک آپ ہیں جو ابھی تک اپنے لیے ڈھنگ کا بندہ بھی تلاش نہیں کرسکیں۔'' ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی آواز میں ملال اتر آیا۔

''ہاں بس..... میں ان معاملات میں بڑی نالائق ثابت ہوئی ہوں۔'' اس نے رنجیدگی سے اعتراف کیا۔

''اب رشتے ڈھونڈنے کا کام بھی کیا مجھے ہی کرنا پڑے گا۔ پھر تو مجھے ایک پراڈوملنی چاہیے، بڑی دولت ہے نانی کے پاس..... مگر وہ بے حد کنجوس ہیں ذرا نہیں سمجھائیں کہ اس عمر میں ایسی کنجوسی بزرگوں کو زیب نہیں دیتی اور سچ پوچھیں تو ان سارے حالات کی ذمے دار کسی نہ کسی طرح نانی ہی ہیں۔ امی، ابا کے آم کے باغات آہستہ، آہستہ کر کے بکتے گئے، اب تو ان کے پاس بہت تھوڑا رقبہ باقی رہ گیا ہے۔ ابا اتنا پڑھے لکھے نہیں ہیں کہ اور کوئی کام کرسکیں۔ امی کو جوانی میں شوگر ہوگئی وہ بھی کوئی جاب نہیں کرسکتیں۔ نانا بھی ساری جائیداد نانی کے نام کر گئے مگر نانی تو کسی کو جائیداد دینے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔'' ازمیر نے سنجیدگی سے دکھا۔ اس قسم کی باتیں وہ بہت بار سن چکی تھی۔

''امی، ابا سے کہو کہ قناعت اختیار کریں۔ لالچ نہ کریں اور تھوڑے پر گزارہ کریں اور الٹے سیدھے طریقوں سے دولت مند ہونے کے خواب دیکھنا چھوڑ دیں۔'' وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولی۔

''واہ، وہ قناعت اختیار کریں اور نانی اتنی بزرگ ہو کر بھی ساری دولت و جائیداد پر ملکہ کی طرح قابض ہو کر بیٹھی رہیں۔ اور غریب اولاد چپ چاپ دیکھتی رہے۔ واہ کیا بات ہے۔ نانی کو چاہیے کہ اپنے حصے کی جائیداد اولاد میں بانٹ کر ان مسائل کو ختم کریں۔ لوگ خوشحال ہوں گے تو دلوں سے نفرتیں بھی ختم ہو جائیں گی۔'' اس نے بڑے بزرگ کی طرح کہا۔

''نانا کی وفات کے بعد جو جائیداد نانا کے نام تھی وہ نانی نے سب اولادوں میں تقسیم کردی تھی جسے سب نے اپنی، اپنی عیاشیوں میں اڑا دیا۔ اب سب کی نظریں نانی کی پراپرٹی پر ہیں اور سب کو ہی ڈر ہے کہ نانی اپنے قیمتی اثاثے کہیں میرے نام نہ کردیں۔ اسی خوف کی وجہ سے شبو خالہ اور یاور ماموں بھی میرے قریب نہ ہوسکے۔'' وہ افسوس سے بولی۔

ازمیر کو جیسے کچھ یاد آیا۔

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جانوروں کے ڈاکٹر کی حمایت میں شبو خالہ اور یاور ماموں بھی امی اور ابا کے ساتھ مل گئے ہیں۔ دوسری طرف نانی اکیلی ہیں مگر مجھے امید ہے کہ نانی جیسی جہاندیدہ خاتون کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر ہی لیں گی۔ آخر ان کے ساتھ مجھ جیسا پارٹنر جو موجود ہے۔'' ازمیر نے کہا۔

ارما کے لیے یہ انکشاف صدمے کا باعث تھا۔ یوں تو امی، شبو خالہ اور یاور ماموں کی آپس میں بنتی نہیں تھی مگر ہر الٹے سیدھے کام میں یہ لوگ اکھٹے ہو جاتے اور نانی کے خلاف مل کر ایک پارٹی بنا لیتے۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی۔ اسے دکھ ہوا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی مخلص نہیں تھا۔ ازمیر نے اس کی خاموشی کو محسوس کیا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ اب یہ دنیا کا ایسا ناممکن کام بھی نہیں ہے۔ بہاول پور میں گھومیں پھریں، محل دیکھیں، کھجوروں کے باغات کی سیر کریں۔ اس پریشانی کا سارا بوجھ مجھے اٹھانے دیں اور جب تک میں آپ کو واپس لاہور جانے کے لیے نہ کہوں آپ اپنی دوست کی خالہ کے گھر مہمان بن کر ہی بیٹھی رہیں سمجھیں۔'' وہ تسلی دینے والے انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے.....'' اس نے کہہ کر بے دلی سے فون بند کردیا۔ رات کی تاریکی کا اندھیرا اس کے دل میں بھی اتر آیا تھا مگر وہ جلد ہار مان جانے والوں میں سے نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے بوجھل دل کے ساتھ

کمرے میں آگئی۔ عائلہ بیڈ پر لیپ ٹاپ کھولے بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔

''ارما! گھر میں سب خیریت ہے ناں؟'' اس کی آواز میں فکرمندی تھی۔

''ہاں.....'' ارما نے نظریں چراتے ہوئے مختصراً جواب دیا۔ عائلہ نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

''تمہارے امی، ابا ملتان چلے گئے؟'' عائلہ نے یونہی پوچھا۔

''نہیں، ابھی وہ لوگ لاہور میں ہی ہیں..... مگر کچھ دنوں تک لاہور واپس چلے جائیں گے۔'' وہ تکیہ ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

عائلہ کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی۔ اسے سمجھ نہیں آئی کہ مزید کیا سوال کرے۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے ارما الجھی ہوئی کہانی کا ایک کردار ہے مگر وہ کسی کو اپنی کہانی سنانے کے لیے تیار نہیں تھی... اور ایسا تب ہی ہوتا ہے جب کہانی میں گہرے راز چھپے ہوں۔ ارما چادر اوڑھ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔

''میں سونے لگی ہوں، مجھے نیند آرہی ہے، مسلسل سفر کرنے کی وجہ سے بہت تھکاوٹ بھی ہوگئی ہے۔'' اس نے کروٹ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے سو جاؤ تم... مجھے تو ابھی نیند نہیں آرہی..... کچھ دیر بعد ہی سوؤں گی۔'' اس نے اٹھ کر لائٹ بند کی اور لیمپ جلاتے ہوئے بولی۔ ارما آنکھیں بند کیے سونے کی کوشش کررہی تھی۔ اس کے ذہن پر بوجھ تھا اور وہ یہ بوجھ کسی کے ساتھ بانٹ بھی نہیں سکتی تھی۔ ازمیر اصرار کررہا تھا کہ وہ اپنے لیے کوئی اچھا انسان ڈھونڈے اور اس سے شادی کر کے اپنا گھر بسائے اور تمام فکروں سے آزاد ہوجائے۔ وہ ایک بار ایسی کوشش کرچکی تھی مگر اس نے دھوکا کھایا تھا۔ اس دھوکے نے اسے تکلیف دی تھی۔ یہ بھی تو مقامِ حیرت تھا کہ دھوکے باز خود خوش وخرم زندگی گزار رہا تھا۔ شادی بھی کرچکا تھا، اسے تو شاید ارما کا نام بھی یاد نہیں تھا۔ شاید دھوکے بازوں کی یادداشت بہت کمزور ہوتی ہے۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔

وہ اب سونا چاہتی تھی۔ ان سب فکروں سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔ اسے فرار کی خواہش تھی۔ یہی فرار حاصل کرنے تو وہ پہاڑوں کے سفر پر گئی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ پہاڑوں کا سفر انسان کو اندر سے بدل دیتا ہے۔ وہیں پہاڑوں پر ہی تو وہ اس اجنبی سالار سے ملی تھی اور اس کی ایک نظر نے ہی اس کے دل کے اندھیروں کو روشنی میں بدل دیا تھا۔ وہ ساحر تھا یا مسیحا..... وہ جو کوئی بھی تھا۔ اس کی نگاہ میں مسیحائی تھی۔

عائلہ کو نیند نہیں آرہی تھی تو وہ لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گئی۔ یونہی سوشل میڈیا پر فرینڈز سے گپ شپ کرتی رہی، بہت عرصے بعد اسے اسکول کی دوست فریحہ آن لائن نظر آئی۔ کچھ دیر اس نے اس کے ساتھ چیٹنگ کی، کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر عائلہ نے اس سے صدف مسعود کے بارے میں پوچھا۔

''فریحہ! کیا تمہیں مس سلطانہ مسعود کی بیٹی صدف مسعود کے بارے میں پتا ہے کہ وہ آج کل کہاں ہوتی ہے اور کیا کررہی ہے؟'' عائلہ نے کچھ سوچتے ہوئے میسج ٹائپ کیا۔

''صدف کی تو اپنے کزن کے ساتھ شادی ہوگئی ہے، وہ آج کل ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہوتی ہے۔'' فریحہ نے جوابی پیغام بھیجا۔ عائلہ ایک دم اچھل پڑی۔

''کیا..... ٹوبہ ٹیک سنگھ؟'' اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔

''ہاں، صدف کا شوہر وہیں رہتا ہے، وہیں جاب کرتا ہے اس لیے صدف بھی وہیں شفٹ ہوگئی۔'' فریحہ نے بتایا۔

''کہاں جاب کرتا ہے وہ؟ اس کا پروفیشن کیا ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟'' عائلہ نے بے چینی سے پوچھا۔ صدف نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''مجھے اس کے شوہر کا نام نہیں معلوم مگر وہ اس کا کزن ہے۔ دونوں کی لو میرج ہے، وہ دونوں تو بچپن سے ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے، تمہیں یاد ہے

گرمیوں کی چھٹیوں میں اس کے گھر ایک لڑکا آیا کرتا تھا، جس کے ساتھ اس کا چکر بھی تھا اور وہ چھپ، چھپ کر اسے خط بھی لکھا کرتی تھی..... اس زمانے میں لو لیٹرز کا اپنا ہی ایک چارم ہوا کرتا تھا۔ وہ دراصل اس کا وہی کزن تھا، وہ وہاں کیا جاب کرتا ہے اس بارے میں تو مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔'' عائلہ بے یقینی کے عالم میں یہ میسجز پڑھ رہی تھی۔

''صدف مسعود کے بارے میں کچھ اور بھی بتاؤ۔'' عائلہ نے بے قراری سے کہا۔

فریحہ اتنے سوالات اور صدف کے بارے میں عائلہ کے اتنے تجسس پر حیران ہوئی تھی۔

''بس مجھے اس کے بارے میں اتنا ہی معلوم ہے، شادی کے بعد اس نے ہم لوگوں سے زیادہ رابطہ نہیں رکھا۔ وہ اپنے گھر بار میں مصروف ہوگئی۔ تمہیں تو پتا ہے کہ شادی کے بعد لڑکیوں کی زندگی کتنی بدل جایا کرتی ہے۔ پرانے رشتے اور پرانی دوستیاں بہت پیچھے رہ جاتی ہیں۔ صدف کا پروفائل بھی مجھے سوشل میڈیا پر کہیں نہیں ملا۔ خیر تم بتاؤ کہ تمہیں اتنے سالوں بعد اچانک صدف مسعود کیسے یاد آگئی۔ اس کے بارے میں تمہارا تجسس مجھے حیران کر رہا ہے۔'' فریحہ نے تیز ٹائپ کیا۔ عائلہ کچھ سوچتے ہوئے چونکی۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے، بہت ساری کلاس فیلوز مجھے سوشل میڈیا پر ملی ہیں مگر صدف کا پروفائل میری نظروں سے نہیں گزرا تو مجھے یونہی اس کا خیال آگیا۔ اسے تو بہت سے لڑکے پسند کرتے تھے تو میں نے سوچا پتا نہیں اس کی شادی کس سے ہوئی ہے۔'' عائلہ نے بات ٹال دی۔

پھر چند ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے فریحہ سے اجازت چاہی اور آف لائن ہوگئی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے الجھ گئی تھی۔

صدف کا شوہر پہلے ارما کو پسند کرتا تھا اس نے ارما کے ساتھ فلرٹ کیا۔ اس وقت وہ یقیناً لاہور میں ہوگا۔ پھر اچانک وہ صدف سے شادی کے بعد اپنے آبائی شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ کیسے چلا گیا اور اگر وہ شروع ہی سے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہی رہتا تھا تو ارما سے اس کی دوستی کیسے ہوگئی۔ یہ بھی ایک معما تھا اور پھر جب وہ بچپن سے ہی صدف کو پسند کرتا تھا تو اس کہانی میں بھلا ارما کہاں سے آگئی تھی۔ پہیلی کی ڈوریاں الجھتی جا رہی تھیں۔ کہانی کے ہر موڑ پر دھند تھی۔

پرانی کلاس فیلوز کو صدف کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا اور ارما اس موضوع پر بات کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ آخر وہ کون بدبخت آدمی تھا جس نے ارما جیسی اچھی لڑکی کو دکھ دیا اور پھر دھوم دھام سے صدف سے شادی کرلی اور ٹوبہ ٹیک سنگھ سدھار گیا۔ اس تجسس نے عائلہ کو بے چین کر رکھا تھا۔ اسے اس اجنبی آدمی سے بے تحاشا نفرت محسوس ہوئی۔

وہ لیپ ٹاپ پر صدف کا پروفائل سرچ کرتی رہی۔ اس نے سوچا کہ صدف جیسی self obsessed لڑکی نے اپنا پروفائل تو ضرور ہی بنایا ہوگا۔ میٹرک کلاس میں بھی وہ میک اپ، فیشن اور گلیمر میں طاق تھی۔ اسے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا شوق تھا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ سوشل میڈیا پر اس کا اکاؤنٹ نہ ہوتا۔ اسے لوگوں کی داد و تحسین کی عادت تھی۔ وہ خاموشی سے زندگی گزارنے والوں میں سے نہیں تھی۔

بالآخر آدھے گھنٹے کی تلاش بسیار اور بے شمار لوگوں کے پروفائلز stalk کرنے کے بعد اسے صدف کا پروفائل مل ہی گیا جو صدف فرحان کے نام سے بنا ہوا تھا۔ اس نے تصویر دیکھ کر صدف کو پہچانا تھا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ کسی سرسبز وادی میں نیلے پانی کی جھیل کے کنارے کھڑی تھی۔ جھیل کے کنارے گہرے گلابی پھولوں سے بھرے ہوئے تھے اور برف پوش پہاڑوں پر سفید بادلوں کا سایہ تھا۔ وہ سبز لباس میں ملبوس اس قدرتی منظر کا حصہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا شوہر درمیانے قد اور سانولے رنگ کا حامل لڑکا تھا جس نے بلیو جینز اور جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ شاید یہ ان کے ہنی مون کی تصویر تھی۔ دونوں کے چہروں پر

مسکراہٹ تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش نظر آرہے تھے۔

عائلہ فرحان کو پہچان چکی تھی کیونکہ اس کی تصویریں بہت پہلے ارما اسے بھیجا کرتی تھی۔

''تو اس آدمی کا نام فرحان ہے۔'' اچانک اسے یاد آیا کہ اس نے بہت پہلے ارما کے منہ سے یہ نام سنا تھا مگر بعد میں یہ نام اس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ وہ غور سے اس تصویر کو دیکھ رہی تھی۔

''نہ جانے یہ کون سی جگہ ہے، ارما کا دل توڑنے کے بعد یہ آدمی کیسے سیریں کرتا پھر رہا ہے اور کتنا خوش لگ رہا ہے۔'' اس نے تصویر دیکھتے ہوئے نفرت سے سوچا۔ ایسی جگہ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ نیلے شفاف پانی کی جھیل۔ جھیل کنارے گلابی پھولوں کی بہار اور جھیل کے اس پار برف سے ڈھکے پہاڑ.....اسے یوں لگا جیسے یہ خطہ پریوں کے دیس کا کوئی حصہ ہے۔

صدف کے پروفائل کی پرائیویسی بڑی سخت تھی۔ وہ تو اسے فرینڈ ریکویسٹ بھی نہیں بھیج سکتی تھی۔ اس کے اکاؤنٹ میں صرف چند تصویریں ہی تھیں۔ اس نے دوسری تصویر دیکھی جس میں سبزے کے درمیان اِک راستہ تھا جہاں سے گزرتے گھوڑے پر کھلکھلاتی ہوئی صدف بیٹھی نظر آرہی تھی۔ دوسرے گھوڑے پر اس کا شوہر ہاتھ سے وکٹری کا نشان بنائے بیٹھا تھا۔ ان دونوں کا لباس وہی تھا جو پہلی تصویر میں نظر آرہا تھا جس کا مطلب تھا کہ دوسری تصویر بھی اسی جگہ کی ہے.....راستے کے دونوں طرف سبزہ تھا جہاں کاسنی رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے اور پیچھے برف پوش پہاڑ بھی نظر آرہے تھے۔ اُن سے ذرا فاصلے پر کچھ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر بلندی کی طرف جارہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی ایسی جھیل تھی جہاں گھوڑوں پر سوار ہو کر جایا جاتا ہے۔ نہ جانے وہ کون سی جگہ تھی، اتنی خوب صورت، حسین اور دلفریب کہ وہ کتنی ہی دیر تک ان تصویروں سے نظر نہ ہٹا پائی۔ اسے تو ایسی کسی جگہ کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا ورنہ وہ فوراً ارما کو ساتھ لے کر وہاں چل پڑتی۔

تیسری تصویر میں صدف اپنے شوہر کا ہاتھ تھامے ہنستی مسکراتی ایک سرسبز وادی میں کھڑی تھی۔ اس کے عقب میں بادلوں کی دھند کے پار بے شمار سدا بہار درخت نظر آرہے تھے۔ ان دونوں کے آس پاس سبز گھاس کے درمیان سفید اور زرد رنگ کے بے شمار پھول کھلے ہوئے تھے۔ شاید وہ ڈیزی کے پھول تھے، عائلہ نے اندازہ لگایا پھر اس نے وہ تصویریں لیپ ٹاپ سے موبائل میں منتقل کر کے محفوظ کرلیں۔

''یہ کون سی جگہ ہوسکتی ہے عالیان سے پوچھوں گی۔'' وہ سوچنے لگی۔ پھر اس نے خود ہی نفی میں سر ہلا دیا۔

''عالیان کو بھلا کیا پتا ہوگا، وہ تو کبھی بہاول پور سے باہر ہی نہیں گیا۔'' یک دم اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

''اس جھیل کے بارے میں سالار کو پتا ہوگا..... اس سے پوچھتی ہوں، وہ سیاحت کے شعبے سے وابستہ ہے، اسے سب تفریحی مقامات کے بارے میں معلومات ہوں گی۔'' یہ خیال آتے ہی اس نے سائڈ ٹیبل پر پڑا موبائل اٹھا کر سالار کو ایک تعارفی میسج بھیجا اور ساتھ ہی اجازت چاہی کہ کیا وہ اسے اس وقت کال کرسکتی ہے، وہ اس کا فون نمبر اس کے دیے گئے کارڈ سے نوٹ کر کے پہلے ہی سیو کرچکی تھی۔

سالار کا فوراً جواب آیا کہ وہ اسے فون کرسکتی ہے، وہ اسے پہچان چکا تھا۔

وہ موبائل تھامے خاموشی سے بیڈ سے اٹھی اور چپل پہن کر دبے قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر آگئی۔ اس نے محتاط انداز میں ٹیرس کا دروازہ کھولا۔ باہر چاندنی رات تھی، ٹیرس کی ریلنگ کے بالکل ساتھ آم کے درخت کی شاخیں نظر آرہی تھیں اور فضا میں آم کے پیڑ کے پتوں کی خوشبو رچی بسی تھی۔ اس نے سالار کو فون ملایا، سالار نے پہلی ہی بیل پر فون اٹھالیا۔

''ہیلو.....امید ہے کہ میں نے آپ کو ڈسٹرب نہیں کیا ہوگا۔'' عائلہ نے رسمی انداز میں کہا۔ دوسری

طرف وہ اس اچانک فون کال پر خاصا حیران تھا مگر اس نے اپنی حیرانی کو ظاہر نہیں کیا۔

''جی نہیں..... ویسے بھی میں اس وقت فارغ ہی تھا۔ آپ بتائیں سب خیریت ہے ناں.....'' اس نے شائستگی سے کہا۔ اس کی اس خوش اخلاقی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

''جی ہاں، میں دراصل آپ سے ایک تفریحی مقام کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی تھی، مجھے خیال آیا کہ آپ کو اس جگہ کے بارے میں ضرور علم ہوگا، کیا آپ کو پاکستان میں کسی ایسی جھیل کے بارے میں معلوم ہے جس کے پانی کا رنگ نیلا ہے اور جس کے کناروں پر گہرے گلابی رنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور عقب میں برف پوش پہاڑ نظر آرہے ہیں، اس جھیل تک جانے کے لیے گھوڑوں اور خچروں پر سفر کرنا پڑتا ہے۔'' اس نے ٹیرس پر ٹہلتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔ وہ اس کی بات سنتے ہوئے چونکا۔

''کیا آپ مجھے اس جھیل کی تصویر بھیج سکتی ہیں؟'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''جی میں آپ کو ابھی بھیجتی ہوں۔'' اس نے کال کے دوران ہی وہ تینوں تصویریں اس کے نمبر پر سینڈ کردیں۔

وہ کچھ لمحے خاموش رہا اور تصویریں دیکھتا رہا پھر کچھ دیر بعد اس کی آواز آئی۔

''یہ رتی گلی جھیل کی تصویر ہے، یہ جھیل وادیِ نیلم آزاد کشمیر میں واقع ہے۔'' اس نے بتایا۔ وہ ذرا حیران ہوئی۔

''اوہ اچھا! تو اس جھیل کا نام رتی گلی جھیل ہے۔ معلومات دینے کا شکریہ.....''

وہ آم کے درخت کے پتوں پر دمکتی چاندی کو دیکھتے ہوئے بے ساختہ بولی۔ پاکستان میں بے شمار ایسے مقامات تھے کہ پاکستان میں رہنے والے لوگوں کو ان کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا۔ یہ مقام حیرت تھا۔

''صرف اس جھیل کے بارے میں ہی پوچھنا چاہتی ہیں آپ؟'' سالار نے مبہم سے انداز میں پوچھا۔ عائلہ کو یہ سوال کچھ عجیب سا لگا۔

''جی ہاں.....'' اس نے بے ساختہ کہا۔

سالار کے اگلے جملے نے گویا اس کے قدموں تلے سے زمین نکال لی تھی۔

''ویسے میں تصویر میں موجود مسٹر اینڈ مسز فرحان کو بھی جانتا ہوں۔ ان کے بارے میں تو آپ کچھ جاننا نہیں چاہتیں؟'' وہ اپنی جگہ پر دم بخود رہ گئی۔ حیرانی کے عالم میں اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل پایا۔

بھلا وہ کیسے جانتا تھا کہ وہ صدف کے شوہر کی جاسوسی کرتی پھر رہی ہے اور اس کے بارے میں تفصیلات جاننا بھی چاہتی ہے..... بھلا وہ صدف اور اس کے شوہر کو کیسے جانتا تھا، اسے محسوس ہوا جیسے وہ کوئی غیر معمولی آدمی تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے اپنے حواس جوڑتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کیا آپ ان دونوں کو جانتے ہیں؟ مگر کیسے؟'' وہ دم بخود سے انداز میں بے یقینی بھری آواز میں بولی۔ سالار کو اس کی حیرت کا اندازہ تھا۔

''یہ جو تیسری تصویر ہے جس میں یہ دونوں سفید اور زرد پھولوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہیں۔ یہ مشک پوری پہاڑی کی تصویر ہے جو نتھیا گلی کے قریب گلیات ریجن میں واقع ہے۔ یہ دونوں چند ماہ پہلے مشک پوری پہاڑی پر میرے گروپ ٹرپ کے ساتھ گئے تھے۔ اس حوالے سے میں انہیں جانتا ہوں، ساتھ سفر کرنے والے لوگ بہت سی کہانیوں اور بہت سے حوالوں کی وجہ سے یاد رہ جاتے ہیں۔'' اس نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

''اوہ، اچھا.....'' وہ سمجھ گئی۔ وہ ایک ٹریول کمپنی کا مالک تھا اور ہر ہفتے کسی نہ کسی تفریحی مقام پر گروپ کے ساتھ جاتا رہتا تو ظاہر ہے اس طرح وہ بے شمار لوگوں کو جانتا ہوگا۔

''کیا آپ مجھے مسٹر فرحان کا فون نمبر دے سکتے ہیں؟'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ دل میں یہ خیال بھی آیا کہ نہ جانے وہ کیا سوچتا ہوگا کہ وہ مسٹر فرحان میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہی ہے مگر وہ بالکل نارمل

انداز میں بات چیت کررہا تھا۔

''ہاں..... مگر لاہور جاکر..... پرانے clients کا سارا ڈیٹا میرے آفس میں موجود ہوتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے پھر آپ مجھے لاہور جاکر مسٹر فرحان کا فون نمبر ضرور دیجیے گا۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ بات ایک راز ہے، ٹاپ سیکرٹ، میں اسے اپنی دوست ارما کے ساتھ بھی شیئر نہیں کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے نپے تلے الفاظ میں واضح کردیا۔ سالار کو بہت سی باتیں بنا کر سوال جواب کیے خود ہی سمجھ لینے کی عادت تھی۔

''آپ میری طرف سے بے فکر ہوجائیں۔ میں اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا۔'' اس نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''جی شکریہ.....'' وہ ٹہلتے ہوئے آم کے درخت کی شاخوں کے پاس ٹھہر گئی۔ اب تو اس کا شکریہ ادا کرنا اس کا فرض بنتا تھا۔

''ارے اس میں شکریے کی کیا بات ہے..... یوں بھی یہ ایک بہت معمولی سا کام ہے۔ آپ بتایئے آپ لوگوں کا کل کا کیا پلان ہے؟'' وہ نارمل انداز میں بات کرتے ہوئے خوشدلی سے بولا۔

''کل شام ہم لوگوں کا دربار محل دیکھنے کا پروگرام ہے۔ دربار محل کے بارے میں ہم نے بہت کچھ سنا ہے۔'' عائلہ نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

''ہم لوگ بھی کل شام دربار محل ہی جارہے ہیں۔ کیا پتا وہاں آپ لوگوں سے ملاقات ہوجائے۔'' اس کی آواز میں مسکراہٹ کی آمیزش تھی۔ اسے خوشی تھی کہ وہ ان کے کل کے پروگرام کے بارے میں جان گیا تھا۔

''ہوسکتا ہے..... اب تو آپ اجنبی نہیں رہے۔'' وہ بھی مسکرائی۔

''ویسے میں پہلے بھی اجنبی نہیں تھا۔'' وہ ذومعنی انداز مگر پُراسرار لہجے میں بولا۔ وہ اس جملے کا مفہوم نہیں سمجھ پائی۔ دروازے پر کھٹکا سا ہوا تو اس نے فوراً مڑ کر دیکھا۔ عالیان ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر آرہا تھا سونے سے پہلے اسے دروازے چیک کرنے کی عادت تھی۔

''چلیں میں فون رکھتی ہوں خدا حافظ۔'' اس نے عجلت میں کہتے ہوئے فون بند کردیا۔

''تم یہاں کیا کررہی ہو؟'' وہ اس وقت اسے یہاں دیکھ کر حیران ہوا۔

''بس نیند نہیں آرہی تھی سو یہاں چلی آئی۔ تم ابھی تک سوئے نہیں؟ صبح اسکول نہیں جانا کیا؟''

''نہیں، میں نے اسکول سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی ہے، آخر میری کزن برسوں بعد آسٹریلیا سے پاکستان آئی ہے۔ میری مہمان ہے، اس کے لیے ایک ہفتے کی چھٹی لینا تو میرا فرض بنتا ہے۔'' وہ دھیرے سے چلتے ہوئے اس کے سامنے آکر ٹھہر گیا۔ اس کی آواز میں شوخی اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کی اس شگفتگی پر حیران ہوئی۔

''واقعی.....؟ پردیسی کزن کا اتنا احساس..... ایسی دریا دلی..... تم آج مجھے کچھ بدلے، بدلے سے لگ رہے ہو۔'' عائلہ نے بھی مسکرا کر اسے دیکھا..... وہ ٹراؤزر اور شرٹ میں ملبوس تھا، گندمی رنگت والے چہرے پر مسکراہٹ کسی روشنی کی طرح چمک رہی تھی اور آنکھوں میں انوکھا سا تاثر تھا۔ اپنی تلخ باتوں سے قطع نظر وہ ایک خوش شکل اور اسمارٹ لڑکا تھا۔

''صحیح کہہ رہی ہو تم..... ایک دن میں، میں کافی بدل گیا ہوں۔'' اس نے اس بات کو مذاق میں اڑادیا۔

''ہر وقت دل جلانے والی باتیں کیوں کرتے رہتے ہو؟ مذاق کرتے ہو تو اس میں بھی تلخی ہوتی ہے۔'' عائلہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے ٹوکا کہ اسے برا بھی نہ لگے۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

''کافی عرصہ بے روزگار جو رہا ہوں، نوکری کے حصول کے لیے مہینوں جوتیاں چٹخا تا رہا۔ دفتروں کے چکر لگاتا رہا۔ نوجوانوں کو یہ خواری اور مایوسی تلخ بنادیتی ہے۔ پھر میں نے لاکھوں، کروڑوں لوگوں کی طرح اپنے خوابوں پر کمپرومائز کرلیا۔ فزکس میں ایم ایس سی کرنے کے بعد مجھے سائنسدان بننے کی خواہش تھی مگر

میں نے خاموشی سے اسکول میں جاب کرلی ہے کہ چلو بے روزگار ہونے سے تو استاد بننا بہتر ہے مگر اس سسٹم نے اور اس معاشرے کے دُہرے معیار نے جو دکھ اور تکلیف مجھے دی ہے، اس کا مداوا تو نہیں ہوسکتا۔ انٹلکچوئیل ذہن سڑکوں کی دھول مٹی کی خاک میں گرد آلود ہوجاتے ہیں اور نوجوانوں کے جوش و ولولے کو معاشی مسائل کا عفریت نگل لیتا ہے۔'' اس نے بے رحم سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ عائلہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے عالیان کی آنکھوں میں جھانکا۔

''تمہیں پتا ہے کہ آسٹریلیا میں لوگ اپنی گزر بسر کے لیے ہر قسم کا کام کرتے ہیں۔ پٹرول پمپ پر کھڑے ہوکر گاڑیوں میں پٹرول ڈالتے ہیں..... کسی ہوٹل میں ویٹر بنتے ہیں، کسان بن کر کھیتوں میں فصلیں اگاتے ہیں..... گائے بھینسوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں..... جہاں بھی انہیں کام مل جائے وہ وہاں کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں..... چاہے کسی جوتوں کی دکان پر یا پھولوں کی دکان پر یا کسی جنرل اسٹور پر..... اور وہ کسی بھی کام کو برا نہیں سمجھتے کیونکہ حق حلال کی کمائی کی اپنی ہی dignity (عظمت) ہوتی ہے۔ جب میں ایک اسٹوڈنٹ تھی تو میں ایک پھولوں کی دکان پر کام کرتی تھی، پھول صاف کرتی تھی، گلدستے بناتی تھی، مجھے اچھے پیسے مل جایا کرتے تھے۔ میں نے پڑھائی بھی کی اور اپنے اخراجات بھی خود اٹھائے، پیسہ جمع کیا اور اب میں خود مختار ہوں۔ دنیا گھومتی پھرتی ہوں، اپنے والدین پر بوجھ نہیں ہوں..... تمہیں تو پتا ہے کہ ابو نے ایگری کلچر میں ماسٹرز کر رکھا ہے مگر وہ آسٹریلیا میں کھیتی باڑی اور کاشت کاری کرتے ہیں، فصلیں اگاتے ہیں، انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ اتنے پڑھے لکھے ہیں تو کسان کیوں بن جائیں۔ درحقیقت حق حلال کمانے والا کوئی بھی پیشہ معمولی نہیں ہوتا۔'' عائلہ نے نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ اس کی بات خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے غور سے چاندنی میں کھڑی اس لڑکی کو دیکھا جس کا حسن اس چاندنی جیسا ہی سحر انگیز تھا اور جو اس کے سامنے مثالیں پیش کرتے ہوئے جوش و ولولے سے بھرپور انداز میں تقریر کررہی تھی تاکہ عالیان کے اندر کی تلخی ختم ہوجائے۔ وہ اس کی اس کوشش پر مبہم انداز میں مسکرایا۔ وہ اسے یہ بتا نہ سکا کہ معاشرے کی عطا کی گئی تلخیاں خوب صورت الفاظ والی پُرجوش تقریروں سے ختم نہیں ہوتیں۔

''اچھی ڈبیٹر ہو تم.....'' چند لمحوں بعد اس نے مبہم سے انداز میں کہا۔

''یہ تعریف ہے یا تنقید؟'' وہ سمجھ نہ سکی۔

''تعریف بھی ہے اور تنقید بھی۔'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔ وہ اس کے انداز پر الجھ گئی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا۔

''خیریت رات ہوگئی ہے۔ اب سونا چاہیے..... رات کو یہاں چمگادڑیں بھی اڑتی پھرتی ہیں، کیا تمہاری دوست نے کبھی کوئی ایسی کہانی نہیں سنائی جس میں رات کو خوفناک قسم کی چمگادڑیں لوگوں سے چمٹ جاتی ہیں۔''

''نہیں..... وہ ڈراؤنی کہانیاں نہیں پڑھتی۔'' عائلہ نے بے ساختہ کہا۔

''پھر کیسی کہانیاں پڑھتی ہے وہ؟ شہزادے اور شہزادی والی؟ بیوقوف لڑکیاں ہوتی ہیں جو ایسی فینٹسی والی کہانیاں پڑھتی ہیں۔'' وہ کندھے اچکا کر بولا۔

''اچھا..... تو عقلمند لوگ کیسی کہانیاں پڑھتے ہیں؟'' عائلہ نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

''عقلمند لوگ زندگی کو پڑھتے ہیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری آواز میں بولا۔ عائلہ کی سیاہ آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ صبیح چہرے پر اجالوں کا عکس تھا۔

''مشکل شخصیت کے مالک ہو تم! تمہاری آدھی باتیں تو مجھے سمجھ ہی نہیں آتیں۔'' وہ کندھے اچکا کر دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔ وہ بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔

''اچھی بات ہے کچھ باتیں سمجھ نہ ہی آئیں تو بہتر ہوتا ہے۔'' وہ مدھم آواز اور ذومعنی انداز میں بولا۔

وہ سر جھٹک کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رات کے اس پہر وہ اس کی باتوں میں سر کھپانا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

وسیع سبزہ زار کے درمیان نظر آتے سرخ و سفید امتزاج کے حامل دربار محل کی شان و شوکت آج بھی قائم تھی۔ وسیع و عریض اور عالیشان محل اپنے اندر بے شمار کہانیاں سموئے ہوئے تھا۔ یہ محل نواب بہاول خان عباسی (5) نے 1905ء میں تعمیر کروایا تھا۔ پہلے اس کا نام بہاول گڑھ تھا مگر بعد میں اس کا نام دربار محل مشہور ہوگیا۔ یہ اپنے زمانے کا مشہور و معروف اور شاہکار محل تھا۔ عباسی خاندان نے ریاست بہاول پور پر دو سو سال سے زائد عرصے تک حکومت کی اور اسے ایک خوشحال ریاست بنایا۔ دربار محل جانے کے لیے پاکستان آرمی سے خصوصی اجازت لینی پڑتی ہے۔ عالیان نے اپنے ایک دوست سے پہلے ہی یہ اجازت لے لی تھی۔

شاہی خاندانوں کے لیے بنائے گئے محل اب عام لوگوں کے لیے سیاحتی مقام تھے، یہ زمانوں کا فرق تھا اور زمانوں کا یہ فرق انسانوں کو ان کے زوال سے خبردار کرتا ہے، محنت اور مشقت سے بنائے گئے شان و شوکت والے محلات یہیں رہ گئے اور انہیں تعمیر کروانے والے انسان چلے گئے۔ تاریخ کے یہ حقائق انسان کو اس کی حیثیت اور حقیقت سے باخبر کرتے رہتے ہیں۔ وہ دھیرے، دھیرے چلتے ہوئے محل کی خوب صورتی میں اس قدر کھو گئی کہ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ عائلہ اور عالیان کہیں پیچھے رہ گئے ہیں۔ وہ ایک راہداری میں رک گئی تھی پھر اچانک اسے سالار نظر آ گیا۔ محل کی دیواروں پر بنے نقش و نگار دیکھتے ہوئے اس کے قدموں کی رفتار سست پڑ گئی۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے وہ ساکت رہ گئی۔

کیا یہ اتفاق تھا کہ وہ ہر جگہ اسے نظر آ جاتا، اس کی چھٹی حس نے اس کے کان میں سرگوشی کی کہ یہ اتفاق نہیں تھا۔ اتنے اتفاقات ایک ساتھ بھلا کیسے ہو سکتے ہیں تو پھر کیا یہ خواہشوں کے پورا ہونے کا موسم تھا۔ وہ سمجھ نہ پائی۔

وہ اس کے سامنے آ کر ٹھہر گیا۔ نیلی جینز اور سیاہ شرٹ پہنے وہ تازہ دم لگ رہا تھا۔ سرخ و سفید چہرے پر ایک اور رنگ بھی تھا جسے وہ دل کی آنکھ سے دیکھ سکتی تھی۔ سنہری آنکھوں میں اک انجانی سی چمک تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جیسے نئے سورج اتر آئے تھے۔

''آپ مجھے اس راہداری میں کھڑی ہوئی کسی کھوئی ہوئی شہزادی کی طرح لگیں۔'' وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے مسکراتی آواز میں بولا۔

سیاہ لمبے فراک اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس کندھوں پر چنری کا میرون دوپٹا اوڑھے وہ کوئی شہزادی لگ رہی تھی۔ لمبے سیاہ بال ڈھیلی ڈھالی چٹیا میں بندھے تھے اور کانوں میں بڑی بالیاں چمک رہی تھیں۔ آنکھوں میں کاجل کی سیاہ لکیر انہیں اور بھی دلفریب بنا رہی تھی۔ وہ اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا پایا۔ وہ اس کے یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے پر گھبرا گئی۔

''محل میں نظر آنے والی سب لڑکیاں شہزادیاں تو نہیں ہوتیں۔'' شاید یہ اس کے اندر کا ڈپریشن تھا جو کبھی کبھار اس کے لہجے اور آواز سے چھلک پڑتا اور وہ کبھی اپنی تعریف پر خوش نہیں ہو پاتی تھی۔

''اس کا فیصلہ دیکھنے والے کو ہی کرنے دیں خیر..... یہ سوال پوچھنا تو بیکار ہے کہ دربار محل آپ کو کیسا لگا..... نور محل کا اپنا حسن ہے اور دربار محل کی اپنی شان و شوکت ہے۔ کیا آپ جانتی ہیں کہ جو لوگ دور، دور سے ان محلات کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں وہ صرف ان کی خوب صورتی کی کشش میں کھنچے چلے نہیں آتے بلکہ ان کی شان و شوکت اور شاندار آرکیٹیکچر انہیں اٹریکٹ کرتا ہے..... لوگ ان چیزوں کو قریب سے دیکھنا چاہتے ہیں جو انہیں متاثر کرتی ہیں کیونکہ انسان کو خوب صورت چیزوں سے متاثر ہونے کی خواہش ہوتی ہے۔ بہاول پور میں اس مقصد کے لیے ہر سال بے شمار سیاح آتے ہیں۔'' وہ اپنی بھاری اور سحر انگیز آواز میں بولا۔ اس کی

آواز کے جگنو اس کے دل تک بھی پہنچ گئے تھے۔

''آپ کے پاس مختلف مقامات کے بارے میں بے شمار معلومات ہیں مجھے تو آپ کوئی حیرت انگیز شخص لگتے ہیں۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا۔

''حیرت انگیز شخص؟'' وہ اس جملے پر محظوظ ہوا پھر ہلکا سا ہنس دیا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس نے اسے اس لقب سے کیوں نوازا ہے۔

''دراصل میرا کام ہی ایسا ہے، میں ہر وقت اینڈ پر کہیں نہ کہیں ٹور لے کر جاتا ہوں اور مجھے پرانے جاننے والے ملتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں اکثر لوگوں کو کوئی حیرت انگیز یا پُراسرار شخص لگتا ہوں۔ مگر حقیقت میں ایسی کوئی بات نہیں ہے، سیاح اور مسافر کسی نہ کسی موڑ پر دوبارہ مل ہی جایا کرتے ہیں، اسی لیے تو کہتے ہیں کہ دنیا گول ہے، یہاں کب، کون کس موڑ پر مل جائے پتا ہی نہیں چلتا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری آواز میں بولا۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ نہیں پائی۔

''ہاں، کب کون کہاں کس موڑ پر مل جائے پتا ہی نہیں چلتا۔'' اس نے وہ بلند دیواروں پر نظر آتے نقش و نگار کو دیکھتے ہوئے دل میں سوچا۔

''آپ کیا سوچ رہی ہیں؟'' وہ کچھ دیر اس کے بولنے کا منتظر رہا پھر اس کے چہرے پر بکھرے سوچ کے رنگوں کو دیکھ کر بولا۔ وہ کسی خیال سے چونکی۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ آپ کا نام سالار کے بجائے شندور خان ہونا چاہیے تھا۔'' نہ جانے کیوں اس کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا۔

سالار کے چہرے کا رنگ یک دم بدلا۔ وہ بری طرح چونک گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر اور آنکھوں میں شاک کی کیفیت تھی۔ جیسے اسے ارما کے منہ سے یہ نام سننے کی قطعاً توقع نہیں تھی۔ ارما کے لیے اس کے یہ تاثرات ناقابلِ فہم اور حیران کُن تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ شندور خان کا نام اس کے لیے اجنبی نہیں بلکہ غیر متوقع تھا۔ اس نام پر سالار کا یوں چونکنا ظاہر کرتا تھا کہ اس نام سے اس کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا۔ کتنی ہی دیر تک وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہا۔ ارما کو ہی کہنا پڑا۔

''آپ اتنا حیران کیوں ہوگئے ہیں؟ مجھے تو یونہی ایک خیال آیا تھا۔'' سالار کے چہرے کے تاثرات اس تیزی سے بدلے تھے کہ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ جیسے کسی خواب سے جاگا۔ چہرے کے راز کو برف کی دھند نے چھپالیا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ بس مجھے آپ کی بات کچھ عجیب سی لگی۔ میرا نام شندور خان نہیں بلکہ سالار خان ہے، حیرت ہے کہ آپ کو یہ خیال کیوں آیا؟'' اس نے اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ اس کے لہجے میں جتاتی ہوئی سنجیدگی در آئی۔

''بس یونہی..... میں کتابیں اور کہانیاں بہت پڑھتی ہوں ناں..... جیسے ہی مجھے کہانیوں کے کرداروں سے ملتے جلتے لوگ نظر آتے ہیں تو میرے ذہن میں اس طرح کے خیالات آتے رہتے ہیں کہ یہ شخص تو فلاں کہانی کے کردار جیسا ہے تو اس کا نام یہ ہونا چاہیے۔'' وہ خود بھی اس کا انداز دیکھ کر ذرا خوفزدہ ہوگئی تھی اس لیے اس نے وضاحت دی۔ وہ سنجیدہ چہرے کے ساتھ کچھ سوچتے ہوئے اس کی بات سن رہا تھا۔

''کہانیاں، کردار، خیالات..... آپ کا اسٹیلکچوئل عام لوگوں سے بہت مختلف ہے۔ یہ تو کسی اور ہی دنیا کے لوگ ہوتے ہیں۔'' وہ اسے سوچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا جیسے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کررہا ہو۔ راہداری کا موڑ مڑتے ہوئے عالیان اور عائلہ بھی ان کے قریب چلے آئے۔

''ارے آپ.....'' عائلہ نے سالار کو دیکھ کر خوش دلی سے کہا۔

''جی میں..... دربارِ محل کی خوب صورتی آپ لوگوں کی طرح مجھے بھی یہاں کھینچ لائی ہے۔'' وہ اپنے چہرے کے تاثرات چھپا کر بدقت مسکرایا۔

''تو پھر آپ آج ہمارے ساتھ چائے

دیجیے۔ گپ شپ بھی ہوجائے گی اور ہم نیکسٹ ٹرپ کو بھی ڈسکس کرلیں گے۔'' عائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سالار کی مسکراہٹ مدھم پڑ گئی۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔

''پھر کبھی سہی..... ابھی میں اپنے گروپ کے ساتھ آیا ہوں، وہ لوگ گائڈ کے ساتھ محل کی دوسری طرف گئے ہیں، وہ لوگ اس طرف بس آتے ہی ہوں گے۔ گروپ کے ساتھ آکر انسان باؤنڈ ہوجاتا ہے اور اپنی ذمے داری کی وجہ سے گروپ کے لوگوں کو نظر انداز نہیں کرپاتا۔'' اس نے سلیقے سے معذرت کی۔

ارما کو یوں لگا جیسے وہ اس کا جملہ سننے کے بعد حیران ہونے کے ساتھ، ساتھ اپ سیٹ بھی ہوگیا تھا۔ اس لیے تو شاید وہ لوگوں کے ساتھ بیٹھنا بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے فرار کی خواہش تھی۔ ارما کو افسوس ہوا کہ اس نے وہ جملہ بولا ہی کیوں۔

''چلیں..... پھر کسی وقت موقع ملا تو آپ ہمیں ضرور جوائن کیجیے گا۔'' عائلہ نے خوشگوار انداز میں کہا۔

''شیور..... چلتا ہوں.....'' وہ دور دروازے کی طرف کسی کو دیکھ کر مدھم انداز میں بظاہر مسکراتے ہوئے بولا مگر اس کے چہرے پر تفکر کا عکس نمایاں تھا..... شاید وہ اس منظر سے ہٹنا چاہتا تھا اس لیے وہاں سے چلا گیا۔ وہ لوگ بھی کچھ دیر بعد دربار محل سے واپس آگئے۔ کمرے میں آکر ارما نے عائلہ سے سالار کے متعلق بات کی۔

''میں دیواروں پر بنے نقش ونگار کے ڈیزائن کو دیکھ رہی تھی جب سالار وہاں آیا۔ ہمارے درمیان تھوڑی بہت بات چیت ہوئی پھر نہ جانے کیوں میرے منہ سے یہ جملہ نکلا کہ آپ کا نام سالار کے بجائے شندور خان ہونا چاہیے تھا۔ وہ تو یہ بات سن کر شاکڈ رہ گیا۔ کتنی ہی دیر تک کچھ بول ہی نہ سکا۔ میں خود اس کے تاثرات دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔'' اس نے سنجیدہ انداز میں کہا۔ عائلہ چونکی۔

''یہ تمہارا واہم بھی تو ہوسکتا ہے ارما..... بھلا وہ شندور خان کا نام سن کر کیوں شاکڈ ہوگا۔ کاغان میں رہنے والی... لبابی جان نے بتایا تو تھا کہ شندور خان ایک ٹرک ڈرائیور ہے۔ اس کا اور سالار کا بھلا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔'' عائلہ اس بات کو سمجھ نہ پائی مگر ارما اپنی بات پر قائم تھی۔

''مجھے نہیں معلوم مگر وہ شندور خان کے نام پر بری طرح چونکا تھا۔ یوں جیسے یہ نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ شاید اس لیے وہ ہمارے ساتھ چائے پینے کے لیے بھی نہیں رکا کیونکہ وہ اپ سیٹ ہوگیا تھا۔'' ارما نے سنجیدہ انداز میں سوچتے ہوئے کہا۔ عائلہ کو اس بات پر حیرت ہوئی۔ اس نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں ارما..... مجھے نہیں لگتا کہ ایسی کوئی بات ہے..... کیا پتا کہ وہ پہلے سے ہی کسی بات یا واقعے کی وجہ سے اپ سیٹ ہو۔ آخر اتنے بڑے گروپ کو مینج کرنا بھی تو اتنا آسان نہیں ہوتا ناں..... آج مجھے بھی وہ کچھ سنجیدہ سا لگا تھا۔ کیا خبر وہ اپنے کسی ذاتی مسئلے کی وجہ سے الجھا ہوا ہو اور تمہاری غیر متوقع بات سن کر حیران رہ گیا ہو اور شندور خان کا نام اسے عجیب سا لگا ہو۔'' عائلہ نے اپنی رائے دی۔ وہ سالار سے فون پر بات کرچکی تھی اور اسے وہ بالکل ایک نارمل انسان ہی لگا تھا۔ ارما نے بے اختیار گہری سانس لی۔ وہ سالار کے بدلتے ہوئے تاثرات نہیں بھول سکتی تھی۔

''عائلہ، کوئی تو بات تو ہے..... مجھے یوں لگتا ہے جیسے سالار کا شندور خان سے کوئی نہ کوئی تعلق تو ضرور ہے۔ اگر اس وقت تم وہاں میرے ساتھ ہوتیں تو تم بھی یہی کہتیں جو میں کہہ رہی ہوں۔'' ارما نے اسے اپنی بات پر یقین دلانے کی کوشش کی۔

''اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو وہ شندور خان کا نام سنتے ہی بتا دیتا کہ وہ اس نام کے کسی بندے کو جانتا ہے۔'' عائلہ کے لیے اس بات پر یقین کرنا مشکل تھا۔

''محل میں کھڑے ہوکر بھلا وہ کسی طویل کہانی کے متعلق کیا، کیا بتاتا، شاید وہ تین رنگوں والی انگوٹھی بھی سالار کی ہے۔'' ارما نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ وہ جیسے بھول بھلیوں میں راستہ تلاش کررہی تھی۔ عائلہ نے

حیرانی کے عالم میں ہولے سے سر کو جھٹکا۔ اسے ارما کی باتیں سمجھ نہیں آرہی تھیں۔

''وہ انگوٹھی شندور خان کی ہے جو بی بی جان کے گھر آیا تھا اور اپنی انگوٹھی وہیں بھول گیا۔ انگوٹھی کا وہ ڈیزائن کامن ہوگا..... ایسی رنگ بہت سے لوگوں کے پاس ہوسکتی ہے۔ ناران بازار سے سالار نے بھی بالکل ویسی ہی انگوٹھی لی تھی مگر اس کی انگوٹھی بھی کہیں کھوگئی۔ یہ اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔ سفر میں لوگوں کی چیزیں اکثر گم ہوجایا کرتی ہیں، شندور خان تو بی بی جان کا رشتے دار تھا مگر سالار کا کاغان کی وادی میں رہنے والے لوگوں سے بھلا کیا تعلق ہوسکتا ہے؟ تم وہم نہ کرو۔''

عائلہ نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ ارما خاموش ہوگئی۔ بحث کرنے کا فائدہ بھی نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی ناقابلِ فہم سی بات تھی جس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ مگر اس کا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس محل کی راہداری میں کھڑے ہوئے سالار کے چہرے کے بدلتے رنگ کو دیکھ کر وہ جیسے کسی راز سے آشنا ہوئی تھی۔ اس کا خیال ٹھیک تھا۔ وہ پُراسرار تھا اور وہ اپنے اسرار کا راز کسی پر بھی آشکار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر ارما کے ان خیالات اور کیفیات کو عائلہ نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اس لیے ارما نے دوبارہ سالار کا ذکر نہیں کیا۔

اگلے دن وہ لوگ عالیان کے ہمراہ بہاول پور کے مشہور و معروف بازار گئے تھے جہاں ارما اور عائلہ نے خوب شاپنگ کی، روایتی جیولری، کڑھائی والے اور مقیش کے ملبوسات، چاندی کے جھمکے، چنری کے دوپٹے وغیرہ لیے عائلہ نے خالہ کے لیے بھی تحائف لیے..... ارما نے نانی کے لیے ریشمی دھاگے کی کڑھائی والا سوٹ اور چاندی پٹی والی مقیش کی ساڑی خریدی۔

سارا دن بازار میں گزرا..... عالیان ان کی خریداری پر اور دکان داروں کے ساتھ بحث و مباحثے کو سنتے ہوئے توبہ، توبہ کرنے لگا۔ فضول خرچی کے نقصانات گنواتا رہا، کفایت شعاری کے لیکچرز دیتا رہا مگر ان دونوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ انہیں اس بازار میں لا کر خوب پچھتایا۔ تھک ہار اسے ان کی منت سماجت کرنی پڑی کہ اب بازار کی گلیوں سے نکل بھی آئیں اور گھر کی راہ پکڑیں مگر ان پر اس کی منت سماجت کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو وہ انہیں زبردستی گھر واپس لے آیا۔

ابھی ارما شاپنگ کا سارا سامان سوٹ کیس میں رکھ کر فارغ ہوئی تھی کہ نانی کا فون آگیا۔ وہ اسے واپس آنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ انہوں نے اسے جانوروں کے ڈاکٹر والا رشتہ ختم ہوجانے کی خوشخبری بھی سنائی۔ اس کے والدین بھی ملتان واپس جا چکے تھے۔ ارما تو یہ سن کر خوشی سے نہال ہوگئی۔ اس نے سوچا کہ ضرور یہ ازمیر کا کارنامہ تھا۔ نانی نے اسے یہ بھی بتایا کہ اس کے لیے ایک بہت اچھا پروپوزل بھی آیا ہوا ہے۔ اچھے خاندانی لوگ ہیں، لڑکا والدین کا اکلوتا بیٹا ہے، انہیں بہت امید تھی کہ وہاں بات بن جائے۔ ارما ان کی بات سنتے ہوئے کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی۔ اسے آنے جانے والے رشتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو کب سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ لوگ آتے اور کھا پی کر چلے جاتے۔ نانی، خوشی، خوشی ان کی خاطریں، کر کر کے بے حال ہوئی جاتیں مگر پھر کسی نہ کسی مسئلے کو ایشو بنا کر انکار کر دیا جاتا۔ ارما کو اس پروپوزل میں کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر وہ اپنی بیزاری کا اظہار کر کے نانی کو افسردہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے نانی سے کہہ دیا کہ لاہور واپس آکر وہ اس معاملے پر بات کرے گی اور وہ عائلہ کے ساتھ جلد ہی واپس آجائے گی۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ اس بڈھے ڈاکٹر سے اس کا پیچھا چھوٹ گیا تھا۔ اسے ازمیر پر بے اختیار پیار آیا۔ اس نے اپنا وعدہ نبھایا تھا۔ اس نے خوشی، خوشی عائلہ کو بھی یہ خوشخبری سنائی۔

☆☆☆

یہ وادیِ کاغان کے ایک گھر کا منظر تھا۔ سورج کی کرنوں نے سرسبز وادی کو روشن کر رکھا تھا۔ سدا بہار درختوں سے ٹکراتی ہوا رنگ برنگے پھولوں کی خوشبو

سے معطر تھی۔ سرخ بالوں والی بی بی جان باغ کے ایک کونے میں بیٹھی لکڑیاں جمع کرنے میں مصروف تھیں۔ یہ لکڑیاں ابھی ابھی حکم خان جنگل سے کاٹ کر لایا تھا۔

زرینہ ذرا فاصلے پر جنگلی پھولوں کے پاس گھاس پر چادر بچھائے بیٹھی گندم صاف کرنے میں مگن تھی۔ رنگین دھاگوں کی کڑھائی والے لباس پر اس نے شیشوں کے کام والی چادر اوڑھ رکھی تھی اور بالوں میں پھولوں کا مہکتا ہوا گجرا سجا تھا۔ اسے روزانہ تازہ پھولوں کے ہار اور گجرے بنانے کی عادت تھی۔ اس کا چہرہ کسی خوشی کو چھپانے والی مسکراہٹ سے دمک رہا تھا اور جھکی پلکیں کسی راز کو چھپاتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔

کچھ دیر پہلے ہی مہمان خواتین اس کے گھر سے گئی تھیں..... اب تو یہ آنا جانا معمول کی بات تھی۔

''زرینہ! کیا تم نے شندور خان کو فون کر دیا ہے؟ اسے ساری بات سے آگاہ کر دیا ہے ناں.....؟'' بی بی جان نے دیوار کے پاس لکڑیوں کو جوڑ کر رکھتے ہوئے رازداری سے پوچھا۔

''جی ہاں بی بی جان، شندور لالا سے میری بات ہوگئی ہے۔ وہ ایک دو دن میں یہاں پہنچ جائیں گے۔'' زرینہ نے گندم صاف کرتے ہوئے جھکی، جھکی پلکوں اور ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ بی بی جان کے چہرے پر اطمینان بھرا تاثر ابھر آیا۔

''میں نے تو تمہارے خان بابا سے کہہ دیا ہے کہ شندور خان آئے گا تب ہی شادی کی تاریخ طے کی جائے گی۔ شکر ہے کہ امان خان کا اپنا پھلوں کا کاروبار ہے، اپنا گھر ہے، زمین ہے، باغات ہیں، ورنہ اگر تمہارے لیے کسی ٹرک ڈرائیور کا رشتہ آجاتا تو شندور خان کبھی نہ مانتا بلکہ اس نے تو اک طوفان کھڑا کر دینا تھا۔'' بی بی جان نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

زرینہ سر جھکائے گندم صاف کرتے ہوئے مسکراتی رہی۔ سیب جیسے گال سرخ ہوگئے تھے۔ خوبانی کے درخت کی شاخوں میں چھپے گھونسلے میں سے چڑیا کے بچوں کی چوں، چوں کی آوازیں آرہی تھیں اور کیاری میں کھلے جنگلی پھولوں کی مہک ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔

''یوں تو وہ لوگ ہمارے پرانے جاننے والے ہیں مگر امان خان کی ماں نے تمہیں پچھلے ماہ گاؤں میں ہونے والی اک شادی میں دیکھا تھا۔ تم لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی ڈھولک کی تھاپ پر پہاڑی گیت گا رہی تھیں۔ ہمارے وقتوں میں بھی یہی ہوتا تھا کہ گھر کی بزرگ خواتین لڑکی کو پسند کر لیتیں اور پھر رشتے کی بات چلائی جاتی۔'' انہوں نے ساری لکڑیوں کو جمع کر کے دیوار کے پاس ترتیب سے رکھتے ہوئے مطمئن انداز میں کہا۔ زرینہ کے چہرے پر قوسِ قزح کے رنگ جھلملانے لگے۔ وہ بی بی جان کو یہ بتا نہیں سکی کہ پچھلے ماہ اپنی سہیلی کی مہندی پر جب وہ پہاڑی گیت گاتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں رنگ برنگی چوڑیاں پہنے تالیاں بجا رہی تھی تو سریلی آوازوں کی کشش گھر کے باہر کھڑے لوگوں کو بھی متوجہ کرنے لگی تھی۔ کسی نے کھڑکی سے جھانکا تھا۔ وہ امان خان تھا، اس کی نظر سبز لباس والی لڑکی پر پڑی جس نے گوٹے کناری والا دھنک رنگ دوپٹا اوڑھا ہوا تھا۔ اس کے گلے میں چاندی کا ہار جگمگا رہا تھا۔ وہ سیاہ گھنے بالوں اور سرخ و سفیدی رنگت والی لڑکی اسے بھا گئی۔

وہ اسے پہچانتا تھا۔ گاؤں کے سب لوگ ایک دوسرے سے واقف تھے۔ وہ باہر اندھیرے میں کھڑا تھا اس لیے روشنی میں بیٹھے لوگوں کو اس کا سایہ بھی نظر نہیں آیا مگر پھر بھی زرینہ نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس کی نظریں اس سے ملیں تو وہ مسکرایا تھا۔ زرینہ کے تالیاں بجاتے ہاتھ اسی لمحے رک گئے۔ چوڑیوں کی کھنک کا ارتعاش ٹھہر گیا اور وہ گھبرا گئی۔ پھر اس نے تیز ہوتی دھڑکن کے ساتھ غیر محسوس انداز میں رخ موڑ لیا تھا۔

پھر جب وہ حکم خان اور بی بی جان کے ساتھ واپس جانے لگی تو اماں خان جنگل سے ذرا فاصلے پر

جھاڑیوں میں چمکتے جگنوؤں کے قریب کھڑا تھا یوں جیسے اسے الوداع کہنے آیا ہو، وہ وہاں سے واپس آئی تو اِک یاد کا جگنو بھی اس کے آنچل میں موجود تھا جسے وہ اب تک سنبھالے بیٹھی تھی۔ وہ سر جھکائے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ چپ بیٹھی رہی۔ اب اسے شندور خان کی آمد کا انتظار تھا۔

☆☆☆

اگلے دن ارما نے ازمیر کو فون کیا مگر ازمیر کی باتوں نے اسے بے حد حیران کر دیا۔

''امی، ابو واپس ملتان آگئے ہیں۔ مبارک ہو آپ کو..... جانوروں کے ڈاکٹر کا پروپوزل ریجکٹ کر دیا گیا ہے۔ اب آپ بے فکر ہو کر لاہور چلی جائیں اور خوب خوشیاں منائیں۔'' وہ خوشگوار انداز میں بولا۔ وہ مطمئن سے انداز میں مسکرا دی۔

''مجھے پتا ہے رات کو میری نانی سے بات ہوئی تھی انہوں نے مجھے یہ خوشخبری سنا دی ہے۔ ازمیر تم نے یہ کارنامہ سرانجام دے کر مجھے اپنا احسان مند کر دیا ہے۔ تمہارا شکریہ کہ تم نے میری اتنی مدد کی۔ میرا اتنا احساس کیا ورنہ مجھے اپنے رشتے داروں سے کبھی خوشی نہیں ملی۔'' وہ خوش تھی..... وہ چونکا۔

''ڈیئر سسٹر! حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس سارے معاملے میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ میرے تو سارے پلان فلاپ ہوتے جا رہے تھے کہ ایک دم امی ابو نے خود ہی اس رشتے سے انکار کر دیا..... معلوم نہیں اچانک ایسی کیا بات ہوگئی..... امی، ابا نے اس سلسلے میں پھر کوئی بات نہیں کی۔ ہم سب تو خود اس کایا پلٹ پر حیران ہیں۔ پہلے تو امی، ابا اس رشتے کے معاملے میں بے حد پُرجوش تھے۔ اپنی طرف سے تو انہوں نے سب تیاریاں بھی کر لی تھیں۔ شبو خالہ اور یاور ماموں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور وہ لوگ روزانہ ڈاکٹر صاحب کے گھر کے چکر لگا رہے تھے۔ نہ جانے ایک دم کیا ہوا، کیا خبر ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں کوئی حسین وجمیل لڑکی آگئی ہو اور وہ اسے دل دے بیٹھے ہوں۔''

وہ بھی اِک کہانی ساز تھا۔ بیٹھے بٹھائے اوٹ پٹانگ کہانیاں بنتا رہتا ارما کو وجوہات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو بس یہ اطمینان تھا کہ رشتے سے انکار ہوگیا ہے مگر حیرت کی بات تھی کہ ازمیر کی کوششوں کے بغیر بھلا یہ کام اتنی آسانی سے کیسے ہوگیا تھا۔

''شکر ہے کہ وہ قصہ ختم ہوا۔ اب مجھے اس ڈاکٹر کے بارے میں مزید کوئی بات نہیں کرنی۔ اب وہ اتنا بھی اہم آدمی نہیں ہے کہ وہ اس کی وجہ سے ہم ہر وقت پریشان بیٹھے رہیں۔ راتوں کی نیندیں حرام کریں، اس سے جان چھڑانے کے طریقے سوچتے رہیں اور اپنا پیسہ بھی خرچ کرتے رہیں۔ اب تم اس ڈاکٹر کا نام بھی نہ لینا۔ میں اس کا ذکر سن، سن کر تنگ آگئی ہوں۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔

''اچھا دفع کریں اس ڈاکٹر کو..... میں نے سنا ہے کہ آپ کے لیے ایک بہت اچھا رشتہ آیا ہے۔ امید ہے وہاں بات بن جائے گی۔ کیا خبر یہی وہ اچھا انسان ہو جس کا ہم سب کو شدت سے انتظار ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''پتا نہیں کون ہے..... یہ تو لاہور جا کر ہی پتا چلے گا۔'' اس نے عدم دلچسپی سے سپاٹ سے انداز میں کہا۔

''مجھے بھی تفصیلات کے بارے میں معلوم نہیں ہے..... مگر سنا ہے کہ لوگ بہت اچھے ہیں اور لڑکے کا نام سالار ہے۔'' ازمیر نے چونکا دینے والا انکشاف کیا۔

''کیا..... سالار.....؟'' ارما کی آنکھوں کے سامنے زمین آسمان گھومنے لگے۔

اس خوابناک ماحول کی خوب صورت مگر پُر تجسس کہانی آگے کیا رنگ دکھاتی ہے یہ پڑھیے اگلے شمارے میں۔

عوام میں شہری شعور کی کمی اور اس کی بہتری کی صورت

شائستہ زریں

عزیز قارئین! السلام علیکم

اس امر سے تو ہم سب ہی واقف ہیں کہ گھر ایک چھوٹا سا معاشرہ ہے۔ جس کے سنگار کی ذمّے داری گھر کے ہر فرد پر عائد ہوتی ہے لیکن بچوں یا چھوٹوں کی نسبت بڑوں کی ذمّے داری کئی گنا زیادہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی عمر اور تجربے کی بنیاد پر بچوں سے زیادہ باشعور ہوتے ہیں دیگر یہ کہ بچوں کی تربیت ان کے سپرد ہوتی ہے۔ گویا ایک بڑے معاشرے کی تعمیر و تشکیل، ترقی و بقا کے لیے ابتدائی تربیت گھر یعنی اسی چھوٹے معاشرے سے دی جاتی ہے۔ جس میں نہ صرف خاندان میں رہنے اور گھر کے طور طریقے سکھائے جاتے ہیں بلکہ شہری اصول و ضوابط بھی اسی تربیت کا حصہ ہیں..... اور جس طرح خاندانی اقدار زوال پزیر ہیں اسی طرح ایک شہری کی کیا ذمّے داریاں ہونی چاہئیں اس سے بھی صرفِ نظر برتی جارہی ہے۔ شہری شعور کی بیداری ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس..... نتیجہ یہ کہ عوام میں من مانی کا شعور عام ہے صفائی کا خیال رکھا جاتا ہے نہ ہی نظم و ضبط کی کوئی اہمیت رہی اور اخلاقی ضابطے؟ وہ بھی ہم سے رخصت ہوتے جارہے ہیں۔ دنیا آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے۔ اور ہم عوام شہری شعور سے بے خبر انجان راستوں پر سفر کررہے ہیں جس کی بنا پر معاشرے میں بہت سی خرابیاں جنم لے رہی ہیں۔ شہری قوانین پر عمل درآمد ہمارے لیے بہت دشوار ہے۔ شہریوں کی یہ غفلت بہت بڑا المیہ ہے۔ اس پر قابو پانا بہت ضروری ہے۔ اسی احساس اور خیال کے پیش نظر ہم نے چند باشعور و معزز خواتین و حضرات سے معلوم کیا کہ

سوال 1: عوام میں شہری شعور کی کمی کا بنیادی سبب کیا ہے؟

سوال 2: اس کی بہتری کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

صباز رحمٰن
(ڈائریکٹر عورت فاؤنڈیشن)

ا: ہمارے سیاسی و سماجی حالات جو شروع سے رہے ہیں یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ پاکستان کے بنتے ہی آئین نہیں بنایا۔ ہمارے یہاں گڈ گورنس نہیں ہے۔

ایک مار دھاڑ، لوٹ مار کا کلچر بن گیا تو اس میں شہری شعور کی آپ کیا بات کرتی ہیں؟ ویسے ہم مذہب کا بہت نام لیتے ہیں لیکن صفائی جو نصف ایمان ہے اس کا ہم بالکل دھیان نہیں رکھتے تو آدھا ایمان تو ہمارا یونہی چلا جاتا ہے۔ اخلاقی ضابطوں کا خیال تو وہی قوم رکھتی ہے ناں جس نے جمہوریت کو صحیح معنوں میں کام کرتے دیکھا ہو اور جس نے اچھی حکومت دیکھی ہو اپنے ملک میں چونکہ یہ سب شروع سے رہا ہی نہیں ہے۔ بااعتبار مجموعی ایک خودغرضی معاشرے میں ہے۔ ہم اپنے گھر کو تو شیشے کی طرح چمکائیں اور گھر کے باہر دروازے پر کوڑا ڈال دیں گے تو اپنے محلّے، گلیوں، سڑکوں کا خیال رکھنا ہم لوگوں نے سیکھا ہی نہیں ہے۔ سب کو اپنی، اپنی پڑی ہے۔ شروع سے ہم سب کا یہی رویّہ ہے جو بد سے بدتر

ہوتا جارہا ہے۔ یہاں تک کہ مسجدوں کے سامنے گٹر ابل رہے ہوتے ہیں۔ ویسے تو اتنا چندا دیتے ہیں لوگ لیکن جب گٹر کے پانی سے گزر کر مسجد جارہے ہیں تو آپ کی صفائی کا کیا ہوا؟ حکومت کچھ نہیں کرسکتی۔ ہم شہری ویسے بہت فضول خرچی کرتے ہیں لیکن ان چیزوں پر پیسہ نہیں خرچ پاتے۔ کیونکہ ہم میں یہ شعور ہی نہیں کہ خود پیسے جمع کر کے گٹر صاف کرادیں۔ سگنل توڑ کر ہم کو خوشی ملتی ہے۔ قطار بنانے میں ہمیں اپنی توہین محسوس ہوتی ہے۔ قطار میں کھڑے ہونے اور اپنی باری پر آگے بڑھنے سے نظم وضبط پیدا ہوگا مگر ہماری قوم نے تو یہ سیکھا ہی نہیں۔

۲: ہمارے حکمران رول ماڈل بنیں، وہ عملی مظاہرہ کریں۔ عام لوگوں کی طرح قطار میں لگیں، چالان کرائیں، چالان بھریں تو نیچے جو عوام ہیں تو ان کو بھی سمجھ آئے گی سبق ملے گا کہ جب ہمارے حکمران ایسے کررہے ہیں تو ہم کیوں نہ کریں۔ عوام کے ہمدرد ابن پیدا ہوں جو شہر کی منصوبہ بندی کے ماہر ہیں، عوام کے دکھ درد کو سمجھتے ہیں۔ ان کو حکومت گھاس نہیں ڈالتی۔ یہاں تو سب کو اپنی، اپنی پڑی ہے عوام کا کون سوچے گا جو عوام کی سوچتے ہیں انکو ناظم نہیں بنایا جاتا اور جب تک ہم اپنے مخلص لوگوں کی بات نہیں سنیں گے۔ ہمارے شہر کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے۔

مصطفیٰ قریشی
(ممتاز ظم اوراٹی وی آرٹسٹ، سیاستدان)

۱: بنیادی سبب تعلیم کا فقدان ہے۔ اول تو تعلیم زیادہ ہے نہیں، بالخصوص اندرون صوبوں میں۔ اور شہروں میں بھی جہاں تعلیم ہے تو زیادہ تر غیر معیاری ہے۔ دینی تعلیم زیادہ اہمیت کی حامل ہے جو ہماری بنیاد ہے۔

۲: بہتری کے لیے تعلیم کو عام کرنا ہوگا۔ باقی دیگر تمام شعبوں کے مقابلے میں تعلیم کے شعبے میں بجٹ کم رکھا جاتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہونے کے لیے انگریزی کی اور دنیاوی تعلیم بھی ہونی چاہیے جیسے طب، قانون، سائنس، ٹیکنالوجی، کامرس وغیرہ لیکن اوّلیت دینی تعلیم کو حاصل ہونی چاہیے۔ خود میری بنیادی تعلیم ''مدرسۃ الجامعۃ العربیہ'' سے ہوئی جہاں میرا بنیادی مضمون عربی تھا اس میں فقہ، حدیث، تفسیر شامل تھے۔ وہاں کے مولوی عربی تعلیم کے ساتھ، ساتھ بہترین انگریزی پڑھاتے تھے۔ مولوی محمد حسین میتھ میٹکس کے ماہر استاد تھے۔ ان کا دماغ کمپیوٹر کے مانند تھا۔ اگر ہمارے دینی مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم بھی دی جائے تو اور دیگر معاملات کے ساتھ، ساتھ شہری شعور میں بھی بہتری آئے گی۔

عمرانہ مقصود
(قلمکار)

بنیادی سبب بڑوں کی عدم توجہ ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر کام کے لیے ایک بنیادی تربیت ہوتی ہے جو آپ کی نہیں ہوئی تو آپ ناکام ہیں۔ اور یہ غلطی بڑوں کی ہے بڑوں کی غلطی کا شکار اس کا چھوٹا ہوتا ہے کہ وہ اپنے بڑوں سے سیکھتا ہے اور ہمیں بھی اپنے سے چھوٹوں کو سکھانا ہے۔ جہاں، جہاں جس کے بس میں جو ہو وہ چھوٹوں کو سکھائے لیکن اب میں نے دیکھا ہے کہ ہر کام میں لوگ پیسہ دیکھتے ہیں سکھانے کے لیے بھی خلوص سے زیادہ پیسہ اہم ہے۔ میں نے اپنی زندگی وقف کردی ہے ایسے لوگوں کے لیے جنہیں میں سکھاتی ہوں اور جو میری ہر بات سن سکتے ہیں تو مجھے لگتا ہے ہر ایک یہ کرسکتا ہے۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ میں نے یہ کام ستر سال کی عمر میں شروع کیا ہے اس سے پہلے بھی میں اس طرح کے کام کرتی تھی لیکن اب کلیکو کام شروع کیا ہے، بہت سارے بچوں کے لیے تاکہ میں ان کو اس دنیا سے جہاں وہ ہیں باہر نکال کر باہر کی دنیا کی پہچان کراسکوں، میرا

خیال ہے کہ میں اس میں کامیاب ہوں۔ یہ بڑوں کا کام ہے کہ بچوں کو سکھائیں اور ان کو وہاں تک پہنچائیں کہ وہ اچھے شہری بن جائیں اور آگے وہی تربیت آنے والوں کو دیں جو انہوں نے حاصل کی..... ایک فرد چاہے تو وہ بھی یہ کام کرسکتا ہے ایک بچے کو بھی سکھائے کہ ایک بیج سے ہی پودا نکلتا ہے۔ اسی طرح ایک بچہ اگر کم عقل ہے دوسرا زیادہ سمجھدار ہے تو وہ آگے کام کرے گا۔ میں نے ایک خبر پڑھی کہ ایک بچہ جو شربت کا ٹھیلا چلاتا ہے اس نے میٹرک میں ٹاپ کیا۔ جو اس کے لیے وجہ شہرت بن گیا۔ لوگ اس کے پاس آرہے ہیں کہ تم آگے پڑھو تو وہ کہتا ہے کہ میں آگے پڑھوں گا تو یہ ٹھیلا کون چلائے گا؟ میری بیوہ ماں اور بہنیں ہیں اور میں اکیلا کمانے والا۔ سوچیں ذرا وہ بچہ کتنے لوگوں کی زندگی بدل سکتا ہے۔ ان شاء اللہ۔ زمین اور ٹاٹ کے اسکولوں میں پڑھنے والوں نے خود کو ثابت کیا ہے لیکن اس کے لیے بہت دل، جگر، عقل اور سمجھ چاہیے سب سے بڑھ کر کوئی سمجھدار انسان اس کے سر پر ہو تو شہری مسائل حل ہوں یعنی ہمارے شہر کی گندگی صاف ہو، کچی آبادیوں کی تباہی حالانکہ کچی آبادیاں کتنی خوب صورت ہوتی ہیں۔ ہم انہیں اچھا بنا سکتے ہیں، وہاں درخت لگوائیں، وہاں کی صفائی کا خاص انتظام کریں۔ اب مجھے لگتا ہے کہ ان کی بہتری کے لیے ہم صحیح راستے پر آرہے ہیں۔ اللہ میرے کہنے میں برکت دے اور شہری شعور میں بہتری آئے۔

شہر بانو

(پہلی نائب صدر PFUJ ایڈیٹر سیلیبرٹیز دی نیوز انٹرنیشنل)

ا: اگر دیکھا جائے تو ہماری عوام کا شہری شعور بالکل ختم ہوگیا ہے اس کی دو تین وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تعلیمی نظام میں سے ان چیزوں کو ختم کردینا جن کی وجہ سے بچوں میں یہ شعور پیدا کرتے تھے۔ شہریت ایک مضمون ہوا کرتا تھا جس میں یہ تمام چیزیں ہوتی تھیں، بچوں کے نصاب میں نظم وضبط کی چیزیں ہوتی تھیں۔ سول ڈیفنس کی تربیت ہوتی تھی، گرلز گائڈز، اسکاؤٹس جس سے بچوں میں نظم و ضبط ہوتا تھا۔ یہ سب چیزیں اسکول سے ختم کردی گئی ہیں۔ سرکاری اسکولوں کی ذمے داری حکومت لیتی تھی جب اونر شپ نہیں ہے تو تربیت بھی نہیں ہے۔ بچے خوف سے سیکھتے ہیں یا محبت سے۔ استادوں کو بچوں سے محبت نہیں تو وہ محبت سے سکھاتے بھی نہیں۔ بچوں کا خوف ختم ہوگیا وہ جانتے ہیں کہ ٹیچرز کو مارنے کی اجازت نہیں، اسکول اب تعلیم وتربیت کا ادارہ نہیں رہے۔ اسکول سے یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم وتربیت کا فقدان ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام بالکل ختم ہوگیا۔ پہلے گھر میں ہر کام کے لیے وقت کی پابندی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ ماں ملازمت پیشہ ہے تو بچے میڈز کے ہاتھوں پل رہے ہیں اور اگر میڈ بھی نہیں ہے تو بچے جو چاہیں کریں۔ انٹرنیٹ، موبائل بچوں کے ہاتھوں میں دے دیا۔ اس میں بچے جو کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اس سے نسل خراب ہورہی ہے۔ ملازمت پیشہ مائیں بچوں کو کوالٹی ٹائم نہیں دے رہیں۔ تیسری چیز ہم نے میڈیا کے ذریعے جو ایک اور چیز سیکھی ہے یا سکھائی گئی وہ یہ کہ صفائی اور نظم و ضبط کی ذمے داری حکومت پر ہے۔ اس وقت ہمارا پورا کراچی گندگی کا گہوارہ بنا ہوا ہے۔ ہم فرد کی حیثیت سے اپنی ذمے داری نہیں نبھا رہے، سیاستدانوں اور کونسلروں پر ڈال رہے ہیں۔ میڈیا نے ہمیں الزام دینا سکھادیا۔

۲: فیملی انسٹیٹیوٹ کو دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ملازمت پیشہ ماؤں پر گھر اور ملازمت کی دوہری ذمے داری ہوتی ہے ان پر اضافی ذمّے داریوں کا بوجھ نہ ڈالیں تاکہ وہ بچوں پر زیادہ توجہ دے سکیں۔ سرکاری و غیر سرکاری مدارس میں یکساں نصاب تعلیم ہونا چاہیے، بچوں کی تربیت کے لیے نصاب میں ضروری تبدیلی کریں۔ اسکولوں میں بچوں کی ذہنی و جسمانی تربیت کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں، ٹی وی کو بچوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ، ساتھ فیملی کی تفریح کا ذریعہ بنائیں کہ تمام گھر والے بلا جھجک ایک ساتھ ڈرامے اور ٹی وی شوز دیکھ سکیں۔ ان میں اخلاقیات سے گری چیزیں نہیں ہونی چاہئیں۔ بقرعید میں قربانی کے بعد گوشت تو فریزر میں رکھ لیا اور آلائش گلیوں میں پھینک دیں جس طرح قربانی کا جانور گاڑی میں لائے تھے اسی طرح آلائش کو بھی ڈمپ کردیں۔ کچھ دنوں بعد ڈینگی اور دوسری بیماریاں شروع ہو جائیں گی۔ یہ اخلاقی اور شہری شعور کی کمی ہی تو ہے جب تک ہم ''میرے لیے'' سے ہٹ کر ''ہمارے لیے'' نہیں سوچیں گے، نہ تو معاشرہ صحیح ہو سکے گا اور نہ ہی ملک۔

سید سرخان نظامانی
(سماجی، ارٹسٹ)

ا: مور لی لی، علم کے حصول سے دوری، ہر درجہ کا کارن حکومت کو ٹھہرانا، خودترسی میں مبتلا رہنا، اپنی بیشتر توانائی موبائل کے سستے پیکجز میں ضائع کرنا، محنت سے بھاگنا وغیرہ۔

۲: بہت نقصان ہو چکا۔ اب ہماری زندگی میں تو ممکن نہیں کہ کوئی بہتری ہو۔ اب سب ختم ہو کر دوبارہ سے ہر چیز مرتب کی جائے گی۔ کرۂ ارض ایک بار پھر ضروری مرمت کے لیے بند ہوگا۔

شاھینہ رفیع
(ریڈیو براڈکاسٹر..... رائٹر)

ا: بنیادی کمی گھر کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ اگر بچپن ہی سے اپنے گھر کے نظم و ضبط بچوں کو سکھائیں گے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ باہر کی بھی تمام چیزوں کو بھی سمجھے گا۔ جتنے بھی شہری اصول ہوتے ہیں۔ وہ گھر میں ہی پہلے سکھائے جاتے ہیں۔ یہ کمی جو پائی جارہی ہے آج کل، خاص کر بچوں میں تو میں سمجھتی ہوں کہ یہ صرف اور صرف گھر کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ آج کل تو یہ تربیت دی جارہی ہے۔ جیسے چاہو بیٹھو، جب چاہو اٹھو۔ جو چیز جہاں چاہے رکھ دو۔ یہ سکھایا ہی نہیں جاتا کہ وقت پر کھانا چاہیے، وقت پر سونا چاہیے، گھر کے ڈسٹ بن میں کوڑا پھینکو۔ یہ سب چھوٹے بچوں کو گھر میں سکھایا جاتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ بچے تو کیا گھر کے بڑے بھی جہاں بیٹھے ہیں کھا پی کر وہیں سب کچھ پھینک دیتے ہیں۔ بچہ وہی کرتا ہے جو وہ بڑوں کو کرتے دیکھتا ہے۔ یہی بچے بڑے ہو کر باہر نکلتے ہیں پان کھایا وہیں تھوک دیا، سگریٹ پی وہیں پھینک دی۔

۲: ایک اچھا شہری بننے کے لیے گھر سے سیکھ کر نکلنا پڑے گا تب کہیں جا کر آپ اپنے شہر، اپنے ملک ہر چیز کو میچ کروگے۔ آج کل کی ماؤں کو لڑکیوں کو خاص طور پر اس کی تربیت دینی چاہیے کہ آج جو وہ میکے میں کریں گی کل سسرال جا کر بھی یہی کریں گی۔ ایک نسل ان کی گود میں پروان چڑھے گی۔ اچھی بیٹی ہی اچھی بیوی اور اچھی ماں بنتی ہے۔

علی عباس
(ٹی وی ارٹسٹ)

ا: شہری شعور میں کمی کا بنیادی سبب تعلیم کا نہ ہونا

ہے بدقسمتی سے ہمارے ملک میں تعلیم کو اتنی ترجیح نہیں دی جاتی۔لڑکوں کے لیے بھی اور لڑکیوں کے لیے بھی خاص طور پر لڑکیوں کے لیے، لڑکے اگر پڑھ بھی لیتے ہیں تو بہت زیادہ نہیں پڑھ سکتے کچھ اس میں ہماری مجبوریاں بھی ہیں، ہمارے ملک کی غربت بھی ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ پڑھائی سستی جگہوں پر بھی ہو جاتی ہے صرف پڑھنے کے لیے دل چاہیے ہوتا ہے۔جب تک دل و ذہن سوچ تبدیل نہیں ہوگی کہ ہم کو پڑھنا ہے اور پڑھ کر آگے بڑھنا ہے۔لوگ یہاں پر کہتے ہیں کہ پڑھ کر کیا کرلو گے؟ نوکری کرلو گے؟ میرے پاس تین ڈگریاں ہیں، میں نے وکالت پڑھی ہوئی ہے، بزنس بھی پڑھا ہوا ہے اور فلم اور ٹی وی کا بھی پڑھا ہوا ہے مجھے لگتا ہے کہ ان تینوں چیزوں کی تعلیم حاصل کرنے سے ڈگری سے زیادہ جو شعور مجھے حاصل ہوا، وہ سب سے زیادہ فائدہ مند چیز ہے میری زندگی میں کتابیں پڑھنے کا شوق وہاں سے پروان چڑھا۔ کتب بینی کا شوق ہوا تو میں نے بڑے، بڑے لوگوں کی باتیں پڑھیں تو مجھے سمجھ میں آیا کہ کسی نے جو ایک اقتباس بھی لکھا ہے وہ اس کی زندگی کا نچوڑ ہے۔ تو ہم تو بڑے خوش قسمت لوگ ہیں ہمیں کسی کی بھی زندگی کا نچوڑ محض ایک سطر میں دے دیا گیا ہے۔ جو غلطیاں انہوں نے کیں، ہمیں بتا دیا کہ یہ غلطیاں مت کرنا اور تب بھی ہم وہ ہی غلطی کر رہے ہیں تو ہم بہت نالائق ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ تعلیم ہمارے شہری شعور کے لیے بہت ضروری ہے۔

۲: شہری شعور کی بہتری کے لیے سب سے پہلے تو تعلیم ہے پھر دوسرا ہمارے معاشرے میں ایک اور بہت بڑا مسئلہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ تم ٹھیک ہو جاؤ، میں ٹھیک نہیں ہوں گا۔ پہلے تم ٹھیک ہو گے پھر میں ٹھیک ہوں گا تو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے مذہب میں بھی ہے کہ ہر اچھے کام کا آغاز سب سے پہلے اپنے گھر سے کرو تو اپنے آپ کو صاف کرنا بہت ضروری ہے۔ اپنے دماغ کی صفائی بہت ضروری ہے۔ دوسروں کا مقابلہ کرنا ضروری نہیں ہے جب آپ اپنے گھر کو صاف رکھیں گے، اپنے آپ کو صاف رکھیں گے تب آپ کے اردگرد سب کچھ خود ہی صاف ہو جائے گا۔ چور ہی دوسرے انسانوں کو چور سمجھتے ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ تعلیم کے ساتھ، ساتھ اپنی صفائی بھی بہت ضروری ہے۔

ہما علی
(افسانہ نگار)

۱: اس کی بنیادی وجوہات اللہ تعالیٰ سے دوری، والدین کی عدم توجہ، احساس کمتری اور تربیت کا فقدان ہیں۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ ہم نے اسلامی تعلیمات اور معاشرتی اقدار کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ میرے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے ''صفائی نصف ایمان ہے'' لیکن ہماری صفائی صرف ڈرائنگ روم تک محدود رہ گئی ہے۔ نظم و ضبط کا مظاہرہ نمازوں میں ہی نظر آتا ہے۔ احساس کمتری بہت بڑی بیماری ہے۔ امیر لوگوں کو دیکھ کر اکثر لوگوں کو لگ جاتی ہے۔ پہلے سر دھڑ کی بازی لگا کر امیروں کی دوڑ میں شامل ہونے کے لیے ان کی دیکھا دیکھی کتے، بلی پال لیتے ہیں۔ لیکن ان کی دیکھ بھال پر توجہ نہیں دیتے، صفائی اور طہارت کا خیال نہیں رکھتے۔ آج اولادوں کے ہاتھوں ماؤں کی عزت پامال ہو رہی ہے۔ والدین نے بچوں کو شتر بے مہار چھوڑ رکھا ہے۔ بچے ساری، ساری رات اسمارٹ فون پر کھیل رہے ہیں۔ اس دوران جنک فوڈ کھا رہے ہیں بیڈ کے نیچے کچرا پھینک دیا، بوتلوں کے خالی ٹن پھینک دیے لیکن حیرت ہے کہ والدین تنبیہ نہیں کرتے۔ کل جب یہی بچے بڑے ہوں گے تو غیر ذمے دار شہری ثابت ہوں گے۔ بچے کی پہلی تربیت گاہ ماں کی گود ہوتی ہے اور پھر گھر کا ماحول۔ مجھے یاد ہے بچپن میں ہم میں سے کوئی بچہ

ناشتے کی میز پر دانت برش کیے بغیر آجاتا تو ممی ناشتا نہیں دیتی تھیں، جب تک وہ دانت صاف نہیں کر لیتا۔ کردار سازی تو گھر کے ماحول سے ہی شروع ہوتی ہے۔ رشتوں کا احترام، بڑوں کی عزت، چھوٹوں سے پیار بھائی بہنوں کے لیے آپس میں قربانی کا جذبہ، اپنے کمرے کی صفائی، چیزوں کو ان کی جگہ پر رکھنا۔ ایسی ہدایات کے لیے وقت ضروری ہے جو پہلے نانی دادی دے دیتی تھیں اب وقت ہم سے گم ہو گیا ہے۔ کوئی پروا بھی نہیں کرتا۔

۲: بچوں میں کتب بینی کی عادت ڈال کر ان کی پڑھی جانے والی کتابوں پر ان سے ڈسکس کریں۔ آج کل آن لائن کلاسز ہو رہی ہیں۔ ان ہی میں ''آج کا پیغام'' کے عنوان سے شہری شعور کی بیداری کے لیے روز ایک چھوٹا سا پیغام دینے کا سلسلہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے پاور فل میڈیا کا کردار بھی بہت اہم ہے جس طرح کرونا کی وجہ سے ہاتھ دھونے کو پروموٹ کیا جا رہا ہے اسی طرح ڈراموں اور اشتہاروں میں اخلاقیات، رشتوں کا احترام اور نظم وضبط کو فوکس کریں۔ اچھی بری باتوں کا فرق چھوٹے، چھوٹے خاکوں کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح شہری شعور کی کمی پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

شجاع اللہ خان

(سینئر کمرشل پروڈیوسر، براڈکاسٹر)

ا: بنیادی وجہ تعلیم کا نہ ہونا اور علم کی کمی ہے۔ ہمارے یہاں رجحان یکسر تبدیل ہوتا جا رہا ہے پہلے صحت مند ماحول ہوا کرتا تھا۔ اب یہ چیزیں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ نوجوان نسل نے جدید ٹیکنالوجی کی زد میں آ کر خود کو محدود کر لیا ہے، بہت ساری چیزیں سوشل میڈیا پر نظر آتی ہیں۔ کیمپینز چلاتے ہیں اور اس کا حصہ بنتے ہیں لیکن عملی طور پر ایسی چیز نہیں ہوتی، معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے نوجوان نسل روایتی اور اخلاقی اقدار سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ شہری شعور میں کمی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ عملی طور پر ہم بہت سی چیزوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ کورونا حالیہ چل رہا ہے اس میں سماجی فاصلے کی بات کرتے ہیں وہ بھی ہم سے فالو نہیں ہو رہا۔ ہم زندگی گزارنے کے بنیادی اصول کہیں چھوڑ آئے ہیں۔ یہ سوشل ایکٹیویز اور جدید ٹیکنالوجی کا دور ہے موبائل اور مختلف ایپس جو بہت زیادہ ٹائم ٹیکنگ ہیں لوگ اس میں مصروف رہتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ بزرگوں کی صحبت سے دوری اور سوشل میڈیا میں وقت صرف کرنا بھی اس کی بڑی وجہ ہے۔ ان کے ذریعے شہری شعور اجاگر کرنا چاہیے۔

۲: جس پر کچھ تنظیمیں ہیں۔ کچھ لیکچرز بناتے ہیں۔ اسی طرح سے ہر علاقے میں اگر بزرگوں کی بیٹھک کا پرانا سلسلہ شروع ہو جائے جہاں بزرگ اپنی زندگی کے تجربات بیان کریں۔ تو اس کے بہترین ثمرات حاصل ہوں گے۔ خاص طور پر نوجوانوں کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔ جو انہیں اچھا انسان اور شہری بنانے میں معاون ثابت ہوگا۔ اس کے علاوہ فزیکل ایکٹیویز دوبارہ شروع ہو جائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے جو بنیادی شہری مسائل ہیں ان میں واضح طور پر کمی نظر آئے گی اور عوام میں شہری شعور بھی بہتر ہوگا۔

نگینہ ضیا

(تبصرہ نگار پاکیزہ)

ا: عوام میں شہری شعور کی کمی کا سبب پہلے میں تعلیم کی کمی کو سمجھتی تھی لیکن آج کل تو تعلیم یافتہ افراد میں بھی یہ کمی نظر آتی ہے۔ بعض لوگ پڑھ لکھ کر بھی جاہل رہتے

ہیں اور چند ایسے بھی ہیں جو بغیر پڑھے لکھے وہ تمام فرائض ادا کرتے ہیں جو تعلیم یافتہ افراد ان سے زیادہ بہتر طور پر جانتے اور سمجھتے ہیں لیکن عمل نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ اس کمی کا بڑا سبب میں سوشل میڈیا کو سمجھتی ہوں کہ اس کی وجہ سے نئی نسل بہت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ بلاشبہ سوشل میڈیا بہت اچھا کام بھی کر رہا ہے لیکن چند لوگوں کی وجہ سے معاشرہ خراب ہو رہا ہے۔

۲: اس کی بہتری بھی سوشل میڈیا سے ہی ممکن ہے کیونکہ جن چیزوں سے معاشرہ خراب ہوگا ان ہی چیزوں سے درست بھی ہو سکتا ہے۔ اگر سوشل میڈیا درست پروگرام کا انتخاب کرے اور تمام سوشل میڈیا user اس پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں تو میرا خیال ہے کہ عوام میں کبھی ان چیزوں کی کمی نظر نہیں آئے گی۔ جب سوشل میڈیا نہیں تھا شہری شعور میں کمی بھی نظر نہیں آتی تھی۔

نسرین مرزا
(مدلمہ)

۱: شہری شعور میں کمی کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے پہلے تو والدین کی تربیت۔ خاص طور پر اپنے بچوں کا غلط بات اور کام سے نہ روکنا۔ جس کی وجہ سے یہ تمام برائیاں ان کی عادت بن جاتی ہیں۔ ایک وجہ لوگوں کی انا اور ضد بھی ہے۔ جتنا بھی سمجھانے کی کوشش کرو کہ آپ غلط کر رہے ہیں۔ ضد میں آکر اور زیادہ غلط کرتے ہیں لیکن اپنی غلطی نہیں مانتے۔

۲: بہتری کے لیے والدین بچوں کو شروع ہی سے سمجھائیں کہ صرف اپنے گھر کی صفائی کا خیال نہ رکھیں بلکہ گھر کے باہر گلی اور سڑک پر بھی کچرا نہیں پھینکیں۔ بچوں کو سکھائیں کہ اپنی خامیوں پر نظر رکھ کر اپنے آپ کو بہتر انسان بنانے کے لیے کوشش کریں نہ کریں کہ جھوٹی انا کی خاطر جان بوجھ کر غلط کام کریں۔ حکومت کو چاہیے کہ گھروں سے کچرا اٹھا کر اسے صحیح طرح سے dispose کرنے کا نہ صرف منصوبہ بنائے بلکہ اس پر فوری عمل درآمد کرے۔ کیونکہ لوگوں کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں انہیں سڑکوں پر کچرا ڈالنا پڑتا ہے پھر یہی کچرا نالوں میں جا کر انہیں بھی بند کر دیتا ہے۔ نالوں کے پاس جھونپڑیاں ہیں انہیں بھی ختم کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ لوگ بہت گندگی پھیلاتے ہیں اور خود ان کی جانوں کو بھی خطرہ ہے۔

☆☆☆

قارئین کرام! شہری شعور کی کمی کا بنیادی سبب اور اس کی بیداری کے ضمن میں آپ نے سروے کے شرکاء کی آرا اور تجاویز پڑھیں۔ کیا ہی اچھا ہو ان تجاویز میں سے جو ہمارے بس میں ہے ان پر عمل ضرور کریں.... بلاشبہ یہ عہد حاضر کا المیہ ہے کہ آج کا بچہ شہری اصول نہ تو اپنے گھر سے سیکھتا ہے اور نہ ہی تعلیمی اداروں میں اس جانب توجہ دی جاتی ہے۔ گزشتہ چند عشروں سے یہ رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب یہ بچہ بڑا ہوتا ہے تو شہری شعور سے قطعاً نا آشنا ہوتا ہے۔

سو کیا ہی اچھا ہو کہ ہم میں سے ہر فرد اپنی انفرادی ذمے داری محسوس کر کے، شہری اصولوں کے مطابق شہر کی بہتری کا نہ صرف سوچے بلکہ اپنے حصے کا دیا جلاتے ہوئے عمل بھی کرے۔ بلاشبہ اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے جس پر عمل کر کے نہ صرف ہم شہری شعور اجاگر کر سکتے ہیں بلکہ شہری دلکشی میں اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ شرط صرف عزم راسخ اور عمل پیہم ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

شہریوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور ان میں شہری شعور اجاگر کرنے کے لیے ادارہ پاکیزہ کی یہ ایک ادنیٰ سی کاوش ہے۔ اللہ عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

☆☆☆

شمعِ ہدایت

اختر شجاعت

رضا.....توفیق الٰہی

تمام تر حمد وثنا اللہ رب العزت کے لیے جو ہمارا مالک، خالق اور رازق ہے۔ وہ ہمارا پیارا رب کہ جس نے ہمارے اچھے کاموں کو ظاہر کیا اور برے کاموں پر پردہ ڈالا۔ جو جرم پر فوراً مواخذہ نہیں کرتا اور ہماری بدکاریوں کی پردہ داری کرتا ہے۔ جو بہت بڑا معاف فرمانے والا اور بہت اچھا درگزر کرنے والا ہے۔ جو ہماری ہر سرگوشی کا جاننے والا، ہر شکایت کا سننے والا اور بہت احسان کرنے والا ہے۔

تمام تر تعریف اس عظیم رب کی جو اپنے بندوں کو رزق عطا فرماتا ہے۔ جس کی ذات سب سے بڑھ کر کریم ہے۔ جس کا جاہ وجلال سب سے بڑا ہے۔ جب اس کی اطاعت کی جاتی ہے تو وہ اس کا بہترین بدلہ دیتا ہے اور نافرمانی کی جاتی ہے تو بھی توبہ پر بخش دیتا ہے۔ ہر بیمار، مجبور و لاچار کی دعا سنتا ہے۔ اس عظیم رب کی بے تحاشا نعمتوں کا بدلہ نہ کوئی دے سکتا ہے اور نہ ہی اس کی لازوال حمد اس کی تعریف اور اس کے شکر کا حق ادا کیا جاسکتا ہے۔

اے اللہ! درود وسلام ہو اس پیارے آقا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو آپ کے محبوب اور امت کے لیے سراپا رحمت ہیں۔

کروڑوں درود وسلام سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان کی آلؑ پر ان کے اصحابؓ پر.....

آج ہمارا موضوع.....''رضا'' ہے۔ رضا کے لغوی معنی ہیں: خوشنودی، مرضی.....

اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے اس نے ہر انسان کے لیے زندگی بھر کا ایک اندازہ لگا رکھا ہے۔ جسے قضائے الٰہی کہا جاتا ہے۔ اللہ کے اس اندازہ شدہ پروگرام کو مانتے ہوئے اللہ کی ہر بات پر راضی رہنا رضائے الٰہی کہلاتا ہے۔

رضا سے مراد درحقیقت یہ ہے کہ بیماری ہو یا پریشانی جب دل میں یہ جذبہ پیدا ہوجائے اور انسان کی سوچ ایک ہی نقطے پر ٹھہر جائے کہ یہ سب میرے آقا، میرے رب کی عطا کردہ ہے اس سے گھبرانے کے بجائے میں اسے اپنے آقا اور مالک کی عطا سمجھ کر سینے سے لگا رکھوں تو یہ مقامِ رضا ہوگا۔

رضا کے دو درجے ہیں۔

۱۔ جہاں انسان رب پر راضی ہوجائے۔

۲۔ جہاں انسان رب سے راضی ہوجائے۔

ان میں سے ایک مقام تو مجاہدہ.....ریاضت اور محنت سے حاصل ہوتا ہے۔ جسے تصوف میں ''حاصلِ کشف'' کہا جاتا ہے۔ دوسرا مقام خالصتاً عطا ہے جو صرف اور صرف رب کی توفیق سے ملتا ہے۔ اسے کسی بھی طور محنت سے کمایا نہیں جاسکتا۔ اس لیے ان میں سے ایک ''حال'' اور دوسرا ''مقام'' کہلاتا ہے۔ رب پر راضی ہوجانا حاصلِ کشف ہے۔ ہم محنت اور ریاضت کے ذریعے اپنے اندر یہ جذبہ پیدا

کر سکتے ہیں اور وہ یوں کہ ہم رب تعالیٰ کے احکامات کی پیروی محض فرض سمجھ کر نہ کریں بلکہ خوشی اور محبت سے اس کی معرفت حاصل کرتے ہوئے ان احکامات کو بجالائیں..... یہ درجہ ''مقام'' کہلاتا ہے۔

اپنے رب کی طرف سے جو بھی عطا ہو اسے اپنی تقدیر کا حصہ سمجھ کر ہنسی خوشی قبول کرے خواہ وہ رحمت ہو یا زحمت..... یہ درجہ خالصتاً اللہ کی توفیق ہی سے عطا ہوتا ہے۔

صوفیہ نے رضا پر کافی بحث کی ہے۔ ...کہ رضا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا دروازہ ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ نے اپنی رضا سے نوازا ہو اس پر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی عنایت ہے۔

حضرت سلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ جب بندہ اپنی خواہشات کو ترک کردے تو وہ اللہ سے راضی ہے۔

حضرت ابن خفیفؒ سے مروی ہے کہ اللہ کے احکام میں دل لگانا اور جن چیزوں سے اللہ راضی ہوتا ہے اور جنہیں وہ پسند کرتا ہے دل کا ان کی موافقت کرنا رضا کہلاتا ہے۔

حضرت رابعہ بصریؒ سے سوال کیا گیا ہے کہ بندہ کب راضی برضا کہلانے کا حقدار ہوتا ہے آپؒ نے فرمایا..... ''جب وہ مصیبت میں بھی اسی طرح خوش رہے جس طرح آرام میں خوش رہتا تھا۔''

حضرت ابوسلیمانؒ فرماتے ہیں کہ رضا یہ ہے کہ نہ تو اللہ سے جنت مانگے اور نہ دوزخ سے پناہ طلب کرے۔

ایک صحابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی۔ ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے تو میرا مال چلا گیا۔ اب میرا جسم بیمار ہوگیا۔''

اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''تمہارے اندر کچھ نہ کچھ بہتری کا سامان موجود ہے جس کی بنا پر یہ حالات آئے ہیں۔'' اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے تعجب کا اظہار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''اے ابوبکرؓ! کیا تم کبھی بیمار نہیں ہوئے؟ کیا تم پر کبھی مصیبت نہیں آئی؟ کیا تم کبھی رنجیدہ نہیں ہوئے؟ کیا تم نے کبھی مشکلیں نہیں سہیں؟ اگر تم نے یہ سب زندگی میں جھیل لیا تو اس سے تمہارے گناہوں کا کفارہ تو یہیں ادا ہوگیا، اللہ تمہاری مغفرت فرمائے..... پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو مشکل میں ڈالتا ہے یا بیمار کرتا ہے تو اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ کو دراصل اس کی بھلائی مقصود ہے اور اللہ اسے کوئی ایسا درجہ عطا کرنا چاہتا ہے جس پر ان مشکلات کو عبور کیے بغیر پہنچنا ممکن نہیں..... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب کوئی شخص اللہ کی قربت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے مشکل میں ڈال کر آزماتا ہے۔''

☆☆☆

حضرت سید علی ہجویریؒ کا قول ہے کہ خدا کا راضی ہونا یہ ہے کہ وہ بندے کی خوش اعمالی پر ازراہِ اجر اسے کرامت اور عزت عطا کرے۔ بندے کا راضی ہونا یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے احکام پر سرِ تسلیم خم کرے اور اوامر کو بجالائے۔ خدا کا راضی ہونا مقدم ہے کیونکہ جب تک اس کی رضا نہ ہو کوئی انسان اس کے احکام بجالانے کی توفیق نہیں رکھ سکتا۔ انسانی رضا کا تعلق رضائے خداوندی سے ہے۔

رضائے الٰہی کا حاصل ہوجانا بہت بڑی کامیابی ہے۔ رضائے الٰہی کا ایک اور انعام جنت عدن ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا اجر جنت عدن ہے جس میں نہریں بہتی ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے..... یہ صلہ اس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔'' (سورۃ البینہ)

ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کی کہ ''یاباری تعالیٰ! وہ کام بتا جسے

میں سرانجام دوں اور تیری رضا حاصل کرسکوں۔ حکم ہوا..... اے موسیٰ! یہ تیرے دائرۂ امکان سے باہر ہے..... حضرت موسیٰ علیہ السلام سجدے میں گر گئے۔ تضرع کیا..... وحی کا نزول ہوا کہ اے ابن عمران! میری رضا اس میں ہے کہ تو میرے حکم پر سرِ تسلیم خم کرے.....'' (یعنی آدمی جب راضی برضائے حق ہوجاتا ہے تو اللہ اس سے راضی ہوجاتا ہے)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب تمام تعلقات سے منہ موڑ کر دل کو غیر سے خالی کردیا اس وقت اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جلوے کی برسرِ عام نمائش کردے۔ اس کے لیے حق تعالیٰ نے نمرود کو مقرر کیا..... چنانچہ نمرود نے آگ جلوائی ابلیس نے آکر منجنیق بنا کردی اور اس میں گائے کی کھال کو چلہ میں سیا گیا اور اس چلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بٹھایا گیا۔ اس وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور عرض کیا۔ ''کیا آپ کو مجھ سے کوئی حاجت ہے؟'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ ''حاجت تو ہے مگر تم سے نہیں۔'' تب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا پھر اللہ تعالیٰ ہی سے عرض کیجیے؟ فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ میری عرض سے بے نیاز ہے وہ میرے حال کو جانتا ہے۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرمانے کا یہ مطلب تھا کہ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ مجھے اس کی راہ میں آگ میں ڈالا جارہا ہے۔ میرے حال پر اس کا علم میرے عرض و سوال کا محتاج نہیں ہے..... پھر لوگوں نے دیکھا کہ اس عظیم رب تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے کس طرح محفوظ فرمایا۔

حضرت شیخ فرید الدین عطار فرماتے ہیں کہ حضرت فضیل بن عیاضؒ کے لبوں پر 30 سال تک تبسم نہ آیا..... لیکن جس دن ان کا بیٹا فوت ہوا تو لوگوں نے خلافِ معمول ان کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا کہ اے شیخ! یہ مسکرانے کا کون سا موقع ہے..... فرمایا..... مجھے یقین ہے کہ حق تعالیٰ میرے فرزند کی موت میں راضی تھا اس لیے میں نے بھی رضائے الٰہی کی خاطر تبسم کیا جو اس کی خوشی وہی میری خوشی.....

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں..... ''میں تسلیم کے معاملے میں اس منزل پر پہنچ گیا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو میری جگہ اعلیٰ علیین (فردوس بریں) میں ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے جگہ دے دے اور مجھے ہمیشہ کے لیے جہنم کے انتہائی نچلے درجے میں پھینک دے تو میں اس شخص سے بھی بڑھ کر خدا سے راضی ہوں گا اور شکایت کا ایک حرف بھی زبان پر نہ لاؤں گا.....''

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ''رضا یہ ہے کہ بلا کو نعمت سمجھو.....'' حضرت یحییٰ معاذ رازیؒ سے سوال کیا گیا کہ ''کس طرح معلوم ہو کہ اللہ راضی ہے یا نہیں؟'' فرمایا۔ ''تمہارا راضی ہونا اس کے راضی ہونے کی علامت ہے۔''

جن عاشقوں کی زندگی کا مقصد ہی رضائے الٰہی ہوتا ہے وہ ہر حال میں اللہ کی رضا پر راضی رہتے ہیں..... کیونکہ عاشقانِ الٰہی کا اہم وصف تسلیم و رضا کا خوگر ہوتا ہے..... کامیابی ہو یا ناکامی..... دکھ ہو یا سکھ..... فائدہ ہو یا نقصان وہ ہر حال میں راضی برضا رہتے ہیں کیونکہ تقاضائے محبت یہی ہے کہ ''میری گردن میں دوست کی (غلامی) کی رسی پڑی ہوئی ہے۔ دوست جہاں چاہتا ہے وہاں لے جاتا ہے۔''

☆☆☆

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا۔ ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! بعض لوگ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے کوئی کام کرتے ہیں لیکن اس عمل کی وجہ سے لوگ ان سے محبت کرنے لگتے ہیں۔'' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا..... ''یہ مومن کے لیے دنیا ہی

میں خوشخبری ہے۔''

حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔''جو اللہ کو اپنا رب سمجھ کر اس سے راضی رہا اس نے ایمان کا مزہ چکھ لیا۔'' آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے ''کہ جس شخص کو تین چیزیں عطا ہوگئیں اسے دنیا اور آخرت کی بھلائی مل گئی۔

۱۔تقدیرِ الٰہی پر راضی ہونا۔

۲۔مصیبت پر صبر کرنا۔

۳۔خوشحالی میں دعائیں مانگنا۔''

حضرت عمر بن خطابؓ جب بیمار ہوتے تو طبیب کے مشورے پر عمل نہ کرتے.....لوگوں نے ایک دفعہ ان سے کہا کہ آپ طبیب کو کیوں نہیں بلاتے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔''بخدا اگر مجھے معلوم ہوجائے کہ تندرستی میرے کان کو ہاتھ لگانے میں ہے تو میں کان کو کبھی ہاتھ نہیں لگاؤں.....اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے۔''

صوفیا کہتے ہیں کہ رضا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا دروازہ ہے۔مراد یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا سے نوازا ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی عنایت ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ نے ایک بار حضرت رابعہ بصریؒ کی موجودگی میں کہا''بارالٰہا! ہم سے راضی ہوجا.....'' یہ بات سن کر حضرت رابعہ بصریؒ نے ان سے کہا۔''تم کو اس بات سے شرم نہیں آتی کہ تم اس کی رضا کے طالب ہو جس سے تم خود راضی نہیں ہو۔'' حاضرینِ مجلس میں سے کسی نے ان سے دریافت کیا کہ بندہ اللہ سے کب خوش اور راضی ہوتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ''اس وقت جب وہ مصیبت پر بھی اسی طرح خوش ہو جس طرح نعمت و راحت پر خوش ہوتا ہے۔''

حضرت بشر حافیؒ سے روایت ہے کہ میں شہر آباد ان کی طرف جارہا تھا کہ ایک کوڑھی مجذوب کو دیکھا کہ چیونٹیاں اور کیڑے مکوڑے اس کا گوشت کھا رہے تھے، مجھے اس پر بڑا ترس آیا اور میں نے اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا.....اسے گویا ہوش سا آگیا.....اور کہنے لگا کہ یہ کون واہیات شخص ہے کہ میرے اور میرے خالق کے درمیان خواہ مخواہ مداخلت کررہا ہے۔''

حضرت بشر حافیؒ روایت کرتے ہیں کہ بغداد میں ایک شخص کو بہت زیادہ لاٹھیاں ماری گئیں اس نے اُف تک نہیں کی۔ میں نے پوچھا اے شخص.....اس قدر جور وستم کے باوجود تیرے منہ سے اُف تک نہ نکلی.....آخر کیسے؟ اس نے کہا میرا محبوب میرے سامنے تھا اور دیکھ رہا تھا۔(پھر اف کیسی) تب میں نے کہا اگر وہ سب سے بڑا محبوب سامنے ہوتا تو کیسی رہتی؟

یہ سنتے ہی اس نے ایک چیخ ماری اور گر پڑا دیکھا تو جان نکل چکی تھی۔

☆☆☆

حضرت سہل تستریؒ سخت بیمار تھے.....اور درد کی شدید شکایت تھی لیکن اس کا علاج نہ کرتے تھے لوگوں نے پوچھا کہ آپؒ اس کا علاج کیوں نہیں کرتے؟ فرمایا۔''تمہیں کیا معلوم کہ جو درد دوست نے مرحمت فرمایا ہو اس میں تکلیف نہیں ہوتی بلکہ راحت ملتی ہے۔''

☆☆☆

بنی اسرائیل میں ایک عابد مدت تک عبادت و ریاضت میں مشغول رہا ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ اسے اشارہ دیا جارہا ہے کہ جنت میں فلاں عورت تیری رفیق و ہم نشین ہوگی.....عابد نے بڑی جستجو کی اور اس عورت کو ڈھونڈ لیا تاکہ اسے معلوم ہو کہ اس عورت کی عبادت و ریاضت کس درجے کی ہے.....لیکن اسے دیکھ کر وہ سخت حیران ہوا.....کہ وہ

عورت نہ تو نمازِ تہجد ادا کرتی ہے اور نہ کوئی نفلی روزہ رکھتی ہے البتہ فرائض کی پابند ضرور ہے۔ بالآخر عابد نے اس سے پوچھا..... ”مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا کون سا عملِ خاص ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بس یہی کچھ ہے جو کچھ تم دیکھ رہے ہو..... عابد نے بہت زیادہ اصرار کیا..... تب وہ عورت بولی کہ عمل کا تو مجھے علم نہیں لیکن ایک خصلت البتہ میری یہ ہے کہ جب میں بیمار ہوتی ہوں تو شفا اور صحت کی خواہش نہیں کرتی..... دھوپ میں ہوں تو سایے کی آرزو نہیں کرتی..... اور اگر سایہ تکلیف دہ ہو تو دھوپ کی خواہش نہیں کرتی..... عابد نے اپنا ہاتھ سر پر رکھتے ہوئے کہا کہ تم اسے ایک خصلت بتا رہی ہو..... یوں نہیں کہتیں کہ ایک عظیم الشان خصلت تمہیں حق تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے..... بلاشبہ یہ بہت بڑی چیز ہے۔“

حضرت وہبؒ بیمار ہوئے تو ان کے پاس امیر مکہ ایک نصرانی طبیب لے کر گئے۔ طبیب نے دریافت کیا..... آپ کو کیا تکلیف ہے؟ حضرت وہبؒ نے فرمایا۔ معاذ اللہ میں تجھے اپنی تکلیف ہرگز نہیں بتاؤں گا..... لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہمیں بتائیں ہم اسے بتا دیں گے۔ انہوں نے فرمایا۔ سبحان اللہ! یہ لوگ کیسی عقلوں کے مالک ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی شکایت اس کے دشمن کے پاس کرنے کو کہتے ہیں..... تم سب یہاں سے چلے جاؤ۔

☆☆☆

اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کرنا اور اللہ کے لیے دشمنی کرنا ایمان کی مضبوط دستاویزوں میں سے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ ”کیا تو نے میرے لیے کوئی عمل کیا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا۔ ہاں میرے رب..... میں نے نماز پڑھی ہے اور روزے رکھے ہیں، صدقہ دیا ہے ان کے علاوہ اور اعمال کا نام بھی لیا.....“ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”یہ چیزیں تو تیرے ہی لیے ہیں لیکن کیا تو نے کبھی میری وجہ سے کسی سے دوستی کی ہے یا میری وجہ سے کسی سے عداوت کی ہے؟“ اس بات پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ اللہ کے لیے محبت اور دشمنی کرنا سب اعمال سے افضل ہے۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا ارشاد ہے کہ اہلِ معرفت کے نزدیک مصیبت کا آجانا عین رضائے الٰہی کے مطابق ہے کیونکہ اللہ کی راہ میں جو شخص اللہ سے محبت کرے گا وہ کسی مصیبت کو برداشت کرنے میں کوتاہی نہیں کرے گا۔

حضرت حبیب عجمیؒ نے گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا اور تقریباً سات سال تک انہوں نے گوشت نہ کھایا اور برابر نفس کا مقابلہ کرتے رہے۔ جب نفس نے بہت ستایا تو ایک روز بازار گئے اور کباب روٹی خریدی اور لے کر چلے تو راستے میں ایک غریب لڑکا نظر پڑا اس سے دریافت کیا کہ تم کس کے بیٹے ہو؟ اس لڑکے نے اپنے باپ کا نام بتایا اور مزید بتایا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے..... حضرت حبیب عجمیؒ اس کے باپ سے واقف تھے اس کا نام جان کر آپؒ کو بہت دکھ ہوا اور کباب روٹی فوراً اس لڑکے کو دے دی اور سات برس کی خواہشِ نفس کو ایک دم اللہ کی خوشنودی اور اس کی رضا کے لیے قربان کر دیا..... سبحان اللہ.....!

حضرت شقیق بلخیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بہت سے استادوں سے علمِ شریعت اور علم طریقت حاصل کیا۔ لیکن رضائے مولا جس میں حاصل ہوئی وہ صرف یہ چار باتیں ہیں۔

۱۔ روزی کی طرف سے مطمئن رہنا۔
۲۔ تمام امور میں اخلاص کا ہونا۔
۳۔ شیطان اور نفس کی خواہشات کو اپنا دشمن سمجھنا۔
۴۔ توشۂ آخرت جمع کرنا۔

آپؒ ایک روز وعظ فرما رہے تھے یکایک جذب میں آکر لوگوں کی طرف خطاب کیا اور

فرمایا۔لوگو! اگر تم مرد ہو تو قبرستان جا کر آباد کرو.....اگر تم بچے ہو تو مکتب میں جا کر پڑھنے بیٹھو اور اگر تم پاگل ہو تو پاگل خانے میں جاؤ اور اگر تم کافر ہو تو کفرستان میں جاؤ اور اگر تم مسلمان ہو تو اسلام کا راستہ اختیار کرو.....یعنی اسلام کی باتیں سیکھو۔

☆☆☆

حضرت رابعہ بصریؒ نہایت غربت کی زندگی بسر کرتی تھیں۔حضرت مالک بن دینارؒ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے دیکھا کہ آپؒ کی کل کائنات ایک شکستہ کوزہ ایک بوسیدہ بوریا اور ایک اینٹ ہے۔اس کوزے سے پانی پیتی ہیں اور وضو کرتی ہیں۔اس بوریے پر بیٹھتی ہیں سرا اینٹ پر رکھ لیا کرتی ہیں۔

حضرت مالک بن دینارؒ یہ دیکھ کر آب دیدہ ہو گئے بولے۔رابعہ.....! میرے بہت سے امیر دوست ہیں جو ضرورت ہو وہ لا دوں.....آپؒ نے فرمایا۔مالک.....! آپ غلطی پر ہیں سب کا رازق یہاں ایک ہی ہے کہ وہ درویشوں کو ان کی درویشی کی وجہ سے بھول بیٹھا ہے.....اور امیروں کو ان کی امارت کی وجہ سے یاد کرتا ہے اگر نہیں اور یقیناً نہیں اور وہ سب کچھ جانتا اور دیکھتا ہے تو پھر اسے یاد دلانے کی کوئی ضرورت نہیں..... وہ اسی طرح پسند کرتا ہے تو ہم بھی اسی طرح پسند کرتے ہیں.....جس طرح وہ پسند کرے۔

اسی طرح ایک اور بزرگ نے آپؒ کو شکستہ لباس پہنے دیکھ کر کہا کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جنہیں آپ کا ایک اشارہ کافی ہے۔فرمایا۔دنیا کس سے مانگوں وہ تو محض اللہ کی ملکیت ہے اور اللہ ہی سے طلب کی جا سکتی ہے دوسروں کے پاس جو کچھ ہے وہ تو ایک مستعار حالت میں ہے۔کچھ لوگ پہنچے.....ان سے کہا اللہ تعالیٰ نے تمام فضائل مردوں کے لیے وقف کر دیے ہیں اور آج تک کوئی عورت نبوت کے درجے پر فائز نہیں ہو سکی ہے۔

آپؒ نے فرمایا.....درست مگر یہ خیال رہے کہ آج تک کسی عورت نے خدائی کا دعویٰ بھی نہیں کیا اور نہ ہی کوئی عورت مخنث ہوئی یہ دونوں شرف بھی مردوں کو ہی حاصل ہیں.....وہ خاموش ہو گئے آپ کی ہر بات پر.....فرمایا کرتی تھیں کہ کوشش کرو کہ دل بیدار ہو جائے اور جب وہ بیدار ہو گیا تو پھر کسی چیز کی حاجت نہیں رہتی اور دل بیدار وہی ہے جو حق میں گم ہو جائے اور جو اس میں گم ہو گیا اسے پھر کسی کی بھی ضرورت نہیں کہ یہی درجہ فنا فی اللہ ہے۔

فرمایا.....عورت وہ ہے جو اللہ سے دل طلب کرے اور جب دل مل جائے تو دل کو اسے واپس دے دے کہ وہ اسے حفاظت سے رکھے۔

صوفیہ سے مروی ہے کہ رضا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا دروازہ ہے۔مراد یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا سے نوازا ہو اس پر یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی عنایت ہے۔

حضرت ابو عثمان حیریؒ سے مروی ہے کہ مجھے چالیس سال ہو گئے اللہ نے مجھے جس مقام پر رکھ دیا میں نے اسے ناپسند نہیں کیا اور جس مقام کی طرف پھیر دیا میں ناراض نہیں ہوا۔

اللہ تعالیٰ پر یقین کے مقامات میں سے سب سے بلند مقام رضا کا ہے.....جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن رضا رکھا اللہ تعالیٰ اسے رضا کی جزا دے گا۔

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ جو آسمان سے زمین پر نازل ہونے والی چیز پر راضی رہا اس کے گناہ معاف کر دیے گئے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ ”سب سے بہتر چیز جو بندے کو عطا کی جاتی ہے وہ اس پر راضی رہنا ہے جو اللہ نے اس کے لیے تقسیم کی ہے۔“

ایک روایت میں ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھوڑے سے رزق پر راضی رہا اللہ تعالیٰ اس کے تھوڑے سے عمل پر راضی ہو جائے گا۔

جو اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنا مرتبہ یا مقام دیکھنا چاہے تو وہ دیکھے کہ اللہ تعالیٰ کا اس کے نزدیک کیا مقام یا درجہ ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو وہی درجہ دیتا ہے جو وہ اس کو اپنے دل میں دیتا ہے۔

ایک حدیث میں مروی ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ میری امت کے ایک گروہ کو پرلگا دے گا وہ قبروں سے نکل کر اڑتے ہوئے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ وہ وہاں نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے..... فرشتے ان سے پوچھیں گے کہ تم نے حساب دیکھا؟ وہ کہیں گے نہیں ہم نے کوئی حساب نہیں دیکھا۔ پھر پوچھیں گے کہ تم نے پل صراط پار کیا؟ وہ کہیں گے کہ ہم نے پل صراط نہیں دیکھا..... فرشتے کہیں گے کہ تم کس امت سے ہو؟ وہ کہیں گے کہ ہم امت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہیں..... تب فرشتے کہیں گے کہ تم ہمیں بتاؤ کہ دنیا میں تمہارے کیا اعمال تھے؟ وہ بتائیں گے کہ ہمارے اندر دو خصلتیں تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت سے ہمیں اس درجہ تک پہنچا دیا۔ فرشتے پوچھیں گے کہ وہ کون سی دو خصلتیں ہیں؟ تب وہ کہیں گے کہ جب ہم خلوت (تنہائی) میں ہوتے تھے تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچا کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے جو تھوڑا بھی تقسیم کر دیا تھا ہم اس پر راضی رہتے تھے..... فرشتے کہیں گے کہ تم واقعی اس کے حقدار ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مناجات میں ہے کہ اے پروردگار! تجھے تیری کون سی مخلوق زیادہ محبوب ہے؟ فرمایا..... وہ کہ جس سے میں اس کی محبوب چیز لے لوں تو وہ مجھ سے مصالحت کرے۔ پوچھا کون سی مخلوق پر زیادہ ناراض ہے؟ فرمایا..... جو مجھ سے کسی معاملے میں بھلائی مانگے پھر جب میں اس کے لیے فیصلہ کروں تو وہ میری قضا پر ناراض ہو جائے۔

ان سب سے زیادہ سخت بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں جو میرے ابتلا پر صبر نہیں کرتا اور میری قضا پر راضی نہیں رہتا اور میری نعمتوں پر شکر نہیں کرتا تو اسے چاہیے کہ میرے سوا کسی دوسرے کو رب بنالے۔

اللہ تعالیٰ کی رضا کے طالبوں کے اعمال کا اجر اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے اجر سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔

اہلِ محبت کا یہی وصف ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے ہر کام سے راضی رہتے ہیں..... اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اپنی رضا عطا فرمائے..... اللہ رب العزت نے ہمارے لیے جو پسند کیا ہے اس سے بہتر کچھ اور نہیں ہوسکتا۔ ہمیں ہر حال میں اس سے راضی رہنے اور کبھی ناگواری نہ کرنے کا خیال آئے تو اللہ جو دے اس پر راضی ہو جاؤ تو اللہ بھی بہت جلد آپ سے راضی ہو جائے گا۔ اللہ ہمیں اپنی رضا والی زندگی عطا فرمائے، آمین۔

حرفِ آخر

اپنے رب کی عظیم بارگاہ میں نادم دل کے ساتھ دعا گو ہوں کہ اس مضمون میں کوئی غلطی، کوئی کوتاہی دانستہ یا نادانستہ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات و فرمودات میں ہوگئی ہو..... تو اے میرے رب! مجھے معاف کر دے..... مجھے معاف فرمادے کہ تو اپنے بندوں کی خطاؤں کو معاف کرنا پسند کرتا ہے۔ میرے اس مضمون کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمالے اور اس پر ہم سب کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

اس مضمون میں میں نے جن بے حد قابلِ احترام ہستیوں کی کتب سے مضامین منتخب کیے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

انداز نو

بنتِ زیب

دھنک ایف ایم 94 کے مشہور آر جے

اسد علی چوہدری

اس بار پٹہ اک نیا انداز لیے حاضر ہیں کہ جس کے تحت مختلف شعبہ جات کے نمایاں افراد سے ملاقات کرائی جائے گی مگر دلچسپ اور مختصراً انداز و اطوار میں یعنی ایک جملے کا سوال اور ہاں، نہیں، کیوں کے تحت مختصر جواب.....

آج ہمارے اس نئے سلسلے کے دوسرے باصلاحیت مہمان اسد علی چوہدری ہیں۔

اپنے والدین کے گلشن میں شادی کے اٹھارہ برس بعد مہکنے والے یہ سپوت اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہیں۔ بچپن ہی سے غیر نصابی سرگرمیوں بالخصوص اسکول میں ہونے والے ڈراموں میں خوب حصہ لیا۔ بزم طلبا سے ریڈیائی سفر کا آغاز کیا۔ کمپیوٹر سائنس میں گریجویشن کے بعد ملازمت کے ساتھ ساتھ دھنک ایف ایم ۹۴ سے آر جے کی حیثیت سے وابستہ ہیں۔ اسد بہت مہذب اور با اخلاق ہیں، ادب کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔ اسد کی شخصیت کی مزید گرہیں کھولنے کے لیے پڑھتے ہیں اسد علی چوہدری کی باتیں۔

◯ کوئی لوٹا دے میرا بچپن مجھے.....!

❀ نہیں۔ مانا میرا بچپن بہت اچھا تھا لیکن زندگی کے ہر دور کا اپنا مزہ ہے۔

◯ بچپن میں پڑوسیوں کی اطلاعی گھنٹی بجا کر بھاگ جانے اور پکڑے جانے پر مار کھانے کا تجربہ بہت ہے!

❀ نہیں بھئی۔ یہ اعزاز میرے حصے میں کبھی نہیں آیا۔

◯ بچپن میں بہت کھانڈ را تھا گھر میں تو ٹکتا ہی نہ تھا!

❀ بالکل نہیں۔ گھر کا پالا بچہ ہوں۔

◯ بچپن میں پڑھائی کے نام سے میری جان جاتی تھی!

❀ نہیں بھئی۔ اور اس کی وجہ میرا پڑھنے کا شوق ہی نہیں ابا کا خوف بھی تھا۔

◯ ابو کی مار نے بنا دیا مجھے!

❀ ہاں۔ اکلوتا ہونے کے باوجود بہت پٹا ہوں۔

◯ ادب انگریزی کا یا اردو کا بہت مشکل ہے پڑھنا!

❀ نہیں۔ ادب اگر دلچسپ طریقے سے پڑھایا جائے تو اس سے زیادہ دلچسپ اور عمدہ مضمون کوئی نہیں۔

◯ میتھس اور سائنس کی کیا بات ہے۔ ہمیشہ سے میرے پسندیدہ رہے ہیں!

❀ بالکل بھی نہیں، بھاگتا رہا ہمیشہ ان سے لیکن پڑھا بھی اور کامیاب بھی ہوا۔

◯ میرا مزاج لڑکپن سے شاعرانہ ہے!

❀ بالکل جناب اور اب ایف ایم پر میرا یہ شاعرانہ مزاج بہت کام آرہا ہے۔

◯ شدید بھوک اور کھانے کو کچھ نہ ملے تو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہوں!

❀ ہاں۔ ایسا ہو تو جاتا ہے۔ شدید بھوک بے حال کر دیتی ہے ناں۔

◯ دیسی کھانوں کی الگ ہی لذت ہے!

❀ بے شک اور اماں کے ہاتھ کے ہوں تو کیا بات ہے۔ اور پھر یہ ہماری پہچان بھی تو ہیں۔

◯ دوستوں سے دعوتیں اڑانے کا شوق ہے سر انہیں کھلانے کا نہیں!

اسد علی اپنے شفیق والدین کے ہمراہ (میری ساری کامیابیاں تمہیں سے ہیں)

❁ نہیں بھئی دونوں کا ہی شوق ہے ہاں مہانداری تھوڑی سی مشکل ہے ویسے۔

☺ دوستی کا کوئی مول نہیں!

❁ بے شک دوستی انمول ہے۔

☺ دوستوں کا دوست ہوں میں!

❁ بالکل اور اچھی طرح نبھانے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔

☺ دوستوں کی محفل میں گاتا ہوں اور خوب گاتا ہوں!

❁ ہاں بھئی گاتا ہوں اور خوب گاتا ہوں۔

☺ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے!

❁ ہاں۔ دونوں ہی انتہا چاہتے ہیں۔

☺ محبت کے اظہار کے لیے الفاظ سے بڑھ کر رویہ اہم ہوتا ہے!

❁ بے شک اور اس طرح محبت نبھانا بہت بڑا ہنر ہے۔

☺

محبتوں میں عجب ہے دلوں کو دھڑکا سا
نہ جانے کون کہاں راستہ بدل جائے

❁ جی۔ ہائے! اب تو محبت بھی چاہنا کی ہو گئی۔ چلے تو چاند تک نہ چلے تو رات تک۔

☺ دل اور دماغ کی جنگ میں ہمیشہ میرا دماغ جیت جاتا ہے!

❁ نہیں میں دل کی زیادہ سنتا ہوں۔ لیکن کیا ہی اچھا ہو جو دل، دماغ اور ضمیر تینوں کو ساتھ لے کر چلا جائے۔

☺ پُرسکون زندگی کے لیے پیسہ بہت ضروری ہے!

❁ بالکل، بے شک پیسہ سب کچھ نہیں لیکن بہت کچھ ہے۔

☺ اپنی زندگی اپنے انداز سے گزارنے کا قائل ہوں!

❁ جی جناب! ہم کیوں چلیں اس راہ پر جس راہ پر سب ہی چلیں۔ (بہت خوب)

☺ زندگی کا بے فکرا روپ مجھے بے حد پسند ہے!

❁ نہیں۔ کیونکہ فکرات زندگی کا حصہ ہیں۔

☺ الحمد للہ زندگی کے معاملات میں متوازن سوچ اور رویہ اختیار کرتا ہوں!

❁ جی۔ میری انتہائی کوشش یہی رہتی ہے کہ توازن برقرار رہے۔

☺ زندگی کو استاد بنایا تو وہ از خود سنورتی چلی گئی!

❁ نہیں۔ زندگی سے بڑا استاد وقت ہے۔ سب سکھا اور سنوار دیتا ہے۔

☺ پہاڑ جتنا مسئلہ بھی چٹکی بجاتے حل کر لیتا ہوں!

❁ نہیں جناب۔ چٹکی بجاتے تو صرف گا سکتا ہوں۔

☺ اپنے گُن گانے میں میرا کوئی ثانی نہیں!

❁ نہیں بھئی اپنے منہ میاں مٹھو بننا مجھے پسند نہیں۔

☺ صبح سویرے چڑیوں کی چہچہاہٹ سماعت معطر کر دیتی ہے!

❁ جی بالکل لیکن یہ گئے دنوں کی بات ہے، اب اتنی جلدی اٹھنا نہیں ہوتا۔

☺ غروبِ آفتاب اور طلوعِ مہتاب کا نظارہ ساحل سمندر پر جتنا اچھا لگتا ہے کہیں اور نہیں!

❁ جی جناب۔ لہروں کے شور میں یہ نظارے اور بھی دلکش اور مسحور کُن لگتے ہیں۔

☺ برستے بادل یادوں کو آواز دیتے ہیں!

❁ جی بالکل لیکن ساتھ ہی مسائل کو بھی دعوت دیتے ہیں، بلدیہ کی ناقص کارکردگی کے طفیل۔

☺ سردیوں کی اداس شامیں بہت اچھی لگتی ہیں!

❁ جی بالکل کہ خاموشی میں خود سے ملاقات ہوتی ہے۔

☺ لانگ ڈرائیونگ تفریح کا بہترین ذریعہ ہے!

اداکارہ و ماڈل نادیہ حسین سے انٹرویو کرتے ہوئے

❁ ہاں کیونکہ اس میں لطف بہت آتا ہے۔

◯ بھاؤ تھاؤ کیے بنا خریداری میں لطف ہی نہیں آتا!

❁ نہیں مجھ سے نہیں کیا جاتا۔ ہاں ابا ساتھ ہوں تو ہر چیز کی آدھی قیمت بول کر شرمندہ کر دیتے ہیں۔

◯ شاہ خرچی میں میرا کوئی ثانی نہیں!

❁ کہہ سکتی ہیں کیونکہ خریداری کرتے ہوئے بہت شاہ خرچ ہو جاتا ہوں۔

◯ تحائف کے لین دین سے محبت بڑھتی ہے!

❁ جی بالکل۔ لیکن تحفے سے زیادہ نیت پر منحصر ہے۔

◯ وفاقی وزیر خزانہ خاتون کو ہونا چاہیے!

❁ نہیں۔ وجہ صرف اتنی ہے کہ ہمارے گھر کے وزیر خزانہ ابا ہیں اور کسا کامیاب بجٹ بناتے ہیں۔ واہ۔

◯ اگر میں ڈاکٹر ہوتا تو ڈھائی کا حق ادا کر دیتا!

❁ جی ہاں۔ علاج کے ساتھ ساتھ اپنی مسکراہٹ اور باتوں سے۔

◯ غلط رویے کے جواب میں سبق سکھانے کی حکمت عملی اختیار کرتا ہوں!

❁ نہیں کوشش کرتا ہوں کہ محبت سے اصلاح کروں۔ لیکن بہرحال انسان ہوں۔

◯ ارے کہاں؟ مجھے غصہ کب آتا ہے؟

❁ اور کیا؟ اتنا کم آتا ہے۔

◯ ضدی تو بس بچپن میں تھا اب تو بہت معصوم ہوں!

❁ واقعی ایسا ہی ہے۔ ہاں بچپن میں تھوڑا ضدی تھا۔

◯ ذرا سے بخار سے گھر سر پر اٹھا لیتا ہوں!

❁ نہیں گھر والے مجھے سر پہ بٹھا لیتے ہیں۔

◯ کچھ بھی کروں میں، مجھے کوئی نہ ٹوکے، بس!

❁ ہاں ناں۔ آزاد ملک کا آزاد شہری ہوں آزاد رہنا پسند ہے لیکن اماں ابا بھی اماں ابا ہی ہیں۔

◯ اپنی بات پیار سے نہیں دھونس سے منواتا ہوں!

❁ بالکل بھی نہیں۔ پیار سے منوانا اچھا لگتا ہے۔

◯ بہانے بنانے کی میری عادت اسکول کے زمانے سے ہے!

❁ ہرگز نہیں۔ ہائے کوئی بہانہ نہیں چل سکا میرا کبھی۔ اس لیے عادت بھی نہیں پڑی۔

◯ کبھی کبھی ہنسی ضبط کرنا بہت محال ہوتا ہے!

❁ جی ہاں۔ ایک بار ہنس دیا تھا آن ایر زور سے۔

◯ لڑکیاں شوخ و چنچل ہی اچھی لگتی ہیں!

❁ نہیں۔ باشعور، سمجھدار اور بردبار لڑکیاں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔

◯ چھٹی کا دن سو کر گزارتا ہوں!

❁ نہیں۔ اب کہاں سونا نصیب ہوتا ہے۔

◯ نقصِ امن کا خدشہ ہو تو دل کی بات لبوں

تک آنے سے روک لیتا ہوں!

❁ جی۔ ایسے موقع پر گریز کرتا ہوں سچ کہنے سے۔

☾ ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں!

❁ جی۔ بہت دیرینہ رستوں پر کسی سے ملنے جانا ہو۔

☾ وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے!

❁ جی۔ وعدے تو ہوتے ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں۔

☾ فرماں برداری کوئی مجھ سے سیکھے!

❁ نہیں۔ میں کہاں کا فرماں بردار؟ کوئی سکھا دے مجھے فرماں برداری۔

☾ سچ کڑوا اور جھوٹ شیریں ہوتا ہے!

❁ بے شک.....

سچ کو تمیز ہی نہیں بات کرنے کی
جھوٹ کو دیکھو کتنا میٹھا بولتا ہے

☾ بہت بذلہ سنج ہوں میں!

❁ بالکل اور میرا ریڈیو کا پروفیشن اس کا متقاضی بھی ہے۔

☾ لوگوں میں آسانیاں تقسیم کرنے کا قائل ہوں!

❁ جی۔ کیونکہ اس سے بڑی راحت اور کوئی نہیں اور اپنے ہر شو میں سامعین کے لیے میرا پیغام بھی یہی ہوتا ہے۔

☾ اپنے دکھ اور پریشانیوں میں اپنوں کو شریک کرتا ہوں!

❁ یقیناً۔ کیونکہ وہ ہمارے دکھ سکھ کو زیادہ شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ اپنے جو ٹھہرے۔

☾ (برجوں) ستاروں پر آنکھ بند کر کے یقین کرتا ہوں!

❁ نہیں ستاروں پر تو نہیں۔ ہاں ستاروں کے خالق پر آنکھ بند کر کے یقین کرتا ہوں۔

☾ سیرت نہیں تو عارض و رخسار سب غلط.....!

❁ جی۔ اچھی سیرت ہی سب کچھ ہے۔

☾ منافقت سخت ناپسند ہے مجھے!

❁ بالکل۔ لیکن کہیں نہ کہیں ہم سب منافق ہیں۔

☾ مستقبل کی منصوبہ بندی کا قائل ہی نہیں!

❁ نہیں زیادہ نہیں کہ اکثر جو سوچو وہ نہیں ہوتا۔

☾ کتب بینی میرا دل پسند مشغلہ ہے!

❁ جی۔ لیکن اب موقع کم ملتا ہے۔

☾ سوشل میڈیا وقت کی ضرورت سہی لیکن خط لکھنے اور پڑھنے کا اپنا ہی لطف تھا اور ہے!

❁ جی۔ اس میں تو شبہے کی گنجائش ہی نہیں۔

☾ درخت بچاؤ مہم میں مجھے بھی اپنا حصہ ڈالنا ہے.....!

❁ جی۔ کیونکہ پاکستان کو ہرا بھرا بنانا ہے۔

☾ شدید تھکن میں سخت چڑچڑا ہو جاتا ہوں میں.....!

❁ جی۔ تھک جاتا ہوں تو نہ چاہتے ہوئے بھی مزاج بگڑ ہی جاتا ہے۔

☾ ہوگا کوئی مجھ سا سنجیدہ مزاج!

❁ بالکل بھی نہیں۔ ہنسے بولے بنا مجھ سے رہا نہیں جاتا۔

☾ خوشی میں بے ساختہ رویا بھی ہوں میں!

❁ نہیں۔ اتنا خوش ابھی تک نہیں ہوا۔

☾ کامیاب زندگی کے لیے بتدریج ارتقا کا قائل ہوں!

❁ جی۔ تھوڑی تھوڑی کوشش روز اور پھر ایک دن روشن صبح۔

☾ ناکامی ہی دراصل کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے!

❁ جی بکھریں گے نہیں تو نکھریں گے کیسے؟

☾ الحمدللہ میں ایک کامیاب انسان ہوں!

❁ جی اللہ کا بڑا احسان ہے۔

کئی دہائیوں سے امریکہ میں مقیم کمیونٹی ریڈیو کے نگراں اور ریڈیو پاکستان دھنک ایف ایم 94 کے سامعین مسٹر اینڈ مسز مجاہد فاروق اسد علی چوہدری کے مہمان

☽ میری زندگی کا سب سے بڑا خوف ہی میری طاقت ہے!

❁ جی۔ کیونکہ ڈر کے آگے جیت ہے۔

☽ پہلی کمائی مزے سے دوستوں میں اڑادی تھی!

❁ نہیں۔ اماں ابا کو دے دی تھی۔

☽ کرکٹ میرا پسندیدہ کھیل ہے!

❁ نہیں بالکل نہیں۔ بے تکا سا کھیل لگتا ہے مجھے۔

☽ ناشتا میں بہت زبردست بناتا ہوں!

❁ نہیں جناب۔ نہ کرتا ہوں نہ بناتا ہوں۔

☽ اماں اور ابا سے یکساں قریب ہوں!

❁ اس میں کیا شک ہے۔ ایک میرا چاند ایک میرا تارہ۔

☽ سمندر سے بہتر تفریحی مقام اور کوئی نہیں!

❁ جی بالکل کہ سمندر میں سکون ہے لیکن جب یہ سرکش ہوجائے تو ساری تفریح خاک میں ملادے۔

☽ ویلنٹائن ڈے بہت اہتمام سے مناتا ہوں!

❁ ہاہاہاہا، نہیں کبھی نہیں منایا۔ لیکن برا بھی نہیں سمجھتا۔

☽ شادی میں اپنی پسند کی کروں گا!

❁ کیوں بھئی؟ مرضی تو درزی کی ہوتی ہے ناں۔ (بھئی کیا مطلب!)

☽ عوامی لباس پہننے میں فخر محسوس کرتا ہوں!

❁ جی۔ ایک تو یہ ہمارا قومی لباس ہے دوسرے مجھ پہ سجتا بھی بہت ہے۔

☽ موسیقی میں تو گویا میری جان ہے!

❁ جی بالکل اور اگر آواز مادام نور جہاں کی ہو تو کیا بات ہے۔

☽ تیز دھنوں سے آراستہ موسیقی روح کی سزا ہے!

❁ جی بالکل۔ صرف سزا نہیں کڑی سزا۔

☽ پہلی بار جب مائیکروفون کا سامنا کیا، وہ گھبراہٹ آج بھی یاد ہے!

❁ نہیں گھبراہٹ نہیں ہوئی تھی ہاں خوشی بہت ہوئی تھی اور وہ ساعتیں اب بھی یاد ہے۔

☽ صداکاری، اداکاری سے زیادہ مشکل کام ہے!

❁ جی بالکل کیونکہ اس میں سارا زور ہی آواز پر ہوتا ہے۔

☾ دل بہت اداس تھا اور ایف ایم پر ہنستا گاتا لائیو شو کیا!

❁ جی اکثر ایسا ہوا ہے کہ اپنا دکھ بھلا کر اپنے سامعین کو خوش کرنے کا اپنا ہی لطف ہے۔

☾ مجھ کو ترجیحاً سنجیدہ شو کرنا زیادہ اچھا لگتا ہے!

❁ نہیں۔ڈپریشن ہو جاتا ہے۔

☾ محض اچھی آواز کی بنیاد پر صداکاری کے شعبے میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے!

❁ نہیں، اچھی آواز کے ساتھ، ساتھ لہجے کا اتار چڑھاؤ اور بامقصد باتیں بہت اہم ہیں۔جی صداکاری کا اصل کمال ہی یہی ہے اور یہ فن میں نے ریڈیو کی اپنی استاد سیما رضا دار صاحبہ سے سیکھا ہے۔

☾ اپنے شو میں گاتا بھی ہوں!

❁ جی بالکل سامعین کی فرمائش اور اپنی خواہش دونوں پر۔

☾ سامعین اور مداحوں کی کثیر تعداد میرے لیے گئے، انٹرویوز شوق سے سنتی اور پسند کرتی ہے!

❁ جی کیونکہ میں دوستانہ ماحول میں دلچسپ اور بامقصد سوال کرتا ہوں اپنے مہمانوں سے۔

☾ ریڈیائی صحافت میں خود کو منوانا چاہتا ہوں!

❁ جی یقیناً۔اور دھنک چینل پر لیے جانے والے میرے انٹرویوز اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔میم ربیعہ اکرم نے مجھے اس کا موقع دیا۔

☾ مداحوں نے اگر مان دیا ہے تو پریشان بھی کیا ہے!

❁ نہیں بالکل نہیں۔وہ بھی محبت کا ایک انداز ہے مداحوں کی۔

☾ شہرت میرے سر چڑھ کر بول رہی ہے آج کل خوب اتراتا پھرتا ہوں!

❁ نہیں جناب۔تھوڑی بہت شہرت سے انکساری پیدا ہوئی ہے۔

☾ میرے گھر والے میرے فن کے قدردان بھی ہیں اور نقاد بھی!

❁ جی ہاں.....اماں ابا دونوں میرا شو نہ صرف سنتے بلکہ بے لاگ تبصرہ کرنے کے ساتھ، ساتھ مشورے بھی دیتے ہیں۔

☾ ریڈیو کے لیے ڈراما لکھنے اور کرنے کا اپنا ہی مزہ اور نشہ ہے!

❁ جی بالکل بہت لکھے ریڈیو کے لیے ڈرامے اور صداکاری بھی کی، ریڈیو مائیک کا لطف ہی اور ہے۔

☾ موجودہ ایف ایم چینلز کے معیار میں تبدیلی کا آرزومند ہوں!

❁ جی کچھ حد تک.....

☾ موضوعات میں تبدیلی کی ضرورت ہے!

❁ جی بالکل وہی پیار، محبت، دل اور درد کے پیچھے نہ پڑے رہیں۔اور بھی موضوع ہیں بولنے کو محبت کے سوا۔

☾ پاکستان میں کسی ایسے تربیتی ادارے کی کمی محسوس ہوتی ہے جہاں آر جے کو بین الاقوامی معیار کی تربیت دی جائے!

❁ جی۔کیونکہ اس سے ہر لحاظ سے بہتری آئے گی۔

☾ ریڈیو شو کی میزبانی ایک سنجیدہ عمل ہے!

❁ جی بالکل۔سنجیدہ لیں گے اس کو تب ہی کامیاب بھی ہوں گے۔

☾ اپنے مداحوں کے لیے میرا پیغام!

❁ ایک دوسرے کو انسان ہونے کا حق دیں، خوش رہیں اور خوش رکھیں۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔

☆☆☆

عزیز قارئین!

اسد علی کے ہاں / نہیں / مگر کیوں کے ''جواز'' آپ کو کیسے لگے۔اپنی رائے سے آگاہ ضرور کیجیے گا۔

☆☆☆

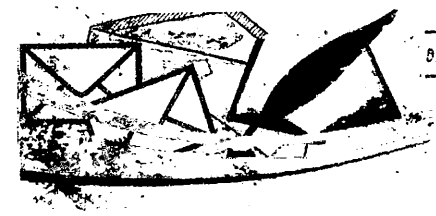

بہنوں کی محفل

مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

03316266612,021.35386783.021.35802552.Ext:122.107

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ وبرکاتہ!

تمام حمد وستائش اس ذات والا صفات کو زیبا جو کل کائنات کا خلق کرنے والا ہے۔ یکتا و وحدہ لاشریک ہے اور کروڑوں درود وسلام حبیب خدا رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر جو وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ پروردگار عالم کے حضور دست! تہ دعا گو ہیں کہ اپنے خزانہ غیب سے وہ سب کچھ عطا کرے جو ہمارے حق میں بہترین ہو۔ نہ صرف ہمارے وطن پاکستان بلکہ پوری دنیا سے اس وبا کا خاتمہ کردے، انسانیت کو امان ہو اور ہم بحیثیت مسلمان اپنے رب کی بارگاہ میں حقیقی معنوں میں بخشش وعنایات پائیں۔ (الٰہی آمین)

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

عزیز بہنو! خلوص بھرا سلام اور دعائیں لیے آپ کی محفل میں حاضر ہوں، آپ سنائیں کیا حال ہے پیاری بہنو! آج کل مون سون کا سیزن ہے جہاں ہم لوگ انجوائے کرتے ہیں وہیں مختلف بیماریوں اور پریشانیوں کا بھی شکار ہوجاتے ہیں۔ مختلف بیماریاں پھیلی ہوئی ہیں جن میں کورونا سرفہرست ہے۔ ایک افسوس ناک خبر جس سے بہت سی بہنیں تو باخبر ہیں اور کچھ کو ہمارے ذریعہ اطلاع ملی کہ انجم انصار کے شوہر عبدالرب صدیقی بھی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ اس قدر اچانک کہ دو گھنٹے پہلے تک بالکل ٹھیک تھے ذرا سی طبیعت بگڑی اور دو گھنٹے کے اندر ختم ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ انجم انصار کو اتنا بڑا صدمہ سہنے کی ہمت عطا فرمائے، آمین آپ لوگ سلسلے وار ناول اور کہانیاں اور افسانے پڑھ کر تو اپنی رائے دیتی ہی ہیں اور سب لوگ بہت اچھا لکھ رہے ہیں، میں خود بھی پڑھ کر انجوائے کرتی ہوں اس دفعہ مدیحہ شاہد کی کہانی پڑھی جو یقیناً آپ کو پسند آئی ہوگی انہوں نے منفرد موضوع کا انتخاب کیا اس ماہ آپ لوگ اس کا دوسرا حصہ پڑھیں گے۔ ملک کے حالات جس طرح خراب ہو رہے ہیں اور پریشان کن ہیں بہنوں سے التماس ہے کہ ملک وقوم کی بہتری کے لیے خصوصی دعائیں کریں۔ اللہ ہم سب کو ناگہانی آفات و پریشانی سے بچائے، آمین۔ اس کے ساتھ ہی اجازت دیں۔ بشرطِ زندگی اگلے مہینے پھر ملاقات ہوگی۔

دعا گو عذرا رسول

پیاری بہنو! آپ کے خطوط محفل کی جان ہیں، کورونا وائرس سے جو متاثر ہوئے اور اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ان کے لیے دعائے مغفرت اور جو بیمار ہیں ان سب کے لیے دعائے صحت ہے۔ اللہ پاک سب کے پیاروں کو سلامت رکھے اس ماحول کے نتیجے میں نفسیاتی وذہنی عوارض میں بھی لوگ مبتلا ہو رہے ہیں، ہمیں ایک دوسرے کی دل جوئی اور تسلی وتشفی کرنی ہے۔ جس حد تک ممکن ہو آپس میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ دلوں کی رنج، میل، غم وغصہ بھلا کر ایک ہو کر اپنوں کا ساتھ دیں کہ زندگی میں انہی چیزوں کی ضرورت سب سے بڑھ کر ہوتی ہے..... بیماری اور غم کے لمحات میں لوگ اپنے پیاروں کے منتظر رہتے ہیں۔ اللہ پاک ہمیں ایک دوسرے کا ہم درد وغم گسار بنائے رکھے۔ الٰہی آمین۔

☆☆☆

بہنو! حسبِ روایت نت نئی خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوصِ دل سے درود ابراہیمی اور اس

کے بعد تین بار آیتِ کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہلِ وطن کو بھی یاد رکھیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

سالگرہ مبارک

☆ فضہ بتول، بہارہ کہو، ہادیہ عدیل، امریکا۔ سمارا انعم بھٹی، ڈیرہ غازی خان۔ ماہین جبار، سیالکوٹ۔

☆ آسیہ عامر، کراچی کو بیٹوں اور شوہر کی سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔

☆ گزشتہ دنوں باقاعدگی سے امتحانات تو بچوں کے نہ ہو سکے مگر پورے سال کی تعلیمی کارکردگی دیکھ کر نتیجے نکالے گئے ہیں اور الحمدللہ ہماری پاکیزہ بہنوں کے بچے نئی جماعتوں میں چلے گئے ہیں اور آن لائن کلاسز پوری دلچسپی اور شوق سے جاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جلد ہی پوری دنیا اور ملک پاکستان میں ہر چیز معمول پر آجائے اور سب ہنسی خوشی اپنے وطن کی ترقی و خوش حالی میں اپنا حصہ ڈالیں، الٰہی آمین!

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی اور پُرخلوص دوست امینہ عندلیب، سلانوالی کے لیے خصوصی دعائے صحت کی التماس ہے۔

☆ شاعرہ، مصنفہ مستقل پاکیزہ تبصرہ نگار فریدہ جاوید فری، لاہور کی ان دونوں کافی طبیعت خراب ہے۔

☆ مستقل تبصرہ نگار نادیہ، راول پنڈی کے بیٹے کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔

☆ آج کل کورونا وائرس کے باعث بہت لوگ مختلف بیماریوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ کہیں بخار ہے تو کہیں کھانسی اور جسم میں درد اس سلسلے میں وزارتِ صحت کی جانب سے ذرائع ابلاغ مسلسل احتیاطی تدابیر بتا رہے ہیں سو ہم سب کو ان احتیاطوں اور پرہیز پر سختی سے عمل کرنا ہے۔ پاکیزہ سے وابستہ ہمارے بیشتر دوست احباب اس کا شکار ہو چکے ہیں سب کے لیے دعائے صحت کی خصوصی استدعا ہے۔

انتقالِ پُرملال

☆ اس ماہ قائداعظم محمد علی جناح کا یوم وفات ہے کہ جن کی انتھک محنت کا ثمر ہمارا پیارا ملک پاکستان ہے۔

☆ معروف شاعر راحت اندوری مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔

☆ اپنے قارئین کو ایک اور افسوس ناک خبر سے آگاہ کرتے ہیں کہ پاکیزہ کی دیرینہ لکھاری محترمہ شمیم فضل خالق کے شوہر نامدار 2 جولائی کو طویل علالت کے باعث انتقال کر گئے۔ مرحوم نہایت با اخلاق اور اصول پرست شخصیت کے مالک تھے۔ اللہ پاک شمیم فضل خالق اور لواحقین کو یہ عظیم صدمہ برداشت کرنے کی طاقت عطا کرے اور مرحوم فضل خالق کے درجات بلند فرمائے۔ ادارہ پاکیزہ اہلِ خانہ کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

☆ مصنفہ فرحت انصاری، ملتان کی نوعمر بھتیجی وفات پا گئی۔

☆ جبین نیاز، ملتان کے چچا مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔

☆ پچھلے دنوں حدیث اختر کے شوہر کی پندرھویں برسی کے سلسلے میں فاتحہ خوانی ہوئی۔

☆ وادیِ کاغان سے تعلق رکھنے والی پاکیزہ کی باقاعدہ قاری و تبصرہ نگار شگفتہ حیا ترمزی کی جواں سال جیٹھانی مختصر علالت کے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔

سب مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کی گزارش ہے۔

☆☆☆

اب بہنوں آتے ہیں آپ کے پیارے، پیارے خطوط کی طرف۔

بھ تمیمہ کوکب، ضلع جہلم سے۔ ''تین ماہ کے طویل انتظار کے بعد پاکیزہ رسالہ دیکھنا نصیب ہوا۔ ایسے لگا جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔ جیسے کوئی کھوئی ہوئی قیمتی چیز مدتوں بعد مل جائے۔ مجھے کچھ کہنا ہے' نزہت اصغر صاحبہ کا ایک، ایک لفظ بہت پُراثر اور دل میں اترنے والا تھا۔ دین کی باتیں اور اسمائے گرامی نبی کریمؐ سے روح کو سرشار اور ایمان کو تر و تازہ کیا۔ قناعت، رضائے الٰہی، اختر شجاعت صاحبہ کی بہت پراثر، خوب صورت دل کو چھونے اور چھا جانے والی تحریر تھی۔ اے کاش ہم سب بھی قناعت پسند بن جائیں، آمین یارب العالمین۔ شائستہ زریں صاحبہ کا انسانی زندگی پر کورونا اور لاک ڈاؤن کے اثرات، بہت خوب

تھا۔علم وادب کے روشن چراغ، نزہت اصغر صاحبہ کا اور ہائے افسوس، ناہید فاطمہ حسنین کا دل پر غم وافسوس کے گہرے بادل کی طرح چھا گیا۔ ہما بیگ صاحبہ کے جواں سال بیٹے کا دکھ آنکھوں کو نم کر گیا۔ اللہ پاک ان کو یہ گہرا بہت صبر وآزمائش والا دکھ برداشت کرنے کی توفیق دے، انہیں صبر جمیل عطا ہو، آمین یارب العالمین۔ (جی بالکل) اندازِ نو بھی بہت اچھا لگا۔ میرا سارا رنگ اتار دو اور میں عشق ہوں دلچسپ ہوتے جارہے ہیں۔ ناولٹ وافسانے بھی بہت خوب تھے۔ عذرا آپی کو اللہ صحت وزندگی عطا فرمائے اور وہ جلدی سے بہنوں کی محفل میں پیاری، پیاری باتیں کریں، نزہت اصغر صاحبہ نے کچھ باتیں اپنی بہنوں سے کر کے دل کو جیت لیا ہے۔ بہت پیاری پُراثر باتیں تھیں، جزاک اللہ۔ آخر میں یہ کہ پاکیزہ کے تمام سلسلے بہت بہترین ہیں۔ اللہ تعالیٰ پاکیزہ کے تمام اسٹاف اور سب پاکیزہ بہنوں کو ہر بیماری اور پریشانی سے محفوظ رکھے، آمین۔'' (بہت پیارے جامع تبصرے اور پُرخلوص حوصلہ افزائی کا بے حد شکریہ)

❁ افشاں ناز، اسلام آباد سے۔ ''پاکیزہ کی ایک عرصے سے قاری ہوں مگر تبصرہ شاید ہی کبھی لکھا ہو۔ اس مرتبہ اتنا لمبا گیپ آیا تو بے حد کمی محسوس ہوئی۔ پاکیزہ تو ہمارا ساتھی ہے۔ اب میں کچھ کہانیوں پر بات کروں گی۔ افشاں آفریدی کا ناول کچھ زیادہ ہی طوالت اختیار کیے ہوئے ہے۔ دُرِمکنون کی مشکلات اب تو ختم کردیں۔ بے حد لمبی شادی ہوگئی کہ گزر ہی نہیں رہی۔ پچھلے ماہ طیبہ عنصر کا افسانہ حقیقت سے کوسوں دور تھا (افسانہ جو ہوا ڈیئر) بھلا ایسا بھی کیا کہ گھر میں اتنی بڑی پارٹی کی تیاری اور بیگم صاحبہ کو خبر ہی نہیں۔ کچھ تو حقیقت ہوتی۔ ہما علی کا افسانہ بڑا دردناک تھا۔ اس خاتون کی کیفیت دل پر اثر کرگئی۔ دیگر تحریریں بھی نارمل رہیں مگر ہم پاکیزہ کو بے حد مضبوط اور کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ بہت شکریہ۔'' (افشاں اسی طرح آتی رہیے گا۔ آپ پہلی دفعہ تبصرہ لے کر آئیں بہت شکریہ آپ کی تجاویز پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے)

❁ طیبہ عنصر مغل، راول پنڈی سے۔ ''نزہت پیاری! یقین کریں بہت ہی دکھ ہوا انجم اپیا کے شوہر کے انتقال کا اگر ہوسکے تو میری طرف سے بہنوں کی محفل، جہاں بھی ان کے لیے لکھیں، میرا پیغام بھی لگا دیں۔ نہایت ہی دلگرفتہ ہوں انجم اپیا کے شوہر کی رحلت پر..... چاہوں بھی تو ان کے دکھ کا مداوا ممکن نہیں ہے ہمارے بس میں یہی ہے کہ مرحوم کے لیے مغفرت کی دعا کریں اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، انجم اپیا اور تمام لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے ہم دکھ کی اس گھڑی میں اپیا کے ساتھ ہیں۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

❁ تسنیم ماپارا، کراچی سے۔ ''خیر سے مئی تا جولائی کا شمارہ موصول ہوا۔ یہ دنیا ایک گلوبل ولیج بن چکی تھی۔ اس Pandemic نے سب کی کایا ہی پلٹ دی لوگ جو صبح کراچی، دوپہر دبئی اور شام لندن میں گزارتے تھے وہ سب خواب ہوگیا۔ سچ ہے سب ٹھاٹ پڑا رہ گیا جب لاد چلا بنجارا۔ اداریہ خوب رہا حسب حال۔ اللہ نے چاہا تو اس مشکل وقت سے بھی اس کے رحم و کرم سے نکل ہی آئیں گے ان شاء اللہ۔ (بالکل جی اللہ کی رحمت سے مایوسی کیسی) دل مزید برا ہوا اس وقت جب عین اختتام رمضان اور عید کی پُرمسرت گھڑیاں قریب تھیں کہ طیارے کا سانحہ ہوا۔ الفاظ گم ہیں کس طور اور کیسے تسلی دی جائے جن کے پیارے دیکھتے ہی دیکھتے ان سے بچھڑ گئے۔ ہماری پیاری دوست ہما بیگ کا لختِ جگر بھی اس حادثے کی نذر ہوا۔ ہم بھی پرسے کو گئے لیکن ناہید فاطمہ کی طرح الفاظ جیسے کھو گئے ہوں۔ ہما بیگ کا صبر اور ان کی ہمت وحوصلہ بیان سے باہر ہے، ہمیں اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہوگیا تھا۔ اللہ تعالیٰ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ چلیے کچھ افسانوں کی طرف آتے ہیں۔ سلسلے وار ناول میرا سارا رنگ اتار دو، کچھ اب غیر ضروری طوالت اختیار کررہا ہے بہت سہہ لیے دکھ اب بیچاری دُرِمکنون کو نجات دلائیے پلیز۔ (جی بس اس کی مشکلات ختم ہورہی ہیں) گولے کی چادر کی گرمی خوب تھی۔ میں انمول کی اگلی قسط کا انتظار ہے۔ چھوٹی سی تمنا اور دیگر افسانے بھی اچھے رہے۔ فرحین اظفر ع عورت پھر بازی لے گئیں بڑی خوب صورت تحریر۔ حسب سابق شمع ہدایت قناعت کے موضوع پر پُراثر تحریر۔ اللہ اختر شجاعت کو جزائے خیر عطا کرے، آمین۔ اس دعا کے ساتھ اجازت۔ اللہ ہم سب کا نگہبان رہے، آمین۔'' (جزاک اللہ، تسنیم پیارے سے تبصرے کا شکریہ)

❁ تسنیم فضل خالق، پشاور سے۔ ''بڑی افسوس ناک خبر یہ ہے کہ میرے شوہر فضل خالق کی 2 جولائی کو ڈیتھ ہوگئی ہے۔ ویسے تو وہ کافی عرصے سے علیل تھے۔ بہنوں سے دعائے مغفرت کی استدعا ہے اور میرے لیے صبر کی دعا کریں۔ ایک عورت کے لیے اس سے بڑا نقصان اور کوئی نہیں ہوسکتا بس خدا مجھے صبر دے۔ میرے شوہر بہت زیادہ شریف، بااخلاق اور صاحب کردار

انسان تھے۔اللہ پاک مغفرت کرے۔'' (پیاری شمیم آپا یہ خبر پڑھ کر دلی صدمہ ہوا۔اللہ پاک آپ کو صبر دے۔مجھے یاد ہے ایک دفعہ آپ نے کوئی واقعہ بھی لکھا تھا اپنے شوہر کی ایمان داری اور اصول پسندی کا کہ دفتری امور میں کس قدر مستعد تھے اور اپنے اسٹاف، ماتحت وغیرہ سے کس خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔انسان کا کردار ہی یاد رہ جاتا ہے۔اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔کیا کریں یہی دستورِ حیات ہے ہر ذی روح، ذی نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے)

❁ تسنیم کوثر، کراچی سے۔''سب سے پہلے سلمٰی غزل کے افسانے ماں کی کیا بات ہے بہترین اور جامع کہانی خوب صورت اندازِ تحریر بہت پسند آئی اور بھئی بے حد دلی مسرت ہوئی کہ سلمٰی غزل صاحبہ نے اپنی پہچان کروادی۔یقین جانیے ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی دل چاہ رہا ہے فوراً آپ سے ملوں، فون پر بات کروں، پیاری سلمٰی غزل یقیناً آپ اب بھی اتنی ہی خوب صورت اور دلکش ہوں گی اور آپ نے درست کہا حمیدہ حیدر ہماری ہیڈ مسٹریس کا نام تھا جو زیادہ تر ساڑی پہنتی تھیں اور اس زمانے میں ہم انہیں آپا اور، تمام ٹیچرز کو باجی کہا کرتے تھے اور ایک شاید آپ کی کزن ریحانہ نام کی ٹیچر بھی ہوا کرتی تھیں جو کہ بہت ہی ہنس مکھ سی تھیں اور یہ بھی بتادوں کہ دونوں پروین ہماری خالہ زاد تھیں۔ تو جناب نزہت اصغر اب ہمارا فون نمبر اور ان کا نمبر ہم تک آپ کے توسط سے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔(جی بالکل) اب ذرا بات ہوجائے نایابِ جیلانی کے انپوتے ناول میں عشق ہوں، یقین جانیے بہت پسند آرہا ہے یہ ڈرامائی ناول مگر نایاب ہاتھ ہولا رکھیں آپ تو کہیں سے نہیں پہنچ جاتی ہیں اور ہم سر پکڑے کہانی کو سمجھنے میں لگ جاتے ہیں۔اس بار عورت کہانی نہایت عمدہ رہی حقیقت سے بالکل قریب تر اسٹوری دل کو لگی ایک گھرانا کیا بلکہ زیادہ تر گھرانوں میں یہی کہانی ہورہی ہے اور بھئی میرا سارا رنگ اتار دو حسین ترین ناول تو ہے مگر کہانی ابھی تک وہیں کی وہیں ہے۔(ذرا آہستہ سفر کررہی ہے تاکہ سب کے کردار واضح ہوجائیں) اور اس کے علاوہ انمول بھی بہترین جارہا ہے۔ایک سجدہ مکمل ہونے کے بعد ہی کچھ کہیں گے اور عظمٰی مشتاق کی شاعری اللہ بچائے نے بڑا مزہ دیا واہ بھئی واہ کیا کہنے، اس کرونے سے اللہ بچائے اونے پونے سے اللہ بچائے۔بہت خوب وہ آئے بزم میں غزالہ عزیز سے ملاقات اچھی رہی اس کے علاوہ ناہید فاطمہ حسنین کی تحریر 2020ء کیا ایک انتہائی تباہ کن سال رہا۔نہایت عرق ریزی سے لکھی گئی تحریر اچھی لگی اور آخر... میں بزم پاکیزہ میں آج کل ہمارے سوالات شامل نہیں ہورہے ہیں آخر کیوں؟ اور ہاں عذرا رسول کو ہمارا اسلام کہیے گا ان کی بہنوں کی باتیں پیاری لگتی ہیں اللہ انہیں، آپ سب کو ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔''
(پیارے سے تبصرے کا شکریہ اور آپ کو اپنی ٹیچر مل گئیں اس کے لیے مبارک باد)

❁ فرخندہ جعفری، گجرات سے۔''ماہ مئی، جون، جولائی، اگست کے خوب صورت ٹائٹل سے سجے پاکیزہ پڑھے۔اتنے مشکل حالات کے باوجود کسی بھی آئٹم میں کمی محسوس نہیں ہوئی۔اتنی خوب صورت حقیقت کو چھوتی ہوئی کہانیاں پڑھنے کو ملیں۔بہنوں نے اپنے خوب صورت تبصروں کا خوب رنگ جمایا۔مجھ جیسی ناقص العقل کے تبصرے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔تسنیم کوثر صاحبہ نے میرے تبصرے کی تعریف کی ہے بہت شکریہ۔میرا تو یہ حال ہے آنکھوں سے اندھی نام نور بھری۔تمام کہانیاں اتنی اچھی ہیں کوئی کمی ہو تو تبصرہ کروں۔(ارے اتنا بھی کیا کسرِ نفسی سے کام لینا) گولے کی چادر، سلمٰی نگار نے ہمارے بچپن کی یاد تازہ کردی اس زمانے میں واقعی انسان اتنا بے بس تھا کہ ساڑھے چار پیسے کی چادر بھی اس کے بس میں نہیں تھی۔رائٹر نے حقیقت کو چھوتی ہوئی کہانی لکھی ہے۔آب نیساں، ناہید سلطانہ اختر صاحبہ نے پورے معاشرے کی عکاسی کی ہے۔ہنستے بستے خاندانوں میں اچانک ایسی دراڑیں پڑتی ہیں کہ کچھ باقی نہیں رہتا۔سگے بہن بھائی جن میں آپس میں اتنا خلوص اور پیار ہوتا ہے ایک دوسرے کی شکل سے نفرت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا تمہارا مرنا، جینا ختم۔وہ پیارے خون کے رشتے ایک دم بیگانے ہوجاتے ہیں یہ تو ہر گھر کی کہانی ہے۔(معاف کرنا) ناہید سلطانہ اختر نے ضرور ایک بھرے کنبے کی قریب سے اسٹڈی کی ہے یہ کہانی نہیں حقیقت ہے۔یہ آب نیساں جو بڑی مشکل سے کسی، کسی کو ملتا ہے پل بھر میں ختم ہوجاتا ہے۔چھوٹی سی تمنا فرحی نعیم نے اچھا لکھا ہے بچوں کے نام رکھنے پر اکثر لڑائی، جھگڑے ہوجاتے ہیں۔بچہ صرف دادی، پھوپی اور ان سے ملتے جلتے رشتے داروں کا کیوں لگتا ہے۔نانی، خالہ کون ہوتی ہیں نام رکھنے والی حالانکہ جتنی خواری نانی، خالہ اس بچے کے لیے کرتی ہیں وہ کوئی نہیں کرتا مگر نام نہیں رکھ سکتیں۔کہانی کا اینڈ اچھا کیا۔جس چھوٹی سی تمنا کو ساری زندگی دل میں چھپائے رکھا اس تمنا کو اپنی بیٹی پر پورا ہوتے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ان تین ماہ کے ڈائجسٹوں میں ایک سے بڑھ کر ایک اچھی کہانی ہے۔تمام محترم اور پیاری رائٹرز کو مبارک باد۔عید مبارک، جشنِ آزادی مبارک۔ماہ اگست میں بھی بہت عمدہ اور اچھی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔کچھ نے دل کو دکھی کیا کچھ نے اچھا پیغام دیا۔عذاب لمحے، ہما

علی کی کہانی پڑھ کر دل بہت دکھی ہوا مگر یہ رسالہ بچیاں پڑھتی ہیں۔ بہرحال انہوں نے درندہ صفت انسانوں کو اوپن کیا ہے۔ پریوں کا دیس، مدیحہ شاہ رائٹر نے بہت محنت سے اچھی کہانی لکھی ہے گھر بیٹھے پریوں کے دیس کی سیر ہوگئی ہے۔ اتنے اچھے علاقوں سے واقفیت ہوئی ہے اچھی کہانی ہے۔ ماں، سلمیٰ غزل مٹ گئے فاصلے، عفت کل اعزاز، ع عورت ع غلطی فرحین اظفر، شجر سایہ دار، سیما رضا رواں۔ کس کس کہانی کی تعریف کی جائے۔ ویسے تو تعریف اس اللہ تعالیٰ کی ہے جس نے انسانوں کو اتنے اچھے ذہن دیے ہیں جو اتنی اچھی کہانیاں لکھتے ہیں تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اللہ تعالیٰ تمام لکھنے والوں کو سلامت رکھے۔'' (بہت پیارے تفصیلی اور پُرخلوص تبصرے کا شکریہ، آپ جیسے قارئین ہی ہماری ہمت بندھاتے ہیں)

محترمہ تانیہ مرزا، لاہور سے۔ ''برسات کے موسم میں پاکیزہ پڑھنے کا لطف دوبالا ہوگیا۔ اس شمارے کی خوب صورت کہانی پریوں کا دیس پڑھتے ہوئے ہم نے خود کو جھیل سیف الملوک کی سیر کرتے ہوئے محسوس کیا۔ سرسبز وادیاں، بلند پہاڑ، دریائے کنہار، سبز پانی کی جھیل سیف الملوک، لکڑی کی کشتی، لوک داستانیں، ناران کا بازار، چاندی کے زیور، وادیٔ کاغان کا گھر اور خوبانی کے درخت۔ غرض یہ کہانی پڑھتے ہوئے ہم اس کہانی کی خوب صورتی کے طلسم کدے میں گم ہوگئے۔ ہمارا بھی دل چاہنے لگا کہ سامان باندھ کر پہاڑوں اور وادیوں کی سیر کے لیے نکل پڑیں۔ مدیحہ شاہ جب بھی لکھتی ہیں کمال لکھتی ہیں۔ ان کی کہانیاں اور ڈرامے اپنی انفرادیت کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ رسالے کے باقی سلسلے بھی زبردست ہیں۔ دعا ہے کہ دنیا کے حالات جلد ٹھیک ہوجائیں اور لوگ اپنی نارمل روٹین دوبارہ سے بحال کریں اور دنیا کی رونقیں لوٹ آئیں۔ غزالہ عزیز سے ملاقات بھی خوب رہی، سیما رضا اور عفت کل اعزاز اور افشاں آفریدی کی تحریریں بھی اچھی رہیں۔'' (مختصر تبصرے کا شکریہ)

محترمہ ثوبیہ سرور، سیالکوٹ سے۔ ''باجی مجھے پاکیزہ بہت پسند ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کے لیے کچھ لکھوں۔ میرے ذہن میں بہت سی کہانیاں ہیں لوگ کہتے ہیں جسمانی تشدد نظر آتا ہے مگر ذہنی تشدد نظر نہیں آتا، یہ بالکل درست بات ہے۔ ہمارے معاشرے میں کتنی خواتین ہیں جو مسلسل اس ٹارچر کا شکار ہیں جو نظر بھی نہیں آتا اور شخصیت بھی تباہ ہوجاتی ہے۔ جسمانی تشدد کی تو سزا مل سکتی ہے مگر جو ذہن و دل اور روح پر گھاؤ لگتے ہیں ان کا مداوا کیسے ہو۔ بس اسی پر میں لکھنا چاہ رہی ہوں۔'' (پیاری بہن تو یہ بات تو تم نے بہت گہری کی ہے۔ کیا کریں یہ تو تعمیر کی عدالت خود ہی اسے سزا دیتی ہے جو ذہنی تشدد کرتے ہیں۔ اللہ پاک اس کا بدلہ خود لے گا مظلوموں کا ساتھی اللہ تعالیٰ ہے۔ ہمارا معاشرہ واقعی بیمار معاشرہ ہے اچھی بات ہے تم اپنی تحریر سے یہ چیزیں اجاگر کرو)

محترمہ حمیرا اشاری، کہوٹہ سے۔ ''میں عرصہ بیس سال سے زائد سے رسالہ پاکیزہ پڑھ رہی ہوں۔ ہر لحاظ سے مکمل رسالہ ہے۔ جہاں ہماری رائٹرز تفریح فراہم کررہی ہیں وہیں نصیحت بھی ہوتی ہے، میری تجویز ہے کہ جوان بچیوں کی تربیت کے لیے خصوصی مضمون بھی دیں۔ نئی شادی شدہ لڑکیاں اپنے گھروں میں کیسی رہیں۔ یہ باتیں بھی ضرور بتائیں۔ ہمیں اس کے تمام سلسلے ہی پسند ہیں۔'' (مختصر تبصرے کا شکریہ پیاری حمیرا۔ ہماری معزز رائٹرز کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ کہانی میں تفریحی عنصر کے ساتھ اصلاح بھی ہو کوئی نصیحت بھی ہو مگر ہلکے پھلکے پیرائے میں۔ دس صفحوں کا خالص مضمون دیں گے تو آپ ہی بور ہوجائیں گی)

محترمہ حدیث اختر، حاصل پور سے۔ ''شکر الحمدللہ کہ اب پاکیزہ بروقت مل گیا۔ ہم تو اس کے دیدار کے لیے چشم براہ کیے رہتے ہیں۔ آج ذکیہ آپا بہت یاد آرہی تھیں ان کو سلام کہیے گا۔ (ان کی طرف سے وعلیکم السلام۔ وہ بھی سب بہنوں کو خوب یاد کرتی ہیں) بہت پیاری بہنا غزالہ عزیز نے بہت درست لکھا ہے میرے دل کی بھی آواز ہے بیٹا، بہو، پوتا واپس گدو چلے گئے تو طبیعت بہت اداس تھی۔ منیب بیٹے نے رسالہ لاکر دیا تو ہمدم دیرینہ کو پاکر کچھ دل سنبھلا۔ پہلے آپ کا مجھے کچھ کہنا ہے سنا پھر دین کی باتیں پڑھیں۔ اسمائے نبی توبہ کے بارے میں پڑھا، رک کر کافی دیر تک دعا مانگی۔ اللہ پاک ہم سب کے لیے کافی وشافی ہو پھر غزالہ عزیز

سانحۂ ارتحال

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون..... ہم بڑے دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اپنے قارئین کو آگاہ کررہے ہیں کہ معروف قلمکار اور سابق مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ محترمہ انجم انصار کے شریکِ سفر جناب عبدالرب صدیقی 2 اگست کو قضائے الٰہی سے وفات پاگئے۔ مرحوم نہایت شریف النفس اور نیک فطرت انسان تھے۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا ہو الٰہی آمین..... ادارہ سوگواران کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

سے آپ کی گفتگو پڑھی اور پھر محفل میں آئے۔ تمام مرحومین کے لیے دعائے مغفرت اور بیماروں کے لیے صحت یابی کی پُرخلوص دعا۔ تحریریں سب ہی اچھی ہیں پر پتا نہیں دل کچھ گم صم سا ہے۔ اس دعا کے ساتھ اجازت کہ اے مالکِ دو جہاں اپنے بندوں پر رحم فرما۔ انجم انصار کے شوہر کا پتا چلا اللہ پاک انجم صاحبہ کو صبر دے اور بھائی عبدالرب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔'' (شکریہ)

❁ غزالہ رشید، کراچی سے۔ ''امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ آسانیاں دے۔ آج صبح ہی سیما رضا کے میسج سے انجم انصار صاحبہ کے شریکِ حیات کے وصال کا پتا چلا۔ ایسے موقع پر الفاظ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ پاکیزہ کے توسط سے..... اگرچہ ان کے دکھ کو کم کرنا ہم انسانوں کے بس کی بات نہیں لیکن ان کے اس درد کو محسوس کرتے ہوئے، دعا ہے رب العالمین سے کہ ان کو صبرِ جمیل عطا ہو اور مرحوم کے درجات بلند ہوں الٰہی آمین۔'' (جی ہاں غزالہ بہت افسوس ناک خبر ہے مشیت ایزدی کے آگے کس کا بس چلتا ہے۔ بس ہم تو الفاظ کے ذریعے ان کی دل جوئی کر سکتے ہیں)

❁ شہناز فضل، کراچی سے۔ ''پروین افضل شاہین کو ہم پسند کرتے ہیں اور ان کی اولاد کے لیے بھی بہت دعا کی تھی۔ میرے دو بھائی کے بھی بچے نہیں ہیں میرے بیٹے کی شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں ابھی تک بچہ نہیں ہوا سب دعا کریں، آمین۔ تمام بہنوں کو سلام اور دعائیں۔'' (عزیزی شہناز آپ کے مختصر خط کا شکریہ، سب بہنیں آپ کے بھائی اور بیٹے کے لیے ضرور دعا کریں گی)

❁ آسیہ عامر، کراچی سے۔ ''شٹ ڈاؤن نے تو ایسی مت ماری کہ میں بے خبری میں ہی ماری جاتی۔ میں یہ سمجھ رہی تھی کہ اگلے مہینے بھی یہی پاکیزہ چلے گا لیکن آج اختر شجاعت آپی سے بات ہوئی تو کہنے لگیں اگلے مہینے کا مضمون میں نے ابھی تیار نہیں کیا تو مجھے ہوش آیا کہ اگلا مہینہ اگست کا ہے۔ اگست کے مہینے میں تو مجھے ویسے بھی بہت خوشی ہوتی ہے میرے پیارے بیٹوں اور سیٹھ صاب (میرے شوہر عامر) کی سالگرہ ہوتی ہے۔ یاد آیا پچھلی تبصرہ لکھنے۔ سب سے پہلے تو اسما شاہد کا بہت شکریہ کہ میری خوشی میں بہت خوش ہوئیں ڈھیروں دعائیں دیں واقعی دعائیں ہی تو ہوتی ہیں جو ہم کسی کو سچے دل سے دیتے ہیں جزاک اللہ۔ شمع ہدایت ہم سب کا پسندیدہ مضمون پاکیزہ کی شان ہے۔ قناعت تو دور کی بات ہم ناشکرے کسی بات پر بڑی سے بڑی نعمت پر شکر ادا نہیں کرتے۔ خالی اس بات کو لے لیا جائے کہ ہمارے تمام اعضا نارمل ہیں تو صبح سے لے کر رات تک شکر ادا نہیں کر سکتے۔ افشاں آفریدی کا میرا سارا رنگ اتار دو جتنی تعریف کی جائے کم ہے افشاں صاحبہ کی سوچ جھلکتی ہے۔ مُدّرِ ملکنوں کے کردار میں بھی خولہ کے کردار میں بھی عاصمہ کے کردار میں حتیٰ کہ عکرمہ کے کردار میں۔ گولے کی چادر ایک مختصر مگر نہایت شاندار تحریر دل میں اترنے کی حد تک مگر جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ سلمیٰ نگار صاحبہ کے انتقال کے بعد چھپی۔ (ہاں بس کیا کر سکتے ہیں) عائشہ خان کا ایک سجدہ بہت اچھا جا رہا ہے تین صداقت کے رانگ نمبر میں نظیر پہلوان نے بہت ہنسایا۔ ہلکی پھلکی تحریر پڑھ کر مزہ آیا۔ تم عشق ہمارا ہو، شرکا ظلمی کا افسانہ بس نارمل سا لگا۔ مجھے کچھ کہنا ہے، نزہت اصغر صاحبہ نے صد فیصد صحیح لکھا۔ خدا خاموش بیٹھا تھا۔ کسی کا دل نہ توڑا تھا پھر ایک ایسی وبا پھیلی فضاؤں اور ہواؤں میں سب ہی کچھ تھم گیا۔ ہمایک صاحبہ کے جواں سال فرزند کے انتقال یا شہادت..... بہت دکھ ہوا دکھ ایک لفظ ہے جو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ طیبہ عنصر مکمل کا میرے ہم سفر شادی کے شروع کے سالوں میں اس طرح کے سرپرائز ملتے ہیں۔ دل کے اندر بھی رستہ، کنیز علی کا واقعی دل چاہ رہا ہے کہ میں بھی بچوں کی ایسی مسکراہٹ دیکھوں لیکن میں کہاں جا کر بانٹوں؟ (محلے میں) ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کا آب نیساں سچی کہانی لگی۔ پڑھ کر ہم بھی ماضی میں کھو گئے۔ اللہ خونی رشتوں میں ہمیشہ پیار سلامت رکھے، آمین۔ بہنوں کی محفل میں عذرا رسول صاحبہ کی بہت کمی محسوس ہوئی لیکن انہوں نے بھی میرے بیٹے کے حافظ ہونے پر بہت خوشی کا اظہار کیا اللہ تعالیٰ ان کو بہت ساری خوشیاں دے اور ہاں میرا پیغام شیریں حیدر تک پلیز پہنچا دیجیے کہ پتا نہیں کیوں پچھلے ہفتے مجھے بہت یاد آئیں کئی دفعہ سوچا نزہت آنٹی سے نمبر لے کر ان سے بات کروں لیکن سستی بھی کوئی چیز ہے جو ہر طرف چھائی ہوئی ہے۔'' (شیریں الحمدللہ بخیریت ہیں اور جلد ہی ایک اور خوب صورت تحریر کے ساتھ آ رہی ہیں ان شاءاللہ ...طویل تبصرے کا شکریہ)

❁ زرتاشیہ نعمان، ملتان سے۔ ''امید کامل ہے سب کے گھروں میں عید پُرمسرت اور اچھی رہی ہوگی۔ (الحمدللہ) سب سے پہلے رخ کرتی ہوں میں عشق ہوں کی جانب جس خوب صورتی سے یہ ناول آگے بڑھ رہا ہے وہ قابلِ ستائش ہے اور نایاب جیلانی کی تشبیہات اتنی جاندار اور مزے کی ہوتی ہیں کہ پڑھ کے دل جھوم اٹھتا ہے۔ مدیحہ شاہد کو ویلکم کرتی ہوں ایک بہت دلکش تحریر

لے کر پاکیزہ میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ پریوں کا دیس پڑھتے ہوئے کچھ چمکتی یادوں کے جگنو میرے اردگرد جھلملانے لگے، شادی کے بعد پہلا رخت۔ مر جو باندھا تھا میاں صاحب کے ساتھ تو اس کی منزل شمالی علاقہ جات تھے، ہم شوگران، ناران، کاغان سے ہوتے ہوئے اس پُرفسوں جھیل سیف الملوک کہلائی جاتی ہے اس کے حسن سے اپنی آنکھیں خیرہ کیں۔ بہت دلکش سفر تھا وہ، ظاہر ہے محبوب کی سنگت ہو اور حسین مناظر تو طبیعت کے ساتھ، ساتھ روح بھی سرشار ہو جاتی ہے۔ (جی بالکل درست کہا، دیکھا کیا یاد دلایا ہے مدیحہ نے) فرحت انصاری کی دلنشیں دل پڑھی اور پڑھ کے پچھتائی، بہت ساری معذرت کے ساتھ..... اُف اتنی بورنگ لو اسٹوری بالکل سیدھی ریل کی پٹڑی کی طرح، مزہ تو تب تھا جب لائبہ کی شادی شاہ زیب کے ساتھ ہو جاتی تھوڑا ٹوئسٹ آتا کہانی میں۔ (ارے جب ٹوئسٹ آتا ہے تو وہ بھی آپ جیسے پیارے قارئین کو گراں گزرتا ہے بھئی) سعدیہ رئیس کی میں انمول بہترین جا رہی ہے اس بار کی قسط بھی خوب شاندار تھی۔ عورت کہانی میں فرحین اظفر نے ایک بہت حساس اور قابلِ غور بات پر قلم اٹھایا، یہ حقیقت ہے کہ کبھی، کبھی والدین اپنی اولاد میں بہانگ دہل تفریق کرتے ہیں۔ شجر سایہ دار میں سیما رضا دراصاحبہ نے تقسیم ہند سے لے کر موجودہ حالات تک کا جو تانا، بانا بُنا ہے وہ نہایت قابلِ ستائش ہے، جامع اور مختصر انداز تحریر نے اس افسانے کو چار چاند لگا دیے جس کے لیے مصنفہ کو مبارک باد۔ عفت کل اعزاز اچھی تحریر لائیں فاصلے مٹ گئے اچھا ہوا کہ مٹ گئے کیونکہ اب جو انٹ فیملی سسٹم میں وہ والی بات نہیں رہی کہ چوٹ ایک کو لگے اور درد پورا کنبہ محسوس کرے۔ حنا ابرار کی عید تم سنگ ہلکے پھلکے پیرائے میں ایک مضبوط پیغام دیتی ہوئی تحریر تھی، اللہ کی راہ میں صرف جانور ذبح کرنا ہی قربانی نہیں، دلوں میں کدورتیں پنپ رہی ہوں، رشتوں سے قطع تعلق ہو، کہاں کی قربانی اور کیسی عید، اپنے نفس کو قربان کرنا جہاد افضل ہے۔ (بالکل درست کہا) رائٹر ہما علی کی عذاب لمحے روکنے کھڑے کر دینے والی تحریر تھی، اللہ سب کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عزت محفوظ رکھے، آمین۔ سلمیٰ غزل کی ماں کہانی بس سوہی تھی، کچھ خاص جاذبیت نہیں تھی تحریر میں غزالہ عزیز صاحبہ کا انٹرویو پڑھا اور سچ پوچھیں تو زہت آپی آپ سے ملنے کا اشتیاق ہونے لگا لیکن پھر سوچا شاید یہ ممکن نہ ہو پائے اس لیے اس آدھی ملاقات پر ہی اکتفا کیا جائے یہ جان کر مجھے شدید اچنبھا ہوا کہ رائٹر افشاں آفریدی جرمنی میں مقیم ہیں تو کیا وہ اپنے سلسلے وار ناول میرا سارا زنگ اتار دو کی اقساط ہر ماہ آپ کو بھجواتی ہیں؟ (جی انہوں نے پاکستان آ کر یہ مکمل دے دیا تھا بس اینڈ باقی ہے) چلیں اب اجازت لیتی ہوں اگلے ماہ پھر ملاقات ہو گی زندگی بخیر۔ سب کے لیے ڈھیروں دعائیں مجھے اور میری فیملی کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا اور ہاں زہت آپی اکیس ستمبر کو مابدولت کی سالگرہ ہے۔" (بہت شکریہ زرتاشہ بی بی اتنا تفصیلی تبصرہ کیا آئندہ بھی اپنی رائے کا اظہار کیجیے گا)

❀ ہما علی، اسلام آباد سے۔ "تبصرہ لیٹ کر رہی ہوں کیونکہ رسالہ پڑھ ہی نہیں سکی کہ میرے داماد اور ان کے تمام گھر والے کورونا میں مبتلا تھے۔ بیٹی اور نواسہ میرے پاس آئے ہوئے تھے تو بچے ہوئے تھے۔ ایک تو پریشانی پھر کام بھی بہت بڑھ گیا تھا۔ اب ذرا فرصت ملی تو جو پڑھا اچھا لگا۔ دل کے اندر بھی ہے رستہ، گولے کی چادر اور آبِ نیساں بہت عمدہ تحریریں ہیں۔ سب سے زیادہ جس چیز نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ ہما بیگ کا دکھ تھا۔ دنیا کا سب سے بڑا دکھ اولاد کا دکھ ہے۔ اللہ سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ دل کٹ کے رہ گیا۔ اللہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہما اور سب خاندان والوں کو حوصلہ اور ہمت عطا کرے، آمین ثم آمین۔" (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

❀ حرا قریشی، ملتان سے۔ "ماہنامہ پاکیزہ ہر بار حسنِ طباعت و اشاعت کے جملہ لوازم سے آراستہ ہوتا ہے۔ ہر دفعہ محبوب من پاکیزہ پاکر دل بلیوں اچھلتا ہے۔ اہلِ ذوق افراد کی مدیرانہ کاوشیں قابلِ تحسین ہیں۔ دعا ہے اس رب سوہنے سے، جو کونین و دارین کا مالک عالی ہے، اس جریدے کی تزئین و آرائش کا پیش کیا گیا جمالیاتی سحر لوگوں کے دلوں میں یونہی اترتا رہے اور وقت کے ہر گزرتے دن ہفتے، ماہ، سال یہ یونہی نکھرتا رہے، آمین۔ میرا ایک شعر خصوصی طور پر قابلِ قدر مدیران (پاکیزہ ٹیم) کی نذر.....

آسماں پہ جو یہ ستارے ہیں..... سب محبت کے استعارے ہیں

پاکیزہ میں شائع ہونے والی پہلی تحریر پر احساسات بالکل ایسے تھے جیسے بڑی منتوں سے مانگے کسی نومولود کی پیدائش پر ایک ماں کے ہوتے ہیں..... ایک ایسی نادیدہ مسرت جو ناقابلِ پیمائش ہوا کرتی ہے۔ بہت زیادہ جوش اور خوشی کی کیفیت ہوتی ہے۔ ہمارا تو دل محبوب من پاکیزہ کے لیے بھی اکثر یہی کہتا ہے۔ "واہ کیا بات ہے تمہاری!" اشاعت کے کئی سال مکمل کرنے پر پاکیزہ سے منسلک ہر فرد کو

بے حد مبارک باد..... بہت سی نیک تمنائیں..... اور ڈھیر ساری دعائیں..... سدا شاد آباد رہیں۔ اس شعر کے ساتھ اجازت.....

ہمارے گھر کی دیواروں پہ خوشبو میں اترتی ہیں..... کھلا یادوں کا ہم جس دن دریچہ چھوڑ دیتے ہیں۔'' (اف حرا بیٹی آپ نے تو خط نہیں افسانہ در افسانہ لکھا ہے۔ خلوص بھرے نامے کا شکریہ۔)

سمارا النعم بھٹی، ڈیرہ غازی خان سے۔ ''اگست کا شمارہ ملا تو بے انتہا خوشی ہوئی۔ جولائی کے شمارے کے لیے کہا گیا ہے کہ ختم ہو گئے ہیں آپی سوچیں کنٹی نیشن، انتظار رہا بالآخر اگست کا شمارہ ٹائم پر مل گیا تو تبصرہ لکھ رہی ہوں۔ (جی شکریہ) ٹائٹل اچھا تھا۔ اداریے میں آپ کی باتیں پُر اثر ہوتی ہیں۔ بہنوں کی محفل میں خطوط کم تھے مکمل ناول بھی ایک ہی تھا، مدیحہ شاہد کا پسند آیا۔ افسانے تمام بہترین و سبق آموز تھے۔ ناولٹ میں فرحت انصاری، سعدیہ رئیس چھائی رہیں، انٹرویو سلسلہ وہ آئے بزم میں ہمیشہ کی طرح بہترین سوال و جواب پر مشتمل تھا، خصوصی مضامین محنت سے سجے ہوئے تھے، محفل میں موجود بہنوں کے لیے خصوصی دعائیں..... اللہ بیماروں کو صحت و تندرستی عطا فرمائے، آمین۔ باقی مستقل سلسلے دین کی باتیں سے لے کر روحانی مشورے آپ کی عرق ریزی کا شاہکار ہوتے ہیں۔ رب تعالیٰ سے دعا ہے کہ ماہنامہ پاکیزہ دن دُگنی، رات چوگنی ترقی کی روشن منزلیں طے کرے، آمین۔'' (شکریہ اگست کا پاکیزہ وقت پر مل گیا اب ان شاء اللہ ستمبر کا بھی جلد ہی مل جائے گا..... جاندار تبصرے کا شکریہ)

مسکان نور، لاڑکانہ سے۔ ''آپی میں پہلی بار آپ کو خط لکھ رہی ہوں پلیز جگہ ضرور دیجیے گا۔ آپی میں اپنا افسانہ آپ کو بھیج رہی ہوں پلیز بتا دیجیے گا کہ اچھا ہے یا نہیں..... میں سندھی ہوں آپی اس لیے اگر میری کہانی میں کوئی غلطی ہو تو ٹھیک کر دیجیے گا پلیز..... پاکیزہ ڈائجسٹ زبردست ہوتا ہے میں اپنے بھائی سے ڈاؤن لوڈ کروا کر پڑھتی ہوں اور آپ سے یہ بھی پوچھنا تھا کہ کیا میں پچھلے مہینے کے ڈائجسٹ کا تبصرہ بھیج سکتی ہوں۔'' (آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ املا کی غلطی تو ٹھیک کر دیتے ہیں مگر کہانی میں کوئی جان ہو کوئی سبق ہو تو قابلِ غور ہوتی ہے..... آپ تبصرہ بھیج سکتی ہیں۔ پاکیزہ کے دوسرے سلسلوں میں بھی حصہ لیں۔)

عظمیٰ مشتاق، نارووال۔ عید کے حوالے سے آپ کی تحریر تاخیر سے موصول ہوئی آئندہ کبھی شامل ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

جیبنا، کراچی سے۔ ''مثلِ چاند ٹھہرا..... یوں سہ ماہی بن کر پاکیزہ پھر آ گیا۔ پاکیزہ اِک آگاہی بن کر سلامت رہو۔ (واہ بہت خوب) آپی مئی تا جولائی کا شمارہ 21 تاریخ کو ملا اور آج 23,7,20 کو تبصرہ لکھ رہی ہوں، پچھلے دو ماہ سے کبھی ہا کر سے، کبھی بہن سے اور کبھی بک اسٹال سے ہر دوسرے دن پوچھ رہی تھی اور اب تو بغیر جواب سنے سامنے والے کا منہ دیکھ کر سمجھ جاتی کہ اس ماہ بھی پاکیزہ کا دیدار نہ ہوگا۔ سب سے پہلے خط، نعت اور نظم کی اشاعت کا شکریہ۔ نیا سلسلہ اچھا لگا۔ جاری رکھیے گا، کہانیوں میں اِک چھوٹی سی کہانی گولے کی چادر، ایک بھاری اثر لیے ہوئے تھی۔ رائٹر کا نام سلمہ نگار اور آگے بہنوں کی محفل میں قاری سلمہ نگار کے انتقال کی خبر تو کیا دونوں نام اِک ہی شخصیت کے ہیں۔ صد افسوس..... (جی ہاں کہانی پہلے کی آئی ہوئی تھی) میرے ہم سفر، اچھی تحریر رہی، شروع میں ہیروئن بھنائی ہوئی رہیں مگر آخر میں اسے اپنی ساری تھکان کا صلہ بہت خوب صورت ملا۔ اپریل فول کی سب سے زوردار چیز امی کا چھڑنا تھا۔ کافی پُر اثر رہا سی اندھی تقلید کا اثر ہے جو آج بچہ، بچہ فول بنایا بڑا مزہ آیا جیسے نعرے کی عملی تفسیر بنا ہوا ہے۔ جانے کہاں جا چھپی ہے، ہمارے بزرگوں کی سکھائی تمیز اور احترام۔ عزت دار۔ ڈھابے پر سانگرہ سو سو رہی۔ آپ نیساں خاصی چہتی ہوئی تحریر..... ناہید جی بہت باریکی سے رشتوں اور ناتوں کے بے لگام ہوتے تعلق کو بہت خوب صورتی سے بیان کرتی ہیں، رانگ نمبر ہلکی پھلکی دلچسپ تحریر تھی۔ تم عشق ہمارا ہو، حسد اور رقابت کی صحیح عکاسی کرتی تحریر خوب صورت کہانی بہت شاندار دونوں میاں، بیوی اپنی جگہ پر مضبوط کردار لیے ہوئے تھے ویلڈن۔ سروے بہت اچھا لگا۔ پاکیزہ ڈائری، حسن نکھارے بہت پسند آئے۔ بزم پاکیزہ، میں اکثر گنگناتی ہوں تو اچھے ہی ہوتے ہیں۔ روحانی مشورے، ہومیو کلینک، لکھنے والوں کو اللہ اس کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ شاعری تمام کی تمام بہت اچھی بہت خوب صورت لگی۔ نگینہ ضیا بنگش کے لطیفے بہت مزیدار رہے اور بہنوں کی محفل تو ہے ہی پاکیزہ کا چاند تقریباً چار ماہ بعد بہنوں کے حال احوال کی خبریں پڑھیں، خوشی کی بھی اور غم کی بھی یہی زندگی کا عروج و زوال ہے۔ بہر حال سہ ماہی پاکیزہ زندگی کے پھیکے پڑتے رنگوں کو تھوڑا گہرا گیا۔'' (بہت شکریہ تفصیلی تبصرے کا اب ان شاء اللہ اشاعت میں تعطل نہیں آئے گا۔ اللہ بہتر کرے، آمین)

فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ ''پچھلے دنوں طبیعت کافی خراب تھی۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے مری بھی نہیں جا سکی۔ بس آپ سب مجھے دعاؤں میں یاد رکھیں۔ سب کو سلام۔ اختر شجاعت صاحبہ، عذرا رسول، انجم انصار سب کو سلام۔ ڈاکٹر کہتے ہیں

آرام کریں، اچھی آب وہوا میں وقت گزاریں۔ میں سب کو بہت یاد کرتی ہوں۔ (اللہ پاک آپ کو صحت دے۔ سب بہنیں آپ کے لیے دعائیں کرتی ہیں۔ آپ اسی طرح اپنی شاعری بھیجتی رہیں۔) پاکیزہ ملا جو کہ اگست کا تھا لاک ڈاؤن کی وجہ سے رسائل نہیں مل رہے تھے بہت پریشان تھی شکریہ۔ پاکیزہ کیا ملا پھولوں کا گلدستہ مل گیا مگر بہت افسوس کے ساتھ یہ خبر بھی ملی کہ باجی انجم انصار کے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ دل غم سے بھر گیا۔ اللہ تعالیٰ انجم باجی جو کہ میری بہن بھی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو صبر عطا کرے اور ان کے شوہر کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین، میری بھانجی عظمیٰ آفاق اور بچوں کو بھی صبر دے، آمین۔ اس مرتبہ سب نے ناولٹ اور افسانے ایک سے بڑھ ایک ہیں میں بھی بہت سخت بیمار ہوں میری صحتیابی کی تمام بہنیں دعا کریں شکریہ۔۔۔۔۔۔'' (مختصر خط کا شکریہ۔۔۔۔۔۔اللہ آپ کو صحت سے رکھے، آمین)

سلمیٰ غزل، کراچی سے۔ ''ویسے تو سب کچھ منجانب اللہ ہی ہے مگر لگتا ہے کہ 2020ء مصنفین کے لیے کچھ بھاری ہے۔ اللہ رحم کرے پہلے میرے شوہر داغ مفارقت دے گئے۔ پھر انجم انصار کے شوہر۔ دونوں کے ہی سر سے چھت اُڑ گئی، سائبان چھن گیا اور اللہ ان کو صبر دے اور باقی پر رحم کرے۔ اختر شجاعت نے تقدیر پر خوب لکھا سہی نے صحیح کہا ہے کہ تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے مگر شاعر مشرق نے بھی کہا ہے کہ تدبیر سے تقدیر بھی بدل جاتی ہے مگر اس میں بھی اللہ کی رضا شامل ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ہما علی کے افسانے عذاب لمحے نے دل چیر کر رکھ دیا۔ یقین کیجیے مجھے پڑھتے ہوئے احساس ہی نہیں ہوا کہ آنسو بہہ رہے ہیں جب الفاظ دھندلے ہونے لگے تو پھر بیٹھ کر باقاعدہ رونا شروع کیا۔ وہ اذیت، وہ تکلیف، اُف ہما آپ نے حقیقت کو ایسا روپ دیا کہانی لگ ہی نہیں رہی تھی بالکل سچ لگ رہا تھا کیونکہ ہمارے پاکستان میں یہ سب ہو رہا ہے۔ افشاں آفریدی، بہت اچھا جا رہی ہیں مگر میرا خیال ہے بس اب اختتام ہونا چاہیے۔ (اب سمٹ رہا ہے ناول) سیما رضا نے تجر سایہ دار کمال کا لکھا ہے۔ 14 اگست کی مناسبت سے لاجواب..... کاش خالہ جی جیسا جذبہ ہر پاکستانی میں ہو۔ (جی بالکل) عفت گل اعزاز کا بھی مٹ گئے فاصلے ٹھیک لگا لیکن بامقصد تھا سوائے اس کے بڑے بھائی کا احسان جتانا ذرا نہ بھایا غیروں کے ساتھ کر کے بھی نہ جتانا چاہیے پھر یہ تو خون کے رشتے تھے۔ دعاؤں کا ثمر، فوزیہ سرور کا لاجواب کاش لڑکیوں کی سمجھ میں آجائے اور عشق کا بھوت اتنی آسانی سے اتر جائے جیسے فوزیہ سرور نے اتارا۔ فرحین اظفر ہمیشہ کی طرح با مقصد افسانہ لائیں پتہ نہیں شادی کے بعد مائیں، بہوؤں کو سوکن کیوں سمجھنے لگتی ہیں اور بیٹوں کو سوتیلا..... مگر خیر اب زمانہ کافی بدل گیا ہے۔ اب نہ یاور جیسے بیٹے ہیں اور نہ آمنہ جیسی بہویں اور ساسیں بھی کافی سمجھدار ہوگئی ہیں۔ حنا! ابرار کا ہلکا پھلکا افسانہ ٹھیک لگا۔ دلبیز دل بھی بڑھ کر مزہ آیا اور اختتام بھی اچھا لگا۔ مدیحہ شاید کی تحریر لاجواب الفاظ کا چناؤ زبردست منظر نگاری بے مثال..... لیکن اینڈ میں حلق کڑوا ہوگیا کہ اگلی قسط اُف اب تو مجبوری ہے پڑھنا پڑے گا ورنہ میں قسط وار پڑھنے سے گھبراتی ہوں مگر انہوں نے بہترین لکھا ہے ایک پختہ اور سجھی ہوئی رائٹر کی طرح باقی بھی سب کچھ پڑھ لیا۔ اب اجازت دیجیے۔ ایک تجویز ہے ہر ماہ پڑھنے والوں کے لیے سوالنامہ دیں تاکہ سب بہنیں اس میں حصہ لیں مزہ آئے گا۔ جیسے اس مرتبہ ملک سے باہر رہنے والوں پر کورونا سے متعلق سوالات تھے ویسے ہی سوالات ملک میں رہنے والوں سے بھی پوچھے جاسکتے ہیں کہ کیا گزری۔'' (تبصرے کا شکریہ..... پچھلے شمارے میں پوچھا تھا ویسے سب قارئین اپنے، اپنے تاثرات بتا سکتے ہیں)

صبا آصف، کراچی سے۔ ''آمنہ حماد کو بہن کی شادی کی دلی مبارک باد، اللہ تعالیٰ دولہا جوڑے کو ہمیشہ خوش وخرم رکھے اور دنیا کی ہر خوشی سے نوازے، آمین ثم آمین۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جولائی کے بعد اگست کا شمارہ ہمارے ہاتھوں میں ہے ان مشکل حالات میں پاکیزہ کے اجرا پر پورے اسٹاف کا بے حد شکریہ۔ مارچ کے شمارے میں سلمیٰ غزل کے شوہر کے انتقال کے بارے میں پڑھا لیکن کورونا کی وجہ سے کوئی رابطہ نہ ہوسکا کہ میں تعزیت کرتی۔ سلمیٰ غزل کا مضمون پچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی۔ پڑھا پڑھ کر آنکھ نم اور دل بہت اداس ہوا۔ سلمیٰ کا دکھ دل میں محسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کے شوہر کی مغفرت کرے اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے دوسری خبر بھی دکھی کر دینے والی تھی۔ ہما بیگ کے صاحبزادے کے حوالے سے موت بہت دکھی کر دینے والی ہے لیکن جوانی کی اچانک موت اور اولاد کی موت یہ دکھ وہی جان سکتا ہے جو اس دکھ سے گزرے۔ اللہ تعالیٰ ہما بیگ کے صاحبزادے کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہما بیگ اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔ نزہت اصغر کا مجھے کچھ کہنا ہے ہمیشہ کی طرح شاندار تھا۔ عید الضحیٰ اور چودہ اگست کے حوالے سے بہت اچھا لکھا۔ فرحین اظفر کا ع عورت ع غلطی ہر تیسرے گھر کی کہانی ہے بس وہی بات کہ جو سہارا دینے کو کندھا پیش کر دے سارا بوجھ

اس کے کندھے پر اس میں غلطی کا ندھا پیش کرنے والی کی بھی ہوتی ہے بعد میں بھی تو میانہ روی پر آتے ہیں انسان کا اپنی ذات پر بھی حق ہوتا ہے رویوں میں عدم توازن سے ہی یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے خواہشات اور ضروریات میں فرق ہوتا ہے۔ میں تشکر ہوں، نایاب جیلانی میں عمامہ کا رویہ سہا دیتا ہے۔ نایاب جیلانی کا یہ جملہ "جب دوسروں کے ٹکڑوں پر پل کر جوان ہوا جائے تو میں اور انا کہیں نہیں رہتی۔ ایک، ایک نوالے پر نمک یاد آتا ہے، ایک، ایک لقمے پر کھلانے والا یاد آتا ہے نہ وہ نمک حرام تھا نہ اپنے باپ کی طرح کم ظرف....." اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہر بچے کو اپنے والدین کے سائے میں پلنا نصیب کرے یا پھر پالنے والا بدلہ سود کے ساتھ نہ وصولے جیسا کہ شام کی خالہ نے کیا۔ سلمیٰ غزل، ماں، بہترین تحریر تھی۔ بہت سی ماؤں کے لیے آئینہ اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر ایک ماں کا بہترین فیصلہ گوشۂ ظرافت میں سیمنٹ کا بم موسم کی مناسب سے مزہ دے گیا۔ بہت عرصے بعد میں دل سے مسکراتی کورونا وائرس نے زندگی کو بہت سہا دیا ہے۔ سیمار ضاردا کی تحریر شجر سایہ دار ایک بہترین تحریر تھی۔ خوشی خالہ جیسا جذبہ حب الوطنی اگر لاکھوں لوگوں میں بھی ہو جائے تو ہمارا پیارا وطن آج جنت کا نمونہ ہو اور لوگ اس کی مثالیں دیں لیکن افسوس کہ یہ جذبہ ہزاروں میں ہی ہے۔ انہی لوگوں پر ملک چل رہا ہے ہونہار بچے پیدا ہو رہے ہیں آج بھی ہمارا وطن سلامت ہے اور ہم بڑے خوش و خروش سے جشنِ آزادی منا رہے ہیں یہ ایک لہو کو گرما دینے والی بہت بہترین کہانی ہے۔ اپنے وطن کے لیے کچھ کر دکھانے کا عزم دیتی ہوئی، امید کے دیے جلاتی ہوئی۔" (تفصیلی تبصرے کا شکریہ..... آپ کی تعریف پہنچا دی گئی ہے۔)

عزیز بہنو! پچھلے شمارے میں چند گزارشات عرض کی تھیں وہی اس دفعہ بھی دُہرا رہے ہیں۔ امید ہے کہ آپ سب تعاون کریں گی۔ ماشاء اللہ ہر کوئی کہانیاں لکھ کر بھیج رہا ہے، ہماری استدعا ہے کہ مطالعے پر زیادہ دھیان دیں کئی اور پرانی رائٹرز کو پڑھیں کہانی چھپوانے کی جلدی نہ کیا کریں۔ رسالے کا معیار پیشِ نظر رکھیں۔ امید ہے ان باتوں پر غور کریں گی۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ محفل میں پھر حاضر ہوں گے آپ سب کی باتیں دلچسپ خطوط، نعتیں، عرضداشتیں سب اہم ہیں مگر ہماری گزارشات پر بھی غور کیا کریں۔ انہی خطوط کے ساتھ اجازت کہ پروردگار عالم ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، محبت و سلامتی سے رکھے اور ہم سب کے ساتھ خیر کے معاملات ہوں..... ہم سب کی دنیا و آخرت کی منازل آسان ہوں، بے شک ہمارا رب ہی دعاؤں کا مستجاب کرنے والا ہے۔ الٰہی آمین.....

آپ کی خیریت کی طالب.....نزہت اصغر

چند گزارشات عرض ہیں

1۔ تمام لکھنے والوں اور تبصرہ کرنے والوں کے لیے لازمی ہے کہ صاف اور واضح لکھائی میں لکھیں۔ 2۔ اپنا نام و پتا رابطہ نمبر ضرور لکھیں۔ 3۔ خط کتابت کے لیے دو پتے دیے جاتے ہیں ایک دفتر کی بلڈنگ کا ایڈریس دوسرا پوسٹ بکس نمبر..... یہ آپ سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ پوسٹ بکس نمبر پر رجسٹرڈ پوسٹ نہیں جاتی یہ آپ کے علاقے کے ڈاک خانے کے عملے کو معلوم ہے اور انہیں آپ کو ضرور آگاہ کرنا چاہیے۔ 4۔ کوریئر یا رجسٹری کرنا ہو تو دفتر کا پتا لکھا کریں تاکہ ڈاک بہ آسانی پہنچ جائے ورنہ پوسٹ بکس سے پہنچ تو جاتی ہے مگر بہت دن لگ جاتے ہیں اس لیے خوب دیکھ بھال کر سوچ سمجھ کر ڈاک روانہ کیا کریں۔ عام ڈاک تو پوسٹ بکس پر پہنچ جاتی ہے مگر رجسٹری نہیں رسید کو اپنے پاس سنبھال کر رکھیں تاکہ بوقت ضرورت کام آ سکے۔ 5۔ اپنی نگارشات بھیجنے کے ہفتہ دس دن بعد درج ذیل نمبروں پر رابطہ کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

ڈائریکٹ نمبر 02135386783 صبح 10 بجے سے شام 5 بجے۔ 02135802552 Ext 107-122 صبح 10 سے شام 5 بجے۔ 02135895313 Ext 107-122

موبائل نمبر۔ 03316266612 صبح 11 بجے سے شام 4 بجے فون کریں میسج کسی بھی وقت send کر سکتی ہیں۔

جوابی ٹیکسٹ کا انتظار کریں۔ جواب ضرور دیا جاتا ہے اگرچہ کچھ دیر سے ہی سہی۔ امید ہے ہماری پیاری اور بے حد سمجھدار بہنیں ان وضاحتوں کو خوب اچھی طرح سمجھ گئی ہوں گی۔ اب دفتر کا پتا بھی نوٹ فرمالیں محفل کے آغاز میں پی او باکس اور ای میل ایڈریس واضح لکھ دیا گیا ہے۔

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.C فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

پاکیزہ ڈائری

آمنہ حماد

حمد

کیسے ہو تیری حمد بیاں اے مرے خدا
انساں کے بس میں ہے یہ کہاں اے مرے خدا
الفاظ تیرے خامہ و قرطاس بھی ترے
اس میں نہیں ہے کوئی گماں اے مرے خدا
گوہر بنایا آب میں نیسانِ آب کو
حیراں ہوں کیوں نہ اہلِ جہاں اے مرے خدا
شہ رگ سے بھی قریب تخیل سے دور ہے
چشمِ بشر سے کیوں ہے نہاں اے مرے خدا
ہر شے ہے تیرے حسن کا پرتو لیے ہوئے
دریا، پہاڑ، کون ومکاں اے مرے خدا
ہر چیز پر گمان ہے تیرے وجود کا
پھر بھی ملا نہ تیرا نشاں اے مرے خدا
تیری عطا کا شکر کرے کیسے ارتضیٰ
یہ کہہ کے چپ ہے میری زباں اے میرے خدا

کلام: ارتضیٰ جونپوری
پسند: نائلہ علی، کراچی

نعت رسول مقبولؐ

اے صلی اللہ میں نے من میں تیری چاہت کی شمع جلائی ہے
اے شاہِ اممؐ دل تجھ پر فدا اور تیرا ہی شیدائی ہے
اے ماہ پیکر، اے ماہ پارہ، ماہ کامل، اے ماہ منیر
تیرے دیدار کی خواہاں مدت سے میری نیند میری بینائی ہے
کوئی صالح عمل میرے پاس نہیں، شانوں پر بوجھ عصیاں ہے
تیری رحمت ہی کی آس پہ بس تیری دید کی آس لگائی ہے
تیرے رخِ روشن کے جلوؤں سے اور تیری پا بوسی سے
اس عالم اور اس دنیا نے رنگ و زیبائش پائی ہے
تو لاثانی گوہرِ یکتا ہے، تجھ سا کوئی نہ آئے گا
تیری مثل کوئی ہوسکتا نہیں نہ تیری پرچھائیں ہی رب نے بنائی ہے
ہے نورِ خداوند تیری ذات مطہر، تو ہے محبوب عزوجل
تیرے عشق سے ہی آقا حاصل عرفانِ حق تک رسائی ہے
اے کاش کبھی ایسا بھی ہو، تہمینہ بتائے لوگوں کو
مجھ عاصی نے روضۂ اقدسؐ پر نعت یہ پڑھ کر سنائی ہے

کلام: تہمینہ عباسی، بہاول پور

دعا

حمد میں تیری کیا کروں
ہر وقت ..... نماز ادا کروں
جب بھی اذان ہوا کرے
لبیک ہی کہا کروں
ہر پھول پر شجر سی ہو
تیری اتنی میں ثنا کروں
دنیا کی طلب نہ بڑھ سکے
ہر اِک گھڑی دعا کروں
عرضی میری.....قبول کر
تیری چاہ سے نہ سوا کروں

ثناخواں: جیبنا، کراچی

حیران نہ ہوں

اللہ کے حروف۔4
محمدؐ کے حروف۔4
رسول کے حروف۔4
کتاب کے حروف۔4
قرآن کے حروف۔4
مسجد کے حروف۔4
کلمہ کے حروف۔4
نماز کے حروف۔4

روزہ کے حروف۔4
زکوٰۃ کے حروف۔4
جہاد کے حروف۔4
سورج کے حروف۔4
چاند کے حروف۔4
کعبہ کے حروف۔4
زم زم کے حروف۔4

از: مہرین کنول، ڈی آئی خان

قابلِ غور

☆ دعاؤں میں تاثیر آپ کی طلب سے آتی ہے اور تاخیر آپ کی بہتری کے لیے ہوتی ہے۔

☆ اگر ہم نے وقت پر دی گئی اذانوں پر صحیح معنوں میں لبیک کہا ہوتا تو آج بے وقت کی اذانوں کی ضرورت نہ پڑتی۔

☆ کھانا زندہ رہنے کے لیے کھاؤ نا کہ کھانے کے لیے زندہ رہو اور عبادات سے تر شحی کے باعث غافل ہو جاؤ۔

☆ دنیا میں ایسے نیک کام کر کے جاؤ کہ بعد مرنے کے بھی لوگ تمہیں اچھے کلام سے یاد کریں اور وہ کام تمہارے لیے صدقۂ جاریہ بن جائے۔

☆ لوگ آپ کی سہولت یا آسانی کو نہیں صرف اپنی ضرورت کو دیکھتے ہیں اور جھٹ سے رائے قائم کر لیتے ہیں۔

☆ خود کو خوش رکھنے کے لیے کسی دوسرے کی اجازت یا خوشنودی درکار نہیں ہوتی بلکہ اپنے رب کے شکر گزار بندے بنے رہو۔ خوش رہو گے ان شاء اللہ۔

☆ راستہ ایک ہی تھا..... پیغمبر خدا حضرت موسیٰ علیہ السلام گزر گئے اور فرعون ڈوب گیا۔ بھروسا راستے پر نہیں اللہ پر رکھو۔

از: سباس گل، رحیم یار خان

دوست

یہ دوست بھی عجیب ہوتے ہیں
دینے پر آئیں تو جان دے دیں
لینے پر آئیں تو ہتھی تک چھین لیں
کہنے پر آئیں تو دل کے تمام راز تک کہہ دیں
چھپانے پر آئیں تو یہ تک نہ بتائیں کہ خفا کیوں ہیں
ناراض ہونے پر آئیں تو سانس تک نہ لینے دیں
منانے پر آئیں تو اپنی سانسوں کو وار دیں
دوست زندگی میں نہیں ملا کرتے
بلکہ
زندگی دوستوں میں ملا کرتی ہے

از: ساجدہ ظفر، کمالیہ

باس کون؟

صاحب دفتر میں ترقی پا کر افسر بن گئے تو اگلے دن ہی آفس کے دروازے پر بڑا سا بورڈ آویزاں کر دیا جسے پڑھ کر پورے اسٹاف کی جان ہی نکل گئی۔

''یہاں میں باس ہوں، صرف میرا حکم چلے گا۔ ہمیشہ یاد رکھنا اور اپنی اوقات میں رہنا۔''

اگلے دن باس باتھ روم گئے، واپس داخل ہوئے تو میز پر ایک کاغذ پر پیغام لکھا ملا۔ ''آپ کے گھر سے آپ کی بیگم کا فون آیا تھا۔ پیغام دیا ہے کہ..... ''کچن کے دروازے سے جو بورڈ اتار کے لے گئے ہو وہ شرافت سے واپس لے آنا۔''

از: ثمینہ کوکب، جہلم

اب نے سن لی

پیار کی تتلی
ہاتھ سے نکلی
اِک وعدے سے
عورت پگھلی
سیپ کی قیدی
کیسے پھسلی
عشق کی راہ
چل دی پگلی
تخت ہزارے

جائے ڈولی
دل سے بات
دل نے کرلی
رک جا، نہ جا
دھڑکن بولی
یاد کے آنگن
کٹھری کھولی
خانم روئی
رب نے سن لی

کلام: فریدہ خانم، لاہور

غزل

میرے درد کو قرار دو
غم کو دل سے اتار دو
ہم ہجر کے ماروں کو
کوئی شامِ وصل ادھار دو
کچھ زیادہ کی طلب نہیں
لفظ پیار کے دو چار دو
اپنی چاہت کی چاندنی سے
بے مایہ زندگی نکھار دو
درد کے ساز بہت سنے
اب گیتوں کی جھنکار دو
خزاں، خزاں اداسیاں
ہمیں صرف بہار ہی بہار دو
قسمت تو نہ سلجھی اپنی
یہ الجھی شب ہی سنوار دو

کلام: فصیحہ آصف خان، ملتان

ہر کشمیری کی آواز

نہیں چاہتے ہم تم سے
یہ دولت یہ عیش و عشرت
دے سکتے ہو گر کچھ
تو آزادی دے دو
نہیں مانگتے آسائشیں
نہ کرتے ہیں فرمائشیں
لا سکتے ہو تو انہیں لا دو واپس
جو پیارے ہمارے زندہ سے لاش ہو گئے
خاک ہو گئے، بے نام ہو گئے
اگر کچھ دان کر سکتے ہو
تو ہماری بیٹیوں کی آبرو کی
وہ دھجیاں لا دو
جو بھیڑیوں نے اڑائی تھیں
کھول دو وہ اِک، اِک بیڑی
جس سے ہماری سانسیں بندھی ہیں
یہاں ہم زندہ تو ہیں مگر سانسیں نہیں ہیں
ہم کچھ نہیں مانگتے اللہ تم سے
بس ہمیں ہماری پہچان لا دو

از: زرتاشیہ نعمان، ملتان

دھوکے باز دنیا

ایک چور دکان میں داخل ہوا تو تجوری پر لکھا تھا۔ ''دائیں بٹن کو دبائیے۔'' چور نے ایسا کیا تو سائرن بج اٹھا اور چور پکڑا گیا۔ عدالت میں جج نے پوچھا۔ ''تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا پسند کرو گے؟'' چور نے بڑی اداس نظروں سے لوگوں کو دیکھا اور پھر افسردہ لہجے میں کہا۔

''میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ یہ دنیا بڑی دھوکے باز ہے۔''

چور کا پیغام

جاسوسی ناولوں اور کہانیوں کا ایک مصنف چھٹیاں گزار کر واپس آیا تو چوروں نے اس کے اپنے اپارٹمنٹ کے گھر کی ہر قیمتی چیز پر ہاتھ صاف کر دیا تھا۔ اس نے کمرے میں ہر چیز کو الٹ پلٹ پایا۔ چوروں نے اس کی لکھنے کی میز پر اس کے نام ایک نوٹ لکھا تھا۔ ''بڑے بھائی اپنے کسی ناول یا کہانی میں اس واقعے کو بھی ضرور جگہ دینا۔''

از: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

انعامی دوڑ

وکیل، چور سے۔ ''اچھا تو تمہارا کہنا ہے کہ تم نے

چاندی کا کپ دوڑ میں جیتا ہے؟''

چور۔ ''جی ہاں۔''

وکیل۔ ''اس دوڑ میں تمہارے ساتھ اور کون تھا؟''

چور۔ ''بازار کے کچھ لوگ، چار پولیس والے اور ایک دکان دار۔''

تو میں کیا کروں؟

کتب فروش لڑکے سے۔ ''تم روز رسالے الٹ پلٹ کر چلے جاتے ہو مگر آج تک تم نے ایک رسالہ بھی نہیں خریدا۔''

لڑکا۔ ''واہ جناب! میں تو ہر روز ایک دو رسالے لے جاتا ہوں۔ اب آپ کو پتا نہیں چلتا تو میں کیا کروں؟''

از: گلزار فاطمہ کراچی

غزل

خوش رو مہ رخوں سے ملا دیجیے
خلافِ مزاج دلوں کو دِلا دیجیے
ان کج اداؤں سے وفا کی توقع ہے عبث
اے اہلِ دل زنجیرِ عدل ہلا دیجیے
ہم تھے ہمہ تن گوش وہ رہے خاموش
ٹھہری، رکی دھڑکنوں کو بہلا دیجیے
نفرتوں کا زہر روح میں اتر نہ جائے
ان آشفتہ سروں کو جامِ عنایت پلا دیجیے
وقتِ رخصت دیکھیے پلٹ کر ایک بار فقط
کب کہا ہے میں نے وفا کا صلہ دیجیے
مدتوں سے ان کے در پر اِستادہ خاکسار
سائل کو خیراتِ دیدار دلا دیجیے
لباسِ دل نشتروں سے تار تار ہوا عظمیٰ
رفو گری سے اب گھاؤ سِلا دیجیے

کاوش: عظمیٰ مشتاق، نارووال

کورونا وائرس

میرے رب یہ کیسی وبا آئی ہے
ساری دنیا میں غم کی گھٹا چھائی ہے
نرم جانے کی جو کر رہے تھے تیاری
رہ گئی دل میں حسرت ساری کی ساری
سنتِ ابراہیمیؑ ہوئی ادا کرنی مشکل
گھر میں برکت جو آنی تھی ہوگئی مشکل
گھر میں آئے نہ کوئی جائے نہ کوئی
گلے ملے نہ کوئی ہاتھ ملائے نہ کوئی
ڈرا رہتا ہے انسان سے انساں اس طرح
جیسے انسان ہو کورونا وائرس کی طرح
یارب ہم سب کو بچالو ان آفات سے
ہو نجات ہماری اسی بلائے بے ثبات سے

کاوش: فرخندہ جعفری، گجرات

دو اشعار

کتنی پیاری لگتی ہوں
راج کماری لگتی ہوں
میری آنکھ میں دیکھو تم
درد کی عادی لگتی ہوں

از: فریدہ فری یوسفزئی، لاہور

چٹ پٹیاں

شادی کیا ہے؟

☆ شادی وہ خوب صورت جنگل ہے جہاں بہادر شیروں کا شکار ہرنیاں کرتی ہیں۔

☆ تیرے جیسا کوئی نہیں سے لے کر تیرے جیسے بہت دیکھے ہیں۔

☆ اجی سنتے ہو سے لے کر بہرے ہوگئے ہو کیا؟ تک کا سفر۔

☆ آپ رہنے دیجیے سے لے کر آپ تو رہنے ہی دیجیے تک کا سفر۔

☆ کہاں گئے جان سے لے کر کہاں مر گئے تک کا سفر.....

اسے کہتے ہیں شادی۔

مرسلہ: نازنین آفریدی، پشاور

کلیاتِ انتخاب

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆جیبنا.....کراچی

اے خاکِ مدینہ تیرا کہنا کیا ہے
تجھے قربِ شاہِ دو عالم ملا ہے

☆ساجدہ ظفر.....کمالیہ

میرے سینے میں کوئی سانس چبھا کرتی ہے
جیسے مزدور کو پردیس میں گھر یاد آئے

☆زرینہ خانم لغاری.....مظفر گڑھ

اب کہاں ایسی طبیعت والے
چوٹ کھا کر جو دعا کرتے ہیں

☆سنبل ملک اعوان.....لاہور

ہماری زندگی پر موت بھی حیران ہے غائر
نہ جانے کس نے یہ تاریخ پیدائش نکالی ہے

☆[illegible]

ہر اک صدا ہو نہیں باز گشت ملتی ہے
نہ جانے ہم ہیں دوبارہ کہ یہ دوبارہ ہے
عجب اصول ہیں اس کا کاروبارِ دنیا کے
کسی کا قرض کسی اور نے اتارا ہے

☆مہرین ضیا بنگش.....کیماڑی

کور چشموں کے لیے آئینہ خانہ معلوم
ورنہ ہر ذرہ ترا عکس نما ہے کب سے
کھوج میں کسی کی بھرا شہر لگا ہے امجد
ڈھونڈتی کس کو سرِ دشت ہوا ہے کب سے

☆ایلیا شیراز.....لاہور

کرنی ہے تو کھل کے کرو انکار وفا کی بات
بات ادھوری رہ جائے تو حسرت رہتی ہے
شہرِ سخن میں ایسا کچھ کر عزت بن جائے
سب کچھ مٹی ہو جاتا ہے عزت رہتی ہے

☆تسنیم کوثر.....کراچی

میری روح میں جو اتر سکیں وہ محبتیں مجھے چاہئیں
جو سراب ہوں نہ عذاب ہوں وہ رفاقتیں مجھے چاہئیں
انہی ساعتوں کی تلاش ہے جو کیلنڈروں سے اتر سکیں
جو ہے کے ساتھ گزر گئیں وہی فرصتیں مجھے چاہئیں

☆کوثر.....ایف بی ایریا

کہکشاں چاند شفق پھول ستارے جگنو
ہر طرف تیرے تبسم کی دنیا ہو جیسے

☆حمیرا انجم وحید.....واہ کینٹ

مت پوچھنا مجھ سے کہ تم میرے کیا لگتے ہو
دل کے لیے دھڑکن ضروری اور میرے لیے تم ہو

☆زرینہ خان.....بہارہ کہو

یہ تو اِک رسم جہاں ہے جو ادا ہوتی ہے
ورنہ سورج کی کہاں سالگرہ ہوتی ہے

☆شہناز فضل.....کراچی

منسوب تھے جو لوگ میری زندگی کے ساتھ
اکثر وہی ملے ہیں بڑی بے رخی کے ساتھ

☆نازنین آفریدی.....پشاور

اس نے پوچھا بھی مگر میں نے کہا کچھ بھی نہیں
دل سے اترے ہوئے لوگوں سے شکایت کیسی

☆ایلیا شاہ.....دستگیر، کراچی

کیسے ہو اس کو حالِ دل زار کی خبر
یوں نامہ بر بہت ہیں مگر معتبر کہاں

☆عروبہ.....کراچی

آسماں پر تیری پہچان بہت مشکل ہے
میری قسمت کے ستارے میرے آنگن میں اتر
یاد آتے ہیں وہ مٹی کے گھروندے مجھ کو
عمرِ خاموش ذرا دیر کو بچپن میں اتر

☆ نگہت زیدی.....بہارہ کہو

نکلا تھا تجھے ڈھونڈنے اِک ہجر کا تارا
پھر اس کے تعاقب میں گئی ساری جوانی

☆ صبا سجاد.....دبئی

اونچا ہو میرا سر کوئی چاہتا نہ تھا
سولی پہ بھی چڑھا تو گرانے لگے مجھے

☆ ستارہ رضوی.....حیدرآباد

ایک وہ بات جو ہونٹوں پہ نہ آئی ہے کبھی
عمر بھر ہم کو اسی بات پہ پچھتانا ہے

☆ گل لالہ.....جہلم

وقت بیتا ہے نہ بیتے گا کبھی
بیت جانے والی شے ہے زندگی

☆ فریحہ ناز.....کوٹری

لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس، کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

☆ عطیہ نوشین.....کراچی

وقف حرمان و یاس رہتا ہے
دل ہے اکثر اداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

☆ انعم جاوید.....کراچی

اب تو مل جاؤ ہمیں تم کہ تمہاری خاطر
اتنی دور آگئے دنیا سے کنارا کرتے

☆ جویریہ سہیل.....کراچی

مجھے یہ ڈر ہے تری آرزو نہ مٹ جائے
بہت دنوں سے طبیعت مری اداس نہیں

☆ بلقیس طاہرہ.....مری

اپنے انعامِ حسن کے بدلے
ہم تہی دامنوں سے کیا لینا
آج فرقت زدوں پہ لطف کرو
پھر کبھی صبر آزما لینا

☆ آئمہ رفیق.....بہاول نگر

کسی دن دیکھنا وہ آکے میری کشتِ ویراں پر
اچٹتی سی نظر ڈالے گا اور شاداب کردے گا

☆ رباب زوار.....لاہور

غلط تھے وعدے مگر میں یقین رکھتا تھا
وہ شخص لہجہ بڑا دل نشین رکھتا تھا

☆ عالیہ نثار.....حویلیاں

ایسے اجڑے ہیں میرے دل کے نگر ترے بعد
ہم نے چاہا بھی مگر ہم سے بسائے نہ گئے

☆ زینب انصاری.....حسن ابدال

یہ چراغ بے نظر ہے یہ ستارہ بے زباں ہے
اب تجھ سے ملتا جلتا کوئی دوسرا کہاں ہے
وہ شخص جس پہ اپنے دل و جاں نثار کردوں
وہ اگر خفا نہیں ہے تو ضرور بدگماں ہے

☆ زرینہ.....کالاشاہ کاکو

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے
اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

☆ ترنم علی.....لاہور

کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

☆ عظمیٰ جہانگیر.....کوئٹہ

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
لہجے میں اُن کے سامنے بات بدل، بدل گئی

☆ عمیرہ ناز.....فیصل آباد

کشتیِ دل بچایئے اتنا مگر رہے خیال
ڈوبے اگر تو پار ہو پار لگے تو ڈوب جائے

☆ مہتاب خان.....چترال

وہ دور ہو تو بجا ترکِ دوستی کا خیال
وہ سامنے ہو تو کب اختیار اپنا ہے

☆ شازیہ خان.....مانسہرہ

اس کو بھی ہم ترے کوچے میں گزار آئے
زندگی میں وہ جو لمحہ تھا سنورنے والا

☆ صائمہ.....میٹرووِل کراچی

ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیمان بھی ہے
عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکوں ایسا کہ مرجانے کو جی چاہتا ہے

منتخب غزلیں

ماہِ ستمبر اردو ادب کے معروف شعرا خمار بارہ بنکوی کا ماہِ پیدائش اور جگر مراد آبادی
کا ماہِ وفات ہے اسی مناسبت سے ان شعرا کا کلام آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے . . .

جگر مراد آبادی
6 اپریل 1890ء تا 9 ستمبر 1960ء

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

چھیڑا تھا جسے پہلے پہل تیری نظر نے
اب تک ہے وہ اِک نغمۂ بے ساز و صدا یاد

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرمِ نوازش
اس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

کیا جانیے کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو
مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد

مدت ہوئی اِک حادثۂ عشق کو لیکن
اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

میں ترکِ رہ و رسمِ جنوں کر ہی چکا تھا
کیوں آ گئی ایسے میں تری لغزشِ پا یاد

کیا لطف کہ میں اپنا پتا آپ بتاؤں
کیجے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

خمار بارہ بنکوی
ستمبر 1919ء تا 19 فروری 1999ء

کبھی جو میں نے مسرت کا اہتمام کیا
بڑے تپاک سے غم نے مجھے سلام کیا

ہزار ترکِ تعلق کا اہتمام کیا
مگر جہاں وہ ملے دل نے اپنا کام کیا

زمانے والوں کے ڈر سے اٹھا نہ ہاتھ مگر
نظر سے اس نے بصد معذرت سلام کیا

کبھی ہنسے کبھی آہیں بھریں کبھی روئے
بقدرِ مرتبہ ہر غم کا احترام کیا

طلوعِ مہر سے بھی گھر کی تیرگی نہ گھٹی
اِک اور شب کٹی یا میں نے دن تمام کیا

دعا یہ ہے نہ ہوں گمراہ ہم سفر میرے
خمار میں نے تو اپنا سفر تمام کیا

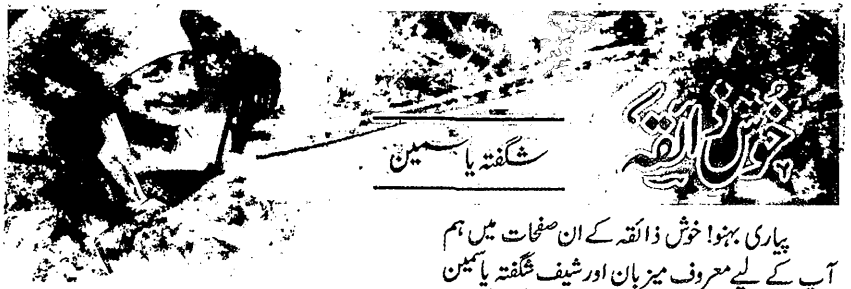

پیاری بہنو! خوش ذائقہ کے ان صفحات میں ہم آپ کے لیے معروف میزبان اور شیف شگفتہ یاسمین کے تیار کردہ کھانوں کی تراکیب بعنوان ''امی کی ریسپی'' لے کر آئے ہیں۔ (مدیرہ)

ڈرائی فروٹ ٹارٹ

اشیا﴾ میدہ، 2 کپ۔ شکر، 1/2 کپ۔ بیکنگ پاؤڈر، 2 چائے کے چمچ۔ انڈے، 2 عدد۔ مکھن، 1/4 کپ۔

فلنگ کے لیے﴾ اخروٹ، بادام، کشمش، پستہ، 1 کپ (ملا کر کاٹ لیں)۔ شکر، 1/2 کپ۔ مکھن، 1 کھانے کا چمچ۔ دار چینی پاؤڈر، 1/4 چائے کا چمچ۔

ترکیب﴾ میدہ، شکر (پسی ہوئی) اور بیکنگ پاؤڈر ایک ساتھ چھان لیں۔ پھر اس میں انڈے، مکھن اور تھوڑا پانی شامل کریں اور نرم گوندھ لیں۔ بیل کر ٹارٹ کے سانچے میں فکس کریں۔ فلنگ کے اجزا کو فرائی پین میں گرم کریں جب چینی پگھل جائے پھر چولھے سے اتار کر ٹارٹ کے اوپر ڈالیں۔ اب ٹارٹ کو 12 سے 15 منٹ 180 سینٹی گری پر بیک کریں۔

بیک ویجی ایگ کپ

اشیا﴾ ٹماٹر، 2 عدد (چھوٹے کیوبز کاٹ لیں)۔ شملہ مرچ، 2 عدد (چوکور کیوبز کاٹ لیں)۔ ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)، 1/2 کپ۔ بروکلی (چوپ کر لیں)، 1 کپ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ سیاہ مرچ پاؤڈر، 1 چائے کا چمچہ۔ انڈے، 6 عدد۔ تیل، حسب ضرورت۔

ترکیب﴾ کیسرول کپس کو تیل لگا کر چکنا کر لیں۔ ٹماٹر، شملہ مرچیں، ہرا دھنیا اور بروکلی کو مکس کر کے کپس میں ڈال دیں۔ انڈوں کو نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں اور کپس میں سبزیوں کے اوپر ڈال دیں۔ کپس کو پہلے سے گرم اوون ٹوسٹر میں 200 سینٹی گریڈ پر رکھ کر 15-10 منٹ تک بیک کریں انڈے سیٹ ہو جائیں تو اوون سے نکال کر بیک ویجی ایگ کپ ناشتے یا کھانے میں سرو کریں۔

حیدرآبادی چکن بریانی

اشیا﴾ چاول، 750 گرام۔ چکن، 1 کلو۔ دہی، 1/2 کلو۔ پیاز (تلی ہوئی)، 1/2 کلو۔ لال مرچ پاؤڈر، 3 چائے کے چمچ۔ ہلدی، 1 چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ پسا گرم مسالا، 1/2 چائے کا چمچ۔ لیموں کا رس، 2 بڑے لیموں کا۔ ہرا دھنیا، 1/2 گٹھی۔ پودینہ، 1/2 گٹھی۔ ہری مرچیں، 6 عدد۔ چھوٹی الائچی، 1/2 چائے کا چمچ۔ جائفل، جاوتری، 1/2 چائے کا چمچ۔ تیل، 1/2 لیٹر۔ زردے کا رنگ، حسب ضرورت۔

ترکیب﴾ چاول دو کنی ابال لیں، چکن کو دہی، تلی پیاز، خشک مسالوں، لیموں، ہرے مسالے کے ساتھ 4-3 گھنٹے کے لیے میرینیٹ کریں۔ ایک پتیلے میں میرینیٹ کی ہوئی چکن کی تہ لگائیں اوپر چاول کی تہ لگائیں۔ چاولوں کے اوپر پیاز والا تیل پھیلا کر زردے کا رنگ ڈال کر 10 منٹ تیز آنچ پر۔ پھر آنچ درمیانی کر کے 20-15 منٹ دم دیں۔

چیزی میٹ بالز ود ٹماٹو نوڈلز

اشیا﴾ مٹن قیمہ، 1/2 کلو۔ انڈا، 1 عدد پھینٹ لیں۔ بریڈ کرمز، 1/3 کپ۔ پارمیسن چیز، 1/4 کپ۔ نوڈلز (ابلے ہوئے)، سرونگ کے لیے۔ کیچپ، 1/2 کپ۔ ٹماٹو سوس، 2 کھانے کے چمچ۔ کٹی کالی مرچ، 1 چائے کا چمچ۔ نمک، سرخ مرچ پاؤڈر، حسب ذائقہ۔ دھنیا پاؤڈر، 1 چائے کا چمچ۔ آئل، فرائنگ کے لیے۔

ترکیب﴾ قیمے کو اچھی طرح میش کر لیں۔ پھر نوڈلز اور کیچپ کے علاوہ تمام اجزا مٹن میں مکس کر لیں۔ آمیزہ

یک جان ہو جائے تو اس کی بالز بنا کر 1 گھنٹے کے لیے ریفریجریٹر میں رکھ دیں۔ آئل گرم کر کے بالز فرائی کریں۔ نوڈلز میں کیچپ مکس کر لیں۔ سرونگ پلیٹ میں نوڈلز دائیں۔ اوپر تیار بالز رکھ کر سرو کریں۔

سویّوں کی قلفی

اشیا: دودھ، 2 لیٹر۔ چھوٹی الائچی، 8 عدد (باریک پسی ہوئی)۔ سویّاں، 1 پیالی۔ چینی، 2 پیالی۔ پستہ، 1/2 پیالی۔ کارن فلور، 2 کھانے کے چمچ۔ چاول کا آٹا، 2 کھانے کے چمچ۔ فلاقند، 1 پیالی (کچل کر رکھ لیں)۔

ترکیب: سویّوں کو ایک پیالی میں ڈال کر ابالیں اور بلینڈر میں پیس لیں۔ ایک دیگچی میں دودھ ڈال کر ہلکی آنچ میں پکا کر گاڑھا کر لیں۔ دودھ پک کر گاڑھا ہو جائے تو سویاں ڈال کر چمچہ چلاتے رہیں پانچ منٹ بعد پستے اور بادام اور چینی ڈال دیں۔ کارن فلور اور چاول کے آٹے کو ایک پیالی ٹھنڈے دودھ میں بھگو دیں۔ دس منٹ بعد کارن فلور اور چاول کا آٹا جس میں دودھ ملا ہوا تھا ڈال دیں۔ آمیزہ گاڑھا ہو جائے تو چولہا بند کر دیں اور ٹھنڈی ہونے پر فلاقند ملا دیں اور اچھی طرح بیٹر (beater) سے پھینٹ کر فریز کر دیں۔ پیش کرتے وقت اوپر پسا ناریل ڈال دیں۔

نوٹ: ہر دو گھنٹے بعد نکال کر ہلکا سا پھینٹ لیں تو قلفی بہت اچھی اور نرم بنے گی۔

ہمیشہ یاد رکھیں امی کی ریسپی کیونکہ یہی ہے راز ہوم شیف بننے کا۔

مکھنی مرغ مسالا

اشیا: چکن، 1 کلو۔ کھویا، 30 گرام۔ دہی، 3/4 کپ۔ پیاز، 1 عدد (چوپڈ)۔ ٹماٹر، 1 عدد (چوپڈ)۔ بڑی الائچی، 2 عدد۔ سبز الائچی، 3 عدد۔ لونگ، 3 عدد۔ ہری مرچ، 5 عدد (درمیان سے کاٹ لیں)۔ ثابت کالی مرچ، 5 عدد۔ لیموں کا رس، 1 کھانے کا چمچ۔ فریش کریم، 4 کھانے کے چمچ۔ گرم مسالا پاؤڈر، 1 چائے کا چمچ۔ سرخ مرچ پاؤڈر، 1 چائے کا چمچ۔ ہرا دھنیا (پتے)، 1 چائے کا چمچ۔ ادرک، لہسن پیسٹ، 2 چائے کے چمچ۔ قصوری میتھی (خشک)، 2 چائے کے چمچ۔ کالی مرچ پاؤڈر، 1/2 چائے کا چمچ۔ دھنیا پاؤڈر، 1/2 چائے کا چمچ۔ ہلدی، 1/2 چائے کا چمچ۔ دارچینی، 1 انچ کا ٹکڑا۔ آئل، حسبِ ضرورت۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ مکھن، 3-2 کیوبز۔

ترکیب: چکن پر تھوڑا سا نمک، لیموں کا رس اور کالی مرچ پاؤڈر لگا کر 30 منٹ کے لیے رکھ دیں۔ قصوری میتھی کو گرم توے پر ڈرائی روسٹ کر کے چوپ کر لیں۔ پین میں آئل گرم کر کے ثابت کالی مرچ، دارچینی، سبز الائچی، بڑی الائچی اور لونگ کڑکڑائیں۔ پیاز شامل کر کے فرائی کریں۔ پھر چکن شامل کریں اور تھوڑا گل جانے تک پکائیں۔ ادرک، لہسن پیسٹ اور ٹماٹر ڈال کر پانی خشک ہو جانے تک پکائیں۔ پھر سرخ مرچ پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر اور ہلدی مکس کریں۔ کھویا اور دہی اچھی طرح مک کر لیں۔ پھر چکن میں شامل کر دیں۔ اب 1/2 کپ پانی، نمک اور گرم مسالا پاؤڈر مکس کر کے ڈھک کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ چکن گل جائے تو فریش کریم، قصوری میتھی اور ہری مرچ مکس کر کے چولھے سے اتار لیں۔ مکھن کے کیوبز اور ہرا دھنیا ڈال کر دیگر لوازمات کے ساتھ سرو کریں۔

از: عرشیہ جنید، کراچی

کھڑا مسالا قیمہ بھنڈی

اشیا: قیمہ، 1/2 کلو۔ بھنڈی (دھو کر گول کاٹ لیں)، 250 گرام۔ پیاز (سلائس کاٹ لیں)، 1 عدد۔ ادرک (چوپ کی ہوئی)، 1 چائے کا چمچہ۔ لہسن (چوپ کیا ہوا)، 1 چائے کا چمچہ۔ لال مرچیں (کٹی ہوئی)، 1 چائے کا چمچہ۔ ثابت گرم مسالا، 1/2 چائے کا چمچہ۔ ہری مرچیں، 1 کھانے کا چمچہ (چوپ کی ہوئی)۔ ٹماٹر (چوپ کیا ہوا) 1/2 کپ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ تیل، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: سوس پین میں تیل گرم کر کے بھنڈیاں ڈال کر فرائی کر کے پلیٹ میں نکال لیں۔ اسی تیل میں پیاز ڈال کر ساتے فرائی کریں، قیمہ شامل کر کے بھون لیں، کٹی ہوئی لال مرچیں، لہسن، ادرک، ثابت گرم مسالا، ٹماٹر اور نمک ڈال کر بھون لیں۔ فرائی کی ہوئی بھنڈیاں اور ہری مرچیں ڈال کر 10 منٹ دم پر رکھ دیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

از: نورین عباس، لاہور

پہلا انعام یافتہ سوال

☆عائلہ خضر.....تونسہ شریف

سوال ﴿آپی صبر کے پھل کا رنگ کیسا ہوتا ہے؟

جواب ﴿ست رنگی۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆شمیم کوثر.....کراچی

سوال ﴿کہتے ہیں کامیابی ہمیشہ قدم چومتی ہے تو بھئی کامیابی کو ہاتھ منہ ناک کان چومنا منع ہے کیا؟

جواب ﴿ارے جب پاؤں ساتھ تو سب کچھ ساتھ.....انہی پاؤں کو چومتی ہے جن سے ہم قدم بڑھاتے ہیں زندگی کی راہوں میں۔

☆حمنیٰ قندیل.....کمالیہ

سوال ﴿محبت اندھی ہوتی ہے پھر اچھی شکل اور بینک بیلنس کو کیسے دیکھ لیتی ہے؟

جواب ﴿عقل کے کوروں کو اپنے مطلب کی چیزیں نظر آجاتی ہیں۔

سوال ﴿ایجاد اور اولاد کے لچھن اگر اچھے نہ ہوں تو کیا کرنا چاہیے۔

جواب ﴿اپنے ہی اعمال وافعال پر غور۔

☆حمیرا انجم وحید.....واہ کینٹ

سوال ﴿کرونا سے کیا آپ پریشان ہیں؟

جواب ﴿نہیں، کرونا رشتے میں میرا بھائی ہے۔

☆نسرین یاسین.....حیدرآباد

سوال ﴿اپنی قبر کھودنے سے کیا مراد ہے؟

جواب ﴿اپنا کام خود ہی کرنا چاہیے۔

سوال ﴿کھانا پینا جب دیں جیسا دیں جتنا...دیں مجال ہے ماتھے پر کوئی شکن تک نمودار ہو جائے یہ تمام خوبیاں کس میں پائی جاتی ہیں؟

جواب ﴿اپنی خوبیاں کیوں بیان کر رہی ہو۔

☆ناعمہ تحریم.....کراچی

سوال ﴿عورت جب روتی ہے تو دوپٹے سے منہ کیوں چھپا لیتی ہے؟

جواب ﴿بھئی تم بھی تو عورت ہو، تمہیں کیا اعتراض ہے۔

سوال ﴿سب سے زیادہ استعمال ہونے والے گھریلو ہتھیار کا نام بتائیے؟

جواب ﴿چاقو چھری.....اس کے استعمال کے بغیر کھانا کیسے کھاؤ گی۔

سوال ﴿دوسروں کی مدد کرنے کا وقت کسی کے پاس نہیں لیکن وہ کیا چیز ہے جس کا وقت سب کے پاس ہے؟

جواب ﴿غیبتیں، برائیاں۔

☆ایمن رانی.....کمالیہ

سوال ﴿کھانے میں زہر گھولنا اور کان میں زہر گھولنے میں کیا فرق ہے؟

جواب ﴿کان کا زہر زیادہ تکلیف دہ ہے۔

سوال ﴿کہتے ہیں وقت بہت قیمتی ہے اس لیے میں تو دوسروں کا ضائع کرتی ہوں.....کیا آپ بھی؟

جواب ﴿اپنے جیسا سمجھتی ہو تو سمجھتی رہو.....تمہاری مرضی۔

☆حمیرا انجم وحید.....واہ کینٹ

سوال ﴿کوئی ایسی خواہش آپ کی جواب تک پوری نہ ہوئی ہو؟

جواب ﴿الحمد للہ بے جا خواہش نہیں پالی ہیں۔

سوال ﴿پہلے سوچو اور پھر بولو کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب ﴿وہ اس لیے کہ سمجھدار لوگ ہمیشہ سوچ سمجھ کر ہی بات کرتے ہیں۔

☆ساجدہ ظفر.....کمالیہ

سوال ﴿کہتے ہیں بڑھاپے کی شادی اور بینک کی چوکیداری میں ایک آنکھ کھلی رکھنی پڑتی ہے مگر کون سی آنکھ.....دائیں یا بائیں والی؟

جواب ﴿جس میں ابھی تک موتیا نہ اترا ہو۔

سوال ﴿بیلن سے روٹیاں گول کرنے اور شوہر کو سیدھا کرنے کے علاوہ اور کون سا کام لیا جاسکتا ہے۔

جواب ﴿برف بھی توڑی جاسکتی ہے۔

☆حمنیٰ .....شیخوپورہ

سوال ﴿سفید پوش اور نقاب پوش میں کیا فرق ہے۔

جواب ﴿سفید پوش کسی مخلص نقاب پوش کی امداد کے منتظر رہتے ہیں۔

سوال ﴿کون سے لوگ دو نمبر کام بھی نہایت دیانت داری سے انجام دیتے ہیں؟

جواب ﴿دو نمبر لوگ ہی ہوں گے ناں۔

☆نسیم منظر.....کراچی

سوال ﴿بادام پر ہتھوڑی مارنے سے بادام بھاگ کر پیٹی کے نیچے کیوں چلا جاتا ہے؟

جواب ﴿پیٹی کیوں رکھی ہے وہاں۔

سوال ﴿سنگار کب غضب ڈھاتا ہے؟

جواب ﴿جب حد سے سوا ہو جائے ڈیئر۔

☆تنسیم کوثر.....کراچی

سوال ﴿اداکاراؤں اور فنکاروں جو بھی ہیں ان سب کا تقریباً ملتا جلتا جملہ کون سا ہوتا ہے؟

جواب ﴿بچپن سے اداکاری کا شوق تھا۔

سوال ﴿بچن کو لگائیں تالا اور فوڈ فلاں، فلاں سے کریں رابطہ آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب ﴿چلو تم تالا لگاؤ ہم آرہے ہیں گھر تمہارے۔

سوال ﴿جلدی بتایئے آپ کو اتنے مزیدار جوابات کیسے آجاتے ہیں اس کا راز تو بتایئے؟

جواب ﴿اللہ کی دین ہے، کبھی غرور نہیں کیا۔

☆عاتکہ خضر.....تونسہ شریف

سوال ﴿آپی جس دن گھر بکھرا پڑا ہو، مہمان اسی دن کیوں آتے ہیں؟

جواب ﴿تمہارا اگھڑا پاد دیکھنے اور کیا۔

سوال ﴿آپی جب خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑے گی تو آپ کون سی دعا مانگیں گی؟

جواب ﴿سب بھول جاتا ہے، ناقابلِ یقین لمحہ لگتا ہے کہ ہم کہاں آگئے۔ اللہ پاک مجھ سمیت سب کو بار، بار وہاں لے جاتے۔ آمین۔

☆تسنیم کوثر.....ایف بی ایریا

سوال ﴿چغلیوں کی تو بہت قسمیں ہوتی ہیں مگر کچھ لوگ لفظوں کی چٹکیاں لینا کیوں پسند کرتے ہیں؟

جواب ﴿کیا کریں اُن کی خصلت ہی ایسی ہوتی ہے۔

سوال ﴿چغلی کھائی جاتی ہے کی جاتی ہے یا کروائی جاتی ہے یا پھر کچھ اور بھی بتایئے تو؟ چغل خور جنت میں نہیں جائے گا.....ہمیں تو یہ معلوم ہے۔

سوال ﴿ہوش کے ناخن اور عقل کے ناخن کا آپس میں کیا رشتہ ناتا ہے؟

جواب ﴿ارے تم کیا جانو نادان حسینہ۔

سوال ﴿دل بلیوں اچھلنا، دل اچھل کر حلق میں آجانا دل باغ، باغ ہونا دل یہ کرنا وہ کرنا آخر بیچارہ ایک دل کتنے محاذوں پر کام کرتا ہے؟

جواب ﴿یہی تو دل کی خوبی ہے سب کو خوش رکھنا چاہتا ہے۔

☆ثمینہ کوکب.....جہلم

سوال ﴿اپنا بچہ روئے تو دل میں درد ہوتا ہے اور دوسرے کا روئے تو.....؟

جواب ﴿ہاتھ میں کھجلی ہوتی ہے۔

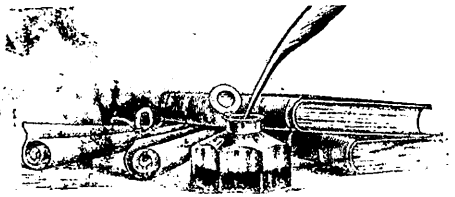

روحانی مشورے

ادارہ

قبولیتِ دعا کے لیے یاد رکھنا چاہیے کہ سب سے مقدم شرط پاک لباس، جائز اور پاک مقام، حلال غذا اور حلال ذریعۂ معاش ہے۔ دل میں اطمینان و خلوص ہو کیونکہ خلوص دعا کا محرک ہوتا ہے۔ ہمیشہ خلوصِ نیت اور رقتِ قلب کے ساتھ بار، بار دعا کرتے رہیے۔

اوقاتِ قبولیتِ دعا

کتاب کافی میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ ''بہترین دعا کا وقت، وقتِ سحر ہے۔'' اور حضرت علی ابن طالبؓ فرماتے ہیں کہ دعا کے لیے چار اوقات غنیمت ہیں۔

1۔ تلاوتِ کلام پاک کے بعد۔

2۔ اذان و اقامت کے درمیان۔

3۔ بارش برسنے اور ہواؤں کے چلنے کے وقت بالخصوص نصف شب کے بعد جو دعا کا بہترین وقت ہے۔

4۔ وقتِ جہاد جبکہ دونوں صفیں آپس میں ملیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''جس وقت تم پر رقت طاری ہو تو اس وقت دعا کرو کیونکہ جب تک خلوص نہ ہو رقت طاری نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ نماز پنجگانہ عمدہ ترین اوقات میں فرض کی گئی ہیں۔ لہٰذا اپنی حاجتیں بعد نماز پنجگانہ طلب کرو۔''

جمعرات کو عصر سے لے کر روز جمعہ غروبِ آفتاب تک بہترین مجرب وقت ہے۔

اول برادر مومن کے لیے بعد اپنے لیے دعا طلب کرو۔

مقاماتِ قبولیتِ دعا

کتاب نجتہ الدعوت میں ہے کہ دعا کی قبولیت کے بہترین مقامات مندرجہ ذیل ہیں۔ یوں تو رب کریم ہر آن ہمارے ساتھ ہے اور ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

1۔ مسجد الحرام۔ 2۔ عرفات۔ 3۔ مشعر الحرام۔ 4۔ مسجد نبوی اور مدینہ منورہ۔ 5۔ مسجد کوفہ۔ 6۔ بیت المقدس۔ 7۔ تمام مساجد۔ 8۔ مقابر شہدا اصلحا و والدین۔ 9۔ تمام آئمہ معصومین علیہ السلام کے روضہ ہائے مبارک خصوصاً (نواسۂ رسول حضرت امام حسین علیہ السلام) دعا مومن کا ہتھیار ہے اور اس کا مصلیٰ جائے دعا ہے۔ خلوص اور یقین کو شاملِ حال رکھیے۔ ان شاء اللہ دعائیں ضرور مستجاب ہوں گی اور پریشانیاں ٹلیں گی اگر اس فانی دنیا میں ہماری ہی بہتری کے لیے دعائیں مستجاب نہ بھی ہوں تو اس ابدی دنیا میں وہ بہترین اجر کا باعث ہوں گی خدا ہمارے یقین اور ایمان کو سلامت رکھے۔ (آمین)

المتین

یہ جمالی اسم پاک ہے۔ اس کے اعداد 500 ہیں۔ اس اسم مبارک کے بے شمار شفائی خواص ہیں۔ اس کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اگر کوئی شیر خوار بچہ دودھ چھڑانے کے بعد ہر وقت روتا رہے اور کسی طرح سے اسے صبر نہ آئے تو ایسی صورت میں یہ اسم پاک گیارہ مرتبہ پڑھ کر پانی پر دم کریں اور بچے کو پلا دیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بچہ سکون محسوس کرے گا اور اس کے رونے کی عادت ختم ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ اسے صبر عطا فرمائے۔

اگر کسی دودھ پلانے والی عورت کے دودھ میں کمی واقع ہو جائے تو وہ ایک کپ پانی پر باوضو حالت میں گیارہ مرتبہ یہ اسم پاک پڑھ کر دم کرے اور پانی پی لے تو ان شاء اللہ چند یوم کے اس عمل سے دودھ کی کمی ختم ہو جائے گی۔

اس اسم مبارک کو کثرت سے پڑھنے سے اللہ تعالیٰ کمزوری دور کر کے مضبوطی و توانائی عطا فرماتا ہے۔

بری عادات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ہر

نماز کے بعد اول و آخر درود پاک پڑھیں اور درمیان میں 111 مرتبہ اس اسم مبارک کو پڑھیں۔ اس اسم پاک کے خواص کی برکت سے اللہ تعالیٰ قلب کو اطمینان عطا فرمائے گا اور دل نیکیوں کی طرف مائل ہو جائے گا۔

جو کوئی یہ چاہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں سکون و سرور کی دولت نصیب ہو تو وہ اس کا کھلا ورد کرے۔

اگر کوئی شخص ہر نماز فجر کے بعد 311 مرتبہ اس اسم مبارک کا ورد کرے تو اس کا دل اللہ تعالیٰ کی یاد کی طرف مبذول ہو جائے گا۔

اگر کوئی شخص ترقی کا خواہشمند ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ہر روز صبح کے وقت باوضو حالت میں 121 مرتبہ اس اسم مبارک کو پڑھے اور اول و آخر تین مرتبہ درود شریف لازمی پڑھے۔ ان شاء اللہ ترقی کے وافر مواقع میسر آئیں گے۔

الخالق

یہ اسم جمالی ہے۔ اس کے اعداد 731 ہیں۔ اس اسم مبارک کو بکثرت پڑھنے والا ہر قسم کی تکالیف اور مشکلات سے محفوظ رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی خصوصی توجہ سے نوازتا ہے۔

تخلیقی کاموں میں حصہ لینے والے افراد کے لیے ہر نماز کے بعد باوضو حالت میں تین سو مرتبہ اس اسم مبارک کا ورد کرنے سے تخلیق کے کاموں میں دماغی صلاحیتیں بڑھ جاتی ہیں اور ذہنی صلاحیتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مشکل کام میں آسانی کے اسباب پیدا فرماتا ہے۔

اس کا ذکر کرنے والا مصائب سے بچا رہتا ہے۔

الفتاح

یہ اسم جلالی ہے۔ اس کے اعداد 489 ہیں۔

جو آدمی نماز فجر کے بعد ستر مرتبہ سینے پر ہاتھ باندھ کر پڑھے گا اس کا دل نور سے منور ہو جائے گا۔

جو لوگ مقرر ہوں۔ شاعر یا ادیب ہوں وہ اس اسم پاک کا نماز فجر کے بعد ضرور ورد کیا کریں۔

دنیاوی حاجتوں کے لیے 489 مرتبہ اس کا ورد کرنا بہت مفید ہے۔

وکیلوں کو مقدمہ جیتنے کی خواہش ہو تو نماز فجر کے بعد 101 بار اس کا ورد کریں۔ ان شاء اللہ مقدمہ جیت جائیں گے۔

ہر نماز کے بعد اس اسم پاک کا ورد کرنے سے دلوں کے زنگ دور ہو جاتے ہیں۔

اس اسم پاک کا بکثرت ورد کرنے سے فیوض و برکات کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

باوضو ہو کر اس کا ورد کرنے والے کی اللہ تعالیٰ ہر مشکل آسان فرماتا ہے۔

اس اسم پاک کی خاصیت یہ ہے کہ اس کا کثرت سے ورد کرنے والے کو اللہ تعالیٰ ہر مشکل کام میں فتح و نصرت سے نوازتا ہے۔

اگر کوئی رزق کی تنگی دور کرنے کے لیے نماز فجر کے بعد اول و آخر تین مرتبہ درود پاک پڑھے اور درمیان میں 121 مرتبہ اس اسم پاک کو پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں فراوانی عطا فرمائے گا اور اسے کشائش نصیب ہوگی۔

اگر کسی کی کوئی جائز مشکل حل نہ ہو رہی ہو تو اس کو حل کرنے کے لیے نماز عشا کے بعد اول و آخر تین، تین مرتبہ درود پاک پڑھے اور درمیان میں 211 مرتبہ اس اسم پاک کو خلوص نیت کے ساتھ پڑھے اور پھر اللہ تعالیٰ ہر قسم کی مشکل بہت جلد آسان ہونے کے اسباب غیب سے پیدا ہو جائیں گے۔

جس کو بھول جانے کی شکایت ہو اسے چاہیے کہ وہ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد 99 مرتبہ اس اسم مبارک کو پڑھ کر اپنے سینے پر پھونک مارے۔ چند یوم کے عمل سے ہی اس کی دماغی حالت بہتر ہو جائے گی۔ حافظہ قوی ہو جائے گا اور بھول جانے کی عادت رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی۔

پروردگار ہمارے علم میں اضافہ اور عمل میں مضبوطی عطا فرمائے۔ (الٰہی آمین)

☆☆☆

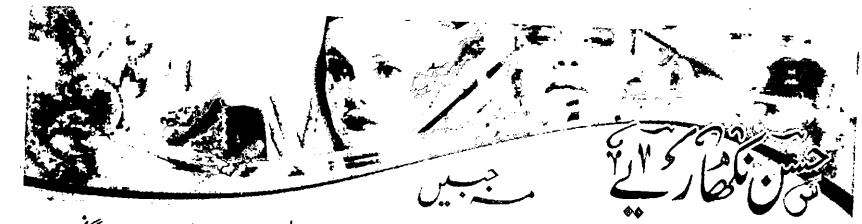

بالوں سے متعلق اہم معلومات

بالوں کو نرم و ملائم بنانا

بعض خواتین کے بال بڑے سخت ہوتے ہیں۔ انہیں نرم کرنے کے لیے غسل کرنے سے قبل ان پر روغن بادام یا روغن ناریل لگائیں۔ اس طرح بال ملائم ہوجائیں گے اور ان کی جڑیں بھی مضبوط ہوں گی۔ یہ ترکیب ان خواتین کے لیے زیادہ مفید ہے جو تراشیدہ بال رکھنے کے باوجود ہر وقت بالوں میں تیل لگا سکیں۔

بالوں کو جھڑنے سے بچانے کی ترکیب

سر کے بال جھڑتے ہوں اور ان کی جڑیں کمزور ہوگئی ہوں تو روغن زیتون، تلوں کا تیل، روغن آملہ اور ناریل کا تیل ہم وزن لے کر ملالیں اور بالوں کی جڑوں میں لگایا کریں۔ بالوں کی جڑیں مضبوط ہوجائیں گی اور بال جھڑنے سے بھی محفوظ رہیں گے۔

بالوں کی سکری دور کرنا

ایک اونس گندھک پاؤ بھر پانی میں ملا کر اس سے بال اچھی طرح دھو ڈالیں سکری دور ہوجائے گی۔ نیز بال نرم اور چمکدار ہوجائیں گے۔

بالوں کو گرنے سے بچانا

میتھی کے لعاب دار بیج پانی میں پیس کر ان سے ہفتے میں دو بار سر کو دھوئیں۔

تیزی سے سفید ہوتے بالوں کے لیے

ماش کی دال (چھلکوں والی) کو پیس کر رکھ لیں اور سورج نکلنے سے پہلے اس سے سر دھوئیں۔ چالیس دن تک یہ عمل دُہرائیں۔

سر دھونے کے بعد بالوں کو الگ الگ رکھنے کی ترکیب

سر دھونے کے بعد بالوں کی جڑوں میں دودھ کا ہلکا، ہلکا مساج (مالش) کریں۔ ازاں بعد نیم گرم پانی میں لیموں کا رس نچوڑ کر بالوں میں ڈالیں اس طرح بال باہم جڑیں گے نہیں۔

سر کی خشکی دور کرنا

سر کی خشکی دور کرنے کے لیے مولی کا پانی نکال لیں اور اس میں تھوڑا سا سرسوں کا تیل ملا کر سر میں لگائیں۔ یہ عمل ہفتے میں ایک بار ضرور کیا کریں..... غذا اچھی کھائیں۔ پھلوں کا استعمال زیادہ کریں۔

سر کا گنج ختم کرنا

گندھک ایک چوتھائی اونس، تارامیرا روغن ڈیڑھ اونس، روغن چنبیلی ایک اونس، روغن زیتون چار اونس ملالیں اور پھر سر پر مالش کیا کریں ایسا کرنے سے جلد ہی گنجا پن دور ہوجائے گا۔ تمباکو کے پھول کو کوٹ دے تیل میں پیس کر لیپ کرنے سے بھی سر کا گنج دور ہو جائے گا۔

بالوں کو لمبا کرنا

آملہ ایک پاؤ، سیکا کائی ایک پاؤ اور ریٹھے ایک پاؤ لے کر سب کو الگ، الگ پیس لیں جب بھی بال دھونے کے لیے بیٹھیں تو ایک کلو پانی میں تینوں سفوف کا ایک، ایک بڑا چمچ ڈال کر ابالیں۔ جب پانی آدھے کے قریب خشک ہوجائے تو بچے ہوئے پانی سے سر دھولیں۔ اس طریقے سے آپ کے بال لمبے ہوجائیں گے یا بیری کے پتوں کا جھاگ ہفتے میں دو بار استعمال کرنے سے بال لمبے ہوجاتے ہیں یا ناریل کے تیل میں لیموں کا عرق ملا کر دن میں تین چار مرتبہ مساج کریں۔ نیم کے پتوں کو اچھی طرح ابال کر اس کے پانی سے سر دھوئیں۔ چائے بنانے کے بعد اس کی پتی کو نہ پھینکیں بلکہ اس میں اور پانی ڈال کر جوش دے لیں اور پھر اسی کے پانی سے سر دھوئیں تو بال لمبے اور چمکدار ہوں گے۔

بال خورے کو ختم کرنے کی ترکیب

انڈے کا تیل لے کر جس جگہ سے بال اڑ گئے ہوں وہاں انگشت شہادت سے اس تیل کو جذب کریں۔ بال خورے کا مرض ختم ہوجائے گا۔

DON'T WANT TO LOSE WEIGHT

وزن گھٹائیں
خوبصورت و تندرست ہو جائیں

ہر دس میں سے چار افراد
موٹاپے کی وجہ سے ذیابیطس کا
شکار ہو جاتے ہیں۔

ہر دس میں سے دو افراد
موٹاپے کی وجہ سے دل کی بیماریوں
میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ہر دس میں سے چار افراد موٹاپے کی وجہ سے
کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

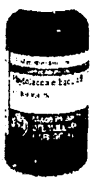

Phytolacca e baccis Ø
10 drops thrice a day

+

Phytolacca americana 3x
1 tablet thrice a day

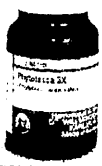

Dr. Willmar Schwabe Germany
From Nature. For Health.

Partner:
Dr. Hamid
General Homoeo (Pvt.) Ltd.

Original Medicines of Schwabe Germany, easily available now at all Homoeo Pharmacies

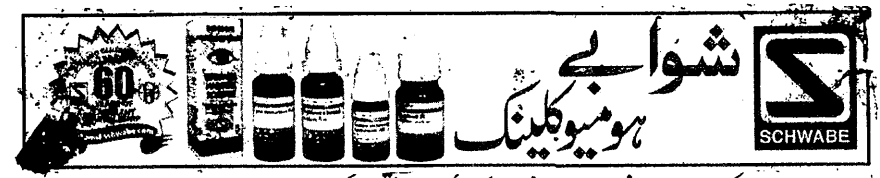

شوابے ہومیو کلینک

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

پتّی اچھلنا اور بواسیر

مسز منا..... کینٹ ملتان

مجھے بہت عرصے سے الرجی ہے جسم پر اور خونی و بادی بواسیر ہے۔ دونوں بیماریوں کے لیے میں نے مختلف ہومیو پیتھک علاج کروائے، وقتی آرام آتا ہے پھر تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ جسم پر سرخ دھبے بن جاتے ہیں۔ ان میں خارش ہوتی ہے اور بواسیر میں درد بہت رہتا ہے جلن بھی بہت ہوتی ہے۔ پہلے قبض کی صورت میں اجابت ہوتی ہے جس سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ پھر مروڑ شروع ہو جاتی ہے۔ آپ کو اس امید پر خط لکھ رہی ہوں کہ آپ اچھی دوا تجویز کریں گے شکریہ۔

جواب: کون سی چیز کھانے، پینے، لگانے، پہننے یا کسی جگہ جانے سے یہ الرجی ہوتی ہے؟ کس وقت ہوتی ہے؟ مرغن کھانوں سے پرہیز کریں، کولڈ ڈرنکس اور ہر قسم کے مشروب سے بچیں۔ سبزیاں، پھل، چکی کے آٹے کی روٹی استعمال کریں۔ پانی کم از کم 12 گلاس روزانہ پیا کریں لیکن کھانے کے ساتھ اور کھانے کے فوراً بعد نہیں پیا کریں۔ کھانے کو خوب چبا کر کھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Aesculus Pentarkan Ptk 3 اور Urtica Pentarkan Ptk 86 کے 10، 10

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

اکتوبر 2019ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: _____

پتا: _____

_____

قطرے ایک گھونٹ سادہ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

قد بڑھانا ہے

طلال.....کراچی

میں بڑی امید کے ساتھ اپنا مسئلہ آپ کو بتا رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کوئی اچھی دوا... قد بڑھانے کے لیے دیں گے جس سے میرے قد میں 4 انچ کا اضافہ ہوجائے۔ میری والدہ کا قد چھوٹا ہے اور والد کا قد نارمل۔ خاندان والوں کے قد بھی بہت اچھے ہیں۔

جواب: بیٹا نماز کی پابندی کرو، صبح فجر کے بعد کھلی فضا میں اچھل کود والی ورزش کرو، متوازن غذا کا (دودھ، دہی، انڈا مکھن، پنیر، فروٹ، سبزیاں، دالیں، گوشت بکرا/گائے، مچھلی) بھرپور استعمال کریں، یہ جسمانی نشوونما اور صحت کے لیے بڑی اہم چیز ہے جسے ہم نظرانداز کرتے ہیں۔ جنک/فاسٹ فوڈز اور مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں۔ رات کو سوتے وقت تکیہ نہ لیں۔ قد آپ کا مناسب ہے۔ بہرحال 6 ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی، Baryta Carb 30 Calc Phos 30، کے 5,5 قطرے 1/2 کپ پانی میں اور AlfalfaQ کے 15 قطرے 1/2 کپ پانی میں ہر کھانے کے دو گھنٹے بعد دن میں 3 مرتبہ لیں۔

بیماریوں کو جمع نہ کریں

ضیاء الحق.....لاہور

تین سال پہلے سفر کے دوران کار کی ٹکر سے دماغی چوٹ کا شکار ہوا مگر گھٹنوں میں تکلیف رہ گئی۔ کان شائیں شائیں کرتے ہیں۔ سماعت کمزور ہوگئی ہے۔ اب نزلہ دائمی قبض، کولہے اور پنڈلی میں کھنچاؤ ہے۔ دائیں طرف ہرنیا ہے، مثانہ میں درد اور پیشاب کم آنے پر گردوں میں ہلکا، ہلکا درد ہوجاتا ہے۔ پاؤں کی انگلیاں سن ہوجاتی ہیں۔ گھٹنوں کے پٹھوں میں درد ہے، گلا خراب رہتا ہے، تھوڑی بلغم آتی ہے، منہ کا ذائقہ پھیکا ہوجاتا ہے.... سانس پھولنے لگا ہے۔

SCHWABE

جواب: محترم، اللہ آپ کو صحت وتندرستی دے آمین۔ آپ یہ بات اچھی طرح ذہن میں رکھیں کہ بیماری نہ ایک دم آتی ہے اور نہ ایک دم جاتی ہے۔ خواہش بے شک ہم سب کی یہی ہوتی ہے کہ ہم دوا کھائیں اور فوراً ٹھیک ہوجائیں۔ ایسا ہوتا ہے لیکن اس وقت جب بیماری حاد ہو، مزمن بیماری وقت لیتی ہے اور ایسی حالت میں بے صبری کرنا مرض کو ناقابلِ علاج بنادیتا ہے۔ کبھی ایلوپیتھک کبھی ہومیوپیتھک تو کبھی یونانی اسی وجہ سے امراض بڑھتے جارہے ہیں جوں جوں ادویات استعمال ہورہی ہیں۔ اللہ سے دعا کریں نماز پڑھیں قرآن کی تلاوت کریں۔ چہل قدمی کریں۔ پانی کم از کم 8 گلاس روزانہ پئیں، کھانا چبا کر کھائیں یا میش کر کے لیں، کھانے کے ساتھ اور کھانے کے فوراً بعد پانی نہ پئیں۔ تیزابیت بڑھتی ہے جس سے گیس جلن اور پیٹ میں بھراؤ کا احساس ہوتا ہے۔ قبض یا موشن کی شکایت ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ تک استعمال کرنے کے بعد اپنا حال بتائیں۔ Barium Carb 30 کے 5، 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن 3 مرتبہ لیں۔

پیریڈ کا مسئلہ

مریم.....ساہیوال

محترم ڈاکٹر صاحب میں دو تین سال سے ہومیو کلینک پڑھ رہی ہوں اور آج ہمت کر کے اپنی بیٹی کا مسئلہ لکھ رہی ہوں بلکہ یوں کہیں مسائل، میری بیٹی پیدائشی صحت مند تھی لیکن 23 سال کی عمر سے اس کو مسئلوں نے گھیر لیا۔ پہلے اس کے پیریڈ بند ہوگئے پھر چہرے پر بال نکل آئے..... کئی حکیموں سے علاج کرایا کبھی فرق پڑا کبھی نہیں پھر لیڈی ڈاکٹر سے علاج کرایا، وہ چکر والی گولیوں کا پتا دیتی تھیں جس سے پیریڈ آتے پھر جیسے ہی چھوڑتی مسئلہ شروع۔ پھر ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے علاج کروایا لیکن بے سود۔ میری بیٹی نے ہر طرح کا پرہیز کیا

کھانے پینے میں۔اب وہ ہومیو پیتھک دوا (Or natic _ oleum Jecoris 3x) ..... استعمال کر رہی ہے۔پیریڈز شروع ہوتے ہیں تو 19-20 دن تک رہتے ہیں اور نہ ہوں تو چھ چھ ماہ بند رہتے ہیں۔جس سے اس کے جسم میں درد رہتا ہے، سوئے تو کروٹ بدل سکتی ہے نہ ہی کروٹ کے بل سو سکتی ہے اُلٹی سوتی ہے۔پاؤں بہت سوج گئے ہیں بلکہ پورا جسم ہی پھول گیا ہے، درد رہتا ہے۔بال ایک دم سفید ہو گئے ہیں۔ہتھیلیوں پر شدید خارش رہتی ہے۔سانس پھول جاتی ہے، کمر میں درد رہتا ہے، بایاں حصہ کندھے سے پاؤں تک سوج گیا ہے۔ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کسی دوا کی وجہ سے انفیکشن ہوا ہے، پٹھوں میں کھنچاؤ پیدا ہو گیا ہے۔مہربانی فرما کر دوا تجویز کریں بہت امید سے خط لکھ رہی ہوں، پرہیز بھی بتائیے گا نوازش ہوگی۔

جواب: 23ویں سال ایسی کیا بات ہوئی کہ یہ سارے مسئلے یکدم پیدا ہو گئے اس وجہ کو جاننا ضروری ہے۔ دوم اس کے کچھ ٹیسٹ کرا کر رپورٹس بھیجیں Blood CBC + ESR Profile, U/S Whole abdomen, Thyroid Profile, Urea, Creatinine, Prolactin, TSH, FSH دوا کی تجویز مکمل تشخیص کے بعد ہو سکے گی۔لہٰذا جلد از جلد یہ ٹیسٹ کرا کر رپورٹس بھیجیں۔

صحت کے اصول اپنائیں

ہوریہ انور.....حیدر آباد

میری بہن غیر شادی شدہ ہے اور دُبلی اور نازک بہت ہے نسوانی حسن تو بالکل نہیں، ابو کے انتقال کے بعد سے ہر وقت چپ رہتی ہے۔نفسیاتی سوچوں کا شکار ہو رہی ہے۔

میری بارہ سال کی بیٹی ہے۔اُس کی ہائیٹ بہت کم ہے، اندرونی صحت مند بھی نہیں، اکثر بیمار رہتی ہے۔

میری ہڈیوں میں، کمر میں، پنڈلیوں میں بہت درد ہوتا ہے۔میرا وزن بھی چاول چائے اور میٹھا کھانے کی وجہ سے 80 پونڈ ہے۔میری ساری ڈاڑھیں ختم ہو چکی ہیں۔ سب دانتوں میں کیڑے ہیں۔ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ سب نئے دانت لگیں گے۔

میری چھوٹی بیٹی کے ابھی سے بائیٹے ہاتھ اور پیر کے پنجوں میں آتے ہیں۔اکثر ٹانگ میں بہت درد ہوتا ہے۔ پیٹ میں کچھ ماہ بعد کیڑے ہو جاتے ہیں۔پہلے اس کو کیڑوں کی دوا بھی دیتی تھی، ایک دم سے بھوک بہت لگتی ہے اور اکثر ہضم نہیں ہوتا، ایک کپ دودھ بھی نہیں پی پاتی۔

میرے چھوٹے بیٹے کی ہڈیاں بہت کمزور ہیں، وہ 11 سال کا ہے۔دو بار ہڈی ذرا سی گھر میں چوٹ اور ٹکراؤ سے ٹوٹ چکی ہے۔

بڑا بیٹا پھر بھی ٹھیک کھا پی لیتا ہے کیونکہ وہ اچھلتا کودتا رہتا ہے مگر اُسے بھی بلغم تھوکنا پڑتا ہے، گیس رہتی ہے، پیٹ پھولا رہتا ہے، جلد تھک جاتا ہے۔

میری بیٹی کے 5,6 سال پہلے ران کے ٹشوز پھٹ گئے تھے۔گھر میں کھیل کے دوران چوٹ لگی۔بعد میں آنے جانے میں گدبنی، تکلیف بہت بڑھ گئی، بخار رہنے لگا۔ درد سے تڑپتی ہے۔

جواب: آپ نے بڑی تفصیل کے ساتھ تمہید باندھی اور اس کے اندر مختصراً اپنی بہن، بیٹی، بیٹے اور اپنا حال بھی لکھا لیکن نامکمل، آپ ایک ساتھ بہت کچھ کہنا چاہ رہی ہیں ہر ایک کا حال تفصیل سے الگ الگ صفحہ پر لکھنا چاہیے تاکہ ہر ایک کا تجزیہ کر کے ہر ایک کے لیے دوا تجویز کی جا سکے۔آپ کو ادویات تجویز کر رہے ہیں تاکہ آپ کے کچھ مسائل حل ہو جائیں۔

۱: تمام گھر والے نمازوں اور قرآن کی تلاوت پابندی سے کریں۔گھر میں خیر و برکت ہوتی ہے۔

۲: صبح سویرے کی آکسیجن اور دھوپ صحت کے لیے مفید ہے۔اس کے لیے رات جلد سوئیں۔

۳: کھانا کھانے کے اوقات مقرر کریں۔

۴: کھانا اچھی طرح چبا کر کھائیں۔

۴: کھانے کے ساتھ، درمیان اور بعد میں پانی نہ پئیں۔

۵: ہر کھانے کے بعد دانت ضرور صاف کریں

خصوصاً رات سونے سے پہلے اور صبح ناشتے کے بعد برش کریں 3 منٹ تک۔

۶: متوازن، صحت مند اور قدرتی غذا لیں۔ رنگدار، کیمیکل، ڈبا پیک شدہ غذاؤں سے بچیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔

بہن کو Ignatia 200 کی ایک خوراک یعنی 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دیں اس کے ایک دن بعد Natrum mur 30,Kali Phos 30 کے 5,5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔

بیٹی کو Echinacea Q اور Baryta carb 30 کے 5.5 قطرے دن میں 3 مرتبہ دیں۔

آپ خود لیں Calc..Carb 30 کے 5.5 قطرے دن میں 3 مرتبہ لیں۔ بیٹوں کو Calc.Carb 30, Calc.Phos 30 کے 5.5 قطرے دن میں 3 مرتبہ ایک گھونٹ پانی میں دیں۔ اور جس بیٹے کو بلغم آتا ہے اس کو Ipecac30 بھی دن میں 3 مرتبہ دیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ آکر دکھائیں۔

۱۰ اور معدہ

ثمرین .....نواب شاہ

ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ بالوں کا ہے۔ ویسے تو ماشاءاللہ میرے بال لمبے اور گھنے ہیں لیکن بالکل بے رونق ہیں۔ لمبائی میں کمر سے نیچے تک آتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بہت زیادہ دو منہ ہو چکے ہیں تقریباً کندھوں تک خراب ہو چکے ہیں۔ برائے مہربانی اس مسئلے کا حل بتائیں، میں بہت پریشان ہوں۔

میرے بالوں سے میل بھی اچھی طرح صاف نہیں ہوتا۔ شیمپو تبدیل کرنے سے بھی کچھ فرق پڑا ہے۔ میرا دوسرا مسئلہ معدے کا ہے۔ میں 11 سے 12 سال کی تھی جب سے میرے معدے میں جلن ہوتی ہے اور اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ معدے سے گرم پانی میرے منہ میں آجاتا ہے میں جگہ، جگہ تھوکتی رہتی ہوں گرمی سردی دونوں موسم میں جلن ہوتی ہے اب تو رات کو سوتے وقت بھی منہ سے پانی نکلنے لگتا ہے۔ جس سے بُو بھی آتی ہے۔ میرے مسئلوں کا حل بتائیں۔ اللہ پاک آپ کو اجرِ اعظیم عطا فرمائے (آمین)

SCHWABE

جواب: متوازن صحت مند غذا کھائیں یعنی دودھ، انڈا، گوشت، سبزیاں، دالیں اور پھل۔ پانی کے کم از کم 6 سے 10 گلاس پئیں لیکن کھانے کے ساتھ نہیں اور کھانے کے فوراً بعد نہیں۔ کھانا اچھی طرح چبا کر کھائیں۔ بالوں کو ہفتہ میں 2 بار ہمارے والے شیمپو سے دھوئیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ پہلے Sulphur 200 کی ایک خوراک 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں صبح نہار منہ لیں اس کے 2 دن بعد Carbo vegetabilis Pentarkan Ptk22 کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ تھوڑے پانی کے ساتھ لیں ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

لیکوریا اور مینسز کی خرابی

وجیہہ بی بی.....ملتان کینٹ

پاکیزہ کے حوالے سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اپنی بیٹی کا علاج آپ سے کروانا ہے، بہت پرانی بیماری ہے بہت علاج کر لیے لیکن آرام نہیں آیا۔ تقریباً جب اس کی عمر 16 سال تھی جب سے اسے لیکوریا ہے مینسز بھی صحیح نہیں آتے دس دن سے زیادہ ٹائم رہتا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے ٹیسٹ بھی کروائے ہیں جو آپ کو بھیج رہی ہوں۔ ایلوپیتھک دواؤں سے آرام ہی نہیں آیا بائیوکیمک دوا بائیو پلاسجن 13 بھی لی ہے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کی وجہ سے ہڈیاں بھی کمزور ہیں۔ کیلشیم بھی لیتی ہے۔ کمزور بھی بہت ہے۔ اب اس کی عمر 30 سال ہے۔ شادی نہیں ہوئی۔ آپ کوئی دوا تجویز کریں۔

جواب: ورزش کرائیں، پہلے واک پھر جاگنگ اس کے بعد رنگ، متوازن غذا کا خیال رکھیں، لال گوشت، سبزیاں اور پھلوں کا استعمال کریں۔ مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی MagnesiumPhos

Ptk60 کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں اور 2 ماہ بعد حال بتائیں۔

سفید بال

رامین.....راولپنڈی

میں ہومیو پیتھک علاج تقریباً ایک سال سے کر ... ہی ہوں۔ میرے بالوں میں سفیدی بہت ہے۔ مجھے نزلہ رہتا ہے اور ناک بند ہو جاتی ہے۔ پہلے آپ سے دو بار خط کے ذریعے علاج کروا چکی ہوں۔

دوائی سے زیادہ فرق نہیں آیا۔ نزلے کے علاج کے لیے بھی دوا تجویز کر دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ کوئی ایسی بھی دوائی تجویز کریں جس سے بالوں کی سفیدی ختم ہو جائے۔

جواب: بالوں کو دھونے کے لیے میٹھا پانی استعمال کریں اور کوئی اچھا شیمپو بھی، ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی AcidPhos30 اور Lycopodium30 کے 5،5 قطرے دن میں 3 مرتبہ ایک گھونٹ پانی میں لیں جبکہ Bacilinum200 ہر 15 دن بعد لیا کریں۔ 6 ماہ بعد اپنی کیفیت سے مطلع کریں۔

آنکھوں کی کمزوری

محمود.....لاہور

میری بیٹی کی عمر ساڑھے سات سال ہے، اس کو تین سال کی عمر سے عینک لگی ہے۔ اس کے سر میں شدید درد ہوتا تھا اور متلی کی کیفیت رہتی تھی۔ بائیں آنکھ کو ٹیڑھا کر کے دیکھتی تھی۔ اب یہ صورت حال ہے کہ ہر چھ ماہ بعد نظر چیک کروانے پر پہلے سے زیادہ کمزور نکلتی ہے۔ برائے کرم ایسی اچھی دوا تجویز کریں جو نہ صرف نظر کو ٹھہرنے میں مدد دے بلکہ ٹھیک بھی کرے۔

جواب: محمود صاحب آپ نے تفصیل بالکل نہیں لکھی اب سر درد کیسا ہوتا ہے یا بالکل ختم ہو گیا ہے اس کے لیے کیا علاج کیا۔ آنکھ کی پوزیشن کیا ہے نمبر کتنا تھا اور اب کتنا ہے۔ بیٹی کا وزن اور خوراک کیسی ہے۔ مکمل تفصیلات لکھیے گا۔ فی الحال ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Staphisagria 30 اور Ruta 30 کے 5،5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں، 2 ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

وقت سے پہلے مینسز

بتول.....کراچی

میں پاکیزہ کی بہت پرانی قاریہ ہوں۔ ہومیو کلینک سے بھی کافی استفادہ حاصل کیا ہے۔ میں ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ پچھلے سال میں شاپنگ کرنے گئی تھی۔ گرمی بھی شدید تھی۔ جب میں گھر آئی تو مجھے مینسز شروع ہو گئے۔ حالانکہ 10 دن پہلے ہی بند ہوئے تھے۔ وہ دن اور آج کا دن ہے۔ ہر ماہ 10 دن پہلے ہی سے مینسز شروع ہو جاتے ہیں۔ جس سبب بہت کمزوری ہو گئی ہے اور خون کی بھی کمی ہو گئی ہے۔ چھوٹی بیٹی سوا سال کی ہے۔ اس کو فیڈ بھی کروانی ہوں۔ برائے مہربانی ایسی دوا بتائیں جس سے میرا مسئلہ بھی حل ہو جائے اور کمزوری بھی دور ہو جائے۔

جواب: محترمہ آپ اپنا الٹرا ساؤنڈ کرا کر رپورٹ ضرور بھیجیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Ptk60 Magnesium Phos Pentarkan کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ اور Ferrum Ptk45 Pentarkan کی دو گولیاں تھوڑے پانی کے ساتھ 3 مرتبہ دن میں لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

☆☆☆

Dr. Willmar Schwabe Germany
Available at All Medical & Homoeopathic Stores
شوابے سنگل ریمیڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیوپیتھی